اُردو کا واحد حوالہ جاتی مجلّہ

عَالمی اُردو ادب

اپریل ۲۰۰۹ء

کشمیری لال ذاکر نمبر

مدیر

نند کشور وکرم

جلد: ۲۸ قیمت ۳۰۰/روپے

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱

ISBN 978-81-88298-08-2

KASHMIRI LAL ZAKIR NUMBER

ALAMI URDU ADAB APRIL 2009

Price Rs. 300

عالمی اردو ادب' میں درج تحریریں تحقیق و حوالہ کی غرض سے شائع کی گئی ہیں اس میں ظاہر کی گئی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ نیز اس میں شائع افسانوں میں نام، مقامات اور واقعات میں مطابقت کو محض اتفاقیہ سمجھا جائے۔

سرورق اور پینٹ کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر نمبر

عالمی اردو ادب اپریل ۲۰۰۹

ایف ۲۱/۱۴ (ڈی) کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱ فون 011-22094419
ای میل nandkishorevikram@yahoo co in

بیرون ملک میں عالمی اردو ادب کی دستیابی کے رابطے

امریکہ

جناب اقبال ظفر ملک

2072 20th Lane, 5B Booklyn
New York USA 11214 Phone 001-718-372-1044

برطانیہ

جناب جتیندر بلو

6 Corfton,Lodge, Corfton Road, Ealing
London, (UK) W52 HU Phone 0044-2089980185

کینیڈا

جناب بی کے بخشی

46, Montrose,Crescent,Unionville,Ontario,
Canada-L3R 725 Phone 001-905-479-0786

Alami Urdu Adab
F-14/21(D) Krishan Nagar, Delhi-110051

فہرست مضامین

شخصیت

فکشن

ناول نگاری

افسانے

نقد و نظر

خاکہ نگاری

شاعری

پیش لفظ

اُردو کی ہمہ جہت شخصیت کشمیری لال ذاکر ۷ اپریل کو نوے سال کے ہو گئے اور انہیں میدان ادب میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے ہوئے ۶۵ سال۔ اس موقع پر ہم انہیں اُن کی ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کرنے کے لئے عالمی اُردو ادب کا یہ خصوصی شمارہ پیش کر رہے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں عالمی اُردو ادب برِ صغیر کی چھ ممتاز ادبی ہستیوں حبیب جالب، دیویندر اسر، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، اشفاق احمد اور گوپی چند نارنگ پر خصوصی شمارے پیش کر چکے ہیں۔ اور اب ہم نے کشمیری لال ذاکر صاحب کی زندگی کے نوے سال مکمل ہونے پر ان پر یہ یادگار مجلّہ پیش کیا ہے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ شاید ہی کوئی اُردو والا ایسا ہوگا جس نے اُن کی کوئی تخلیق خصوصاً ناول یا افسانہ نہ پڑھا ہو۔ کیونکہ ذاکر صاحب کی اُردو ادب میں صحیح شناخت ایک نامور فکشن نگار کی حیثیت سے ہے حالانکہ انہوں نے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ادب کی دیگر اصناف میں بھی اپنی علمی اور ادبی صلاحیت و بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں۔ انہوں نے ایک شاعر کے طور پر اپنی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ صحافت، خاکہ نگاری، رپورتاژ اور سفرنامے پیش کر کے بھی اہلِ اُردو سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی اُردو تصانیف ہندی انگریزی اور پنجابی کے علاوہ بعض دیگر زبانوں میں بھی اشاعت پذیر ہو کر دیگر زبانوں کے اہل ادب سے بھی خراج تحسین پا چکی ہیں۔

یوں تو ذاکر صاحب نے شاعری کے میدان میں بھی بڑی شہرت پائی ہے اور ان کے مجموعۂ غزلیات 'شیشہ بدن خواب'' اور مجموعۂ قطعات ''عکسِ رُخِ گلبدن'' اس کے بیں ثبوت ہیں تاہم ان کا

اصل میدان فکشن ہی ہے۔ اور اس میدان ایک مستند فکشن نگار کی حیثیت سے ایک بلند مقام حاصل کر چکے ہیں اور غالباً وہ ملک کے واحد افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں جنہوں نے ملک کے لگ بھگ ہر اہم مسئلے کو اپنے خوبصورت ناول یا افسانے کی شکل میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اور انہیں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ بعض کے نقوش قاری کے دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ گئے ہیں۔

ذاکر صاحب ملک کے واحد فکشن نگار ہیں جنہوں نے ہر اہم سماجی، قومی اور وطنی مسئلے کو ایک کہانی یا ناول کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ سونامی کا لرزہ خیز قہر ہو یا بھوپال گیس کا المیہ۔ بھودان تحریک ہو یا خواتین پر گھریلو جبر یا تشدد کے مسائل، رونگٹے کھڑے کر دینے والا کنشک ہوائی حادثہ ہو یا کشمیر میں غریبی، بے کاری اور تشدد اور جنگجویانہ صورتِ حال سے نبرد آزما عوام کی صورت حال، ملک میں خشک سالی سے متاثر کسان اور مزدور ہوں یا ملک میں بندھوا مزدوروں کا مسئلہ، قومی یکجہتی کا مسئلہ ہو یا ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی۔ غرضیکہ ہمارا کوئی بھی ایسا قومی مسئلہ نہیں جس پر انہوں نے کوئی ناول، افسانہ یا ڈرامہ قلمبند نہ کیا ہو۔ اور کئی تو ایسے مسائل ہیں جن پر صرف انہوں نے ہی اپنی فکشن نگاری کے نقوش ثبت کئے ہیں۔

ذاکر صاحب کو میدانِ ادب میں اپنی تخلیقات پیش کرتے ہوئے لگ بھگ پون صدی ہونے والی ہے اور وہ ایک سو کے قریب اپنی نگارشات پیش کر چکے ہیں اور اب بھی اُن کے اشہبِ قلم نے رکنے کا نام نہیں لیا اور وہ اب بھی اسی تیز رفتار سے تخلیقی سفر پر رواں دواں ہے۔ اُن پر کئی یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں لیکن ابھی بھی ناقدین و محققین نے اس پر وہ توجہ نہیں دی جس کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ادب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں انہیں تحقیقی اور تنقیدی کسوٹی پر مزید پرکھ کر ان کی ادبی کارگزاریوں کا مفصل تجزیہ و تحقیق کرنے کی ابھی ضرورت ہے۔

یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ ذاکر صاحب اس عمر میں بھی نوجوانوں کی طرح مسلسل کئی کئی گھنٹے مسلسل لکھنے پڑھنے اور انتظامیہ امور کو نپٹانے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ ہریانہ اردو اکادمی کے سیکرٹری کی حیثیت سے برسوں سے اپنی ادبی اور انتظامیہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور اُنہوں نے اپنی کاوش و استعداد سے اس اکادمی کو ملک کی چند برگزیدہ اکادمیوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ اُن کی جسمانی اور ذہنی قوت و صلاحیت کو دیکھ کر لوگ اُن پر رشک کرتے ہیں اور اُن کی اس چستی اور پھرتی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ اُن کی موجودہ استعداد و صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ہم توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اسی طرح مسلسل اپنی ادبی اور انتظامیہ امور کو بخوبی انجام دیتے ہوئے ایک صدی کا فاصلہ بڑی خوش اسلوبی

سے ملے کریں گے اور اُن کی زندگی میں ہی اُن کی صدی تقریبات منعقد کی جائیں گی اور وہ بھی شان و شوکت سے۔ آمین۔

اس شمارے کی تیاری میں ذاکر صاحب کے بے حد عقیدت مند فاروق ارگلی صاحب نے میری خاص طور پر مدد کی ہے جس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔

۷/ اپریل ۲۰۰۹ء **نند کشور وکرم**

کشمیری لال ذاکر

ایک نظر میں

نام	کشمیری لال موہن
قلمی نام	کشمیری لال ذاکر
ولادت	۷؍اپریل ۱۹۱۹ء بیگا بانیاں ضلع گجرات (پاکستان)
والدین	گورداس رام (والد) پرمیشوری دیوی (والدہ)
تعلیم	ایم۔اے (انگریزی) بی ٹی۔ اور تعلیم بالغاں اور سوشل ایجوکیشن میں خصوصی تربیت
شادی	۱۹۴۲ء میں شیلا موہن سے بمقام جموں
بچے	ایک بیٹا (ششی موہن) تین بیٹیاں (۱) ڈاکٹر کملیش موہن (۲) منو جھمر اور (۳) سرشٹی کوشل
پہلی کہانی	الگ الگ راستے۔ ہمایوں لاہور۔ ۱۹۴۳ء
موجودہ پیشہ	(۱) ۱۹۹۲ء سے وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کے ادارہ شکشن سنستھان چنڈی گڑھ کے چیئرمین۔ (۲) سیکرٹری ہریانہ اُردو اکادمی، پنچکولہ
سرگرمیاں اور مشاغل	تیس سال تک پنجاب و ہریانہ کے محکمہ تعلیم میں خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۷۷ء میں، حکومت ہریانہ کے محکمہ غیر رسمی و تعلیم بالغان سے سربراہ کی حیثیت سے سبکدوش۔ (۲) ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۴ء پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ میں سنٹر فار کانٹی نیوئنگ ایجوکیشن کے ڈائرکٹر اور ریجنل وسائل مرکز میں ڈائرکٹر، (۳) ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۲ء جن شکشن سنستھان چنڈی گڑھ میں اعزازی ڈائرکٹر۔ (۴) ۱۹۸۷ء سے ۲۰۰۰ء تک ہریانہ اُردو اکادمی پنچکولہ کے سیکرٹری (۵) ۲۰۰۴ سے ہریانہ انجمن ترقی اُردو کے صدر۔

مطبوعات

افسانے

۱۔ جب کشمیر جل رہا تھا (افسانے رڈرامے) حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۴۸ء
۲۔ ایک کرن روشنی کی۔ ۱۹۷۸ء
۳۔ اُداس شام کے آخری لمحے (افسانوی مجموعہ) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۷۹ء
۴۔ سیریوں والا فقیر (افسانے) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۴ء
۵۔ چنار چنار چہرے (افسانوی مجموعہ) ادارہ فکرِ جدید، نئی دہلی۔ ۱۹۹۴ء
۶۔ برف، دھوپ، چنار (کشمیری معاشرے سے متعلق) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ۲۰۰۵ء
۷۔ سمندری ہواؤں کا موسم (موضوع ہندو پاک دوستی) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۲۰۰۵ء
۸۔ تجھے ہم ولی سمجھتے (خواتین سے متعلق) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۲۰۰۷

ناول

۱۔ سیندور کی راکھ (سوانحی ناول) مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۵ء
۲۔ انگوٹھے کا نشان (بندھوا مزدور پر ناول) مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔ ۱۹۷۸ء
۳۔ چھٹی کا دودھ
۴۔ میرا گاؤں میری زندگی ہے۔ ۱۹۵۵ء
۵۔ مجھے جینے کا حق مل گیا۔ ۱۹۷۶ء
۶۔ ایک لڑکی بھٹکی ہوئی (نوجوانوں کے مسائل پر ناول) قیصر الادب بمبئی۔ ۱۹۷۹ء
۷۔ خون پھر خوں ہے (ایک تاریخی ناول) خیاباں پبلشنگ ہاؤس، بمبئی ۱۹۷۹ء
۸۔ دھرتی سدا سہاگن (بھودان آندولن پر ناول) مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۰ء
۹۔ کھجوراہو کی ایک رات (ایک تاریخی ناول) مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔ ۱۹۸۰ء
۱۰۔ کرماں والی (قومی یکجہتی پر ناول) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۰ء
۱۱۔ ایک شہر۔ ایک محبوبہ (چنڈی گڑھ پر ایک ناول) سٹار پاکٹ بکس، نئی دہلی۔ ۱۹۸۰ء
۱۲۔ تین چہرے ایک سوال (معصوم مزدوروں پر ایک ناول) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۱ء
۱۳۔ لمحوں میں بکھری زندگی (عورتوں کے مسائل سے متعلق) مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۲ء

۱۴۔ جاتی ہوئی رُت (ہندوستانی سوسائٹی میں عورت-ایک ناول) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۹۸۳ء

۱۵۔ سمندر صلیب اور وہ (تاریخی ناول) سیمانت پرکاشن، نئی دہلی۔ ۱۹۸۴ء

۱۶۔ ڈوبتے سورج کی کتھا (بوڑھوں کے مسائل پر) مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء

۱۷۔ بنجر ماول (خشک سالی پر ایک ناول) مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۸۷ء

۱۸۔ بلیک باکس (کنشک ہوائی حادثہ پر ناول) سٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ۱۹۸۹ء

۱۹۔ میرا شہر ادھورا سا (چنڈی گڑھ پر ایک ناول) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۱

۲۰۔ آدھے چاند کی رات (کشمیر کے موضوع پر) ۱۹۹۲ء

۲۱۔ ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (بھوپال گیس المیہ) مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۹۳ء

۲۲۔ اس صدی کا آخری گرہن (ناول) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۹۹۴ء

۲۳۔ میری شناخت تم ہو (سورت میں پلیگ کی وبا پر ناول) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۹۹۴ء

۲۴۔ آدھے چاند کی رات (کشمیر پر ایک ناول) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۹۹۵ء

۲۵۔ بنا چھت کا گھر (نشہ بندی پر ناول) محکمہ تعلقاتِ عامہ، ہریانہ، ۱۹۹۶

۲۶۔ دردِ بے زباں (موضوع بدھ مت) اگست ۱۹۹۹ء تا مارچ ۲۰۰۲ء ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی میں قسط وار اشاعت

۲۷۔ سمندر اب خاموش ہے (سنامی طوفان پر ایک ناول) ۲۰۰۵ء

۲۸۔ اب مجھے سونے دو۔ (خواتین سے متعلق) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ۲۰۰۵ء

۲۹۔ آخری اُدھیائے (ایڈز سے متعلق) پنگیس بکس، پرائیویٹ لمیٹڈ نئی دہلی۔ ۲۰۰۸

ناولٹ

۱۔ شام بھی تھی دھواں دھواں (تین ناولٹ) ۱۹۹۷ء

ڈرامے

۱۔ نیا سویرا (ڈرامے)

۲۔ ہمسایہ (قومی یکجہتی پر ڈرامہ) راج روپ پرکاشن جالندھر ۱۹۶۸ء

۳۔ سلاخ ٹوٹتی ہے (ریڈیائی ڈرامے) ۱۹۹۶ء

شاعری

۱۔ تیشہ مداں حواب (غزلیات) میڈیا، انٹرنیشنل نئی دہلی ۱۹۹۹ء
۲۔ عکس رخ گلبدن (قطعات کا مجموعہ)

خاکے

۱۔ اپنی ہواؤں کی خوشبو (ادیبوں کے خاکے) مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۹۲ء
۲۔ نئی صبحوں کے سفیر (ادیبوں کے خاکے) شانِ ہند، نئی دہلی ۱۹۹۴ء
۳۔ دردآشنا چہرے (ہندوپاک ادیبوں کے خاکے) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۸
۴۔ نگینہ بیکری کا قلندر (اُردو ادباء کے خاکے) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۔۱۹۹۹ء
۵۔ یاراں تیز گام (معاصر ادیبوں کے قلمی خاکے) ۲۰۰۶ء

سفر نامے

۱۔ یہ صبح زندہ رہے گی (پاکستان کا سفر نامہ) سیمانت پرکاش، نئی دہلی ۱۹۹۷ء

دیگر

۱۔ ذاکر کی تین کہانیاں (تین طویل افسانے) مرتبہ صابردت، تیں مورتی پبلشرز ۱۹۶۶ء
۲۔ حِنا پائے خزاں (صابردت سے متعلق) معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۰۰ء
۳۔ سرگزشت انقلاب ۱۸۵۷ء (پروفیسر صادق کے ساتھ مرتبہ) معیار پبلیکیشنز، دہلی ۲۰۰۷ء
۴۔ ۱۸۵۷ء اور میوات (پہلی جنگِ آزادی اور میوات) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۔۲۰۰۸ء

ہندی مطبوعات

ناول

۱۔ سندور کی راکھ سندور کی راکھ۔ووہرہ پبلشرز۔بمبئی ۱۹۵۸
۲۔ مَیں اُسے پہچانتی ہوں۔تیں مورتی پبلشرز، نئی دہلی ۱۹۶۳
۳۔ لہو پکارتا ہے۔سرسوتی وہار، دہلی۔۱۹۷۸ء
۴۔ انگوٹھے کا نشاں۔پراگ پبلشرز دہلی ۱۹۸۰ء
۵۔ دھرتی سدا سہاگن۔پراگ پبلشرز، دہلی ۱۹۸۰ء

۶۔ پنکھوں میں پتھر۔ بھارتی پرکاشن لکھنؤ ۱۹۸۰ء
۷۔ ایک شہر ایک محبوبہ۔ سٹار پاکٹ بکس، نئی دہلی ۱۹۸۰ء
۸۔ بلیک باکس پراگ پرکاشن، دہلی ۱۹۸۶ء
۹۔ کرماں والی دشا پرکاشن، نئی دہلی ۱۹۸۷ء
۱۰۔ تین چہرے ایک سوال دشا پرکاشن، نئی دہلی ۱۹۸۹ء
۱۱۔ ناگ پتری گنگا پراگ پرکاشن دہلی۔ ۱۹۸۹ء
۱۲۔ ڈوبتے سورج کی کتھا دشا پرکاشن۔ ۱۹۹۱ء
۱۳۔ کھجوراہو کی ایک رات سمارگ پرکاشن، دہلی ۱۹۹۲ء
۱۴۔ آدھے چاند کی رات جن وانی پرکاشن، دہلی ۱۹۹۵ء
۱۵۔ میرا شہر ادھورا جن وانی، دہلی۔ ۱۹۹۶ء
۱۶۔ ریشم آدھار پبلی کیشنز، پنچکولہ۔ ۱۹۹۷ء
۱۷۔ میری شناخت تم ہو جن وانی، دہلی۔ ۱۹۹۷ء
۱۸۔ جاتی ہوئی رُت انوراگ پرکاشن، نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء
۱۹۔ اگنی پریکشا آلیکھ پرکاشن نئی دہلی ۲۰۰۶ء
۲۰۔ اب مجھے سونے دو آلیکھ پرکاشن نئی دہلی
۲۱۔ سمندر خاموش ہے آلیکھ پرکاشن، نئی دہلی۔ ۲۰۰۸ء

افسانے۔

۱۔ چراغ کی لو۔ نو ساہتیہ پرکاشن روہتک، ۱۹۶۳ء
۲۔ ہم سب ساکشی ہیں پشن چند اینڈ سنز، نئی دہلی ۱۹۶۶
۳۔ تین کہانیاں، نئی صدی پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۶۶ء
۴۔ نئے سال کی آخری رات، پراگ پرکاشن، دہلی۔ ۱۹۸۵ء
۵۔ مشک رنگی ہرنی۔ دشا پبلی کیشنز، ۱۹۸۹
۶۔ شام بھی تھی دھواں دھواں کادمبنی پرکاشن، نئی دہلی۔ ۲۰۰۳ء
۷۔ سمندری ہواؤں کا موسم یونی سٹار، چنڈی گڑھ۔ ۲۰۰۴

ڈرامے

۱۔ سیما، برف اور پھول (چینی حملے سے متعلق ایک ایکٹ ڈرامہ) بشن چند اینڈ سنز دہلی ۱۹۶۲ء
۲۔ ہتھیلی پر سورج انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن، نئی دہلی ۱۹۹۰ء

پنجابی

۱۔ سندوری راکھ پنجابی پبلشرز، جالندھر ۱۹۸۷ء
۲۔ کرماں والی آرسی پبلشرز، دہلی ۱۹۹۴ء

اس کتابوں کے علاوہ اُردو، ہندی اور پنجابی میں تعلیم بالغاں وغیرہ موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں۔

اعزازات

۱۹۶۹ میں مجموعی اُردو خدمات کے لئے ہریانہ ساہتیہ اردو اکادمی ایوارڈ ☆ ۱۹۸۶ء میں صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں سے اردو فکشن کے لیے قومی سطح کا 'غالب ایوارڈ'۔ ☆ ۸ر ستمبر ۱۹۹۱ کو نائب صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں سے تعلیم بالغان کے لیے نیشنل لٹریسی ایوارڈ ☆ ۱۹۹۳ء میں گورنر اُتر پردیش نے لکھنؤ میں اردو۔ ہندی ساہتیہ کمیٹی کی جانب سے اردو فکشن پر ایوارڈ دیا۔ ☆ ۱۹۹۴ء میں مجموعی ادبی خدمات کے لئے پاکستان کا نیشنل نقوش ایوارڈ۔ ☆ ۱۹۹۴ء میں پچاس سالہ ادبی خدمات پر مہدی نظمی ایوارڈ۔ ☆ ۲۵ر فروری ۱۹۹۵ء کو ہند پاک پر پچاس سالہ ادبی سفر کی تکمیل کے پیشِ نظر چنڈی گڑھ میں جشنِ کشمیری لال ذاکر کا انعقاد اور پذیرائی۔ ☆ ۱۹۹۸ء میں نئی دہلی میں راما کرشنا جے دیال اعزازی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ☆ ۱۵ر اگست ۲۰۰۴ء کو سابق ایڈمنسٹریٹر مرکزی علاقہ چنڈی گڑھ اور گورنر پنجاب جسٹس او۔ پی۔ ورما (سبکدوش)۔ نے ایک تقریب میں انہیں ان کی مجموعی ادبی خدمات پر اعزاز سے نوازا۔ ☆ ۲۰۰۵ء میں عالمی پنجابی کانفرنس لاہور سے مجموعی خدمات پر ایوارڈ۔ ☆ ۲۹ر مارچ ۲۰۰۶ء کو صدر جمہوریہ ہند نے تعلیم اور ادب میں شاندار خدمات انجام دینے پر 'پدم شری' اعزاز سے نوازا۔ ☆ یکم نومبر ۲۰۰۶ء پنجاب سرکار سے شرومنی اُردو ساہتیہ کار ایوارڈ۔ ۸ ستمبر ۲۰۰۷ء کو صدر جمہوریہ ہند، شریمتی پرتبھا پاٹل نے وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کا یونیسکو ایوارڈ (این ایل۔ ایم) عطا کیا۔ ☆ یکم دسمبر ۲۰۰۷ کو ادیب انٹرنیشنل، ساحر کلچرل اکادمی کی جانب سے ساحر ایوارڈ۔

ان کے علاوہ کئی ریاستی علاقائی اکادمیوں نے ان کی کتابوں (۱) کھوراہو کی ایک رات (۲) ذاکر کی تین کہانیاں (۳) انگوٹھے کا نشان (۴) اُداس شام کے آخری لمحے (۵) بیریوں والا فقیر (۶) لمحوں میں بکھری زندگی (۷) اپنی ہواؤں کی خوشبو (۸) ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (۹) شام بھی تھی دھواں دھواں (۱۰) اگنی پریکشا وغیرہ کو انعامات واعزازات سے نوازا۔ نیز کئی انجمنوں اور تنظیموں کی جانب سے اعزازات۔ نیز پنجاب۔ عثمانیہ، کشمیر اور حیدرآباد یونیورسٹیوں میں ان پر پی ایچ ڈی ڈگری کے لئے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔

پتہ

مکان نمبر ۳۶۷ سیکٹر ۴۴۔ اے، چنڈی گڑھ۔

(دفتر) ہریانہ اردو اکادمی، پنچکولہ (ہریانہ)

فون، رہائش ۲۶۰۴۳۹۱ ر دفتر ۰۱۷۲۔۲۶۵۶۰۴۱۲

موبائل ۹۳۵۶۰۹۴۵۹۶

فاروق ارگلی

ہریانہ کے جزیرے میں اُردو کا سمندر —

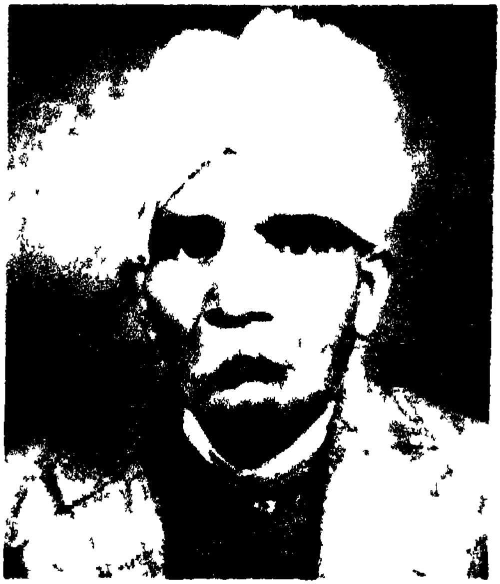
کشمیری لال ذاکرؔ

تقسیم وطن کے بعد بہت سے گہرے گھاؤ اور بہت سارے المیے ہمارا مقدر ہے۔ جمہوری سیاست میں کامیابی کی منزل تک پہنچنے کی شارٹ کٹ ضرورت نے ہندوستان جنت نشاں کی اس پاکیزہ دھرتی پر مذہبی عصبیت اور تنگ نظری کے خنجر اگا دیے جہاں صدیوں پرانی مشترکہ ہندو مسلم تہذیب کے رنگا رنگ گل بوٹے لہلہاتے تھے۔ زہریلی سیاست کے شعلے بھڑکا کر مشترکہ تہذیب کو خاک کر دینے کی کوشش کی گئی، امن و محبت کی ٹھنڈی فضاؤں میں نفرت کا زہر گھول دیا گیا۔ اس دھرتی کی سب سے خوبصورت آواز اردو زبان کو مٹا ڈالنے اور اسے صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر محدود کرنے کی سازشیں کی گئیں (اب بھی کی جارہی ہیں) وہ اردو زباں جسے بھارت کے صوفیوں، سنتوں، واعظوں، اپدیشکوں، شاعروں، ادیبوں، منشیوں، مصدیوں، ہنرمندوں، امیروں، غریبوں اور محنت کشوں نے صدیوں کی ریاضت سے پروان چڑھایا، اسے تعصب کے خنجروں سے لہولہان کر ڈالنے میں تنگ نظر ذہنیت کامیاب بھی ہوئی لیکن ہندوستانی تمدن کی بے باک سچائی اس ذہنیت کے مکروہ چہرے پر ہمیشہ طمانچے برساتی رہی گی کہ ہندوستاں میں پیدا ہونے والی یہ بین الاقوامی زباں اردو صرف میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، داغؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ، مجروحؔ، فیضؔ، فرازؔ یا حالیؔ، شبلیؔ، ابوالکلام آزاد یا علی میاں کی ہی زبان نہیں، یہ اردو تو آج بھی رتن ناتھ سرشارؔ کی، چکبستؔ کی، پریم چند کی، کرشن چندر کی، راجندر سنگھ بیدی کی، دتاتریہ کیفیؔ کی، لبھو رام جوشؔ کی، تلوک چند محرومؔ کی، جگن ناتھ آزادؔ کی، دیوندر ستیارتھی کی، تارا چرن رستوگی کی، گیان چند جین کی، کالی داس گپتا رضاؔ کی، سریندر پرکاش کی، بلونت سنگھ کی، رتن سنگھ کی، رام لعل کی، آنند موہن گلزار زتشی کی، اور کشمیری لال ذاکرؔ جیسے انگنت دانشوروں، شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، قلم کاروں اور کروڑوں ہندوستانیوں کی اپنی زبان ہے اور رہے گی۔

اور آج اسی اردو زباں کے ایک نامور افسانہ نگار، شاعر اور دانشور جناب کشمیری لال ذاکرؔ کا ذکر کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ ہمارے عہد میں اردو فکشن کے بہت سے دور ساز ناموں کے جلو میں



کشمیری لال ذاکر



ذاکر صاحب کے والد گورداس رام جی



والدہ شریمتی پرمیشوری دیوی



ذاکر صاحب کی اہلیہ شریمتی شیلا موہن اپنی چھوٹی بیٹی منجو کو بغل میں لیے ہوئے۔



ذاکر صاحب خاندان کے افراد کے ساتھ



صدر جمہوریہ ہند شریمتی پرتبھا پاٹل ''ذاکر صاحب'' کو تعلیم کے میدان میں حکومت ہند کا یونیسکو ایوارڈ عطا کرتے ہوئے۔



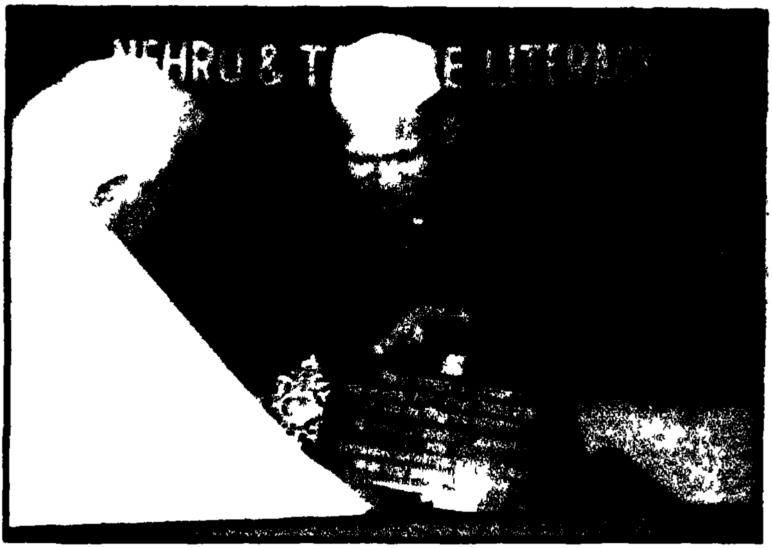
سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام ذاکر صاحب کو تعلیم اور ادب کے میدان میں خصوصی خدمات پر ''پدم شری'' کا اعزار دیتے ہوئے۔



گورنر ہریانہ عالی جناب ڈاکٹر اے۔آر قدوائی ایرانی اسکالر پروفیسر سروش صفوی کو مومینٹو پیش کرتے ہوئے۔تصویر میں کشمیری لال ذاکر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔



ہریانہ کے وزیر اعلیٰ شری بھوپندر ہڈا ذاکر صاحب کی تصنیف کا اجراء کرتے ہوئے۔



سابق صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ڈاکٹر شنکر دیال ذاکر صاحب کو اعزاز دیتے ہوئے۔



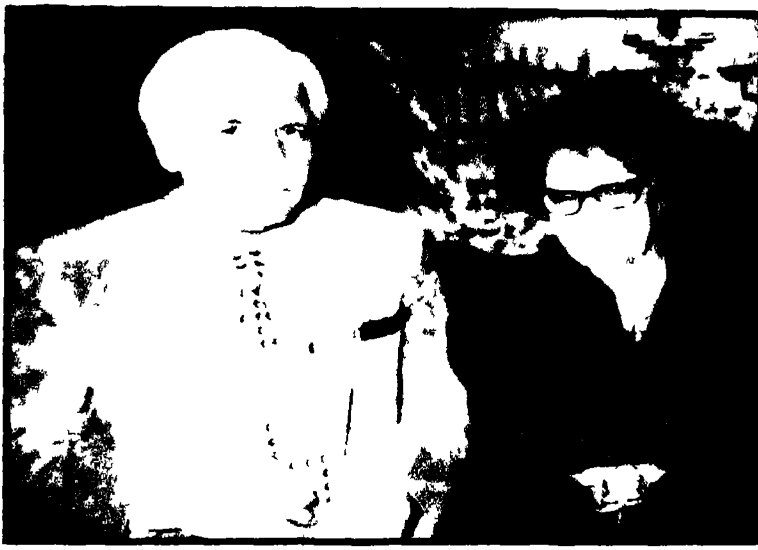
سابق گورنر ہریانہ سید مظفر حسین برنی ذاکر صاحب کے ناول ''بلیک باکس'' کا اجراء کرتے ہوئے۔
تصویر میں بائیں جانب شری کنہیالال سابق وزیر داخلہ ہریانہ اور دائیں جانب
ذاکر صاحب کی بیٹی ڈاکٹر کملیش موہن۔



ذاکر صاحب مشہور شاعر قتیل شفائی کے ساتھ



ذاکر صاحب کیفی اعظمی صاحب کے ساتھ



ذاکر صاحب ممتاز ناول نگار اور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کے ساتھ۔



نند کشور وکرم اور کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا نام بھی اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں کے ساتھ اردو کی گزشتہ تین نسلوں کے ذہنوں میں اجالے بکھیر رہا ہے۔ ذاکر صاحب تقسیم کے المیوں، کشمیر، پنجاب اور نئے ہندوستان کے آنکھوں دیکھے اور محسوس کیے گئے انسانی جذبوں، سنگھرشوں، دکھوں اور خوشیوں کے ذاکر ہیں۔ انھوں نے جو دیکھا، جو جیا اور جو محسوس کیا اسے سادگی اور بے ساختگی سے کہانی کے فنی سانچے میں ڈھال کر قبولِ عام کی سند حاصل کر لی۔ کشمیری لال ذاکر نے اپنے محسوسات اور مشاہدات کے اظہار کے لیے کسی ازم یا تحریک کی بیساکھی نہیں تھامی، یہ بس کہانیاں کہتے گئے اور ان کے نام کشمیری لال کے ساتھ 'ذاکر' کا لاحقہ اسم بامسمٰی ہوتا گیا اور پھر یہ ذاکر فن کی اس منزل تک آ پہنچا کہ اپنی اہمیت اور خصوصیت کے ساتھ ایک پورے عہد پر اپنی چھاپ چھوڑنے والی اس کی تخلیقی شخصیت کا ذکر اردو ادب کے مورخین کے لیے ناگزیر ہو گیا۔

کشمیری لال ذاکر کی تخلیقات کو اربابِ نقد و نظر خواہ کسی بھی اسلوبیاتی، معنویاتی یا نامیاتی تنقیدی معیارات کے خانے میں رکھیں، ایوانِ فن کی کس منزل پر ان کی جگہ متعین کریں، اس سے قطع نظر ساٹھ سے زاید برسوں کا طویل علمی سفر، سیکڑوں کہانیاں، متعدد ناول، ڈرامے، شاعری، اسی نوے کتابیں، اردو تعلیم اور زبان و ادب کے فروغ و احیاء کی مسلسل جدوجہد، کشمیری لال ذاکر کو ایک عہد آفریں اردو قلمکار کی حیثیت سے ان بلندیوں پر فائز ضرور کر چکی ہے جہاں سے نیچے اتارنا اب جانبدار تنقید اور مصلحت آمیز ادبی اجارہ داری کے بس کی بات نہیں رہی۔

ہمارے عہد کی اردو دنیا کے لیے یہ امر کتنے فخر و انبساط کا باعث ہے کہ اس ۹۰ سالہ ادیب کے قلم کی رفتار ماند نہیں پڑی، اردو زبان و ادب کی ترویج کے جذبے سرد نہیں ہوئے، آندھیوں میں چراغ جلاتے اور ویرانوں میں چمنستان کھلانے کا جوش مدھم نہیں ہوا۔ ہریانہ اردو اکیڈمی کے فعال روحِ رواں کی صورت میں اردو زبان و ادب کے اس بے آب و گیاہ خطے میں اردو کی فصل اگانے کی مسلسل کوششیں دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اردو کا یہ بے کنار سمندر ہریانہ کے جزیرے میں سمٹ آیا ہو۔

کشمیری لال ذاکر ۷ راپریل ۱۹۱۹ء کو غیر منقسم پنجاب کے ضلع گجرات کے موضع بیگا بانیاں میں ایک معزز موہیال برہمن خانداں میں پیدا ہوئے۔ موہیال برہمنوں کا یہ قبیلہ عام برہمنوں سے ان معنوں میں الگ ہے کہ موہیال برہمن جنگجوئی اور سیف زنی میں خود کو راجپوتوں سے کم تصور نہیں کرتے۔ مذہبی اور تہذیبی طور پر بھی موہیال وسیع النظر، ذہین اور روشن خیال رہے ہیں۔ پنجاب کے حسینی برہمنوں کا تعلق بھی اسی موہیال برادری سے ہے جو سیدنا حضرت امام حسین کی شہادتِ عظمیٰ کی یادوں سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ حسینی برہمن کہے جانے لگے۔ میں نے اٹک جتنے موہیال اور اس کی شاخیں دت اور چھبر

خاندانوں کے جن اصحاب کو قریب سے دیکھا ہے ان میں زیادہ تر علم دوست، انسانیت نواز اور صداقت پسند ہیں۔ نامور فلمی اداکار اور عظیم سیکولر سیاسی رہنما آنجہانی سنیل دت، اردو کے معروف صحافی آنجہانی صابر دت اور بزرگ مجاہد اردو جناب نند کشور وکرم کا تعلق بھی اسی خانوادے سے ہے جس میں کشمیری لال ذاکر جیسے منفرد ادیب نے آنکھ کھولی۔ ان کے والد گوردواس رام مہاراجہ کشمیر کی ملازمت میں تھے۔ اس لیے ذاکر صاحب کے بچپن اور جوانی کا بڑا حصہ جموں میں گزرا۔ انھوں نے بنیادی تعلیم اردو میں حاصل کی لیکن انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا پھر بی ٹی کی سند لے کر مشرقی پنجاب کے محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہو گئے۔ اور جب پنجاب کی دوسری تقسیم کے بعد ہریانہ وجود میں آیا تو انھوں نے اس نئی ریاست کو پسند کیا۔ محکمہ تعلیمات کی شاندار تیس سالہ خدمات سے وہ ۱۹۷۷ء میں سبکدوش ہو جاتے لیکن ان کی بہترین کارکردگی کی وجہ سے ۱۹۸۴ء ملازمت میں توسیع دی گئی۔ ۱۹۸۷ء میں ذاکر صاحب ہریانہ اردو اکیڈمی کے سکریٹری بنائے گئے۔ آج بھی وہ یہ ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس عمر میں ہریانہ کی چھوٹی سی محدود سرکاری وسائل والی اردو اکیڈمی کے ذریعہ جس سرگرمی، لگن اور توانائی کے ساتھ اردو زبان وادب کے خدمت کر رہے ہیں وہ ایک مثال ہے، چنڈی گڑھ میں بڑے بڑے قومی اور انڈو پاک سطح کے ادبی مذاکروں اور مشاعروں کا انعقاد ذاکر صاحب جس پروقار انداز میں کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے شہروں میں منعقد ہونے والے ادبی علمی اجتماعات میں شامل ہو کر خطبات ومقالات پیش کرتے ہیں، مشاعروں میں کلام سناتے ہیں اور جس طرح تحریری اور اشاعتی کاموں کو آگے بڑھا رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے ''۹۰ سالہ نوجواں'' کا لقب ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر ادب میں مقصدیت کے قائل ہیں۔ ان کی کہانیاں اور ناول انسانی زندگی سے جڑی ہوئی صداقتوں کو اجاگر کرتے ہوئے سماج کو اعلیٰ انسانی اقدار اور ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سماجی برائیوں، ظلم، ناانصافی، نفرت، تنگ نظری، مذہبی عصبیت، طبقاتی نابرابری اور انسان کے ہاتھوں انسانیت کو پہونچنے والے نقصانات کے خلاف کھلی جنگ، ماضی کے کرب اور حال کے اندھیرے سے نبرد آزمائی اور روشن مستقبل کی بشارتیں جلوہ گر ہیں۔ ان کی تخلیقات میں سماجی زندگی کے تمام ممکنہ گوشوں کی صاف ستھری تصویر کشی، سادہ اور عام فہم لہجے میں بڑی سے بڑی بات کہہ جانے کی فنی مہارت انھیں دور کا صاحبِ اسلوب افسانہ نگار قرار دیتی ہے۔ قومی یکجہتی کے موضوع پر ان کا شاہکار ناول ''کرماں والی'' مقام انسانیت کو تمام مذہبوں اور عقیدوں پر برتری عطا کرتا ہے۔ عمر کے آخری پڑاؤ پر لڑکھڑاتی ہوئی زندگی جینے والے بزرگوں پر اثر انگیز ناول ''ڈوبتے سورج کی کتھا'' اور

بندھوا مزدوروں کے انسانیت سوز حالات پر ناقابلِ فراموش ناول "انگوٹھے کا نشان" نوجوان نسل کی نفسیاتی، ذہنی، مادی وسماجی رہنمائی اور زندگی کی بھول بھلیوں میں صراطِ مستقیم دکھانے کے لیے نفسیاتی اور تجزیاتی ناول "وہ لڑکی بھٹکی ہوئی" کے علاوہ فرقہ وارانہ فسادات، خشک سالی، قحط، سیلاب، دہشت گردی، بچہ مزدوروں اور نئی سوسائٹی کی خواتین کے سماجی ونفسیاتی مسائل اوران کا شافی حل پیش کرنے والے متعدد ناول اور افسانے، تاریخ وثقافت، شہروں اور گاؤں کی زندگی پر حقیقت افروز تحریریں کشمیری لال ذاکر کو موجودہ عہد کا صاحب نظر فنکار ثابت کر چکی ہیں۔ ڈرامے، رپورتاژ، معاصر ادیبوں اور شاعروں کے خاکے اور سفر نامے، متعدد علمی، ادبی اور سماجی موضوعات پر مقالات ومضامین ان کے بیدار ذہن اور جواں فکر قلم کی شہادت دے رہے ہیں۔ کشمیری لال ذاکر اردو کے ایک ایسے فنکار ہیں جنھوں نے اپنے فکری اظہار کے لیے نہ صرف نثر نگاری میں کمال حاصل کیا بلکہ شعر وسخن کو بھی وسیلہ بنایا ہے، وہ بیک وقت ناول نگار، افسانہ نویس، دانشور اور خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں اساتذہ جیسی پختگی، روانی اور بلاغت ہے۔ اپنی ساری تخلیقی جدوجہد، اور اپنی پوری فنی کائنات کو ان کا شعری وجدان کس طرح وقت کے آئینہ خانے میں سجا دیتا ہے۔ خود ذاکر صاحب سے سنئے۔

یہ اور بات کہ آگے ہوا کے رکھے ہیں
چراغ جتنے ہیں، سارے جلا کے رکھے ہیں
انھیں فسانے کہو، دل کی داستانیں کہو
یہ آئینے ہیں جو کب سے سجا کے رکھے ہیں

جناب کشمیری لال ذاکر کے ادبی سفر اور اس کی نوع بہ نوع خصوصیات کا ذکر اگر اجمالی طور پر بھی کیا جائے تو سینکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔ انھیں گزشتہ چھ دہائیوں میں کروڑوں نے پڑھا ہے۔ اپنے دور کے تمام ہی اہم اخبار اور اخبارات میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ فیض احمد فیض، مالک رام، وزیر آغا، علی سردار جعفری، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، اوپندر ناتھ اشک، قمر رئیس، سریندر پرکاش، وارث علوی، تاراچرن رستوگی، سلیم اختر، آغا سہیل جیسی عظیم اردو ہستیوں نے ان کی تخلیقی اور فنی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

شخصی طور پر ذاکر صاحب، خوش وضع، خوش اخلاق، محنتی، دردمند اور دوست نواز انسان ہیں۔ ان کے چاہنے والے پورے برصغیر میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اپنے ہم چشموں میں وہ ایک مدبر، حقیقت پسند، باعمل، اور کامیاب شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ گھریلو زندگی میں وہ ایک بااصول، ملنسار،

سماجی، اور روایت پسند، زمانہ شناس انسان ہیں۔ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے سنوار کر اپنی ہی طرح بہتر زندگی گزارنے کے لائق بنایا ہے۔ اردو زبان، ادب اور تہذیب ہی ان کی زندگی ہے۔ انھوں نے اس نامساعد دور میں بھی اردو کی شمعیں روشن رکھیں جب ہر طرف تعصب اور تنگ نظری کے اندھیروں کی حکومت تھی۔ ذاکر صاحب کا یہ ایقان آج بھی راسخ ہے کہ ایک دن پورا ہندوستان یہ مان لے گا کہ اردو کسی ایک مذہب یا عقیدے کی زبان نہیں، بلکہ ہر ہندوستانی کی آواز ہے۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا ۱۷ر اپریل ۲۰۰۸ء)

کلیم اختر

کشمیری لال ذاکر، ایک یاد — ایک دَور

اُردو کے ممتاز افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر گاہے بگاہے پاکستان تشریف لاتے ہیں۔ اور لاہور کے ادباء اور شعراء اُن کے اعزاز میں محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات اور زبانِ اُردو سے محبت و عقیدت کا اعتراف کرتے ہیں اور یوں اپنے ایک ہم عصر افسانہ نگار سے اُخوت وارادت کا اظہار کرتے ہیں۔ میں اس سرگرمیوں اور گرم جوشیوں کی روداد وں کو اخبارات و جرائد کی وساطت سے پڑھتا ہوں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں پاکستان میں کشمیری لال ذاکر کے قیام کے دوران کبھی اُن سے نہ مل سکا۔ اور جب ملنے کی کوشش بھی کی تو پتہ چلا چند دن ہوئے واپس بھارت چلے گئے ہیں۔

مجھے کشمیری لال ذاکر سے ملنے کا اشتیاق برابر رہا۔ اور یہی جذبہ کارفرما رہا ہے کہ جب اُن سے ملوں گا تو انہیں کہوں۔ ذاکر صاحب، میں آپ کا شاگرد ہوں — آپ جب ایک مختصر سے عرصہ کے لئے ہری سنگھ ہائی اسکول جموں آئے تھے تو ہماری جماعت کو انگریزی پڑھانے پر مامور ہوئے تھے۔ اور جب وہ اپنے حافظہ پر زور ڈالتے اور ماضی کی یادوں میں کھو جاتے تو تب آہستہ آہستہ کہتے، ہاں کچھ یاد آرہا ہے!

دراصل کشمیری لال ذاکر بی ٹی کا امتحاں دے رہے تھے اور اس امتحان میں عملی تربیت کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ ان دنوں اسے بی ایڈ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جو طالب علم بی ٹی کر رہے ہوں اُنہیں چند ماہ کے لئے مختلف اسکولوں میں بھیج دیا جاتا۔ اُسی سال جبکہ میں کلاس ہشتم کا طالب علم تھا، کشمیری لال ذاکر بھی دیگر چند اساتذہ کرام کے ساتھ ہری سنگھ ہائی اسکول جموں میں تعینات ہوئے تھے۔ یہ اسکول جموں کا خوبصورت اسکول تھا اور بڑے بڑے عالم فاضل اساتذہ یہاں پر جمع تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سردار بھیکم سنگھ تھے جو انگریزی ادبیات پر اتھارٹی تھے۔ سیکنڈ ماسٹر، غلام حیدر حیدر تھے، جو اپنے عہد کے بہت بڑے ڈرامہ نگار اور ادیب انگریزی، اُردو اور پنجابی زباں کے شاعر تھے۔ جناب حبیب کیفوی نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اُردو'' میں ماسٹر غلام حیدر صاحب مرحوم کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اسی اسکول میں جناب آغا قیس شیروانی تھے جو ''بزمِ اُردو جموں وکشمیر'' کے روحِ رواں تھے۔ یہ ادبی تنظیم ریاست جموں

وکشمیر میں اُردو زبان اور ادب کی سب سے بڑی جماعت تھی۔ شیخ غلام حیدر، چشتی، آغا قیس شیروانی کے ماموں تھے۔ یہ تنظیم ہر ہفتہ اپنا اجلاس منعقد کرتی تھی جس میں اہل سخن شرکت کرتے تھے اور اپنی اپنی تخلیقات اور نگارشات پیش کرتے تھے۔ کشمیری لال ذاکر بھی ان محفلوں میں شرکت کرتے تھے اور اپنے افسانے سناتے تھے۔ بزم اُردو جموں وکشمیر کا رسالہ ''فردوس'' تھا جس میں اُس دور کے تمام بڑے بڑے قلمکاروں کی تحریریں چھپتی تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد یہ جریدہ سیالکوٹ سے ''فردوسِ ادب'' کے نام سے آغا قیس شیروانی مرحوم نے جاری کیا۔ ان کے رفیقان قلم محمد جمیل نظامی مرحوم اور ہدایت اللہ اختر مرحوم تھے۔ بزمِ اُردو جموں وکشمیر کا دفتر پیرس روڈ پر قائم ہوا تھا۔ اورینٹل کالج بھی بن گیا تھا جہاں آغا قیس شیروانی، منشی فاضل اور ادیب فاضل کے طلباء وطالبات کو درس دیتے تھے۔ افسوس آغا صاحب مرحوم کی وفات کے بعد کالج بھی بند ہو گیا۔ اور فردوس ادب نے بھی دم توڑ دیا۔ کشمیری لال ذاکر انہی قیس صاحب کے ہم عصر تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخصیت تھی، اُن کا نام لالہ موہن لال دِل تھا۔ یہ زباں اُردو کے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے ''نقدِ دل'' اُن کا مجموعۂ کلام ہے۔ بزم اُردو جموں وکشمیر کے سرگرم رکن اور لالہ گردھاری لال آنند صراف کے چھوٹے بھائی تھے جو سیکولر ذہن کے مالک اور بڑے پیارے انسان تھے۔ ماہ محرم الحرام میں درگاہ شریف ماما پیر مٹھا میں شبِ عاشور سلام آخر پڑھتے تھے۔ انہی مجلسوں میں ایک بار موہن لال دِل نے مرثیہ پڑھ کر اہل مجلس کو تڑپا دیا۔ ایک شعر آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

میدانِ کربلا میں شہیدوں کے خوں سے
ہولی یزید کی تھی شہادت حسینؑ کی

یاد رہے کہ اس سال ہندوؤں کا ہولی کا تہوار اور محرم الحرام کی دسویں تاریخ ایک دن آ گئی تو جموں کے ہندوؤں نے احتراماً اس روز ہولی کھیلنے سے احتراز کیا۔ اور امام عالی مقام کی شہادت کے احترام میں ہولی کا تہوار نہ منایا۔ اس پس منظر میں دِل کے شعر کو پڑھیے۔

جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں وہ ہمارے بچپن اور کشمیری لال ذاکر کی نوجوانی کے دن تھے۔ جو کھدر کی اَچکن اور سفید پاجامہ پہنتے تھے۔ کبھی کبھی سوٹ بھی پہنتے تھے، گھنی مونچھیں، لمبے لمبے بال اُلٹی طرف، خاموش طبع، آنکھیں نیچی کر کے چلتے تھے اور ہر وقت کسی سوچ میں گم رہتے تھے۔ ہری سنگھ ہائی اسکول کے میدان کے درمیاں پیپل کا ایک درخت تھا، جس کے ساتھ ایک حوض تھا جہاں سے پانی پینے کے لئے اسٹور کیا جاتا تھا کیوں کہ جموں میں ان دنوں پانی کی قلت ہوتی تھی کہ ہری سنگھ ہائی اسکول ایک پہاڑی پر

دریائے توی کے کنارے واقع تھا۔ دوسری پہاڑی پر مہاراجہ کی منڈی تھی جس میں سول سیکریٹریٹ کے دفاتر تھے۔ اور دریائے توی کے اس پار باہو کا قلعہ تھا۔ اور اس کے دامن میں پھیلے ہوئے آموں، جامنوں اور سنگتروں کے باغات تھے — اس فضا میں ہر لمحہ ڈوگری گیت گونجتے رہتے تھے۔ پتہ نہیں، اب بھی ایسا ہوتا ہے کہ نہیں، اب اس نگری کے مکیں کہاں گئے ہیں۔ سوچتا ہوں کیا اب جب دریائے توی میں باڑ آتی ہوگی تو کیا ہری سنگھ ہائی اسکول کے طلباء اس نظارے کو دیکھتے ہیں؟ کشمیری لال ذاکر کو ہم طلباء اکثر یہ نظارہ دیکھنے میں محو پاتے تھے۔ اور کبھی آ کر کہتے

''ماسٹر جی، گھنٹی بج گئی ہے۔''

''۔۔اچھا — چلو۔''

اور وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے کلاس میں آجاتے۔

سری ہری سنگھ ہائی اسکول میں ان دنوں ملک عبدالرشید ایم اے، دیودت مہنگی، جو مشہور لیڈر گوپال دت مہنگی کے بھائی تھے۔ ماسٹر پربھاکر، ماسٹر راس کمار (جو اپنی خوبصورتی میں ثانی نہیں رکھتے تھے) بشیر قریشی، ماسٹر گوری کانت (سنسکرت) کے استاد گوری شنکر ڈرل ماسٹر تھے۔ یہ سب عجیب لوگ تھے۔ سوائے تعلیم و تدریس کے ان کو کوئی کام نہ تھا۔ یہ سب استاد آئیڈیل تھے۔ ادبی لحاظ سے وہ اُردو ادبیات کا سنہرا دور تھا۔ دیوان نرسنگھ داس نرگس ''چاند'' اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے بیٹے اقبال تمنائی نے 'پریم' کے نام سے ادبی ماہنامہ جاری کر رکھا تھا۔ گلزار احمد فدا مرحوم (ایڈیٹر جہاد سیالکوٹ) ان کے رفیق قلم تھے۔

ادبی سرگرمیوں کے دو گروپ بن چکے تھے۔ ایک آغا قیس اور چشتی، ولی، جمیل نظامی اور سیوک رام یاصر وغیرہ پر مشتمل تھا۔ دوسرا نرسنگھ داس نرگس، اقبال تمنائی، پریم ناتھ در اور ٹھاکر پونچھی وغیرہ کا تھا۔

لالہ ملک راج صراف مدیر ''رنبیر'' نے راج محل پبلشرز کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کر رکھا تھا جس نے راما نند ساگر، اثر صہبائی اور رسد بھدراہی کی کتابیں شائع کی تھیں۔ اوم پرکاش صراف اور کندن لال ایم اے اس شعبہ کے انچارج ہوئے تھے۔ بچوں کا مشہور عالم رسالہ ''رتن'' اس ادارہ سے نکلتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ کشمیری لال ذاکر کے ان تینوں ادبی و شعری اداروں سے روابط تھے۔ طبیعت فطرتاً مرنجان مرنج پائی تھی۔ خاموشی کا سرمایہ رکھتے تھے اور مسکراتے بھی رکھ رکھاؤ کے ساتھ تھے۔ ہمارے ایک ہم جماعت کرشن لال تھے جن کی والدہ مشہور فلم اسٹار گلاب تھیں۔ جو لاہور منتقل ہو چکی تھیں۔ وہ اسکول میں فلمی رسالے لاتے تھے اور بعض اوقات ادبی رسالے بھی۔ ایک بار کرشن نے کہا، اس رسالہ

میں ماسٹر جی کا نام چھپا ہے۔ دراصل وہ کوئی افسانہ تھا جس کے مصنف کشمیری لال ذاکر تھے۔

ایامِ گرما میں ہم لوگ سری نگر چلے جاتے تھے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ قیامِ پاکستان تک میں جموں نہ آ سکا۔ ۱۹۴۷ء میں جموں اُجڑ گیا۔ قیس اور دل کا جموں تباہ و برباد ہو گیا۔ دیو پنڈت کا جموں اُداس ہو گیا۔ وہ شہر جو اسی بات پر راجہ جامولوچن نے بسایا تھا کہ اس کے دریا توی کے کنارے شیر اور بکری اکٹھے پانی پی رہے تھے، وہ راجہ شکار کھیلتا کھیلتا اس نگری میں آ گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اور دھرتی کا پیار دیکھ کر اُس نے اسے مستقل مسکن بنا لیا۔ پھر اس کی فضاؤں میں ـــ

نہ کر گورے ئیے میلیاں اکھیاں

اسیں پردیسیاں ٹری جاناں

کے گیت گونجنے لگے۔ بستی کا منظر بدل گیا۔ توی سرخ ہو گئی۔ اور جب ایک بار میں نے جموں میں اپنے کزن سے مدتوں پہلے کشمیری لال ذاکر کے بارے میں پوچھا اور سپن مالا کے شوہر سمن جی سے دریافت کیا تو اُنہوں نے لکھا

''ذاکر جی ــــ جموں چھوڑ چکے ہیں۔''

ــــ میں بھی تو جموں سے آ چکا ہوں ــــ!

کملیش موہن

ذاکر ـــ میرے والد

اپنے والدین کے تعلق سے لکھتے وقت کئی خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر اُن پر تنقید کی جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ غصہ کریں اور اگر اُن کی تعریفوں کے پُل باندھے جائیں تو ہوسکتا ہے وہ بھٹک جائیں اور اپنے بچوں کے تعلق سے بے جا دستر ساز رویّہ اپنالیں یا ہمیشہ اپنے بچوں سے اونچی توقعات وابستہ کرلیں۔ میں ان دونوں خطرات سے پوری طرح باخبر ہوں اور اپنے والد، ذاکر صاحب کے تعلق سے اظہارِ خیال کرنے کی جرأت کر رہی ہوں، جنہیں میں بے انتہاء پسند کرتی ہوں لیکن اپنے حقِ اظہارِ رائے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ وہ بھی بعض دفعہ مجھ سے اختلاف کرتے ہیں اور بعض دفعہ مجھے دِق بھی کرتے ہیں۔

میرا بچپن بڑا غیر معمولی تھا کیونکہ میرے سر سے ماں کا سایہ اُس وقت اُٹھ گیا تھا جب میں مشکل سے سات یا آٹھ برس کی تھی۔ میرے حافظے میں اپنے پاپا کے حیراں و پریشاں چہرے کی دھندلی سی تصویر آج بھی محفوظ ہے جس دن اُنہیں اپنی شریکِ حیات سے جدائی کا صدمہ اُس وقت جھیلنا پڑا تھا جب اُن کی عمر چالیس برس بھی نہیں تھی۔ مجھے وہ بحث و تکرار بھی یاد ہے جو میری دادی اور اُن کے جوان بیٹے کے درمیاں ہوا کرتی تھی کیونکہ میری دادی کی خواہش تھی کہ اُن کا بیٹا دوسری شادی کرلے تاکہ اُس کی زندگی میں پیدا شدہ خلاء پُر ہوسکے اور اس کے کم عمر بچوں کی پرورش و پرداخت کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ میں چونکہ بہت چھوٹی تھی اس لئے اپنی دادی کے دباؤ ڈالنے والے حربوں کو بھی نہیں سمجھ سکی تھی جب وہ ہم سے دور چلی گئیں تاکہ میرے والد کو اپنے لئے ایک بیوی اور بچوں کے لئے ایک ماں کا احساس دلا سکیں۔ جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی میں نے اپنے ناپختہ ذہن سے اپنے والد کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی ـــ حالات کے تقاضوں کی وجہ سے میں اپنے والد کے قریب ہوتی گئی جنہوں نے میری جذباتی اور ذہنی اُپج میں مجھے ماں کا پیار دیا۔ میرے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی لیکن جب بھی میں نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا اُنہوں نے میری مدد کی۔

میرے والد کو مجھ سے جو ایک خاص لگاؤ ہے میں اُسے بیاں کرنے سے قاصر ہوں، مجھے آج بھی وہ کئی سفر یاد ہیں جو میں نے اُن کے ساتھ کئے تھے۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ نہ ہی اُردو شاعری کو پوری طرح

سمجھ پاتی نہ ہی ایشین رائٹرس کانفرس یا اُن محفلوں کا سر پیر میری سمجھ میں آتا جن میں میں نے اپنے والد کے ساتھ شرکت کی تھی۔ میری دادی میرے والد سے بہت ناراض رہتیں کیونکہ وہ ایک چھوٹی سی بچی کو نینی تال، کشمیر، بمبئی اور دوسرے کئی دور دراز مقامات کے سفر میں ساتھ لے جاتے تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ساحر لدھیانوی، جگر مراد آبادی، بسمل اُتساہی، جاں نثار اختر اور فیض احمد فیض جیسے بزرگ شعراء کے واضح نقوش آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں جو بڑی شفقت سے کبھی تحفوں اور کبھی اپنے اشعار سے میری پذیرائی کرتے تھے۔ میرے ذہن میں وہ خوشگوار یادیں بھی محفوظ ہیں کہ جب بھی میں کسی تتلی، کسی چھوٹے موٹے زیور یا کسی کتاب کے لئے مچل جاتی تو پاپا اپنے معمولات کو منقطع کر کے میری خواہشات کی تکمیل کرتے تھے، میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتی تھی کہ اپنے بھائی کے لئے بھی چھوٹے موٹے تحفے لیتی جاؤں۔ بہر کیف رفتہ رفتہ مجھے اس بات کی سمجھ آتی گئی کہ ایک قلم کار کا دماغ کس طرح مصروفِ عمل رہتا ہے۔ میں آج بھی اُن واقعات کو یاد کر کے ہنس دیتی ہوں کہ کس طرح اُردو کے اُبھرتے ہوئے شعراء مجھ جیسی لڑکی جس کا ناپختہ ذہن حسی جذبات سے قطعی نا آشنا تھا، کے ضرورت سے زیادہ قریب آنا چاہتے تھے اور میرے والد کس طرح اُن کے ارادوں سے مجھے محفوظ رکھتے تھے۔

بہت چھوٹی عمر میں ہی میں نے بڑی بہن کا کردار نبھانا شروع کر دیا تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ میرے والد کا ردِ عمل اُس وقت کیا ہوا کرتا تھا جب میں اپنی چھوٹی بہن کو نہلا دُھلا کر کپڑے پہناتی تھی۔ یہ بھی بالکل درست ہے کہ میری دادی نے ہم سے ماں کے بچوں کی پرورش میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا تاہم بچوں کو ڈسپلن سکھانے اور اُن کی صحیح نشو ونما میں میرے والد کا بھی بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ موسم گرما کی وہ دوپہر کتنی خوشگوار ہوا کرتی تھیں جب میں اور میرا بھائی ششی اپنی شرارت سے مار نہیں آتے تھے اور چپکے سے کمرے سے کھسک جاتے تھے اور کھیلنے لگتے یا چائے بنانے لگتے جو ہمارے لئے ممنوع شئے تھی۔

پاپا بہت آزاد خیال انسان ہیں، انہوں نے مجھے دادی کی مخالفت کے باوجود ایسے کالج میں داخلہ دلایا جہاں مخلوط تعلیم کا رواج تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اُنہوں نے مجھے نوجوان لڑکوں سے دوستی کرنے کے مسائل سے آگاہ کرنا شروع کیا لیکن مجھے راہِ راست پر رکھنے کا اُن کا اپنا طریقہ تھا۔ ان کا مشورہ آج بھی میرے ذہن میں بہت واضح ہے کہ ''اگر تم سے فعل بھی سرزد ہو جائے تو اُس کی اطلاع مجھے دو اور ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھو۔'' ایک قبل از وقت سمجھدار ہو جانے والی لڑکی جو ماں کے سہارے سے بھی محروم تھی، جو اُس کے بدلتے ہوئے احساسات اور جسمانی ضرورتوں کو سمجھ سکتی، کی تربیت کا یہ انتہائی دانشمندانہ رویہ تھا۔ ایک طرح سے انہوں نے میرے نئے دوستوں سے ربط قائم رکھنے کا اپنا ایک طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ

اکثر مجھے اپنے دوستوں بشمول لڑکوں کو گھر پر مدعو کرنے کے لئے اصرار کیا کرتے۔

بعض دفعہ جب میں پوری پوری دوپہریں اپنے دوستوں کی رفاقت میں گزارتی تو گھر میں تھوڑا سا تناؤ پیدا ہو جاتا۔ میں یہاں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ بعض دفعہ میری وجہ سے میرے والد اور دادی میں تناؤ پیدا ہو جاتا تھا جو اپنے بیٹے سے نالاں تھیں جو لڑکوں اور لڑکیوں کی دوستی کے تعلق سے آزادانہ خیالات رکھتا تھا۔ ایک چھوٹے سے شہر میں یہ بھی ایک غیر معمولی واقعہ ہی تھا کہ میں نے پرنسپل کی مخالفت کے باوجود کالج میں سکریٹری کے عہدے کے لئے ''الیکشن'' میں حصہ لیا۔ پرنسپل نے میرے روایت شکن رویے کے تعلق سے والد سے شکایت کی کہ میں لڑکوں کے ساتھ مل کر الیکشن کا پرچار کرتی ہوں اور طلباء کے بڑے بڑے اجتماعوں میں تقاریر کرتی ہوں۔ میں اُس وقت فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھی تھی جب میرے والد نے پرنسپل کا مشورہ رد کر دیا تھا کہ میں الیکشن سے دستبردار ہو جاؤں۔

جب میں ذہنی طور پر پختہ ہوگئی تو میرے والد نے مجھے ایک ایسے فرد کے طور پر قبول کرنا شروع کیا جس کا اپنا ایک ذہن اور میرے ساتھ ایک مساویانہ سطح کا رتاؤ اختیار کیا۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ اُنہوں نے کیا مجھے اس کی کہانیوں، ناولوں اور شاعری کے تعلق سے ایک دانشور نقاد کے طور پر قبول کیا۔ مثلاً ایک دفعہ اُنہوں نے اپنے ناول 'کرماں والی' کے تعلق سے میرے اعتراض کا حوالہ دیا تھا جو اُس کی اَن پڑھ ہیروئن کے مکالموں کے تعلق سے تھا۔ اس ناول کو ڈرامے کے روپ میں نیشنل اسکول آف ڈرامہ (نئی دہلی) نے پورے ہندوستان میں کھیلا تھا۔ اس بات کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا کہ اُس وقت مجھ میں کس طرح خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو جاتا تھا اور کس طرح مجھے دانشورانہ دیانتداری کی اہمیت سمجھ میں آئی تھی۔ میں یہ جانتی ہوں کہ دوہرے معیارات کو اس دنیا میں اپنے دل کی بات کہنا غیر دانشمندانہ عمل ہے۔ لیکن تجربات نے مجھے سکھایا ہے کہ اپنے اعتقادات کو انسانی ملاحظات سے مستحکم کرنا چاہیے۔ میرے والد ہمیشہ اس بات کی یاد دہانی کراتے رہتے ہیں کہ اُن کی تمام کمزوریاں مجھے ورثہ میں ملی ہیں جیسے مفلس و لاچار افراد کے تعلق سے ہمدردی کے جذبات یا ''الوہی انتشار'' سے تھوڑا بہت لگاؤ۔ نادار اور ضرورت مند افراد کی بنا سوچے سمجھے ہر طرح کی مدد کرنے کی عادت نے کئی دفعہ ہمارے لئے مشکلات پیدا کی ہیں۔ اکثر دفعہ مجھے وہ قرضے یا اشیاء کبھی واپس نہیں ملیں جو ہمارے گھریلو ملازمین نے بڑی آسانی سے مجھ سے ہتھیا لئے تھے۔ یہ لوگ ہمارے پھلوں اور سبزیوں کے چھوٹے سے خطے کو اپنی جائیداد سمجھتے ہیں اور موقع محل دیکھ کر اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

ہمارے خانداں میں یہ بات ایک لطیفے کے طور پر کہی جاتی ہے کہ پاپا کسی راستہ چلتے آدمی کو ہاتھ

سے ملاتے ہیں اور اپنی قسمت کی لٹیا میں اُسے برابر کا شریک کر لیتے ہیں۔ کئی دفعہ مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ پاپا اپنے دوستوں کو ڈنر پر تو مدعو کر لیں گے مگر ہمیں تاریخ اور وقت بتانا بھول جائیں گے۔ ایسی مضحکہ خیز صورتِ حال کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے کہ کھانے کی میز پر صرف دہی اور کھچڑی موجود ہے جبکہ مہماں سات قسم کے ڈنر کی اُمید لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک بار ساحرؔ ہوشیار پوری، جو میرے والد کے بڑے پرانے دوست ہیں، صرف علیک سلیک کے لئے تشریف لائے تھے لیکن اُنہیں ڈنر کے لئے رُکنے پر مجبور کیا گیا۔ میں اس طرح کی صورتِ حال سے جوجھنا سیکھ چکی ہوں لیکن یہ مہماں کی قسمت پر منحصر ہے کہ آیا اُسے لذیذ و پُر تکلف کھانے ملیں گے یا سیدھی سادی دال روٹی۔ یہ تو ایک معمولی سی اُلجھن ہے، اِن کے بھلکڑ پن نے بسا اوقات بڑی دلچسپ صورتِ حال پیدا کی ہے۔ وہ اپنے نئے جان پہچان والوں کے نام بھول سکتے ہیں گو وہ اُنہیں پسند کرتے ہوں۔ مثال کے طور پر اُن کے ایک صحافی دوست ہیں، جو عمر میں اُن سے کافی چھوٹے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے اِن دونوں کی دلچسپ گفتگو سننے کا موقع ملا۔ اپنے دوست سے پاپا نے پوچھا، ''ایک بہت ہی ہونہار مسلم نوجواں ہیں۔ ٹریبون میں کام کرتے ہیں، اُن کا نام نورالزماں ہے، کیا تم اُنہیں جانتے ہو؟'' تھوڑی دیر کے لئے وہ صحافی دوست بڑی کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ پھر اپنا تعارفی کارڈ پیش کیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے، ''میں ہی وہ نوجوان نورالزماں ہوں۔'' اُن کے بہت سے دوست جو اس وقت وہاں موجود تھے اس صورتِ حال سے بیحد لطف اندوز ہوئے اور قہقہے لگانے لگے۔

شروع سے مجھے پاپا کی ایک عادت ناپسند رہی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اُن کے بچوں یا بھانجوں یا بھائیوں سے معمولی غلطی بھی سرزد ہو جائے تو اُنہیں فوری غصہ آجاتا ہے اور وہ مہمانوں کے سامنے ہمیں ڈانٹتے پھٹکارتے ہیں۔ مجھے ایک قصہ یاد آرہا ہے جس کا ذکر خود اُنہوں نے مجھ سے کیا تھا۔ اپنے تبادلے کے سلسلے میں نقل مکان کرنے سے قبل وہ اپنی سالی کے گھر کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرے کزن نے جب اُن کے ہاتھ دھلانے کی غرض سے پانی اُنڈیلا تو اتفاقاً اُن کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی بھیگ گئی۔ اُنہوں نے اس لڑکے کو بہت سخت سست کہا اور اس طرح اُس گھر میں اُن کی خاطر مدارت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس واقعے کی روشنی میں آہستہ آہستہ میں نے اُنہیں اپنے نقطہ نظر کا ہم خیال بنا لیا کہ مجھے اس وقت کتنی اذیت پہنچتی ہے جب وہ اجنبی لوگوں کے سامنے مجھے ڈانٹتے پھٹکارتے ہیں۔ میں ایک بات یہاں ضرور کہوں گی کہ اُنہوں نے بڑے خلوص سے میرے مشورے کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب اُنہیں دوسروں کی راستی کا احساس ہو جاتا ہے تو وہ معافی مانگنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ وہ چٹھی آج بھی میرا

قیمتی اثاثہ ہے جو انہوں نے آفس سے بھیجی تھی اور جس میں درج تھا ''آئی ایم سوری''۔ ہمارے
اختلاف رائے کے تمام مواقع تو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن میں ہمیشہ ایسے موقعوں پر بطور احتجاج خاموشی
اختیار کر لیتی تھی۔

میں نے انہیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ غیر معمولی تپاک کا برتاؤ کرتے دیکھا ہے جس میں تکبر کا
شائبہ تک نہیں ہوتا ہے۔ میں نے انہیں اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرم روی کا برتاؤ کرتے ہوئے بھی دیکھا
اور کبھی غفلت، نااہلی اور غیر ذمہ داری کے مرتکب ہوتے تو اُن پر غصے میں برستے ہوئے بھی دیکھا۔ یہ
بہت لوگ میرے والد کے مداح ہیں اور بعض تو فخریہ کہتے ہیں کہ انہوں نے انتظامی کارکردگی کا فن اُنہی
سے سیکھا ہے۔ وہ کام چوروں کو قطعی برداشت نہیں کر پاتے لیکن انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے
اپنے ماتحتوں کے مفادات کا تحفظ بڑی شدت سے کرتے ہیں۔

ان کی شخصیت، سچائی، نبردآزمائی، تہذیب اور تکلف کا ایک دلچسپ مرکب ہے۔ میں نے یہ بھی
دیکھا ہے کہ ان کے ناقدین جب اُن سے ملتے ہیں تو کس طرح ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت
میں کچھ ایسی مقناطیسیت ہے جس کی وجہ سے کئی افسر، اداکار، فنکار، ہنرکار اور شاعر اُن کے عمر بھر کے
دوست ثابت ہوئے۔ اس طرح میں نے اپنے والد کو کئی کیفیتوں اور کئی رنگوں میں دیکھا، کبھی ایک افسر کی
سختی، کبھی اُن کی مہذب بات چیت، اپنے دوستوں کی رفاقت میں عیش و مسرت کی کیفیت، مزدوروں
اور رکشہ والوں کے ساتھ نرمی اور دوستی کا برتاؤ وغیرہ۔ جن لوگوں سے بھی اُن کا رابطہ قائم ہو جائے اُن سے
قربت پیدا کرنے کی میرے والد میں غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔

ایک بار ان کے ایک دوست نے سماجی ذمہ داری کی بات کرتے ہوئے انہیں ایک سماج سدھارک
کہہ دیا۔ میں واقعتاً یہ نہیں جانتی کہ ہمارے سماج سدھارک کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں لیکن اپنے والد
کے متعلق اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ان میں ایک غیر معمولی خصوصیت ہے اور وہ ہے اُن کا استقلال اور شدید
سماجی شعور مختلف حیثیتوں کا مرکب ہیں۔ ایک قلم کار، سماجی کارکن، حساس شاعر اور ناانصافی کے خلاف
لڑنے والا ایک سپاہی۔ میرے یہ کلمات ایک ہیرو ورشپر کی بڑ لگیں گے لیکن اسی طرح کے جذبات کا اظہار
ان کے قارئین، دوست اور ساتھی اپنے خطوط میں کر چکے ہیں۔ انہوں نے تعلیم بالغاں کے لئے اپنے
آپ کو مکمل وقف کر دیا تھا، بالغ خواندہ افراد کے لئے انہوں نے کہانیاں اور نظمیں لکھیں جن میں ان افراد
کی نفسیات اور مسائل کا پورا خیال رکھا۔ چالیس برسوں تک وہ تعلیم بالغان کی مہم میں سرگرم عمل رہے اور
اس سلسلے میں چنڈی گڑھ کے صنعتی علاقے کی کالونی نمبر ۴ کو منتخب کیا۔ اور اس طرح ملک گیر پیمانے پر

چلائی جانے والی مکمل خواندگی کی مہم میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں وہ انتہائی غیر آمادہ قسم کے افسراں کو بھی رضامند کر کے اُنہیں سرگرم عمل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور وہ سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے مالی منفعت یا ذاتی مفاد کی خواہش کبھی نہیں کی۔ وہ تھوڑے سے عینیت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس طرح اُن کے اندر کے قلم کار کی انا کی تسکین ہوتی ہو، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک قلم کار زندگی کے ہر لمحے کو پوری شدت سے جینا چاہتا ہو نہ کہ صرف تماشائی بن کر۔

اُن کے مخالفین بھی ہیں اور بعض دفعہ وہ دل برداشتہ بھی ہو جاتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ ہریانہ اُردو اکادمی یا چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی کے تعلق سے تعمیری منصوبہ بنانے کے بجائے اوچھی حرکتیں کرتے ہیں۔ میں نے اُنہیں مایوسی، دل برداشتگی اور ناامیدی کی حالت میں بھی دیکھا ہے۔ لیکن ان کی نبرد آزمائی کا جذبہ اُنہیں ہمیشہ مصروفِ عمل رکھتا ہے اور اُن کی عینیت پسندی اور سماجی ذمہ داری کا احساس ان کے عمل میں ان کا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ عوام پر ان کا مکمل اعتقاد ہے تاہم میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جو لوگ اُنہیں فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان کی تنبیہ بھی کرتے ہیں اور یہ ایک عین انسانی عمل ہے۔ جو چیز اُن کی شخصیت کو دلفریب بناتی ہے وہ ہے انتقامی جذبے کا فقدان۔ اکثر اوقات ہم آپس میں بحث و تکرار کرتے ہیں لیکن جلد ہی پھر سے دوست بن جاتے ہیں۔ پاپا زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں اور یہ بات اُس وقت عیاں ہو جاتی ہے جب وہ اپنی جمالیاتی حس کے زیرِ نظر خوشنما جوتوں اور شوخ رنگوں کے ٹی شرٹس اور بش شرٹ کا انتخاب کرتے ہیں۔ اتنے سارے برسوں میں اُنہوں نے ڈھیر سارے کپڑے جمع کر لئے ہیں کہ ہر لباس کو وہ سال میں صرف ایک دفعہ استعمال کر سکتے ہیں۔ اپنے ہم عمروں کے برخلاف اُن پر متانت یا رہبانیت کا غلبہ طاری نہیں ہوا۔ وہ اکثر اپنے ان دو پسندیدہ اشعار کا ورد کرتے ہیں ؎

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یا رب
سو بار جہنم میں جلانا یا رب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

بعض دفعہ وہ اپنی خوابوں کی دنیا میں کھو کر مستقبل کے تعلق سے سوچنے لگتے ہیں۔ لیکن لمحۂ حال اُنہیں اپنے سحر کا قیدی بنائے رکھتا ہے۔ زندگی سے چھیڑ خوانی کرتی ہوئے مسائل کے طوفان کو اپنی رَو میں بہا لے جانے کی وہ کمیاب اہلیت اُن میں موجود ہے۔ لطائف کے سلسلے میں اُن کا حافظہ بہت تیز ہے اور

زندگی کی مضحکہ خیز حالتوں پر اُن کی گہری نظر رہتی ہے۔ایک مزاحیہ کہانی یا واقعہ کا ذکر کر کے مشکل صورتحال سے بچ نکلنے کا سلیقہ اُنہیں آتا ہے۔دوسرے والدین کی اکثریت کے مقابلے میں یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنے آپ پر ہنس سکتے ہیں۔لیکن اکثر اوقات ایسا نہیں ہوتا۔کبھی کبھار وہ مبالغہ کا سہارا لے کر خود کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

میں نے اپنے والد کے تخلیقی عمل کا بہت گہرا مشاہدہ کیا ہے اور اس عمل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ایک قلم کار جسے روزی روٹی کمانے کی اذیت کو جھیلنا ہوتا ہے اپنے دامن میں ایسے تجربات،احساسات اور واقعات کو سمیٹ لیتا ہے جو اُس کی کہانیوں،ناولوں،ڈراموں یا شاعری میں مختلف عکسوں میں در آتے ہیں۔ورڈز ورتھ نے اس مختلف الابعاد اور تہہ در تہہ عمل کو'خلوت میں تجربے کی یادداشت'' کا عمل کہا ہے۔

اکثر افراد اس بات کے تعلق سے حیراں رہتے ہیں کہ قلم کار اپنے کرداروں کو کس طرح تخلیق کر لیتے ہیں۔مجھے اس بات کا تھوڑا بہت اندازہ اس طرح ہوا کہ مجھے اپنے والد اور ایک صحافی کی گفتگو سننے کا موقعہ ملا جو اُن سے انٹرویو لینے آئے تھے۔میرے والد نے کہا،

> ''میرے کردار حقیقی زندگی کی کسی ایک شخصیت کے نمائندہ نہیں ہوتے۔مثال کے طور پر میری کسی کہانی یا ناول کی ہیروئن کے لمبے لمبے بال ویسے ہی ہو سکتے ہیں جو میری بیٹی کے سہیلی کے ہیں،اس کی آنکھیں اُس خاتون کی طرح ہو سکتی ہیں جو بس، ریل یا ہوائی جہاز میں میری ہم سفر تھی،اس کا سڈول جسم کسی ایسی خاتون کا ہو سکتا ہے جسے میں نے کبھی سڑک پر دیکھا ہو،اُس کی آواز اُس خاتون کی آواز سے مماثلت رکھتی ہو جو کسی سمپوزیم میں حصہ لینے آئی تھی۔اس کا مزاج ہو سکتا ہے میری ماں،میری چاچی یا پڑوس کی کسی خاتون سے ملتا جلتا ہو۔اس کی معصوم مسکراہٹ میرے پوتے سے میل کھاتی ہو۔اس طرح میرے کردار جنم لیتے ہیں۔''

بطور قلم کار ذاکر صاحب کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت ان کا واضح فکری عمل اور اُردو زباں کا وجدانی ادراک ہے۔میں تھوڑی بہت اُردو جانتی ہوں۔اس زباں کی ماہر نہیں ہوں،تاہم اُن کے شغلِ نگارش کے روزانہ مشاہدے نے مجھے اس کی بے ساختہ قلمکاری کا مداح بنا دیا ہے۔میں اکثر اُن کے لئے ایلزیکیٹو بونڈ پیپر کے رائٹنگ پیڈ لاتی ہو جس پر وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کے پہلے اور آخری مسوّدات لکھتے رہتے ہیں۔لکھتے وقت وہ ایک لفظ تک کو قلم زد نہیں کرتے۔مختلف زبانوں کے قلم کاروں کی یادداشتیں،

رجستگی اور تکنیکی مہارت اکثر اُن کی اَنتھک عرق ریزی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اُن کے ادیب دوستوں کو ا
بات پر یقین ہی نہیں آتا کہ انہوں نے کبھی اپنی نگارشات کی زبان یا اسلوب کو مزید بہتر بنانے کی کوش
کی۔کئی برس قبل اُن کے ایک سینئر ادیب دوست، اوپندر ناتھ اشک ایک استقبالیہ کے سلسلے میں اُن
اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا چنڈی گڑھ تشریف لائے تھے۔ تب اُنہوں نے ایک پرانی گفتگو کا ذکر کیا تھ
اُن کے اور ذاکر صاحب کے مابین ہوئی تھی۔ تقریباً تیس برس قبل اُنہوں نے اپنے نوجوان دوست ذ
صاحب کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ان کی روش کی پیروی کرتے ہوئے اپنی کہانیوں اور ناولوں کے کم از کم
مسودے لکھا کریں۔ جواباً میرے والد نے عرض کیا تھا کہ ''اشک صاحب کے مشورے پر عمل کر
ہوئے اُنہوں نے جن کہانیوں کی نظر ثانی کی تھی وہ نہ صرف زندگی سے دور ہو گئیں بلکہ اُن کی برجستگی
جاتی رہی۔ اس لئے میں نے اُنہیں پرزہ پرزہ کر کے ردّی کی ٹوکری کی نذر کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے
پہلا اور آخری مسودہ ایک ہی ہوتا ہے جسے میں بورڈ پیپر پر شیفر قلم سے لکھتا ہوں۔'' گو لکھنے کا یہ طریقہ
اثر آفریں ہے لیکن اس کی وجہ سے چند مسائل بھی درپیش آتے ہیں۔ بعض دفعہ پبلشر کے ہاتھوں اُن
مسوّدات کے چند حصے گم ہو جاتے ہیں اور اُن کے پاس اس کی دوسری نقل نہیں ہوتی۔ یہ بات تقریباً ناممـ
نظر آتی ہے کہ ذاکر صاحب اپنے لکھنے کے طریقے کو تبدیل کریں گے اس لئے میں نے انہیں اس بات
رضامند کر لیا ہے کہ وہ اپنے مسودات کی زیروکس کاپیاں رکھا کریں جس کا مطلب ہوا مزید اخراجا
تاہم اس سے اس بات کا خطرہ تو نہیں رہے گا کہ ان کی کوئی کتاب نصف طباعت کے بعد روک دی جا۔
میں یہاں اُس اُلوہی انتشار کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہوں جو اس جگہ بکھرا ہوتا ہے جہاں وہ آ
پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ لکھنے کے لئے اُن کے پاس دو میزیں ہیں جن پر اُردو اکادمی آفس اور شرمَ
ودیاپیٹھ کی فائلیں اور دوسرے کاغذات بکھرے رہتے ہیں۔ وہ منظر بھی دلچسپ ہوتا ہے جب ہر سال
مسئلے پر میری اُن سے بحث ہو جاتی ہے اور وہ ان کاغذات کو قرینے سے لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کا
وہ اپنے مسودات کے تعلق سے بھی ذہنی طور پر اتنے ہی منظم ہوتے جتنے دفتری معاملات کے تعلق
ہیں۔ اُن کے مسوّدات، تصاویر اور اسی نوعیت کی دوسری چیزیں تلاش کرنے کے لیے ہم بھائی بہنوا
ایک باضابطہ مہم سر کرنی ہوتی ہے۔ نتیجتاً پورے گھر پر اُلوہی انتشار محیط ہو جاتا ہے۔
میں یہاں مختصراً اُن کی نگارشات کے اُن موضوعات کا ذکر کرنا چاہوں گی جو مجھ پسند نہیں۔ اُن
تحریروں کا تازہ ترین موضوع عورت کا استحصال بطور بیٹی، بہن، بیوی اور ماں ہے۔ اُن کی چند تازہ تر
کہانیاں مثلاً دوسرا امرد، لفنگی، ڈبل شفٹ، ایک ڈری ہوئی لڑکی، ستوش کمار، ملابار کی شہزادی وغیرہ عور

کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی ہیروئن کے عالم شباب سے لے کر ضعیفی تک کے سفر
انسانی جذبات کی مکمل قوسِ قزح بشمول تقسیمِ ملک کے بعد ہجرت کے مسئلے کو اس خوبی سے پیش کیا گی
کہ قاری اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس سے پوری طرح ہم آہنگ پاتا ہے۔ بعض دفعہ مجھے محسوس ہوتا
نئے اور لبرل خیالات کے دعووں کے باوجود ہم میں سے ہر ایک اپنی نسل کی سماجی اور تہذیبی حد بند
عقائد اور رسومات کا قیدی بنا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر میرے والد خواتین کی تعلیم اور اُن کی معاشی آ
کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ لیکن وہ اپنی بیٹیوں کو سماجی طور سے پُر اعتماد بنانے کے سلسلے میں دوراند
ثابت نہیں ہوئے۔ کاش وہ ہمیں جسمانی تربیت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے اور ہم جوڈو کراٹے
تاکہ ہم بھی بھائیوں کی طرح چھوٹے موٹے کاموں کے لیے آزادی سے باہر جا سکتے۔ ایسا لگتا
ہندوستانی والدین نہ صرف اپنی بیٹیوں بلکہ اپنے بیٹوں کے تعلق سے بھی بہت زیادہ تحفظانہ رویہ اپناتے ہی

نامور والدین کی اولاد ہونا جتنی سنسنی خیز بات ہے اتنی ہی پُر خطر بھی۔ اُن کی اولادیں اُن کی عظ
کے سائے میں زندہ رہتی ہیں۔ والدین کی مداحی کا جذبہ جو ہیرو ورشپ کی حدوں کو چھوتا ہے وہ انہیں
صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ترغیب دے بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ میں یہاں اس بات کا اعتراف
چاہتی ہوں کہ ایسا نہیں کہ ان میں اولاد کی ہمت افزائی کرنے کے جذبے کا فقدان تھا بلکہ انہوں نے
اور باپ کا جو دوہرا کردار ادا کیا اس کی وجہ سے انہوں نے بہت زیادہ تحفظانہ اور محتاط روی کا رویہ اختیار
بہت بعد میں ذاکر صاحب کو اس بات کا احساس ہوا کہ خود اعتمادی نہ کہ اطاعت شعاری ایک فرد کو زندگی
کارزار میں اپنی ہر جنگ سے خود نبرد آزما ہونے کے قابل بناتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھ میں
اعتمادی میرے ساتھ کام کرنے والے ساتھیوں کی حد سے زیادہ بدمزاجی کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔

میرے تعلق سے جو ایک خاص اولاد اور ایک اہم لڑکی کا رویہ برتا گیا ہے اس کے تعلق سے میں
محسوس کرتی ہوں، میں یہ سمجھتی ہوں کہ اس طرح کے رویّے سے ایک بیٹا یا بیٹی اپنی فطری خواہشات
ردِّ عمل کے اظہار سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایک ناز و نعم میں پلی بڑھی اولاد اکثر اپنے والدین کے او
توقعات کے بوجھ تلے زندہ رہتی ہے۔ یہ ایک طرح کی پردہ پوشی سمجھی جائے گی اگر میں کہوں کہ مجھے
شکایت، کوئی پشیمانی یا کوئی حسرت نہیں ہے۔ میں یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتی کہ ہمارے خاندان میں مکمل سک
موجود ہے۔ ذاکر صاحب کے ساتھ ہماری زندگی شیریں و ترش، پیار اور تناؤ، ذہنی ہم آہنگی اور اختلاف
محرومی اور آسودگی کا مرکب رہی ہے۔ تاہم میں اپنے آپ کو اُس والد کی ایک اہم اولاد کے طور پر متعار
کرنا پسند کرتی ہوں جس پر مجھے فخر ہے۔

کے. ایل نارنگ ساقی

شہنشاہِ ادب — کشمیری لال ذاکر

ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۸۷ء میں ہوئی جب قتیل شفائی مجھے اپنے ہمراہ چندی گڑھ لے گئے۔ اس کے بعد میرا اُن کا رشتہ ہمیشہ نیاز مندی کا رہا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ بھی مجھے چھوٹا بھائی مانتے تھے۔ ان سے میرے تعلقات اس طرح نیاز مندی کے ہیں کہ ہریانہ اُردو اکادمی کا جب بھی کوئی مقامی یا انڈو- پاک مشاعرے کا پروگرام بنایا جاتا تو شاعروں کو مدعو کرنے سے لے کر اُن کو ہریانہ میں جائے مشاعرہ تک لے جانے اور واپس لانے کا کام میرے ذمہ ڈال دیتے۔ ہندوستان یا پاکستان کا کوئی ایسا شاعر چاہے علی سردار جعفری ہوں یا کیفی اعظمی، منیر نیازی ہوں، احمد فراز ہوں یا قتیل شفائی ہوں، انہیں مشاعرہ میں لے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری میری ہوتی۔ ۱۹۹۴ء میں ہم نے اُن کا جشن منانے کا فیصلہ کیا اور رصا ردت کوش اور شخصیت کا خصوصی نمبر نکالنے کا کام سونپا، جس کا باقاعدہ اجرا گورنر ہاؤس چندی گڑھ میں آر-سیل گورنر ہریانہ نے کیا، اس کے بعد ہم نے اُن کی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا۔

نند کشور وکرم صاحب نے بتایا کہ وہ اس سال عالمی اُردو ادب کا نمبر کشمیر لال ذاکر صاحب پر نکال رہے ہیں۔ اور مجھے اس پر مضمون لکھنے کا حکم بھی صادر کیا۔ میں سوچنے لگا کہ ذاکر صاحب پر کیا لکھوں، مجھے اُس وقت سعادت حسن منٹو یاد آ گئے، محمد طفیل نے نقوش کے لیے احمد ندیم قاسمی پر جب مضمون لکھنے کے لیے کہا تو اُنہوں نے جواب دیا 'احمد ندیم قاسمی کی زندگی بالکل صاف اور شفاف ہے۔ میں سو بار بھی لکھنا چاہوں تو ہر بار یہ ہی لکھنا پڑے گا کہ احمد ندیم قاسمی نہایت شریف آدمی ہیں۔'' میں بھی اس پریشانی سے دوچار ہوں کہ ذاکر صاحب جیسے شریف آدمی پر مضمون کیسے لکھا جا سکتا ہے۔ جن دنوں ہم ذاکر صاحب کا جشن منا رہے تھے تو میں نے دلیپ سنگھ سے اس پر مضمون لکھنے کی گزارش کی تو اُنہوں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کہ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ بتائیں تاکہ میں مضمون کی تمہید باندھ سکوں۔ ذاکر صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے اپنی پڑوسن کی ساڑھی اُتار لی تھی۔ ان کی یہ بات سن کر سب لوگ بہت حیران ہوئے لہٰذا اُن سے درخواست کی گئی کہ ذرا تفصیل سے بتائیں؟ کیا پڑوسن نے کوئی اعتراض نہیں کیا؟ ذاکر صاحب نے معصومیت سے جواب دیا، اس میں بھلا اعتراض کی کیا بات تھی، اُس کی ساڑھی صحن میں

سوکھنے کے لیے ڈالی ہوئی تھی، میں نے بارش کے آثار دیکھ کر ساڑھی اُٹھا لی تاکہ خراب نہ ہو۔

ذاکر صاحب جوانی کے دنوں میں اس قدر معصوم بھی نہیں تھے۔اُن کا تبادلہ کسی ایسے مقام پر ہو گیا جہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ان کے پڑوس میں ایک محترمہ کا بنگلہ تھا۔لیکن وہ بہت نک چڑھی تھیں، کسی سے بات کرنا گوارہ نہ کرتی تھیں۔ذاکر صاحب نے ایک دن اُن کے بنگلے پر جا کر دستک دی، محترمہ نے دروازہ کھولا، ذاکر صاحب بولے، بی بی آپ کی بکری روز میرے باغیچے کے پھول کھا جاتی ہے،اسے باندھ کر رکھا کریں۔اس پر وہ حیران ہو کر بولیں، 'میرے ہاں کوئی بکری نہیں ہے۔'اس پر ذاکر صاحب نے کہا میں نے بھی کون سا بنگلے میں باغیچہ لگا رکھا ہے۔البتہ بات کرنے کے لئے کچھ تو بہانہ چاہیے تھا۔

کشمیر لال ذاکر کا خیال آتے ہی ایک دلکش تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے خوبصورت، خوبرو، صاف گو، صاف دل، بے لوث شخصیت۔اس کی پیدائش ۷/اپریل ۱۹۱۹ء کو موضع بیگا بانیاں ضلع گجرات میں ہوئی جو اَب پاکستان میں ہے۔انہوں نے انگریزی میں ایم اے پاس کرنے کے علاوہ بی.ٹی کا امتحان اور تعلیم بالغاں میں خصوصی سند حاصل کی۔اس کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر کی رنگین اور تازگی بخش فضاؤں میں گزرا، جہاں ان کے والد محترم شری گرو داس رام جی مہاراجہ کشمیر کی ملازمت میں تھے۔انہوں نے پہلا افسانہ ''الگ الگ راستے'' ۱۹۴۳ء میں لکھا جو اُس وقت کے مشہور اور معروف پرچہ میں شائع ہوا۔ان کی کہانیوں میں کشمیر کی دلکش زمین اور حسن افروز نظارے اور چاندنی اکثر نظر آتے ہیں۔

ذاکر صاحب اُردو، ہندی اور پنجابی میں ناول، افسانوی مجموعے، ڈرامے، خاکے، سفرنامے اور مختلف موضوعات پر ۱۰۰ / سے زیادہ کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔وہ ایک معروف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ جانے پہچانے شاعر بھی ہیں۔گو ان کی اصل شہرت بطور افسانہ نگار ہی ہے لیکن غزل کے میدان میں بھی انہوں نے تازہ کاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔یوں تو اُن کے ہر ناول اور افسانوی مجموعہ کو پسند کیا گیا لیکن ''کرماں والی''، ''سندھو کی راکھ''، ''جب کشمیر جل رہا تھا'' اور ''سمندری ہواؤں کا موسم'' کو خاص طور پر شہرت ملی۔وہ اپنی کہانیوں میں زندگی کے تلخ و شیریں لمحات کی حقیقت نگاری، انسانی جذبات کی گہرائی، جیتے جاگتے کرداروں کی تخلیق اور مناظرِ فطرت کی عکاسی اس سلیقے سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کر اُٹھتا ہے۔

۱۹۹۰ء میں نیشنل اسکول آف ڈرامہ نے آپ کے مشہور ناول کرماں والی کو ڈرامے کی شکل میں کمانی آڈیٹوریم، دہلی میں پیش کیا۔اور پھر عوام کے پرزور اصرار پر عرصے تک اسے اسٹیج کرتے رہے۔

ذاکر صاحب نے کرماں والی میں ایسے ہی انسانیت دوست کرداروں کو جو ہندو بھی ہیں، سکھ بھی اور

مسلمں بھی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس بارے میں خود ذاکر صاحب نے پیش لفظ میں لکھا ہے

''اس ناول کا موضوع تقسیم ہے۔ وہ محرومی اور کسک ہے جس کا احساس اس نسل کے لوگوں کو تھا (جواب بھی ہے) جو پاکستان چلے گئے اور ان کے کچھ افراد ہندوستان میں رہ گئے، کچھ لوگ ہندوستان آگئے لیکن ان کے کچھ عزیز پاکستان میں رہ گئے۔''

ریست جاوید نے ان کے ناول کرماں والی کے بارے میں لکھا ہے

''دراصل کشمیرلال ذاکر اپنی تخلیقی کاوشوں سے ایسے ہی مضبوط پلوں کی تعمیر میں منہمک ہیں وہ انسانی رشتوں کے ایسے ایسے چھوٹے پل تعمیر کرتے ہیں جن کے نیچے سے انسانی جذبات اور احساسات کا صاف وشفاف اور گہرا پانی بہتا ہے جو انسانی برادری کے کھیتوں کو سینچتا اور دھرتی کے باسیوں کی زندگی کو سیراب کرتا ہے۔''

کرماں والی کے بارے میں ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں

''یہ ایک ہندو مسلم سکھ تفرقے اور اتحاد کی کہانی ہے۔ تفرقے سیاست دانوں نے پھیلائے جبکہ عوام متحد رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ صدیوں سے ایک ہندوستانی سماج مشترکہ معاشرتی مسائل اور تہذیبی اقدار کے ساتھ بن چکا تھا اور ہر مذہب و فرقہ کے لوگوں کی جڑیں ایک ایسی زمین میں جمی ہوئی تھیں جس پر سبھی کے آباو اجداد کے پسینے بہے تھے۔''

ذاکر صاحب کے ہاں کردار نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں کیوں کہ ذاکر صاحب کرداروں میں اچھائی اور برائی کے ساتھ ان کرداروں کی فطرت میں ہم سب اپنی شکل دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ہارون ایوب لکھتے ہیں

''ایک ناول نگار کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے زمانے کے افسانوں کو کس حد تک کامیابی سے پیش کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے ناول نگار، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے پیش نظر اپنے ناولوں کا تانا بانا تیار کرتے ہیں کشمیری لعل ذاکر کے ناول اور افسانے بھی وہ گھومتے آئینے میں جو اپنے دور کے ماحول اور اس کے پس پردہ کارفرما عوامل کی کامیاب عکاسی کرتے ہیں۔''

ذاکر صاحب خود اس طرح سے رقم طراز ہیں

''میں افسانوں، ڈراموں اور ناولوں کے لیے اکثر ایسے ہی کردار چنتا ہے جو ذہنی

لحاظ سے مطمئن نہیں ہوتے، جن کی روحیں بے قرار ہیں، جن کے دماغ میں اُلجھنیں ہیں، جن کی زندگی شکستوں کا ایک پہاڑ ہے، لیکن وہ اس پر اوپر کھڑے ہو کر نیچے پھیلے فنا کے بے کنار سمندر میں کود کر جان نہیں گنواتے بلکہ سب سے اونچی چوٹی پر کھڑے ہو کر اُفق سے طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہیں جس کی کرنیں انہیں روشنی اور حرارت کا پیغام دیتی ہیں۔"

حال ہی میں ان کے ۸۹ ویں جنم دن کے موقع پر فاروق ارگلی ان کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں

"ہمارے عہد میں اُردو فکشن کے بہت سے ذور سار ناموں کے جلو میں کشمیر لعل ذاکر کا نام بھی اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں کے ساتھ اُردو کی گذشتہ تین نسلوں کے ذہنوں میں اُجالے بکھیر رہا ہے۔ ذاکر صاحب تقسیم کے المیوں، کشمیر، پنجاب اور نئے ہندوستاں کے آنکھوں دیکھے اور محسوس کیے گئے انسانی جذبوں، سنگھرشوں، دکھوں اور خوشیوں کے ذاکر ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا، جو جیا اور جو محسوس کیا ہے اسے سادگی اور بے ساختگی سے کہانی کے فنی سانچے میں ڈھال کر قبولِ عام کی سند لی ہے۔"

ذاکر صاحب تیس سال تک پنجاب و ہریانہ میں محکمہ تعلیم کے مختلف عہدوں پر رہنے کے بعد ۱۹۷۷ء میں ملازمت سے سکدوش ہوئے۔ اُن کی بہتر کارکردگی کی وجہ سے انہیں دوبارہ ملازمت میں لے لیا گیا اور ۱۹۸۴ء میں یہ رٹائر ہو گئے۔ ہریانہ سرکار نے اُردو اکادمی قائم کی تو ان کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے کے لئے انہیں اکادمی کا سکریٹری مقرر کر دیا۔ ذاتی مصروفیات کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے انہوں نے ہریانہ اکیڈمی چھوڑ دی لیکن کمبل کب انہیں چھوڑنے والا تھا۔ عزت مآب قدوائی صاحب گور ہریانہ مقرر ہوئے تو انہوں نے اسرار کر کے دوبارہ ذاکر صاحب کو اُردو اکادمی کا سکریٹری بنوایا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اتنے کم بجٹ میں ہریانہ اکیڈمی نے وہ کارہائے نمایاں کئے کہ آج ہریانہ اکیڈمی کا شمار ہندوستان کی بہترین کارکردگی والی اکیڈمیوں میں ہوتا ہے۔

یہ مضمون ادھورا رہے گا اگر میں ان کی شعری خدمات کا ذکر نہ کروں۔ یوں تو ذاکر صاحب بہت کم مشاعروں میں حصہ لیتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی اپنا شعری مجموعہ چھپوانے کی طرف توجہ دی۔ لہٰذا جیسے کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں ان کے جشن کے موقع پر ہم نے ان کی غزلوں کو مختلف

رسالوں میں سے جمع کر کے اس کا شعری مجموعہ ''شیشہ مدں حواب'' شائع کیا۔ ذاکر صاحب کی غزلوں کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ روایتی شاعری ہے یا جدید۔ کیونکہ انہوں نے اپنے مشاہدات کو سیدھے سادے انداز میں شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

تمام رات اندھیرے سے شمع لڑتی رہی
یہ مسئلہ تو اُصولوں کا تھا انا کا تھا

وہ چلا گیا رحموں کی تجارت کر کے
مدتوں اس شہر کا چرچا ہوگا

وہ میرا نام لکھے گا ہوا کے جھونکوں پر
پھر اس میں درد کی تلخیاں ملا دے گا

پھر اس کے بعد پرندے ادھر نہیں آتے
بس اک بار انہیں گھر بنانا ہوتا ہے

سانسوں کی دولت کو اپنے ہاتھوں ہی
ڈھلتی عمر میں کھونا اچھا لگتا ہے

تاریک مکانوں کے اُبھرتے ہوئے سائے
سورج کو بھی آنگن میں اُترنے نہیں دیتے

آخر میں ان کے ہی ایک قطعے پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں

ہماری راہ میں ایسے مقام بھی گزرے
کہ مرسلوں کے جہاں پر سلام آتے ہیں
ہماری یاد میں کچھ محفلیں سنورتی ہیں
ہمارے نام پہ گردش میں جام آتے ہیں

کشمیری لال ذاکر

سمندری ہواؤں کا موسم

پُشکر ناتھ کے فادر پنڈت جیالال کول کھیلوں کے بڑے شوقین تھے۔ وہ کھیلوں کو انسانی اور سماجی یکجہتی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جو ملک جو اسپورٹس کو اہمیت نہیں دیتا وہ ملک انسانی قدروں کو مضبوط کرنے کی کوشش میں پچھڑ جاتا ہے۔ اور اُس کا شمار کم ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے لگتا ہے۔

پنڈت جیالال کول کو کرکٹ کا بڑا شوق تھا اور چونکہ اننت ناگ کے ارد گرد کا علاقہ بید کی اعلیٰ قسم کے درختوں کے لئے مشہور ہے، اس لئے اُس علاقے میں اُس زمانے میں کرکٹ بیٹ بنانے کی بہت زیادہ فیکٹریاں تھیں اور اُس علاقے میں بڑی اعلیٰ قسم کے کرکٹ کے بلّے بنتے تھے اور دور دراز تک اُن کی مانگ تھی۔ جیالال کول جی نے بھی ایک ایسی ہی فیکٹری قائم کر رکھی تھی اور اپنے بیٹے پشکر ناتھ کو بھی کرکٹ کے کھیل کی بڑی تربیت دیتے تھے۔ پشکر ناتھ کے فادر اور میرے والد میں گہری دوستی تھی۔ اس لئے میں نے جب اپنی تعلیم پوری کر لی تو میری شادی کشمیری پنڈتوں کے رسم و رواج کے مطابق پشکر پنڈتوں کے رسم و رواج کے مطابق پشکر ناتھ سے ہوگئی۔ پشکر ناتھ نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا اور اُسے گورمنٹ کالج اننت ناگ ہی میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس لئے ہم دونوں اننت ناگ میں رہنے لگے تھے۔ ہم کوشش کر رہے تھے کہ مجھے بھی اننت ناگ کے گرلز اسکول ہی میں ملازمت مل جائے۔ پشکر ناتھ نے اپنے کالج میں کرکٹ کلب بنائی تھی اور شام کو دو گھنٹے اسٹوڈینٹس کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا۔ اتوار کو سارا دن پشکر ناتھ کرکٹ کے میدان ہی میں گزارتا تھا اور جب شام کو تھکا ٹوٹا گھر لوٹتا تھا تو وہ دیوار کی بڑی سی گیلی کی طرح بے سدھ ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اُس کے اس رویے سے بڑی تکلیف ہوتی تھی اور جب میں اس کا اظہار اپنی ساس سے کرتی تھی تو جیالال کول میری آواز سن کر میرے قریب آجاتے اور کہتے

"شاردا! تم نے امریکہ کے پریزیڈنٹ فرینکلن روزولٹ کا نام سنا ہے نا؟"

"سنا ہے پتا جی، وہ بہت بڑے آدمی تھے۔"

"اُنہیں اسپورٹس کا بڑا شوق تھا۔"

"جی پتا جی۔"

'' اُنہوں نے ایک بار اسپورٹس کے ایک فنکشن میں اپنی تقریر میں کہا تھا
''اسپورٹس ار دی فائبر آف دی آل دی اسٹینڈ فار۔ اٹ کیپس اُور اسپرٹس ایلایو۔''
اُن کے یہ الفاظ سن کر میں سر جھکا لیتی اور اپنی گیلی آنکھیں پونچھ ڈالتی جن میں پشکر ناتھ کی بے رُخی کی وجہ سے آنسو آگئے ہوتے تھے۔

جب بھی کبھی مجھے پشکر ناتھ پر غصہ آتا میں اپنے ذہن میں فریڈکلس روزولٹ کے یہ الفاظ دہرانے لگتی۔ جیسے لوگ غصے کے وقت پانی کے چند گھونٹ پی لینے کی تلقین کرتے ہیں، پنڈت جیالال کول میرے لئے ایک رول ماڈل بن گئے تھے۔ پاس کے قصبے بیج بہاڑا میں کول صاحب کے ایک دوست جان محمد بھٹ رہتے تھے۔ اُنہوں نے بھی کرکٹ کے بلّے بنانے ہی کی ایک فیکٹری کھول لی تھی، اور بڑی اچھی کوالٹی کے بلّے بناتے تھے۔ بلکہ اکثر تو یہ دونوں دوست باہمی اشتراک ہی سے اپنا بزنس بھی کرتے تھے۔ دونوں میں غضب کی آپسی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ہمارے دونوں گھرانوں کے آپسی تعلقات کی لوگ مثال دیا کرتے تھے۔ دونوں خاندان عید اور دیوالی بھی ملکر مناتے تھے۔ جب کبھی کول صاحب، میری ساس، پشکر ناتھ اور میں کھیر بھوانی دیوی کے درشنوں کو جاتے تھے تو ہمارے ساتھ خورشید آنٹی بھی جاتی تھیں اور اُن کا بیٹا ارجمند بھی۔ ارجمند کی عمر مجھ سے چار برس کم تھی، وہ بڑا خوبصورت اور دراز قد کا لڑکا تھا اور کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ بڑا ہی کم گو اور شریف تھا۔ کئی بار تو اُسے گفتگو پر مائل کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ کھیر بھوانی مندر کے وسیع صحن میں خورشید آنٹی بھی ہمارے ساتھ پوجا میں شامل ہوتی تھیں اور میری ساس کے ساتھ ہی دیوی کھیر بھوانی پر دودھ چڑھاتی تھیں۔ جو پرشاد ہم مندر سے لاتے تھے اُس کا آدھا حصہ بھٹ انکل کے گھر میں بٹتا تھا، دیوالی کی رات کو جتنے چراغ ہمارے گھر کی چھت اور دیواروں پر جلتے تھے اُتنے ہی چراغ بھٹ انکل کی دیواروں اور چھت پر جلتے تھے۔ اور آدھی رات تک جلتے رہتے تھے۔ جب بھی بھٹ انکل عیش مقام کے قریب پہاڑی پر بنے فقیر بابا کے مزار پر سجدہ گزارنے جاتے تھے تو ہم سب بھی ساتھ ہوتے تھے اور بڑی عقیدت سے سجدہ گزارتے تھے اور مزار کے سجادہ نشین کے دئے ہوئے تبرک کو بڑے ادب سے حاصل کرتے تھے۔ ارجمند بڑا باادب اور عقیدت مند لڑکا تھا۔ وہ جب مزار پر سر جھکاتا تو بہت دیر سجدے میں پڑا رہتا تھا۔ خورشید آنٹی اُسے بڑے پیار سے اُٹھاتی تھی اور اُس کا ماتھا چومتی اور پھر مزار میں سوئے فقیر بابا سے درخواست کرتی تھی کہ وہ اُس کا اس نازک سے بیٹے کی حفاظت کرے۔ اُس دن عیش مقام سے پھر ہم پہلگام چلے جاتے تھے اور تمام دن لدر نالے کے کنارے گزارتے تھے۔ وہیں مل جل کر کھانا تیار کرتے تھے اور سماوار میں نمکین چائے بنا بنا کر پیتے رہتے تھے۔ دوڑ دھوپ کا سارا کام پشکر

ناتھ، ار جمند اور میرے ذمے ہوتا تھا۔ جب شام کو ہم گھر لوٹتے تو ہم سب بڑے خوش اور شاداب ہوتے تھے۔ اُن دنوں دونوں خاندانوں پر خدا کی بڑی برکت تھی۔ ہائے کیا دن تھے وہ!

پھر جو حالات پلٹا کھانے لگے تو کھاتے ہی چلے گئے۔ حالات بھی تو کبھی کبھی بپھرے ہوئے دریا کی طوفانی لہروں کا روپ دھار لیتے ہیں، وقت کے دریا کا کنارا ایک بار ٹوٹ جائے تو حدِ نگاہ تک جل تھل ہو جاتا ہے۔ بس یہی ہوا کشمیر کی حسین وادی کے ساتھ اور ہمارے دونوں بھرے پُرے خاندانوں کے ساتھ۔

اُس برس دونوں خاندانوں کو کاروبار میں بڑا نقصان ہوا، کیوں کہ سارے ملک کا ماحول اچانک بگڑ گیا تھا اور بازار میں مندا چھا گیا تھا۔ بہت سی رقمیں جو وادی سے باہر کے شہروں سے وصول ہونا تھیں، ایک دم رُک گئی تھیں۔ نئے آرڈر ملنے ویسے ہی بند ہو گئے تھے۔ تجارت کو مجموعی طور پر بڑا زبردست دھکا لگا تھا۔ کول صاحب بڑے ہی حساس آدمی تھے، ذرا ذرا سی بات اُنہیں پریشان کر دیتی تھی، ایک بار تو انہیں ہارٹ اٹیک بھی ہو چکا تھی، اس لئے وہ کھانے پینے میں بھی بڑی احتیاط برتتے تھے، لیکن کاروبار میں اتنا بڑا نقصان اُن سے برداشت نہ ہو سکا۔ بھٹ انکل اُنہیں تسلیاں تو بہت دیتے رہے لیکن اُن پر زیادہ اثر نہیں ہوا۔ ایک رات وہ ہلکا سا کھانا کھا کر سوئے تو پھر جاگے ہی نہیں۔ اُنہیں سوتے سوتے ہی ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ نیند ہی میں پرلوک سدھار گئے۔ بس وہ رات ہمارے دونوں خاندانوں کے لئے آفتوں کے آغاز کی پہلی رات تھی۔ اُس کے بعد سکون اور شانتی نے ہمارے گھر کو الوداع کہہ دی۔ اگلے روز سوگواروں کے ایک بہت بڑے ہجوم نے پنڈت حیالال کول کے مرت شریر کو شمشان میں چتا پر رکھ دیا اور اُن کے بیٹے پشکر ناتھ کول نے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگاتے ہوئے اُن کی چتا کو آگ دے دی۔ اور پھر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ شمشان سے دھیرے دھیرے چھٹ گئی اور چتا کے شعلے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔

اُس اذیت ناک شام کو اننت ناگ کے قصبے پر ایک نئی آفت ٹوٹی۔ بازار میں ایک بم پھٹا تھا، ایک آدمی کی موت ہو گئی تھی اور دس آدمی زخمی ہو گئے تھے۔ سارے قصبے میں کہرام مچ گیا تھا۔ لوگ ڈر کے مارے اپنے اپنے گھروں میں قید ہو گئے تھے اور تمام قصبے پر کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔

وہ رات ہمارے اور بھٹ انکل کے خاندان کے ساتھ سارے قصبے کے لئے قیامت کی رات تھی۔

اس رات کی پھر صبح ہوئی ہی نہیں۔ رات کا اندھیرا روز بہ روز گہرا ہی ہوتا گیا اور ایک ایسی گھڑی آ گئی جب کشمیر کی حسین وادی جو خوشبوؤں اور خوبصورت پھولوں کا مسکن تھی، دھوئیں، بارود اور آگ کے شعلوں کا

آتش زار بن گئی، اس آتش زار میں بہت دیر تک جھلسنا دشوار تھا۔ اب تو بھٹ انکل ہی ہمارے کاروبار اور اپنے کاروبار دونوں کو سنبھال رہے تھے۔ ویسے اب سنبھالنے کو بچا بھی کیا تھا۔ دھیرے دھیرے اُنھوں نے پشکر ناتھ کے مشورے سے ہمارا کاروبار بھی سمیٹ دیا اور اپنا بھی۔ لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ ہمیں کم سے کم نقصان ہو۔ زیادہ نقصان اُنھوں نے خود ہی برداشت کیا۔

یہ بھی مثبت انسانی قدروں کی ایک روشن مثال تھی، جو بھٹ انکل نے وادی کے ناموافق حالات میں قائم کی تھی۔ اور اسی روشن قدروں کی جلتی ہوئی مشعل کو وہ اپنے کمزور ہاتھوں میں سنبھالے ایک شام، خورشید آنٹی اور اپنے بہت ہی نازک اور خوبصورت بیٹے ارجمند کو ساتھ لے کر وادی کی حدوں کو پار کر گئے۔ وہ اُس دن سہ پہر کو ہمارے گھر آئے تھے اور جب تک رُخصت نہیں ہوئے روتے ہی رہے تھے۔

''میں بہت شرمسار ہوں بھابھی کہ اب اس ماحول میں میرا دم گھٹ رہا ہے، میں کھلی سانس لینے کے لئے آپ سے جدا ہو رہا ہوں۔''

''ہمیں کس کے سہارے چھوڑ رہے ہو بھائی صاحب؟'' ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''اللہ کے سہارے، اور تو سب سہارے ٹوٹ چکے ہیں۔''

'اب تو اُس کا سہارا بھی ٹوٹ رہا ہے بھائی صاحب۔''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

بھٹ انکل نے پشکر ناتھ کو سینے سے لگایا اور دونوں پھپھک پڑے، پھر اُنہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے: ''میں نہیں جانتا کہ ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں، اب تو صرف یہاں سے بھاگ رہا ہوں، یہاں رہنا اب ممکن نہیں۔ لیکن میں جہاں بھی جاؤں گا اور جب تک زندہ رہوں گا آپ سے میرا رشتہ بنا رہے گا۔ آپ کا اور میرا رشتہ خون کا رشتہ ہے اور خون کا رنگ ساری دنیا میں ایک ہی ہے، خون کا رنگ جو دنیا کے ظہور میں آنے پر خدا نے اُسے بخشا تھا، دنیا کے ختم ہونے تک اُس کا وہی رنگ رہے گا۔ مجھے اس کا یقین ہے۔''

میں بھٹ انکل کے گلے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔

پھر وہ میری ماں سے مخاطب ہوئے: ''کھیر بھوانی کا پرشاد جو آپ پچھلے منگل کو لائی تھیں، اُس کا کچھ حصہ ایک پوٹلی میں باندھ کر مجھے دے دیں، میں اسے ایک تعویذ کی طرح اپنے پاس رکھوں گا۔ سنا ہے کھیر بھوانی دیوی کے تالاب میں جمع دودھ کا رنگ بھی کالا ہوتا جا رہا ہے، اب خدا ہی سب کی حفاظت کرے۔''

میری ماں نے ایک لال رنگ کے کپڑے میں کھیر بھوانی کا پرشاد باندھ کر بھٹ انکل کو دیا، اُنہوں نے اُس چھوٹی سی پوٹلی کو ماتھے سے لگایا اور پھر اُسے اپنی جیب میں رکھ کر آنسو بھری آنکھوں سے فوراً گھر کی ڈیوڑھی سے باہر نکل گئے۔ ہم سب سکتے میں خاموش کھڑے تھے جیسے گھر سے جاتے ہوئے وہ ہماری جان بھی اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔

کوئی چھ ماہ کے بعد اچانک انکل جان محمد بھٹ کا خط آیا۔

یہ خط اُنہوں نے کراچی سے لکھا تھا۔

پشکر ناتھ نے خط پڑھ کر سنایا۔

''تو بھٹ صاحب کراچی پہنچ گئے ہیں۔'' ماں نے کہا۔

''ایسا ہی لگتا ہے۔''

''کیا کر رہے ہیں وہاں؟''

''کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے کی کوشش میں ہیں۔''

''بڑا ہیرا آدمی تھا بھٹ، خط کا جواب اُسے کل ہی دے دو، پشکر۔''

''دے دوں گا ماں جی، اور سب کی طرف سے نمسکار بھی لکھ دوں گا۔''

''جب تک انکل کا جواب آئے گا بھگوان جانے ہم کہاں ہوں گے۔'' میں بڑی افسردہ دلی سے بولی۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا شاردا۔'' پشکر ناتھ نے ایک لمبی سی سانس لی۔

دراصل وادی کے حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ یقین سے کوئی بھی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہندو اور سکھ تو کیا مسلمان بھی وادی چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ہر روز کہیں نہ کہیں بم پھٹنے کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ ہر تیسرے دن اچانک بازار بند ہو جاتے تھے۔ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو اغوا کر لیا گیا تھا اور کچھ دنوں کے بعد دور دراز جگہ اُن کی لاش ملی تھی۔ اسکولوں اور کالجوں میں ہندو ٹیچرس، اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ عوام کا حکومت پر سے وشواس اُٹھ گیا تھا۔ آپا دھاپی کا عالم تھا۔ سب کو اپنی فکر تھی، کوئی کسی کا پُرساں حال نہیں تھا۔ میری ساس نے تو گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں بھی اسکول میں جاتی تھی تو اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر۔ پشکر ناتھ کی کرکٹ کی ٹیم ختم ہو گئی تھی۔ اب کسی کو اس میں دلچسپی نہ تھی۔ پشکر ناتھ نے اپنا بیٹ، ٹانگوں پر باندھنے والے پیڈ، ہاتھوں کے دستانے اور سر پر رکھنے والا ہیلمٹ، سب کچھ گھر کے ایک کونے میں ڈال دیا تھا۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے وہ کرکٹ کی گیند کو ہاتھ میں

اُچھالتا رہتا اور جانے کیا سوچتا رہتا۔ میں نے اُس سے کئی بار پوچھا کہ وہ ہر وقت گیند کیوں اُچھالتا رہتا تھا۔

میرے بار بار پوچھنے پر ایک بار اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میری گیند در اصل ' یا کا گلوب ہے اور میں اُسے اپنی مرضی کے مطابق گھما رہا ہوں۔ دنیا میرے ہاتھوں کی گرفت میں ہے، اور اس کا سارا نظام میرے قبضے میں ہے۔ میں اس وقت بھگوان ہوں اور سارا سنسار میرے قبضے میں ہے۔'

''کاش ایسا ہوتا میرے بھولے شوشنکر! ہم تو اس گھڑی اپنی مرضی سے اپنے گھر کی کھڑکیاں بھی نہیں کھول سکتے کہ تازہ ہوا اور سورج کی روشنی ہمارے کمروں میں داخل ہو سکے۔ ہوا اور روشنی پر بھی تو پہرے لگ گئے ہیں ڈیئر۔'

میری بات سن کر شیشنکر ناتھ ہنس پڑا اور بولا۔

''لیکن اس طرح سوچنے پر تو کوئی پہرہ نہیں ہے، جیسے میں سوچتا رہتا ہوں۔ شاردا، ہماری سوچ تو آزاد ہے۔''

''تم بالکل اپنے فادر پنڈت جیالال کول ہی کی طرح سوچتے ہو۔''

''تم بھی تو اُنہیں اپنا رول ماڈل سمجھتی تھیں۔''

''اب بھی سمجھتی ہوں، لیکن ایسے انسان اب کتنے رہ گئے ہیں۔ ہماری بستی میں تو بھٹ انکل کے چلے جانے کے بعد ایک بھی نہیں رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ایک دن ہمیں بھی اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔''

''لگتا تو مجھے بھی ہے۔ لیکن میں اس کا اظہار ماں سے نہیں کرتا۔ وہ تو ایک دم ٹوٹ جائیں گی۔''

لیکن شیشنکر ناتھ کی ماں بڑی دھرم کرم والی مہیلا تھیں۔ اُن میں بڑی غضب کی انٹیوشن تھی۔ کئی کئی بار تو اُن کی کہی ہوئی بات سو فی صدی صحیح ہوتی تھی۔ مجھے اس کا بہت تجربہ تھا۔ مجھے اُنہوں نے دبے لفظوں میں کئی بار کہا تھا کہ اب ہمیں اپنا گھر چھوڑنا ہی پڑے گا۔

چند ہی مہینوں کے بعد کشمیری پنڈتوں نے اپنے گھروں کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ گھروں میں تالے لگا کر وہ اپنی وادی کو خیر باد کہنے لگے۔ جس کو وادی کے باہر جہاں جہاں ٹھکانہ ملتا چلا جاتا۔ اننت ناگ کا کالج اور اسکول تو برائے نام ہی کھلتے تھے۔ حاضری واضری تو ہوتی نہیں تھی، ایک دن پہلے ہی تو پھر بم دھماکہ ہوا تھا اور موقع پر ہی دو موتیں ہو گئی تھیں۔ دُکانیں بند ہو گئی تھیں اور کالج اور اسکول غیر معین عرصے کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے ہمارا گھر سے باہر نکلنا تو ایک طرح سے بند ہو گیا تھا۔

ایک صبح چائے پیتے ہوئے ماں جی نے بڑے درد بھرے لہجہ میں کہا۔

''پشکر، مجھے پچھلے تین چار روز سے بڑے ڈراؤنے سے خواب آ رہے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی مجھے بار بار کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنا گھر چھوڑ کر فوراً یہاں سے نکل جائیں۔ کچھ دنوں میں یہاں نرک جیسی آگ برسے گی۔ پھر یہاں سے بھاگنا بھی مشکل ہو جائے گا۔''

''مگر یہاں سے نکل کر ہم جائیں گے کہاں؟ سری نگر سے باہر تو مجھے کوئی جانتا بھی نہیں۔ جموں میں، دو ایک کالج لیکچرار میرے واقف کار ہیں۔ بس۔''

''تو اُن سے بات کرو، دو تین کمروں کا کوئی مکان کرائے پر مل جائے۔ ہمیں تو سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ چاہئے اس وقت۔''

''میں آج ہی اُن سے بات کرتا ہوں۔''

پشکر ناتھ نے اُسی دن اپنے لیکچرار دوستوں سے بات کی۔ وہ تو جموں میں بھی صرف دو ہی بار گیا تھا۔ اُس شہر سے اُسے زیادہ واقفیت نہیں پچھلے کچھ عرصے سے تو بہت سے کشمیری پنڈت خاندان اپنے گھر چھوڑ کر جموں ہی چلے گئے تھے اور وہیں چھوٹے چھوٹے مکان کرائے پر لے کر زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کے بارے میں اِدھر اُدھر سے جو خبریں آ رہی تھیں وہ بہت اچھی نہیں تھیں۔ بزرگ لوگ تو جموں کی گرمی سے نالاں تھے، جواں لڑکے لڑکیاں بے کار گھومتے رہتے تھے، اور روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ لگتا تھا کہ ہماری قسمت میں اب جموں کی گلیوں کے پتھروں کی ٹھوکریں لکھی جا رہی تھیں۔ کس دن ان ٹھوکروں کا آغاز ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

لیکن ابھی تو زندگی کی ایک اور بہت بڑی مصیبت کا سامنا باقی تھا۔ اس کے بارے میں تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

کئی راتوں کے مسلسل ڈراؤنے خوابوں نے پشکر ناتھ کی ماں جی کی ذہنی اور جسمانی حالت بہت خراب کر ڈالی تھی، وہ تنہا بیٹھی اپنے آپ سے اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی تھیں، اور کچھ پوچھنے پر بے ربط جواب دیتی تھیں اور بنا مطلب کے ہنستی رہتی تھیں۔ اب انہوں نے پوجا میں بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کہتی تھیں یہ پوجا پاٹھ فضول کا ڈھکوسلہ ہے، بھگوان جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ لوگ ساری زندگی اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہتے تھے اور یہی دھوکا ایک دن اُن کی جان لے لیتا تھا۔ بھگوان تو بہت بڑا مسخرا تھا اور اپنی تفریح کے لئے ڈرامے کرتا رہتا تھا۔ ہم لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے تھے اور اسے خوش کرنے کے لئے دن رات اُس کے سامنے ناچتے رہتے تھے۔ اور پھر ایک دن جب اُس کا جی بھر جاتا تو یہ سارا ناچ ایک کھش میں

سمایت ہو جاتا ہے۔ ناچنے والے تھک کر سو جاتے تھے اور وہ سب سے بڑا مسخرا اسٹیج پر پردا گرا کر تھیٹر بند کر دیتا تھا۔ اس طرح کا اُلٹا گیاں پہلی بار ماں جی اس رور دار طریقے سے دے رہی تھیں کہ ہمیں بھی ڈر لگنے لگا تھا۔

ایک صبح ماں جی کو مسلسل ہچکیاں آنے لگیں۔ ایک مٹ کو بھی تھم نہ رہی تھیں۔ میں اُن کے بستر کے ساتھ بیٹھی اُن کو سمھال رہی تھی اور پشکر ناتھ ڈاکٹر کو بلانے گیا تھا۔ جب تک ڈاکٹر پہنچا ماں جی کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے انجکشن دیا اور کھانے کو دوا دی۔ دوپہر کو دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ لیکن دوپہر سے پہلے ہی ماں جی کو آخری زوردار ہچکی آئی، ہچکی اتنی زوری تھی کہ ماں کی ایک دم تڑپ اُٹھیں اور اُس کے بعد سر تکئے پر پھیک کر ہمیشہ کے لیے شانت ہو گئیں۔ محلے کے پانچ سات لوگ آئے اور ماں جی کے مرت شریر کو سبھالنے میں ہمیں مدد کرنے لگے۔ ان میں دو تین تو وہی بزرگ عورتیں تھیں جو اکثر ماں جی کے پاس آیا کرتی تھیں۔ اب وقت ایسا آ گیا تھا کہ ماں جی کی ارتھی اُٹھانے کو بھی آدمی نہیں مل رہے تھے۔ جب پنڈت جیالال کا دیہانت ہوا تھا تو سارا قصبہ اُمڈ پڑا تھا اور اب مشکل سے آٹھ آدمی ماں جی کی ارتھی کے ساتھ تھے۔ معاملہ بھاگم بھاگ کا تھا۔ ساری رسمیں منٹوں میں ختم ہو گئیں۔ کس وقت کیا کیا جائے کوئی نہیں جانتا تھا، جانے کب کرفیو نافذ ہو جائے۔ پشکر ناتھ نے ماں جی کی چتا کو آگ دی ہی تھی کہ جو آدمی ساتھ آئے تھے بھاگ کھڑے ہوئے کیوں کہ کہیں قریب ہی میں سائرن کی آواز گونجی تھی۔

صرف ہمارا ایک پڑوسی اور پشکر ناتھ ہی رہ گئے۔ یا دو بزرگ عورتیں کھڑی رہیں جو ماں جی کی پرانی ساتھیں تھیں۔

اُس رات مجھے اور پشکر ناتھ دونوں کو ڈر لگتا رہتا تھا۔ ہم دونوں رات بھر جاگتے رہے اور روتے رہے۔ سارا کھیل ختم ہو گیا تھا، اب تو میدان سے ریفری بھی جا چکے تھے۔ سنسان میدان اور بکھری ہوئی وکٹیں اس بات کی گواہ تھیں کہ یہاں کبھی بڑا زوردار میچ ہوا تھا، زندگی اور موت کے درمیان اور زندگی مات کھا کر بری طرح پٹ چکی تھی۔

چوتھے کی رسم کے بعد پشکر ناتھ اور میں نے مٹن کے تیرتھ استھان پر جا کر ماں جی کی استھیاں جل میں پرواہ کر دیں اور اپنے اپنے ہاتھ جھاڑ کر واپس لوٹ آئے۔ رشتوں کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی تھی۔

بس ایک ہفتہ کے بعد ہم نے اپنے مکان پر تالا ڈالا اور ضروری ساماں ساتھ لے کر جموں کے لئے روانہ ہو گئے۔

رام داس ڈوگرہ نے جو اُن دِنوں گاندھی میموریل کالج میں انگریزی کا لیکچرار تھا۔ ہمیں فتو کے

چھاؤنی محلے میں اپنے پرانے پشتینی مکان کے اوپر والے دو کمروں میں ٹھہرا دیا۔ ڈوگرہ کی بیوی اور اُس کی ماں نے ہمارا بہت ستکار کیا۔ ان کا پانچ سال کا بیٹا پرتاپ تو پہلے ہی دن میرا دوست بن گیا اور ہر روز شام کو بہت سارا وقت میرے ہی ساتھ گزارتا تھا۔ جموں پہنچنے کے دوسرے ہی دن پشکر ناتھ نے انکل جان محمد بھٹ کو ایک طویل خط لکھا اور اُنہیں اپنی مصیبتوں کی تمام داستاں کہہ دی۔ پشکر ناتھ نے اپنے کام کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی، جس میں رام داس ڈوگرہ نے بہت مدد کی اور آخر تین مہینوں کی کوشش کے بعد پشکر ناتھ کو گورنمنٹ کالج اکھنور میں عارضی ملازمت مل گئی۔ رام داس ڈوگرہ کی کوشش سے مجھے بھی مڈل اسکول بڑی براہمنیاں میں ایک لیو۔ ریزرو ویکنسی میں نوکری مل گئی جو چھ ماہ کے بعد مستقل کر دی گئی۔ خدا کی مہربانی سے ایک اجنبی شہر میں ہمیں بہت دنوں تک خوار نہیں ہونا پڑا ورنہ تو ہم ذہنی طور پر بالکل ہی ٹوٹ جاتے۔ دھیرے دھیرے ہم جان گئے کہ کشمیری پنڈتوں کے جو خانداں وادی کو چھوڑ کر جموں آ گئے تھے کتنے ذلیل اور پریشان ہو رہے تھے۔ اس کے اپنے ہی وطن کے لوگ اُن سے ایسا سلوک کر رہے تھے جس کی اُنہوں نے کبھی توقع نہ کی تھی۔ بزرگ عورتیں اور مرد جنہوں نے وادی کے باہر کبھی قدم نہ رکھا تھا، بے حد مایوس تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچتے تھے کہ اس طرح کی ذلت کی زندگی گزارنے سے بہتر ہوتا اگر وہ اپنے ہی گھروں میں زندگی کے آخری پلوں کا سامنا کرتے۔

دن میں تو ہمارے گھر میں تالا پڑا رہتا تھا۔ پشکر ناتھ تو ملازمت کے سلسلے میں اکھنور چلا جاتا تھا اور میں بڑی براہمنیاں چلی جاتی تھیں۔ ہم دونوں تو شام ہی کو اکٹھا ہوتے تھے۔ اور شام کا یہ وقت ہم ڈوگرہ کے بیٹے پرتاپ کے ساتھ گزارتے تھے۔ جو اپنی توتلی باتوں سے ہمیں خوش کرتا رہتا تھا۔ ایک دن رام داس ڈوگرہ کی بیوی نے باتوں ہی باتوں میں کہا۔

''شاردا بہن، اب تو بہت برس ہو گئے ہیں آپ کی شادی کو، اب تو آپ کو اولاد کا سکھ پراپت ہونا چاہیے۔''

''میں نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔''

''کیوں نہیں سوچا آپ نے کبھی؟''

''جن حالات سے ہم لوگ آج کل گزر رہے ہیں اُن میں تو بے اولاد رہنا ہی ٹھیک ہے۔''

''کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مسز ڈوگرہ۔ اولاد تو ہم اپنے سکھ کے لئے چاہتے ہیں نا، دُکھ کے لئے تو نہیں۔ اگر میرا بچہ ہو جاتا تو میں نہ تو اُس کی پرورش کر سکتی اور نہ ہی اپنے حالات سے لڑ سکتی۔ میرے بچے

کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی اور ہماری بھی۔"

"پُشکر جی نے بھی آپ سے اس وشیہ پر کبھی بات نہیں کی؟"

"نہیں مسز ڈوگرہ۔ ہم دونوں کی سوچ ایک جیسی ہے۔"

"ہمارے ڈوگرہ خاندانوں میں اگر کسی بہو کے دو سال تک بچہ نہیں ہوتا تو اُس پر انگلیاں اُٹھنے لگتی ہیں۔"

"ہوتا تو ہمارے خاندانوں میں بھی ایسا ہی ہے، لیکن ہم نے اُن اُنگلیوں کی کبھی پرواہ نہیں کی، لوگوں کی انگلیاں تو کسی نہ کسی بات پر اُٹھتی ہی رہتی ہیں۔ آپ کس کس کی انگلیاں کاٹتی پھریں گی۔"

"میری ساس ایک دن ڈوگرہ جی سے کہہ رہی تھیں، اس بارے میں۔"

"تو ڈوگرہ جی نے کیا جواب دیا تھا؟"

"اُن کا جواب تو ٹھیک ہی تھا، اُنہوں نے کہا تھا کہ یہ پشکر اور شاردا کا ذاتی معاملہ ہے، کسی دوسرے کو اس میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا خیال ہے آپ کا۔ یہ جواب ٹھیک نہیں تھا؟"

"میرے خیال سے تو ایک دم ٹھیک تھا۔ لیکن ہمارے خاندانوں میں فیصلے پرانے زمانے کی بزرگ عورتیں کرتی ہیں، ہم نہیں۔"

"اور اسی لئے اکثر فیصلے غلط ہوتے ہیں۔"

"شاید۔" مسز ڈوگرہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا، اُسی سمے نیچے کی منزل سے اُس کی ساس نے اُسے پکارا اور وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ "پھر ملوں گی۔ اب چلتی ہوں۔" یہ فیصلہ اُس کا نہیں اُس کی ساس کا تھا۔

آج ایک اور سماجی مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔

یہ سماجی مسئلے تو انسان کو ستاتے ہی رہتے ہیں۔ جب کوئی سماجی مسئلہ درپیش نہیں ہوگا تو کوئی نہ کوئی سیاسی مسئلہ آپ کی نیند حرام کرنے کے لئے تلوار بن کر سامنے کھڑا ہو جائے گا۔ انسان کو زندگی بھر جتنی ننگی تلواروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بھگوان کو کسی ایک بھی ایسی ننگی تلوار کا سامنا کرنا پڑے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔

پشکر ناتھ اور میں ایک دن اننت ناگ میں اپنے چھوڑے ہوئے گھر کی بات کر رہے تھے، جب سے ہم جموں آئے تھے اپنے گھر کے بارے میں تو ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ پشکر ناتھ نے کبھی کسی کو خط لکھ کر اپنے گھر کے بارے میں بھی پوچھا نہیں تھا۔ خود کسی نے ہمیں کبھی اطلاع نہیں دی تھی۔ ہمارے

آنے کے بعد جو خبریں ہمیں اخباروں سے ملتی تھیں اُن کے مطابق تو اسلام آباد دہشت گردوں کا ایک طرح سے مرکز بن گیا تھا۔ تشدد، لوٹ مار اور آتش زنی کی نت نئی خبریں اخباروں میں چھپتی تھیں۔

''کیا اَب کبھی ہم اپنے گھر واپس جاسکیں گے۔'' میں نے پوچھا تھا۔

''گھر کا بھی کہیں وجود باقی ہوگا جب نا۔ دہشت گردوں نے شاید اُس کا نام و نشاں ہی مٹا دیا ہو۔''

''کسی نے بچایا نہیں ہوگا ہمارے گھر کو؟''

''تم بتاؤ۔''

''کس نے بچایا ہوگا آخر۔ تمہیں یاد ہے ڈیڈی کیا کہا کرتے تھے۔''

''ڈیڈی کہا کرتے تھے اگر تم ایک بار اپنے گھر کو چھوڑ دو تو پھر تمہارا گھر تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے، اُس کا کوئی تعلق نہیں رہتا تمہارے ساتھ۔''

''تو ہم اَب ہمیشہ کے لئے بے گھر ہو گئے ہیں کیا؟''

''میرا تو یہی خیال ہے۔''

''تو اَب ہمارا وطن ہم سے سدا کے لئے چھن گیا ہے۔''

''ایسا ہی لگتا ہے ڈیئر۔''

پُشکر ناتھ کی بات سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میری تو تمام یادیں جڑی تھیں اُس گھر کی دیواروں سے۔ سب اُجڑ گئی ہوں گی۔ سب فنا ہوگئی ہوں گی۔ سب جل کر راکھ ہوگئی ہوں گی۔ اب تو کچھ بھی نہیں بچا ہوگا، میری زندگی کا۔

''رونا فضول ہے۔ زندگی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہوگا اَب۔''

''کیسے کر پائیں گے؟''

''ہمت سے، حوصلے سے، عزم سے۔''

''یہ سب کہاں ہیں ہمارے پاس پُشکر۔''

''اسے حاصل کرنا ہوگا، ایک پرندہ ققنس، وہ اپنے پروں کو آگ لگا کر خود ہی اُس میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے، پھر وہ اُسی راکھ سے اپنے آپ کو دوبارہ زندہ کرتا ہے۔ ہم سب ققنس ہیں شاردا۔ اپنی ہی راکھ سے ایک بار پھر جنم لیں گے، عزم کرو اور مسکراؤ۔''

''میں دوبارہ زندہ رہنے کا عزم کرتی ہوں پُشکر۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور پُشکر ناتھ کول نے مجھے اپنی بانہوں میں لے کر میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ بوسہ میرے عزم پر پختہ مہر تھی۔ اَب مجھے اس مہر کی

پاسداری کرتا تھی۔ اس کی حفاظت کرتا تھی۔ اس کی لاج رکھتا تھی۔

اگر چہ وادی سے ہمارے سبھی رشتے ٹوٹ گئے تھے۔

لیکن ایک رشتہ ابھی بھی قائم تھا۔ وادی کی پرانی اور عظیم روایات کا رشتہ، جو اتنی صدیوں سے انسانی قدروں کی حفاظت کرتا آ رہا تھا۔ اسی رشتے کی لو سے جو مشعل روشن کر کے انکل جان محمد بھٹ اپنے ساتھ کراچی لے گئے تھے۔ اُس کی روشنی ابھی تک ہمارے دلوں میں زندہ تھی۔ بھٹ انکل اپنے خطوں سے اس روشنی کو لگاتار توانائی بخش رہے تھے۔ وہ اپنے خطوں میں لگاتار اُس رشتے کی عظمت کو دہراتے رہتے تھے، جس کی اس استحصالی دور میں ہم سب کو ضرورت تھی۔ اُنہوں نے اپنے تازہ خط میں یہ دردھری خبر بھی دی تھی کہ خورشید آنٹی اُن کو اچانک چھوڑ گئی تھیں اور وہ بھی اُس دن، جب وہ ارجمند کے بیٹے آفتاب کی چوتھی سالگرہ کا جشن منانے پر ایک بہت خوبصورت پروگرام کا اہتمام کرنے میں مصروف تھے۔ جشن کا گھر ماتم کدے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جو لوگ جشن منانے کے لئے آئے تھے وہ سب شریکِ جنازہ ہو کر سوگوار بن گئے تھے۔ اُس ایسے کے تاثر سے وہ ابھی تک اُبھر نہیں پائے تھے۔ اور ایک دم تنہا ہو گئے تھے۔ لگتا تھا بھرے پُرے قافلے کے مسافروں نے اُنہیں لق ودق صحرا میں اچانک چھوڑ دیا تھا۔

قافلہ سالار تمام قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے قافلے کو سرِ منزل لے گیا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد پشکر اور میں زار و قطار رونے لگے اور ہماری یہ حالت دیکھ کر ہمارے غم میں رام داس ڈوگرہ، اُس کی بیوی اور ماں بھی شریک ہو گئے۔ اُس نے یہ روپ کبھی دیکھا نہیں تھا۔ رام داس کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ انسانی رشتوں کا یہ روپ بھی ہوتا ہے، اُس کی نظر میں پشکر ناتھ اور میری قدر کئی گنا بڑھ گئی۔ ہم لوگ ہزاروں میل کی دوری پر رہنے والے دوسرے مذہب کے ایک آدمی کے دُکھ میں کس بری طرح تڑپ رہے تھے۔ اُس آدمی کے دُکھ میں جس کے ساتھ ہمارا کوئی ذاتی رشتہ نہیں تھا اور جو کئی سال پہلے کبھی پشکر کے والد کے دوست کی حیثیت سے ملا تھا۔ اور اُس سے اُن کے خاندان کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اُس رات پشکر ناتھ اور میں دیر تک بھٹ انکل سے ٹیلی فون پر اپنے اتھاہ غم کا اظہار کرتے رہے اور معافی مانگتے رہے، ہمارے پاس پاسپورٹ نہیں تھا، اس لئے ہم کراچی نہیں آ سکے تھے۔ جان محمد بھٹ اور اُس کے بیٹے ارجمند کو ٹیلی فون پر ہوئی اس بات سے بڑی تسلی ہوئی۔ البتہ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اُس سے اگلے ہی روز پشکر ناتھ اور میں نے پاسپورٹ کے لئے اپلائی کر دیا اور بھٹ انکل کو ایک بہت ہی طویل اور دُکھ بھرا خط لکھا اور اپنے گہرے صدمے کا اظہار کیا۔

وقت گزرتا گیا۔

ماہ وسال گزرتے گئے۔

دونوں ملکوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی گئیں، دو جنگیں بھی ہوئیں۔ دہشت گردوں کی کارروائیاں تیز سے تیز تر ہو گئیں اور اب وادی میں ہندو آبادی صرف نام کو ہی رہ گئی تھی۔ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر ملک کے مختلف حصوں میں ہجرت کر گئے تھے۔ ہجرت کا یہ موسم ایک دم خزاں کا موسم تھا۔ ہم نے کشمیر کی وادی میں جتنی بہاریں دیکھی تھیں اور جتنے پھولوں کا نظارہ کیا تھا وہ تو سب ماضی کے اوراق میں بدل گئے تھے۔ پشکر ناتھ کہا کرتا تھا کہ اننت ناگ کی سڑکوں پر گھنے چناروں کے پتے اب سرخ انگاروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ انگارے دن رات ہمارے دلوں میں سلگ سلگ کر گہرے اور جلتے ہوئے زخم پیدا کر رہے تھے۔ خزاں کے دن تھے لیکن دل کے زخموں پر بہار تھی، یہ وہ اذیت تھی جس کا ہم ہجرت زدہ لوگوں کو دن رات سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کچھ مدت کے بعد ایک بڑی ہی حوصلہ پرور خبر آئی۔

پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف اپنی بیگم کے ساتھ ہندوستان آرہے تھے اور اُن کی ایک بہت ہی اہم ملاقات ہندوستان کے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری واجپئی صاحب سے ہو رہی تھی۔ آگرہ شہر کا انتخاب اس ملاقات کے لئے بہت مناسب تھا۔ محبت کرنے والوں کا یہ شہر ہی صحیح جگہ تھی جہاں دونوں ملکوں کی محبت کی کہانی کا نیا حصہ لکھا جانے والا تھا۔ تمام دنیا کی نگاہیں دونوں ملکوں کے عظیم سربراہوں کی اس ملاقات پر لگی تھیں۔ ساری دنیا کے صحافی اور میڈیا ایکسپرس آگرہ پہنچ چکے تھے اور منٹ منٹ کی خبریں دونوں ملکوں کے عوام تک بھیجی جارہی تھیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے ہر شہری کے دل و دماغ پر تین چار دن تک اُمید و بیم کا عالم چھایا رہا۔ سب کو یہ خیال تھا کہ اس اونچی سطح کی ملاقات کا ضرور کوئی مثبت نتیجہ نکلے گا۔ میں اور پشکر ناتھ، رام داس ڈوگرہ اور اُس کی بیوی شام ہی سے ٹیلی ویژن سے جڑ کر بیٹھے تھے اور منٹ منٹ کی خبریں سن رہے تھے۔ اور ٹیلی ویژن پر تمام تصویریں دیکھ رہے تھے۔ ہماری طرح دونوں ملکوں کے شہریوں کی یہی حالت تھی۔ جنرل مشرف اور اُن کی بیگم شام کو اجمیر میں خواجہ غریب نواز کی درگاہ پر حاضری بھی دینے والے تھے۔ لیکن آخری خبر یہ تھی کہ دونوں سربراہوں کی اونچی سطح کی یہ ملاقات ناکام رہی تھی، اُس دن آدھی رات کو جنرل پرویز مشرف اور اُن کی بیگم پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ اور جنرل مشرف خواجہ غریب نواز کی درگاہ پر سجدہ نہیں گزار سکے تھے۔

اس ملاقات کے ناکام ہونے کا رنج دونوں ملکوں کے عوام کے دلوں پر کئی دنوں تک چھایا رہا۔ میری اور پشکر ناتھ کی تو ہمت ہی ٹوٹ گئی تھی۔ لگتا تھا کہ خزاں کا یہ موسم اب کبھی ختم ہوگا ہی نہیں۔ دہشت گردوں کی کارروائیاں بڑھ جائیں گی اور کشمیر کی وادی سے ہجرت زدہ معصوم اور بے قصور لوگوں کی

مصیبتیں اور بڑھ جائیں گی۔ اور پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ اب کی جو ماحول پیدا ہوا اُس سے تو یہ لگنے لگا تھا کہ ما تھی نفرتیں اور کڑواہٹیں اور تلخیاں پہلے کی نسبت زیادہ شدید اور طویل ہو جائیں گی۔

انکل جاں محمد بھٹ کے اُن دنوں جو خطوط آئے تھے اُن سے تو یہ محسوس ہوتا تھا جیسے دونوں ملکوں کے درمیاں پیدا ہوئی خلیجیں اور گہری ہو جائیں گی اور اب ہم جیتے جی ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکیں گے۔ اپنے ایک خط میں تو انکل بھٹ نے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اَب وہ ہمیں خط لکھنے بند کر دیں گے۔ ایک دوسرے کو دئے جانے والے یہ چھلاوے ٹوٹ جانے چاہئیں۔ انہوں نے تو پُشکر ناتھ کو بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ اَب وہ اس کے خط کا جواب نہ دے۔ وہ اس فضول اور بے کار عمل کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ جھوٹے بھروسوں اور خام ارادوں کے فریبوں کو مزید جاری رکھنا عبث تھا۔ پُشکر ناتھ اور میں انکل بھٹ کے اس خط کو بار بار پڑھتے رہے اور روتے رہے۔

''تو کیا ہم انکل بھٹ کی بات مان لیں اور اس خط کا جواب نہ دیں؟'' پُشکر نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟''

''تاکہ تمہاری گواہی بھی شامل ہو جائے۔''

مقدمہ ہارنے کے لئے۔''

''ہاں۔''

''اس لئے کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہو جائے۔''

''ہاں شاردا۔'' وہ چیخا۔

''میں یہ گواہی نہیں دوں گی۔''

''تو کیا کروں۔''

''انکل بھٹ کی تجویز رد کر دو۔ اُنہیں اُن کے خط کا منہ توڑ جواب دو۔''

''منہ توڑ جواب؟''

''تاکہ اُنہیں احساس ہو کہ بڑھاپے میں اُن کا دماغ سٹھیا گیا ہے۔''

''اوہ! کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''اگر تم انکل بھٹ اور اُس کے بچوں کو ملنا نہیں چاہتے تو اپنا اور میرا پاسپورٹ جلا دو۔ اُنہیں لکھ دو کہ یہ رات جو ہم پر چھائی ہے ابھی اور گہری اور سیاہ ہوگی لیکن اُس کے بعد اُتنا ہی زیادہ روپہلا سورج طلوع ہوگا۔''

"یو آر گریٹ شاروا" یہ کہہ کر پشکر ناتھ نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور انہیں مضبوطی سے جکڑ لیا۔

اگلے روز پشکر ناتھ نے انکل بھٹ کو ایک بہت ہی جذباتی اور طویل خط لکھا اور انہیں یقین دلایا کہ یہ رات ہماری نہیں ہے لیکن طلوع ہونے والی صبح ہماری ہوگی۔ اور یہ صبح ارجمند اور اُس جیسے کروڑوں معصوم اور سادہ بچوں کے لئے ایک نئے مستقبل کی نوید لے کر آئے گی۔ اُس روشن مستقبل کا انتظار کرنا ہمارا مقدس فرض ہے۔

پھر کچھ اور عرصہ گزر گیا۔

ایک اور حوصلہ افزا خبر آئی۔

ہندوستان کے وزیراعظم لاہور جا رہے تھے۔ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف سے ملنے۔ اور دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے کئی تجویزیں لے کر۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ دونو ں پڑوسی ملکوں کو ایک دوسرے کا دوست بنانے اور آپسی رشتوں کو زیادہ خوشگوار بنانے کی یہ اُن کی آخری کوشش ہوگی کیوں کہ اُس کے بعد ہندوستان میں نئے انتخابات کا وقت آ جائے گا اور انہیں اس اہم مقصد کے حصول کے لئے دوسرا مناسب موقع نہیں ملے گا۔

دونوں ملکوں کے سربراہوں کی یہ اعلیٰ سطح کی ملاقات بہت کامیاب رہی۔ آپسی رشتوں کو سدھارنے اور سوارنے کے لئے کئی اہم فیصلے لئے گئے۔ ریل کی سہولیتں بحال ہو گئیں۔ ویزا میں کئی رعایتیں دی گئیں۔ ہوائی راستے کھول دیے کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ سیماؤں پر آمنے سامنے کھڑی فوجوں کی بھی واپسی کے بھی امکان پیدا ہو گئے۔ کشمیر کے کئی برس پرانے مسئلے پر بھی سنجیدگی سے سوچنے کا اعلان ہوا۔ اٹل بہاری واجپئی کی ہندوستان واپسی پر اُنہیں سماجی اور سیاسی طور پر ایک کامیاب اسٹیٹس مین مان کر اُن کی تعریف کی گئی۔ آپسی رشتوں کو مضبوط کرنے کی دونوں ملکوں کے سربراہوں کی ان کوششوں کو بین الاقوامی سطح پر بھی استقبال کیا گیا اور اِن کوششوں کو ایک خوشگوار مستقبل کا ضامن قرار دیا گیا۔

بہت دنوں کے بعد جموں کے لوگوں میں بھی اُمید کی کرن جاگی اور اُنہوں نے بھی ان کوششوں کا سواگت کیا۔ یہاں سے گئے ہوئے مہاجر کشمیری پنڈتوں نے بھی اِن اقدام کو ایک اچھا شگون مانا اور اُمید کی کہ شاید وہ بھی کبھی اپنے گھروں میں واپس جاسکیں، حالاں کہ یہ بات واضح نہیں تھی کہ وہ کب اور کیسے واپس جاسکیں گے۔ مگر پشکر ناتھ اور میں پھر بھی خوش تھے کہ خزاں کے موسم کی شدت تو کچھ کم ہوگی ہی۔

اُنہی دنوں انکل جان محمد بھٹ کا خط آیا۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے سربراہوں کی ملاقات کو بڑا

ہی ایک قدم مانا تھا اور اُمید کی تھی کہ شاید ہم لوگ کبھی کراچی جا سکیں اور انکل کو اور اُس کے گھر کے افراد کو مل کر پرانے رشتوں کی تجدید کر سکیں۔ انکل بھٹ نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ خود بھی ہندوستان آنے کے آرزومند تھے اور ایک بار اننت ناگ بھی جانا چاہتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے نا اُمید ہو کر یہ خبر بھی دی کہ وہ پچھلے ۱۰ برس سے شدید آرتھرائیٹس کے شکار تھے اور اُن کی دائیں ٹانگ تو ایک دم بے کار ہو گئی تھی۔ اب وہ گھر سے باہر بھی کبھی ہی جاتے تھے۔ اور تمام برس کی دیکھ بھال اب ارجمند ہی کرتا تھا۔ اس خبر سے تو پُشکر اور میں دونوں پریشان ہوئے۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ اب انکل بھٹ تو ہمیں شاید ہی ملنے آ سکیں۔ پُشکر نے اس خط کا جواب دیا اور انکل بھٹ کو مشورہ دیا کہ اب میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی تھی اور اگر انکل ہڈیوں کے کسی اچھے ایکسپرٹ سے رجوع کریں تو شاید بیماری کا علاج ہو سکے۔ جموں میں اس کا کوئی ایکسپرٹ نہیں تھا ورنہ پُشکر انکل بھٹ سے کہتا کہ وہ اپنی تمام کیس ہسٹری اور تازہ ایکس رے رپورٹ اُسے بھیج دیں۔ لیکن پُشکر نے خط میں یہ نہیں لکھا کیوں کہ عملی طور پر ایسا کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔

پر ہم خوش تھے۔ ملاقات کی جو یہ ایک ہلکی سی صورت نکلی تھی، شاید کبھی اس میں کامیابی کا امکان نکل آئے۔

پھر اور سمے گزر گیا۔

دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری کی اُمیدیں بندھنے لگیں۔

عوام پر اس کا اثر حوصلہ افزا تھا۔

چھٹ پٹ دہشت گردی کی وارداتوں کے باوجود دونوں ملکوں میں اعلیٰ سطح پر یہ کوششیں جاری تھیں کہ سیاسی مسئلوں کا حل باہمی بات چیت سے ہی نکالا جائے اور اس کے لئے مختلف سطحوں پر گفتگو جاری رہے۔ مختلف سطحوں پر ایک طے شدہ پلان کے مطابق بات چیت متواتر جاری تھی۔

اور پھر ایک بڑی ہی راحت بخش خبر کا چرچا ہونے لگا۔

یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کی کرکٹ ٹیم پاکستان کی کرکٹ ٹیم سے پاکستان میں کئی دوستانہ میچ کھیلے۔ دونوں ملکوں کے سیاسی اور سرکاری حلقوں میں اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے مختلف پہلوؤں پر سوچ وچار ہونے لگا اور آخر ایک دن اخباروں میں یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ دونوں ملکوں کے کنٹرول بورڈوں نے آپس میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کی کرکٹ ٹیم مارچ ۲۰۰۴ء میں پاکستان جائے گی اور وہاں ایک ساتھ کئی میچ کھیلے گی۔ میچ دیکھنے جانے والے ہندوستانیوں کو ویزا کی سہولتیں دی جائیں گی اور انہیں دوستی کے سفیر مان کر اُن کی اعلیٰ پایہ کی مہمان نوازی

کی جائے گی۔

پھر ایک دن صبح سویرے پشکر ناتھ اخبار لے کر میرے پاس کچن میں آگیا۔ میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔

''ارے یہ بیکار کا کام چھوڑو اور ایک شاندار خبر سنو۔''

''سناؤ ایسی کیا خبر ہے جس نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔''

''تو سنو'' اور اُس نے اونچی آواز میں خبر پڑھنا شروع کر دی۔

ہندوستان اور پاکستان کی کرکٹ ٹیمیں آپس میں ایک ایک دن کے پانچ انٹرنیشنل میچ اور پانچ پانچ دن کے تین ٹیسٹ میچ پاکستان کے مختلف شہروں میں کھیلنے جا رہی ہیں۔ تفصیل اس طرح ہے

ایک ایک دن کے میچ	پانچ پانچ دن کے تین ٹیسٹ میچ
۱۳/مارچ — کراچی میں	۲۸/مارچ سے ۱/اپریل تک — ملتان میں
۱۶/مارچ — راولپنڈی میں	۵/مارچ سے ۹/اپریل تک — ملتان میں
۱۹/مارچ — پشاور میں	۱۳/مارچ سے ۱۷/اپریل تک — ملتان میں
۲۱/مارچ — لاہور میں	
۲۷/مارچ — لاہور میں	

تھوڑی دیر میں پیچھے سے رام داس ڈوگرہ بھی ایک دوسرا اخبار لے کر آیا اور اُسی خبر کی تصدیق کرنے لگا۔ وہ بڑا ایکسائیٹڈ تھا۔ بولا

''آج ہمیں کام پر نہیں جانا چاہیے اور چھٹی لے لینی چاہیے۔''

''ایگریڈ، ڈوگرہ۔'' پشکر نے یہ کہہ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔

''آج آپ بھی اسکول نہیں جائیں گی۔'' ڈوگرہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ٹھیک ہے، ٹیلی گرام بھیج دیں۔''

اُس دن ہم کام پر نہیں گئے اور شام تک مستی مارتے رہے۔

رات کو پشکر ناتھ نے انکل جان محمد بھٹ کو ٹیلی فون کیا۔

''انکل جی، میری طرف سے، شاردا کی طرف سے اور ہمارے مالک مکان رام داس ڈوگرہ کی طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ کرکٹ کے میچوں کے فیصلے نے ہر طرف خوشی کی لہر دوڑا دی ہے۔''

''پاکستاں میں بھی یہی ماحول ہے۔ میں خود تمہیں ٹیلی فون کرنے ہی والا تھا۔ اب تم اور شاردا ۱۴ ر مارچ کو کراچی پہنچ جاؤ۔ میچ ۱۳ ر مارچ کو ہے۔ میں تمہیں آنے جانے کے دو ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھیج رہا ہوں۔ پروگرام کی اطلاع دو۔ ارحمد اور اُس کی بیوی اور اُس کا بیٹا آفتاب تمہیں ۱۲ ر مارچ کو ایئرپورٹ پر ریسو کریں گے۔ میں ٹانگ میں تکلیف کی وجہ سے ایئرپورٹ نہیں آسکوں گا۔''

''یو آر ریئلی گریٹ انکل۔'' پُشکر ناتھ نے اونچی آواز میں کہا اور پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں بھی انکل سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن ٹیلی فون کٹ گیا تھا۔

''کاش میں نے بھی اپنا پاسپورٹ بنوالیا ہوتا۔'' راستے میں ڈوگرہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''پھر تو تم ہمارے ساتھ چلتے۔ مزہ آجاتا۔''

جتنے ہم لوگ خوش تھے ڈوگرہ اُتنا ہی اُداس تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ زندگی کا ایک بہت ہی سنہرا موقع اُس نے کھو دیا تھا۔

۱۲ ر مارچ کی دوپہر کو میں اور پُشکر ناتھ انٹرنیشنل ایئرپورٹ دہلی سے پاکستان (پی آئی اے) ایئرلائنس کے ہوائی جہاز میں سوار ہوئے۔ ہم دونوں کا دہلی کا یہ پہلا سفر تھا اور ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا پہلا موقع تھا۔ ہمیں تو ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سیٹ بیلٹ فکس کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس میں بھی ہمارے ساتھ بیٹھے تیسرے مسافر نے ہماری مدد کی۔ وہ دہلی سے میچ دیکھنے کے لئے کراچی جارہا تھا۔ اُس کا نام سریندر موہن تھا اور کناٹ پیلیس میں اُس کی ریڈی میڈ گارمنٹ کی دکاں تھی۔ وہ دیکھنے میں بڑا اسمارٹ لگتا تھا، اور اس سے پہلے بھی دو ایک بار پاکستاں جاچکا تھا۔ ہم دونوں تو اُس کے مقابلے میں ایک دم دیہاتی لگتے تھے۔ ہمیں تو ہوائی جہاز میں سفر کرنے کے بارے میں بنیادی باتوں کا بھی علم نہ تھا۔ ہم تو دوسرے مسافروں کو اور خاص طور پر سریندر موہن کو دیکھ کر اُن کی نقل اُتارے جارہے تھے اور سریندر موہن ہماری اس نااہلیت سے بڑا محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ وہ بنا مطلب کے گفتگو کرتا رہے۔ وہ بار بار میری طرف بڑی عجیب نظر سے دیکھتا تھا اور اپنی آنکھوں سے کوئی پیغام مجھ تک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے آخر اُس کی طرف دیکھنا بند کردیا اور اُس کی نازیبا حرکتوں کے بارے میں پُشکر ناتھ کے کان میں آہستہ سے کہا۔ اُسے غصہ تو بہت آیا لیکن وہ پی گیا۔ جب تک ہوائی جہاز قائدِ اعظم ایئرپورٹ پر نہیں اُتر گیا اُس نے اپنی بے ہودہ حرکتوں کو جاری رکھا۔ ہوائی جہاز سے اُترتے وقت اُس نے پُشکر ناتھ سے کہا کہ ہم کراچی میں کہاں ٹھہریں گے۔

''ہم اپنے انکل کے پاس ٹھہریں گے۔''

"اگر آپ چاہیں تو جہاں میرا قیام ہوگا آپ بھی وہاں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"نہیں ہمارا انتظام ہے۔" میں نے کھیج کر کہا۔

"آپ اتنی ناراضگی سے کیوں بول رہی ہیں؟"

"آپ کی بے ہودہ حرکتوں کی وجہ سے۔"

وہ زور سے ہنسا اور بولا

"لیکن آپ ہیں بہت خوبصورت۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی وہ مسافروں کے ریلے میں آگے نکل گیا۔

کراچی کا ایئرپورٹ تو بے حد خوبصورت تھا۔ مجھے تو یہ دلّی کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے زیادہ خوبصورت اور صاف ستھرا لگا۔ ہم ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو میں نے بھیڑ میں کھڑے اونچے قد اور خوبصورت خدوخال والے ارجمند کو پہچان لیا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور اُس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ پھر اُس کی بیوی شمع مجھ سے لپٹ گئی اور پھر کرکٹ کی یونیفارم میں سجا اُس کا بیٹا آفتاب میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ پُشکر ناتھ اور ارجمند دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے دیر تک مسکراتے رہے۔

"انکل کیسے ہیں ارجمند بھائی؟" میں نے پوچھا۔

"اُن کی صحت آج کل کوئی بہت اچھی نہیں۔ شوگر کی بیماری نے اُنہیں اور بھی نالاں کر رکھا ہے۔"

"خدا اُن کی نگہبانی کرے۔" پُشکر ناتھ بولا۔

ارجمند نے ہمارا سامان گاڑی کی ڈکی میں رکھا۔ ساتھ کی سیٹ پر آفتاب کو بٹھایا۔ پچھلی سیٹ پر میں، پُشکر ناتھ اور شمع بیٹھ گئے۔ شمع راستے بھر ہم سے باتیں کرتی رہی۔ بیچ بیچ میں ارجمند پیچھے مڑ کر بات چیت میں حصہ لے لیتا۔ کراچی بڑا صاف ستھرا شہر لگ رہا تھا۔ سڑکیں بڑی کشادہ اور صاف تھیں، البتہ ٹریفک بہت تھا۔ گھر پہنچے تو اتنے بڑے مکان میں آرام کرسی پر برآمدے میں بیٹھے انکل جان محمد بھٹ ہمارا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ انہیں کرسی سے اُٹھ کر مجھے اپنی بانہوں میں لینے میں کافی پریشانی ہوئی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ خاصے کمزور بھی لگ رہے تھے۔ ارجمند نے اُنہیں سہارا دے کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا اور پھر پُشکر ناتھ نے بڑے ادب سے جھک کر اُن کے پاؤں چھوئے اور آنسوؤں بھری آنکھوں سے کپکپاتے لہجے میں کہا، "انکل جی آج مجھے آپ کے قدموں کے نیچے جنت مل گئی ہے۔ میں بے حد خوش قسمت ہوں۔ رشتوں کی جو مشعل آپ اتنے برس پہلے جلا کر اپنے ساتھ لائے تھے آج وہ پورے آفتاب کی طرح جگمگا رہی ہے۔ کاش دونوں ملک اُس کی روشنی میں شر اور

ہو کر لافانی ہو جائیں۔''

پُشکر ناتھ نے اپنی گیلی آنکھیں پونچھیں اور ایک بار مسکرا دیا۔

''شمع بیٹی، اپنی آپا اور بھائی کو اندر لے جاؤ۔ انہیں آرام کرنے دو، بہت تھک گئے ہوں گے۔''

آفتاب کرکٹ کی یونیفارم میں سجا سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جیسے طلوع ہوتا ہوا سورج اپنی روپہلی کرنیں سارے جہاں میں بکھیر رہا ہو۔

وہ دن اور شام اور رات ہماری زندگی میں پہلی بار آئے تھے۔ اور ہمیں احساس دلا رہے تھے کہ زندگی حسین ہے اور جینے کے قابل ہے اور انسانی رشتے بڑے مقدس اور عظیم ہیں۔ اُس رات سونے سے پہلے میں نے شاید پہلی بار پرارتھنا کی تھی اور انکل بھٹ اور اُن کے سارے خاندان کی سلامتی کی دُعا مانگی تھی۔

شام کو ار حمند، شمع اور آفتاب کے ساتھ ہمیں سمندر کے کنارے لے گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار سمندر کا نظارہ کیا تھا اور ایک دم سحر زدہ ہو گئی تھی۔ میں نے تو سری نگر میں جھیل ڈل دیکھی تھی اور یا پھر دو ایک بار اپنے طالب علمی کے زمانے میں اپنی اسکول کی سہیلیوں کے ساتھ وُلر جھیل کو دیکھا تھا۔ اس وقت لامحدود سمندر کو دیکھ کر تو میرے تمام اندازے غلط ہو گئے تھے۔ سمندر کی لہریں بار بار اُٹھ کر کناروں سے ٹکرا رہی تھیں اور ہلکا ہلکا شور پیدا کر رہی تھیں۔ دن میں چلتی ہوئی گرم ہوا اب خنک جھونکوں میں بدل گئی تھی۔ اور سارا ماحول ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ کراچی کا موسم ہی ایک دم بدل گیا تھا۔ کراچی میں موسم اس طرح بدلتے تھے مجھے اس کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ سچ کہوں تو سمندر کے کنارے سے ہٹ کر اس وقت گھر جانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سمندری ہواؤں کا یہ موسم کتنا پیارا، کتنا خوبصورت اور کتنا مدہوش کن تھا۔ میں اپنے جذبات روک نہ سکی اور بول اُٹھی۔

''شمع تم لوگ کتنے خوش قسمت ہو جو سمندری ہواؤں کے اس موسم میں زندگی گزار رہے ہو۔''

''یہ سب ابا جان کی مہربانی ہے، اُنہوں نے ہماری زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کتنی قربانیاں دی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔''

''دوسروں کے لئے قربانیاں دینا تو اُن کے کیریکٹر کا حصہ ہے۔ اس کا اندازہ مجھے بہت پہلے ہو چکا ہے۔''

''اور مجھے بھی شمع۔'' قریب کھڑے پُشکر ناتھ نے میری بات سن لی تھی اور فوراً اُس نے اپنے ردِّعمل کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ آفتاب تو مجھ سے الگ ہو ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنی نرم

و نازک انگلیوں سے میرا ہاتھ تھام لیتا اور مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھنے لگتا۔

''آفتاب تو تم پر عاشق ہو گیا ہے شاردا۔'' پشکر ناتھ نے مسکرا کر کہا۔

''میں بہت خوش ہوں کہ مجھے اس عمر میں بھی کوئی چاہنے والا ملا ہے۔ کیوں آفتاب ڈیئر!''

''یس شاردا آنٹی۔''

اس کا جواب سن کر بھی زور سے ہنس پڑے اور اُسی لمحہ ایک بہت بڑی لہر سمندر کے درمیان سے اُٹھتی ہوئی اُس جگہ سے آٹکرائی جہاں ہم سب کھڑے تھے۔ ہم سب لہر کے پانی سے بھیگ گئے۔ جب ہم سمندر کے کنارے سے لوٹے تو سمندری ہواؤں کا موسم اپنے پورے شباب پر تھا۔

اگلے دن نیشنل اسٹیڈیم میں ہندوستان اور پاکستان کی کرکٹ ٹیموں کے درمیاں پہلا ون ڈے میچ ہونے والا تھا۔ انکل بھٹ نے صرف اپنے آپ کو چھوڑ کر ہم سب کے لئے عمراں خان اینکلو ئیر کے مہنگے ٹکٹ خرید رکھے تھے۔ اُنہیں اس بات کا افسوس تھا کہ وہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے اس شاندار موقع سے محروم رہ جائیں گے۔ انہوں نے بڑی محبت سے ہمیں نیشنل اسٹیڈیم جانے کے لئے رخصت کیا اور ارجمند کو ہدایت کی کہ وہ میری اور پشکر ناتھ کی دیکھ بھال میں کوئی کمی نہ رکھے۔ جب ہم لوگ نیشنل اسٹیڈیم میں پہنچے تو وہاں لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ جو لوگ کل تک ٹکٹ نہیں خرید سکے تھے وہ اُن لوگوں سے مہنگے داموں میں ٹکٹ خرید رہے تھے جنہوں نے ایک سے زیادہ ٹکٹ خرید رکھے تھے۔ میچ دیکھنے والوں میں جواں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنے گالوں پر پاکستان کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے پینٹ کروا رکھے تھے۔ میں نے کچھ ایسے پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں بھی دیکھیں جن کے ایک گال پر پاکستاں کا جھنڈا پینٹ ہوا تھا اور دوسرے گال پر ہندوستاں کا جھنڈا۔ یہ نظارہ تو لوگوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ہمیں کچھ ایسے بھی ہندوستانی نظر آئے جنہوں نے اپنے ایک ہاتھ میں ہندوستاں کا جھنڈا پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پاکستان کا جھنڈا۔ اُس وقت چار پاکستانی نوجوان ہمارے قریب سے گزرے جنہوں نے ہندوستان کے بہت بڑے ترنگے کو چاروں کونوں سے پکڑ رکھا تھا اور اُسی طرح اسٹیڈیم کے اندر جا رہے تھے۔ اُسی وقت دو پاکستانی لڑکیاں ہمارے پاس آئیں اور بولیں

''آپ ہندوستان سے آئی ہیں؟''

''جی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم پاکستان کی سر زمین پر آپ کا استقبال کرتے ہیں۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''ہمارے پاس فالتو ٹکٹ ہیں، ہم آپ کو آفر کرتی ہیں۔''

''ٹکٹ ہمارے بھائی جان نے خرید رکھے ہیں۔ آپ کی اس گریٹ آفر کا شکریہ۔''

پھر اُن لڑکیوں نے بنا کچھ کہے آفتاب کے دونوں گالوں پر ایک ایک جھنڈا چپکا دیا۔ ایک گال پر ہندوستان کا جھنڈا اور دوسرے گال پر پاکستان کا جھنڈا تھا۔

''گڈ لک ٹو یو بیگ میں۔'' وہ دونوں لڑکیاں آفتاب کو وِش کرتی ہوئی اسٹیڈیم کے اینٹرینس کی طرف بڑھ گئیں۔

ایک اجنبی ملک میں جس سے پچھلے پچاس برسوں سے ہمارا دُشمنی کا رشتہ چلا آرہا تھا اچانک دوستی کا اس کھلے دل اور گرم جوشی سے اظہار، بڑا حیران کن کرشمہ تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں میں نے جلدی سے ساڑی کے پھور سے پونچھ ڈالا۔ ہم کچھ دیر اور اسٹیڈیم کے باہر کھڑے رہے اور لوگوں کے جوش اور ولولے کا اندازہ کرتے رہے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے وِیٹر ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان اور پاکستان کے جھنڈے ہاتھوں میں تھامے اسٹیڈیم کے اندر داخل ہو رہے تھے۔

''میں نے ہزاروں لوگوں کی اتنی بڑی بھیڑ کبھی نہیں دیکھی کراچی میں۔'' ارجمند نے پُشکر ناتھ سے کہا۔

''ہم نے بھی کہاں دیکھی ہے اتنی بھیڑ۔ اور یہ ساری بھیڑ امن اور شانتی کی بحالی کے لئے جمع ہے۔''

''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو پُشکر ناتھ۔''

''میں تمہیں بتاؤں ارجمند بھائی۔ جنگ اور انتشار چاہنے والوں کی تعداد ہمیشہ ہی کم ہوتی ہے، امن اور سکون اور بھائی چارے کے آرزومندوں کی تعداد اُن سے ہزاروں گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اب تک دوسری جنگ عظیم کے بعد کئی اور جنگیں ہو چکی ہوتیں اور دنیا پوری طرح تباہ ہو چکی ہوتی۔''

اُسی لمحہ جوان لڑکیوں کی ایک بھیڑ نعرے لگاتے ہوئی ہمارے قریب سے گزری۔ وہ ''پاکستان اور ہندوستان زندہ باد'' کے نعرے لگا رہی تھی۔ اُس بھیڑ میں ہندوستانی لڑکیاں بھی شامل تھیں اور پاکستانی لڑکیاں بھی۔ وہ اپنے ہاتھوں میں دونوں ملکوں کے جھنڈے تھامے اسٹیڈیم کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے اَب ہمیں بھی اندر چلنا چاہیے۔ دونوں ٹیموں کے کیپٹن ٹاس کرنے والے ہیں۔'' ارجمند بولا۔ اور پھر ہم سب اُس کے پیچھے پیچھے بہت بڑی بھیڑ کا حصہ بنے ہوئے اسٹیڈیم کے اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں عمران خان اینکلوئیر میں پہنچ گئے اور ہم چاروں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آفتاب

میری گود میں بیٹھا تھا۔

پاکستانی ٹیم کے کپتان انضمام الحق نے ٹاس جیتا تھا اور ہندوستانی ٹیم کے کپتان سورو گانگولی کو بیٹنگ کی دعوت دی تھی۔ دونوں ٹیمیں میدان میں اُتر آئی تھیں اور اسٹیڈیم میں جمع دونوں ملکوں کی بہت بڑی بھیڑ پر زور تالیوں سے دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں کے استقبال کر رہی تھیں۔ جب ہندوستانی ٹیم کے سلامی بلے باز نے پہلی بار گیند کو ہٹ کیا تو میچ دیکھنے والوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر ہندوستانی ٹیم کی حوصلہ افزائی کی۔ میں نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر اپنی دائیں اور بائیں طرف نظر دوڑائی۔ دونوں طرف میچ دیکھنے والے پاکستانی اور ہندوستانی شوقین دونوں ملکوں کے جھنڈے ملے جلے انداز سے لہرا رہے تھے۔ میں نے بھی خوش ہو کر تالی بجائی اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر میچ دیکھنے لگی۔ مجھے تالی بجاتے ہوئے دیکھ کر آفتاب نے بھی اپنے ننھے منے ہاتھوں کو بجانا شروع کر دیا۔ پچھلی قطار میں بیٹھا ایک آدمی اپنے ساتھ والے آدمی سے کہہ رہا تھا۔

''یہ ہزاروں مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں، جو اس وقت نیشنل اسٹیڈیم میں جمع ہیں دراصل امن اور دوستی کے سفیر ہیں، جو اپنے اپنے ملکوں کے مختلف علاقوں سے دوستی اور امن کے پیغام لے کر یہاں اسٹیڈیم میں آئے ہوئے ہیں۔ پروٹوکول کے مطابق ہمیں ان کی عزت کرنی چاہیے۔''

ہم سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ درمیانی عمر کا ایک پاکستانی دریٹر یہ بات کہہ رہا تھا۔ اُس کے یہ الفاظ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ایسے الفاظ سنے تو ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ ایسی باتیں تو پنڈت جیالال کول ہی کیا کرتے تھے۔ اُسی لمحہ گیند نے باونڈری کو پار کیا اور سارا اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اُٹھا۔ ہندوستانی تالیاں اور پاکستانی تالیاں ایک ہی جیسی تھیں۔ قہقہوں، مسکراہٹوں، آنسوؤں اور تالیوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

اچانک ارجمند نے میرا شانہ ہلایا۔

''اُدھر دیکھو تمہارے ملک کے تین وی آئی پی زور زور سے ہاتھ ہلا رہے ہیں۔''

میں نے گردن گھمائی اور اُسی لمحہ ٹھکر ناتھ اور شمع بھی اُسی طرف دیکھنے لگے، جس طرف میں دیکھ رہی تھی۔ ایک بڑے ترنگے جھنڈے کے پیچھے مسز سونیا گاندھی کی بیٹی پرینکا، اُس کا بھائی راہل اور پرینکا کا ہسبینڈ رابرٹ وڈیرا۔ وی آئی پی انکلوئیر کی پہلی قطار میں بیٹھے مسرت اور ولولے سے ہاتھ ہلا ہلا کر دونوں ٹیموں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

''وِس از وِنڈرفل۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''امن اور دوستی کے لئے تو ہمارے ملک کا ایک ایک بچہ کوشاں ہے۔'' پُشکر ناتھ بولا۔

''پاکستان میں بھی یہی عالم ہے پُشکر۔'' ارجمند نے کہا۔

''اب تو دونوں ملکوں کی دوستی یقینی ہے۔'' شمع خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''خدا ہماری مدد کرے۔ ہماری یہی دُعا ہے۔'' ارجمند نے یہ کہتے ہوئے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

ساتھ والے حنیف اسکوائر سے ارجمند ایک بڑی مزے دار خبر لایا تھا۔ دانش گاہ ہائی اسکول کراچی کے نویں کلاس کے ایک لڑکے عادل نے اپنی پیٹھ کے پیچھے ہندوستانی ترنگا باندھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ پوچھنے پر عادل نے کہا تھا: ''میں نے اپنے ملک کا جھنڈا ایک ہندوستانی فین کے جھنڈے سے صرف اُس سے دوستی کرنے کے لئے بدل لیا ہے، اب ہم دونوں بہت پکے دوست بن گئے ہیں۔''

یہ خبر سن کر ہم سب خوش ہو گئے۔

گرمی بہت تھی۔ ارجمند تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہم سب کے پینے کے لئے کچھ نہ کچھ لے آتا رہا تھا۔ لیکن اب اپنی سیٹ پر پوری طرح جم کر بیٹھ گیا تھا۔ پُشکر ناتھ تو بڑے انہماک سے میچ کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اسے تو بہت مدت کے بعد اس طرح کا میچ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ تو ایک منٹ کے لئے بھی میچ سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔ شمع اور میں تو پھر بھی دھیمی آواز میں آپس میں باتیں کر لیتی تھیں لیکن پُشکر اور ارجمند تو ایک لفظ بھی نہ بول رہے تھے اور پوری توجہ سے میچ کی ایک ایک گیند پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ پندرہ سال کے بعد دونوں ملکوں کی ٹیمیں پاکستان کی سرزمین پر ایک ساتھ اتنے میچ کھیل رہی تھیں۔ اپنے آپ میں یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ میچ کے آخری کچھ منٹ تو بے حد ایکسائٹمنٹ کے لمحے تھے۔ اسٹیڈیم میں ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ اب آخری اوور تھا، اور اُسی میں دونوں ٹیموں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ کرکٹ بڑی ناقابلِ اعتماد گیم ہے۔ اس میں آخری لمحوں کے دوران کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ آشیش نہرا گیند پھینک رہا تھا۔ اب کھیل کا سارا دارومدار اُسی پر تھا۔ اچانک ہی ایک دھماکہ ہو گیا۔ ہندوستانی کھلاڑی محمد کیف نے پاکستانی کے آخری کھلاڑی شعیب ملک کی گیند کو کیچ کر لیا اور اسی سے میچ کا پاسہ پلٹ گیا۔ آشیش نہرا نے اپنے ہاتھوں کا جادو دکھایا۔ کراچی کے نیشنل اسٹیڈیم میں کھیل کا پہلا ون ڈے میچ ہندوستانی ٹیم نے پانچ رنوں سے جیت لیا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہزاروں پاکستانی اور ہندوستانی میچ دیکھنے والوں نے بڑے جوش کے ساتھ مل کر تالیاں بجائیں اور ہندوستانی ٹیم کی جیت پر انتہائی خوشی اور ولولے کا اظہار کیا۔ نیشنل اسٹیڈیم میں ہر طرف ہندوستانی اور پاکستانی جھنڈے لہرا رہے

تھے۔ امن اور دوستی کے ہزاروں سفیر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے نہ صرف میچ ہی جیتا تھا بلکہ پاکستان کی سرزمین پر پاکستان کے عوام کے دل بھی جیت لئے تھے۔

کراچی نیشنل اسٹیڈیم دھیرے دھیرے خالی ہونے لگا اور ارجمند ہم سب کو ساتھ لئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

جب ہم گھر پہنچے تو انکل جان بھٹ بڑے بشاش نظر آرہے تھے۔

''آپ سب کو میچ جیتنے کی مبارک باد۔''

''خیر مبارک انکل۔'' پشکر ناتھ نے جواب دیا اور بڑی عزت سے انکل بھٹ کے پاؤں چھوئے۔

''آپ نے تو ابا اتنی بڑی ضیافت کا انتظام کرلیا ہماری غیر حاضری میں۔'' ارجمند بولا۔ اُس نے میز پر رکھی کھانے کی چیزیں دیکھ لی تھیں۔

''ارے میں نے کیا کیا ہے۔ ہوٹل والوں کو ٹیلی فون کیا، اُنہوں نے آپ لوگوں کے آنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے سارا انتظام کردیا۔''

''یہ تو سب نان ویج لگتا ہے ابا جان۔'' شمع نے کہا۔

''ارے نہیں بیٹی مجھے کشمیری برہموں کا بھی خیال ہے۔ ویج کا بھی انتظام ہے۔ لیکن یہ تو سب کچھ ہضم کرجاتے ہیں۔'' انکل کی بات سن کر میں اور پشکر زور سے ہنسے۔

''لیکن انکل یہ سب کس تقریب میں ہے؟'' پشکر ناتھ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آج ہم لوگ عید اور دیوالی دونوں تہوار ایک ساتھ منا رہے ہیں۔ دیوالی تمہارے یہاں آنے کے موقع پر اور عید میچ جیتنے کی خوشی میں۔''

انکل بھٹ کا یہ جواب سنتے ہی مجھے پشکر ناتھ کے فادر پنڈت جیالال کول کی یاد آگئی۔ ایسی دل کو چھو لینے والی باتیں تو صرف کول صاحب ہی کیا کرتے تھے۔ اُن کی یاد آئی تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انکل بھٹ نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے میرے قریب آگئے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

''تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں بیٹی؟''

''مجھے کول صاحب کی یاد آگئی تھی۔ ایسی عالمانہ باتیں تو وہی کیا کرتے تھے۔''

''اُس آدمی کی کیا پوچھتی ہو۔ ہی وار اے گریٹ مین' ہم تو اُس کے مقابلے میں صرف بالشتیے ہیں۔ ارجمند، شمع، پشکر اور تم۔''

''آپ نہیں انکل، آپ تو کول صاحب کی برادری کے ہیں۔ اور چند برسوں کے بعد ایسے لوگ چراغ نہیں سورج لے کر ڈھونڈے پر بھی نہیں ملیں گے۔'' پشکر ناتھ نے انکل بھٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ارجمند کا بیٹا آفتاب تو مجھ سے الگ ہوتا ہی نہیں تھا۔ وہ اس وقت بھی میرا ہاتھ مضبوطی سے تھامے میرے ساتھ کھڑا تھا۔

''تم تو آپا اپنے نابالغ عاشق کو سنبھالو۔ یہ تو تمہارے غم میں پاگل ہو جائے گا۔''

''پاگل نہیں ہوں گا می، تم فکر مت کرو۔'' آفتاب نے سنجیدگی سے کہا۔ اُس کے جواب پر ہمارا سب کا بہت اونچا قہقہہ گونجا۔

پھر ہم سب نے مل کر عید اور دیوالی کے تہوار ایک ساتھ منائے اور سارے گھر میں چراغ ہی چراغ جلا دئے۔

شاردا تو شمع کے سدروم میں سو رہی تھی اور آفتاب اُسی کے ساتھ اُسی کے پہلو میں گہری نیند سو رہا تھا۔ پشکر، ارجمند کے کمرے میں لیٹا تھا اور اُس سے گپ شپ کر رہا تھا۔ لیکن چاہ رہا تھا کہ کاش شاردا اس وقت اُس کمرے میں ہوتی اور شمع کے بیڈروم میں نہ سو رہی ہوتی۔ آج وہ بے حد خوش تھا اور اپنی یہ خوشی اُس کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا اور اُسے کہنا چاہتا تھا کہ اب اُنہیں بھی یہ فیصلہ کر لینا چاہئے کہ گھر میں آفتاب جیسا ایک خوبصورت اور معصوم بیٹا آ جائے اور وہ اپنی سب مشترکہ روایات اُس کے معصوم ہاتھوں میں سونپ دیں اور اُس کہیں کہ وہ ہزاروں سال کی اِن عظیم روایات کو سنبھال کر رکھے۔ لیکن شاردا اُس وقت اُس کے ساتھ والے پلنگ پر نہیں تھی اور وہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ والے پلنگ پر تو ارجمند سو رہا تھا اور اُس کے اونچے خراٹوں کی آواز خاموش کمرے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

اگلی صبح جاگتے ہی میں اور پشکر ناتھ نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ ہم دونوں نے اپنے بہت پرانے اٹیچی کیس کھولے۔ یہ اٹیچی کیس پرانے اسٹائل کے بھی تھے۔ یہ ہمیں شادی کے دوران کول صاحب نے دئے تھے۔ اب یہ اتنے بوسیدہ ہو گئے تھے کہ انہیں گھر سے باہر لے جانے میں بھی ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ ہم کراچی آنے سے پہلے دو نئے اٹیچی کیس خریدنا چاہتے تھے لیکن ویزا وغیرہ کے چکر میں ایسے پھنسے کہ نئے اٹیچی کیس خریدنے کا ہوش ہی نہ رہا۔ جب ہم نے ہوائی جہاز میں لوگوں کے اتنے اتنے شاندار اٹیچی کیس دیکھے تو ہمیں اپنے آپ میں شرم آنے لگی۔ ہم نے سوچا تھا کہ ہم کراچی سے دوسری چیزیں خریدتے وقت اٹیچی کیس بھی خرید لیں گے۔ آج ہمارا شاپنگ کرنے کا پروگرام تو تھا ہی، سب سے پہلے میں نے اپنے والا

اٹیچی کیس کھولا اور اُس میں سے وہ تمام کھلونے نکالے جو ہم نے جموں سے آفتاب کے لئے خریدے ہوئے تھے۔ اُس کے بعد پشکر ناتھ کا اٹیچی کیس کھولا اور اُس میں سے تین شال نکالے، جو ہم نے کشمیر ایمپوریم سے انکل بھٹ، ارجمند اور شمع کو دینے کے لئے خریدے تھے۔ ہم نے ایک بہت اچھا شال نکالا اور پشکر اور میں دونوں انکل بھٹ کے کمرے میں پہنچے۔ انکل بھٹ بستر میں بڑے بڑے تکیوں کے سہارے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

''آداب انکل۔'' پشکر ناتھ نے اُن کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔

''جیتے رہو۔''

پھر میں نے بھی انکل کو آداب کیا اور اُن کی دُعائیں حاصل کیں۔

''انکل ہم آپ کے لئے ایک شال لائے ہیں۔ قبول کیجئے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے شال انکل کے کندھوں پر ڈال دیا۔

''کمال کر دیا تم نے تو بیٹی۔ میں تو ابھی تک برسوں پرانے اپنے شال کو اَب تک استعمال کرتا آرہا ہوں۔ سچ مانو تو اس کے ایک ایک تار میں یادوں کے اتنے گرم گرم لمبے گندھے ہیں کہ اب تک اس کی گرمی اور نرماہٹ ویسی کی ویسی ہے، اسی لئے میں نیا شال یہاں سے نہیں خریدنا چاہتا تھا۔ یہاں سے خریدا ہوا شال تو کورے لٹھے کی چادر کی طرح ٹھنڈا کھردرا اور بے جاں ہوتا ہے۔ اُس سے میری بوڑھی ہڈیوں اور بے جان جسم کو کیا گرمی ملتی۔ تم نے میرے لئے یہ نیا شال لا کر میری ایک بہت ہی شدید خواہش اور فوری ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ تم دونوں سلامت رہو۔'' یہ کہہ کر انکل بھٹ نے ہم دونوں کی پیٹھ تھپتھپائی اور اُس کی کمزور دُھندلی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر ہم دونوں ارجمند اور شمع کے کمرے میں آ گئے۔ دونوں نیند کا خمار اُتار رہے تھے۔

''آیئے پشکر اور شاردا جی، سلام عرض کرتا ہوں۔'' ارجمند نے پلنگ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ہم بھی سلام عرض کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ شمع نے پلنگ سے اُٹھ کر مجھے میری بانہہ سے تھام لیا اور آفتاب پہلے کی طرح میرے پہلو میں میرے سامنے سٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پشکر نے شال ارجمند کو پیش کی اور میں نے شمع کو۔ لمحہ بھر کے بعد آفتاب بول اُٹھا۔

''اپنے عاشق کے لئے کچھ بھی نہیں۔'' آفتاب نے میری طرف دیکھا اور میرے بازو کو جھنجھوڑ دیا۔ میں بازو کو چھڑا کر اپنے کمرے کی طرف لپکی اور لمحہ بھر میں ڈھیر سارے کھلونے چادر میں ڈال کر لے آئی۔ اور اُنہیں آفتاب کے سامنے رکھ دیا۔

''تھینکس شاردا آنٹی۔ونڈرفل۔'' آفتاب نے میری ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

''اس تمام تکلف کی ضرورت تھی پشکر؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''ہاں ارجمند، ضرورت تھی۔'' پشکر ناتھ نے جواب دیا۔

''یہ چھوٹی چھوٹی باتیں انسانی رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں بھائی صاحب۔'' میں بیچ میں بول اُٹھی۔

ماحول ایک دم سہانا، خوبصورت اور خوشگوار ہو گیا۔

ناشتے کے بعد انکل جاں محمد بھٹ نے کہا۔

''تمہارے پاس ڈیرا صرف تین دن کا ہے۔کل تو تمہیں یہاں سے چلا جانا ہوگا۔اس لئے آج ہی کراچی کو جی بھر کر دیکھ لو۔''

پھر انکل بھٹ، ارجمند اور شمع سے مخاطب ہوئے۔

''انہیں شہر کی بھی سیر کراتے رہو اور ساتھ ساتھ شاپنگ بھی کراتے رہو۔میں جانتا ہوں انہیں بہت ساری چیزوں کی ضرورت ہے۔خاص طور سے شاردا کو، یہ بڑی قناعت پسند لڑکی ہے۔''

''ٹھیک ہے ابا جاں۔آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔'' شمع نے جواب دیا۔

''ایک اور تجویز ہے میری طرف سے ارجمند۔''

''فرمائیے ابا جی۔''

''انہیں بندر روڈ ضرور لے جانا، اُس علاقے میں ہندوؤں کی پرانی آبادی ہے اور اندر جا کر دو بڑے خوبصورت مندر ہیں، جن کی دیکھ بھال اُسی علاقے کے لوگوں کے ذمے ہے۔وہ مندر انہیں ضرور دِکھانا۔مندر بارہ بجے کے بعد بند کر دیئے جاتے ہیں۔اس لئے سب سے پہلے انہیں وہیں لے جاؤ۔اس کے بعد کوئی دوسرا پروگرام بنانا۔''

''ٹھیک ہے ابا جی۔'' ارجمند نے جواب دیا۔

''تو بس اب نکل جاؤ۔'' ''وقت ضائع نہ کرو۔''

ہم لوگ پندرہ منٹ میں تیار ہو کر گھر سے نکل آئے۔آفتاب پہلے کی طرح مجھ ہی سے چمٹا ہوا تھا۔ کتنا پیارا تھا آفتاب۔میں تو اُسے بہت مس کروں گی۔

بندر روڈ کا علاقہ تو خاصا گنجان تھا۔گاڑی کو اتنی بھیڑ میں سے گزارنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ارجمند نے کسی نہ کسی طرح یہ کام پورا کر ہی لیا۔فٹ پاتھوں پر دکانیں تھیں جہاں تک پہنچنے کے لئے لوگوں سے

کتر نے لگتے تھے۔ اِدھر اُدھر سائیکلیں اُلٹی سیدھی پڑی تھیں، بیچ بازار میں رکشا والوں نے اپنا رکشائیں بھی کھسا رکھی تھیں، کہیں کہیں تھوڑی سی جگہ دیکھ کر لوگوں نے گاڑیاں بھی پھنسا رکھی تھیں۔ ہمیں اُتار کر ارجمند گاڑی پارک کرنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا۔ بارہ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ ہم نے بازار سے پرشاد چڑھانے کے لئے مٹھائی خریدی اور اپنی گھڑی پر نظریں لگائے ہوئے ارجمند ہمیں مندروں میں لے آیا۔ پجاری جی تو اس سمے مندر کے پٹ بند کرنے کا انتظام کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمارا پرشاد دونوں مندروں کی مورتیوں پر چڑھایا، پھر ہم سب کو چرن اُمرت دیا اور ہمارے پرشاد میں اپنی طرف سے کچھ پرشاد ڈال کر ہمیں واپس کر دیا۔ ''انکل جی کے لئے پرشاد ضرور لے جانا۔ تمہیں کھیر بھوانی والا قصہ یاد ہے نا۔'' میں نے شنکر سے کہا۔

''بالکل یاد ہے۔''

اُس نے انکل بھٹ کے لیے پرشاد الگ رکھ لیا۔

ارجمند اور شمع نے بھی ہماری ہی طرح بھگوان کی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ ہمیں دیکھ کر آفتاب نے بھی اپنا ماتھا مورتیوں کے آگے فرش پر ٹیک دیا۔ اُس نے تو ماتھا اُٹھایا ہی نہیں۔ وہ تو میں نے اُس کا بازو پکڑ کر اوپر اُٹھایا۔

''اب اُٹھو آفتاب، ماتھا ٹیک دیا تم نے۔'' وہ اُٹھا اور پجاری جی نے اُس کے ماتھے پر ہم سب کی طرح ٹیکا لگا دیا اور میں نے اُس کے منھ میں مٹھائی ڈال دی۔

''آپ کے بھگوان تو بہت خوبصورت ہیں شاردا آنٹی۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھگوان تو سبھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ چاہے تم اُنہیں کسی بھی نام سے پکارو۔ اللہ، رب، واہے گرو، کرائسٹ، سبھی بھگوان کے نام ہیں اور سبھی خوبصورت ہیں۔''

''تھوڑی مٹھائی اور کھلاؤ۔'' اُس نے کہا۔

''میں نے مٹھائی کا بڑا سا ٹکڑا آفتاب کے منھ میں ڈال دیا۔

بازار میں سے گاڑی کو نکالنا تو بڑی مشقت والا کام تھا۔ ارجمند نے کمال ہشیاری سے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔

''میرا خیال ہے پہلے کسی معقول جگہ پر لنچ لیا جائے ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔'' شمع نے ارجمند کو یہ سجھاؤ دیا۔

''یہی ٹھیک رہے گا۔ یہاں سے نکل کر کسی نزدیک کے ہوٹل میں چلتے ہیں۔''

ارجمند نے سندر روڈ سے گاڑی نکالی اور اُسے ساتھ لگتی ہوئی کھلی سڑک پر ڈال دیا۔ کوئی دس منٹ کے اندر ہم ایک بہت اچھے ہوٹل کے اندر پہنچ گئے۔ ریسیپشن پر کھڑے دو آدمیوں نے ارجمند کو سلام کیا اور اُن میں سے ایک آدمی ہم سب کو دور کونے میں پڑی بڑی سی میز کے ساتھ لگی خوبصورت کرسیوں کی طرف لے آیا۔

''آپ یہاں تشریف رکھئے۔ یہ بڑے سکوں کی جگہ ہے۔ میں کچھ پینے کو بھجواتا ہوں۔''

میرے لئے قلفی بھیج دیں۔'' آفتاب نے اپنی فرمائش رکھ دی۔

''ابھی بھجواتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ہوٹل کا آدمی چلا گیا۔

''ہم لوگ کبھی کبھی ادھر آجاتے ہیں، یہاں کی قلفی بہت اچھی ہوتا ہے۔ آفتاب تو آتے ہی قلفی کی ڈیمانڈ رکھتا ہے۔''

''بڑی سمپل سی ڈیمانڈ ہے بھائی صاحب۔'' میں نے کہا۔ آفتاب کی کرسی تو میری ہی کرسی کے ساتھ تھی۔ تھوڑی دیر میں سب سے پہلے پلیٹ میں قلفی اور فلودہ جس پر گلاب کا عرق چھڑکا ہوا تھا، آفتاب کے لئے آ گیا، اُس نے بنا کچھ کہے سنے چھری سے قلفی کاٹنا شروع کر دی۔

ہوٹل کا کھانا بھی اچھا تھا، اور انتظام بھی۔ جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو دوپہر کے دو بج چکے تھے۔

''شمع میرا خیال ہے اس وقت ہم شاپنگ کا کام پٹا لیں۔ گرمی بہت ہے، شہر کے مختلف علاقوں میں گھومنے میں تو تکلیف ہوگی۔''

''تمہاری تجویز ٹھیک ہے۔ دُکانوں کے اندر ہم بیٹھ بھی سکیں گے اور شاپنگ بھی کر سکیں گے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے پشکر بھائی؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''آپ ہی کی تجویز مناسب ہے۔''

چناں چہ ہم جلتی تپتی دوپہر میں دُکان دُکاں گھومنے لگے۔ اور ارجمند اور شمع بغیر ہم سے پوچھے اپنی مرضی اور پسند کے مطابق چیزیں خریدنے لگے۔ میرے خیال سے وہ انکل بھٹ کی دی ہوئی ہدایتوں پر عمل کر رہے تھے۔ اگر ہم کبھی بولتے تو وہ مسکرا دیتے۔ مگر چپ رہتے اور زیادہ قیمت والی چیز خرید لیتے۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ لیکن تھے ہم ان کے ساتھ۔ اُنہوں نے جی بھر کر شاپنگ کی اور پھر سارے ساماں کو رکھنے کے لئے بڑے بڑے اور مہنگے قسم کے دو اٹیچی کیس بھی خریدے۔ ان کے رنگوں کے انتخاب میں شمع نے میری رائے لی اور ارجمند نے پشکر کی رائے۔ اس تمام بور کرنے والے پروسیس میں بے چارا آفتاب پریشان ہوتا رہا اور مجھ سے ہی چمٹا رہا۔ البتہ بیچ بیچ میں کئی بار ارجمند اُسے کچھ نہ کچھ پلاتا

ضرور رہا۔ گرمی تو واقعی بہت تھی۔ ایک دم پسینہ بہا دینے والی گرمی۔ گرمی سے تو میں خود بھی دُکھی ہو رہی تھی۔ جب ہم نے سارا سامان اٹیچی کیسوں میں رکھ کر انہیں گاڑی میں رکھوایا تو آفتاب کے صبر کا پیمانہ ٹوٹنے لگا۔

''پاپا، اب گھر چلو مجھے بڑی گرمی لگ رہی ہے۔''

''تمہاری آنٹی اور انکل کو شہر نہ گھما دیں؟'' ارجمند نے پوچھا۔

''نہیں پاپا اس وقت نہیں۔''

''تو چلو گھر چلیں بھائی صاحب۔'' میں نے ارجمند سے کہا۔

''پھر تو شہر کے مختلف حصوں کی وِزٹ رہ جائے گی۔''

''رہ جانے دیجئے، شہر تو سبھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آفتاب کو گھر لے چلئے۔''

''شاردا ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' پشکر نے بھی میری تائید کی۔

چنانچہ ارجمند نے گاڑی گھر کی طرف موڑ دی، گھر پہنچے تو چھ بجنے والے تھے۔

انکل بھٹ ابھی آرام کر کے اُٹھے ہی تھے۔

''تم لوگ واپس بھی آ گئے؟''

''ہاں ابا جان۔'' ارجمند نے جواب دیا۔

''اِن لوگوں کو کہاں کہاں گھمایا؟''

''گھمایا کہیں بھی نہیں۔ بس دکانوں ہی کے چکر کاٹتے رہے۔'' ارجمند نے کہا۔

''یہ تو اس طرح شاپنگ کرتے رہے جیسے شادی کا سامان خریدنا ہو، انکل جی۔'' میں بولی۔

''ہمارے لئے تو یہ موقع شادی سے بڑھ کر ہے، اب تم لوگ کب آؤ گے اِدھر؟''

''آپ جب حکم کریں گے ہم حاضر ہو جائیں گے انکل جی۔'' پشکر نے اپنی بات کہی۔

''میرے دن تو اب پورے ہونے والے ہیں، حکم کیا درخواست کرنا بھی ناممکن ہو جائے گا میرے لئے۔'' انکل جی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

میری آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔ آفتاب مری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ایک دم اُداس ہو گیا۔

''میرا خیال ہے اَب تم کچھ دیر آرام کر لو۔ نہا دھو کر گھنٹہ بھر میں نکل جانا۔''

''جب تک موسم میں بھی حرارت کم ہو جائے گی۔'' انکل بولے۔

''جی۔'' میں نے کہا۔

''ارے میرے لئے مندر سے بھگوان کا پرشاد نہیں لائیں، شاردا؟''

''لائی ہوں انکل جی۔''

میں نے پرس میں سے پرشاد نکال کر انکل کے ہاتھوں میں دیا اور اُنہوں نے اُسے ماتھے سے لگا کر منہ میں ڈال لیا۔

آج میں پھر کافروں میں شامل ہو گیا ہوں۔''

''آپ تو جنم ہی سے کافر ہیں۔ انکل جی۔'' یشکر ناتھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن اَب میرا کافر بھائی جیالال مجھے چھوڑ گیا۔ شکوہ تو اسی بات کا ہے۔'' اُنہوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اَب اُن کے قہقہے میں اتنی توانائی نہیں رہی تھی۔ جب ہم دوبارہ گھر سے نکلے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور کراچی کی صاف ستھری کشادہ سڑکیں بجلی کی روشنی میں چمکنے لگی تھیں۔ ارجمند ہمیں شہر کے مختلف حصوں میں گھما رہا تھا۔ اُس نے کار کی رفتار بھی آہستہ رکھی تھی تا کہ ہم تمام علاقوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکیں۔ بیچ بیچ میں وہ اپنی کومینٹری بھی کرتا رہا تھا۔ کلفٹن کے علاقے میں گھماتے ہوئے اُس نے کہا کہ کسی زمانے میں یہ علاقہ کراچی کا سب سے پاش ایریا تصور کیا جاتا تھا لیکن اب ڈیفنس کالونی والا علاقہ اس پر سبقت لے گیا ہے۔ ارجمند کے مطابق کراچی کے ماحول، کلچر اور عمارتوں کے ڈیزائنوں میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی تھی۔ لاہور میں ابھی پرانا کلچر زندہ تھا اور وہاں کے لوگ اس کی نمائندگی کرتے تھے لیکن کراچی تو الٹرا ماڈرن شہر بن گیا تھا۔ اس میں سمندر کا بھی بہت بڑا رول تھا۔ یوں گھومتے گھومتے اور شہر کے مختلف علاقوں کی خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہوئے آخر ہم سمندر کے کنارے پہنچ گئے، یہی ہماری آخری منزل تھی۔ اس کے بعد تو ہم گھر چلے جائیں گے۔

ابھی پورنماشی میں تو کئی دن باقی تھے لیکن چاند کی قاش کافی بڑی ہو گئی تھی اور اس کی روشنی سمندر کے وسیع پانی پر رقص کر رہی تھی اور سمندر کی لہریں جب اُبھر کر ایک دوسرے میں مدغم ہوتیں تو چاند کی روشنی کا وہ منظر بڑا طرب ناک ہو جاتا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سمندر کے پانی سے معطر ایک بڑی مدہوشی کا عالم پیش کر رہے تھے۔ میں نے تو جوتے اُتار کر اپنے پاؤں اور پنڈلیاں سمندر کے پانی میں ڈال دی تھیں۔ شمع نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ آفتاب نے بھی اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں میرے پاؤں پر رکھ دیئے۔ البتہ اُس کی پینٹ پوری طرح بھیگ گئی تھی۔

''میری پینٹ تو گیلی ہو گئی شاردا آنٹی۔''

''کوئی بات نہیں۔ سمندر سے مسخری کرو گے تو ایسا ہی ہوگا۔''

"تو ہم سمندر سے مسخری کر رہے ہیں آنٹی۔"

"اور کیا کر رہے ہیں ہم لوگ۔ پانی کا اتنا بڑا حدود کے بغیر وسیع پھیلاؤ جس کا کہیں کوئی کنارہ نہیں۔ اُس پانی کو ہم اپنے گندے پاؤں سے میلا کرتے جا رہے ہیں۔ یہ سمندر کے پانی سے مسخری نہیں تو کیا ہے۔ تم ہی بتاؤ۔"

"مسخری ہی ہے آنٹی۔" آفتاب بولا۔

"شاردا تو جو بھی کہے آفتاب کے لیے وہی سچائی ہے۔" شمع بولی۔

"میرا عاشق ہے بھائی۔" میں نے کہا۔ میری بات سن کر سب ہنس پڑے اور آفتاب نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے سمندر کے پانی کو اِدھر اُدھر پھینکنا شروع کر دیا۔

ہائے کتنا پیارا موسم تھا سمندری ہواؤں کا موسم۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اس تمام موسم کو اپنے دوپٹے میں سمیٹ لوں اور گھر جا کر اسے دونوں اٹیچی کیسوں میں ڈال دوں اور اُن کو تالا لگا دوں اور انہیں ہندوستان واپس پہنچ کر ہی کھولوں اور اس سارے سمندری ہواؤں کے من موہک موسم کو ان سب جگہوں پر مٹھی مٹھی کر کے بکھیر دوں جو سمندر سے دور ہیں۔ اور جنہیں اس کا احساس نہیں کہ سمندر کے کنارے رہنے والے لوگ اس موسم کی آغوش میں کیسے پروان چڑھتے ہیں۔ اس موسم کی ہواؤں میں دوستی اور امن کا جو پیغام گھلا ہے وہی تو میں قریہ قریہ، شہر شہر، پہاڑ پہاڑ، دشت دشت، پہنچانا چاہتی ہوں۔ سمندری ہواؤں کے موسم کا جو حصہ بچ جائے گا اُسے پتھروں اور مسدروں کے شہر جموں کے ہر گلی کوچے اور ہر آنگن میں چٹکی چٹکی کر کے بانٹ دوں۔ میں اس سوچ میں ڈوب گئی اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ سمندر کی ایک تیز اور اونچی لہر نے مجھے کمر تک بھگو دیا تھا۔ اور آفتاب کے اب سارے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔

"کہاں چلی گئی تھیں؟" پشکر نے حیرت سے پوچھا۔

"میں اپنے شریر سے نکل کر باہر گھوم رہی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"اب واپس آ گئی ہو؟"

"ہاں، اور واپس جا بھی رہی ہوں اپنے گھر۔ چلو ارجمند بھائی اب گھر چلیں۔ انکل جی انتظار کر رہے ہوں گے۔"

میں نے آفتاب کو پانی سے نکال کر اُس کی پینٹ اُتار دی تو وہ شرما گیا۔

"آپ تو مجھے ننگا کر رہے ہیں شاردا آنٹی۔" آفتاب ننگا ہی ریت پر بھاگ کھڑا ہوا۔

جب ہم گھر پہنچے تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ انکل بھٹ کے سونے کا ٹائم ہو گیا تھا۔

م سب بھی کچھ دیر کے بعد سو گئے۔ کھانے پینے کا پروگرام تو ہم نے گھومتے پھرتے جاری ہی رکھا تھا، اب ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

آج ہمیں ہندوستان کے لئے روانہ ہونا تھا۔

انکل جان محمد بھٹ صبح ہی سے بڑے جذباتی ہو رہے تھے۔ آج تک جتنے خط پشکر نے اُنہیں لکھے تھے وہ سب انہوں نے تاریخ وار سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ اور انہیں ایک خوبصورت فائل میں لگا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ صبح ہی سے فائل کو کھول کر بیٹھے تھے اور اُن خطوں کو پڑھے جا رہے تھے۔ اور اُن کی آنکھیں بار بار چھلک رہی تھیں۔ صبح سویرے بیڈٹی دینے کے لئے شمع اور میں دونوں اُن کے کمرے میں گئیں۔

''آؤ بیٹیو، نئی صبح کی مبارک تم دونوں کو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کی دُعائیں جب ہمارے ساتھ ہیں تو ہمارے لئے ہر صبح متبرک ہے۔'' شمع بولی۔

''آپ نے تو ہمیں محبتوں اور دُعاؤں کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ انکل جی۔''

میں نے اُنہیں چائے کی پیالی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''آج کی صبح قابل پرستش ہے کہ نیا طلوع ہوتا ہوا سورج دونوں ملکوں کے عوام کے لئے امن اور دوستی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ آج دونوں ملکوں کے عوام ایک نئے مستقبل کی دہلیز پر کھڑے ایک دوسرے کی طرف پُرعزم اور پُر اُمید نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاردا، تم اور پُشکر ناتھ صرف دونوں ملکوں کی کرکٹ ٹیموں کے میچ دیکھنے والے دو ہندوستانی نہیں ہو بلکہ تم تو وہ سفیر ہو جن کے ہاتھوں میں امن اور دوستی کے فرماں ہیں۔ میں تمہیں پاکستان کے عوام کی طرف سے سلام کرتا ہوں۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میں نے بڑے ادب سے انکل بھٹ کے سامنے سر جھکا دیا۔

''سفیر نہیں جھکا کرتے۔ اُن کے آگے تو دوسرے لوگ جھکا کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے مجھے اوپر اُٹھا لیا۔

''اب ہم آئیں گے ہندوستان ایسے ہی میچ دیکھنے۔ اب ہم دوستی اور امن کے سفیر بن کر آئیں گے تمہارے ملک میں۔ آج ہم تمہیں سلام کر رہے ہیں، کل تم بھی ہمیں سلام کرنا بیٹی۔'' انہوں نے یہ کہہ کر اپنی چھلکتی ہوئی آنکھوں کو پونچھنا شروع کر دیا۔ میں اور شمع چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آئیں۔

جب میں کمرے میں واپس آئی تو پشکر وہاں موجود نہ تھا۔ وہ ارجمند کے کمرے میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔

آفتاب ابھی تک سو رہا تھا۔ کل وہ تھک بھی تو بہت گیا تھا۔

''شاردا آپا، تم لوگوں کے جانے کے بعد آفتاب بہت اُداس ہو جائے گا۔''

''میں بھی تو بہت اُداس ہو جاؤں گی، شمع۔''

''آپا، اب آپ اسے ایک خوبصورت سے ماہتاب کا تحفہ دے دو۔ وہ ایک دم خوش ہو جائے گا۔ مستقبل اب ہمارا نہیں، آفتاب اور ماہتاب کا ہوگا۔'' میں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ مجھے لگا کہ میرے دل کے کسی گوشے میں ایک پیاری سی لہر جاگی تھی۔

پھر شمع چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد پشکر ناتھ بھی ارجمند کے کمرے سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

آتے ہی بولا۔

''شاردا، آج ارجمند بھائی نے مجھ سے ایک فرمائش کی ہے۔''

''شاید وہی فرمائش کی ہے جو شمع نے مجھ سے کی ہے۔ دونوں کی ملی بھگت ہے۔''

''شاید۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا اور اُس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اُس دن کا نیا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

پھر ہم دونوں اپنے اپنے ڈھیر سارے ساماں کو سنبھالنے لگے۔ مجھے لگا کہ میری اور پشکر ناتھ کی شادی آج دوسری بار ہو رہی تھی اور یہ سارا سامان ہمیں اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔

''میں تو سوچتی ہوں کہ اب ہم جموں میں دوسرے ہنی مون کے لئے جائیں گے، پشکر۔''

میں نے اپنا کچھ سامان اٹیچی کیس میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' پشکر مسکراتے ہوئے بولا۔

'' اور یہ کتنی حیرت ناک بات ہے۔'

''ہاں شاردا، میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

ہم دیر تک اپنا اپنا ساماں ترتیب سے اپنے اپنے اٹیچی کیسوں میں رکھتے ہوئے بولے۔

ناشتے کے دوران ارجمند نے ہم سے پوچھا۔

''آج کہیں چلو گی شاردا آپا؟''

''نہیں ارجمند بھائی، آج ہم گھر ہی میں رہیں گے اور جو کچھ ہم نے یہاں آ کر حاصل کیا ہے اُسے ڈھنگ سے اپنے دل و دماغ میں سجاتے رہیں گے تا کہ ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ پر فٹ بیٹھ جائے۔''

انکل بھٹ جو میز کی دوسری طرف بالکل سامنے بیٹھے ہوئے تھے، میری بات سن کر بولے ''مجھے لگتا ہے میرا مرحوم دوست پنڈت جیالال کول اپنی ساری شخصیت کی دولت تمہیں ہی سونپ گیا ہے۔ ایسی باتیں صرف وہی شخص کیا کرتا تھا۔ مجھے بار بار یاد آتا ہے جیالال۔''

ہم نے ایئرپورٹ جانے سے پہلے، دن کا تمام وقت گھر ہی میں گزارا۔ آفتاب سے مذاق کرتے رہے آپس میں باتیں کرتے رہے، چھوٹی چھوٹی چیزیں جو ادھر اُدھر رکھی تھیں اُنہیں سنبھالتے رہے۔

''ان پرانے اٹیچی کیسوں کا کیا کرو گی شاردا آپا؟''

''انہیں پھینک دیتے ہیں اور کیا کریں گے؟''

''پرانی چیزوں کی تو بہت قدر ہوتی ہے۔ انہیں تو شہر کے میوزیم میں رکھا جاتا ہے۔'' ارجمند ہنسا۔

''تو انہیں نیشنل آرکائیور میں رکھوا دو۔'' پُشکر نے مذاق میں کہا۔

''میں بتاؤں ہم کیا کریں گے ان اٹیچی کیسوں کا؟'' شمع بولی۔

''بتاؤ۔'' ارجمند نے اسے مخاطب کیا۔

''شاردا آپا والے اٹیچی کیس میں تو آفتاب کے تمام کھلونے رکھ دیں گے اور پُشکر بھائی والے اٹیچی کیس میں وہ تینوں خوبصورت اور قیمتی شال سنبھال کر رکھ دیں گے جو ہمیں تحفے میں ملے ہیں۔ جب سردیوں کا موسم آئے گا اور ہلکی ہلکی خنکی ہو جائے گی تو ہم سب اپنے اپنے شال اٹیچی کیس میں سے نکال کر اوڑھیں گے اور اُس میں رچی ہوئی ہلکی ہلکی گرمی سے اپنے جسموں کو راحت دیں گے۔''

''ارے کیا بات کہہ دی ہے۔'' ارجمند نے شمع کی پیٹھ تھپکی اور آفتاب نے بھی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اپنی ماں کی پیٹھ تھپک دی۔

اس ہلکی سی آپسی گفتگو نے انسانی رشتوں کی لطافت اور نزاکت کو اور بھی لطیف اور نازک بنا دیا۔ ہم سب خوش ہو گئے۔

آفتاب مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔

''بڑے ابوجاں کہہ رہے تھے آپ اور پُشکر انکل ہم سب کو انڈیا آنے کی دعوت دیں گے۔''

''ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں بڑے ابوجاں، آفتاب۔ کرکٹ کے اگلے میچ انڈیا میں ہوں گے اور آپ سب وہ میچ دیکھنے آئیں گے۔''

''جیسے آپ لوگ کراچی آئے ہیں شاردا آنٹی؟''

''ہاں آفتاب۔''

''لیکن مجھے کون دعوت دے گا؟''

''تمہیں سارا ہندوستان دعوت دے گا آفتاب۔ آفتاب کو کوئی ایک آدمی تھوڑی بلاتا ہے، اُسے تو ساری دنیا بلاتی ہے۔''

''بچ اشاردا آنٹی؟''

''ہنڈریڈ پرسینٹ بچ آفتاب'' میں نے یہ کہہ کر آفتاب کو اپنی بانہوں میں لے کر اُسے چوم لیا۔ مجھے لگا جیسے میں دونوں ملکوں کے مستقبل کو اپنی بانہوں میں لے کر اُسے چوم رہی تھی۔

قائدِ اعظم ایئر پورٹ پر ہمیں سی آف کرنے کے لئے ارجمند، شمع اور آفتاب ہی آئے تھے۔ انکل جان محمد بھٹ نہیں آئے تھے ہمارے ساتھ۔ جب وہ ہمارے استقبال کو ایئر پورٹ نہیں پہنچے تھے تو اَب الوداع کہنے کے لئے کیسے آسکتے تھے۔

جب ہم پی آئی اے کے ہوائی جہاز کے اندر داخل ہوئے اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تو مجھے لگا کہ دوستی اور امن کا پیغام لے کر آنے والے دو سفیر اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر شاد و کامراں اپنے دیس واپس جا رہے تھے۔ میں نے اُس سرخ گلاب کی تازہ پنکھڑیوں کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، جو ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے آفتاب نے بڑی محبت سے مجھے دیا تھا اور اپنے شاداب اور معصوم گلابی ہونٹوں سے میرے دونوں گال چوم لئے تھے۔ پُشکر ناتھ مسکراتے ہوئے بڑے پیار سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے دور اُسے کسی آنے والی صبح کی پہلی کرن نظر آ رہی ہو۔ سمندری ہواؤں کے موسم کے اُس پار!

عبدالمغنی

کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری

اس وقت میرے سامنے جناب کشمیری لال ذاکر کے حسبِ ذیل ناول ہیں

۱	انگوٹھے کا نشاں	مارچ ۱۹۷۸ء
۲	کرماں والی	اگست ۱۹۸۰ء
۳	دھرتی سدا سہاگن	دسمبر ۱۹۸۰ء
۴	ڈوبتے سورج کی کتھا	دسمبر ۱۹۸۵ء

ان سب ناولوں کا تعلق دیہات سے ہے، گرچہ ان پر شہری زندگی کی کچھ پرچھائیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ ان میں دو ''کرماں والی'' اور ''ڈوبتے سورج کی کتھا'' تقسیم ہند کے اثرات کے آئینہ دار ہیں۔ چاروں میں پنجاب کا ماحول اور معاشرہ ہے۔ اس پس منظر میں گزرتے ہوئے وقت کی تبدیلیوں کا مرقع پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی اس مرقعے میں انسانیت کی بنیادی قدروں کو روشن کیا گیا ہے۔ مذہبی فرقے، معاشی طبقے، انسانی نسلیں اور مقامی حلقے ایک دوسرے سے بہ یک وقت تصادم بھی کرتے ہیں، تعاون بھی۔ یہ تاریخ کی کش مکش اور زمانے کی گردش ہے۔ روئے زمین پر آدم وحوا کی داستاں اسی طرح مرتب ہوئی ہے۔

''انگوٹھے کا نشاں'' جس موضوع پر تصنیف کیا گیا ہے اس کے متعلق ''پہلا قدم'' کے عنواں سے لکھے ہوئے دیباچے میں مصنف خود ہی وضاحت کرتے ہیں

> ''حاکم اور محکوم کے آپسی رشتوں کی کئی کڑیاں ہیں، جن میں سے اکثر کی بنیاد مجبوری پر ہے۔ بیگار کی پرتھا بھی ان اُلجھے ہوئے رشتوں کی ہی ایک کڑی ہے۔ جاگیردارانہ نظام کا تمام تر ڈھانچہ سینکڑوں برس تک اس نیو پر قائم رہا کہ کچھ طاقت ور برسر اقتدار لوگ اپنی اقلیت کے باوجود بھی سارے کمزور اور مجبور لوگوں کی تقدیر کے مالک بن جائیں میرا یہ ناول اس پرتھا کے خلاف خاموش بغاوت کرنے کی مختصر سی داستان ہے ''

اس داستان کا ہیرو کلی رام ہے، جو اپنے ماپ رام پھل کی طرح جاہل ہے صرف انگوٹھے کا نشان کاغذات پر لگا سکتا ہے، دستخط نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں ان پڑھ کھیت مزدور، ز میں داروں کے غلام، مجبور اور مظلوم ہیں، لیکن خود دار اور جرأت مند ہیں، باغیانہ خیالات رکھتے ہیں، ایک چھوٹے سے گاؤں تک محدود رہنے کے باوجود زمانے کی رَو اُن کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرتی ہے اور وہ آگے بڑھ کر غلامی کا جوا اپنی گردن سے اُتار پھینکتے ہیں، گاؤں کے دوسرے کساں مزدور اُن کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ ایک نئی آزاد بستی بساتے ہیں، تاکہ ان کی آئندہ نسل آزادی اور خوش حالی کی سانس لے سکے۔ اس سلسلے میں حکومت وقت بھی ان کی مدد کرتی ہے، اس لئے کہ ملک کی آزادی کے بعد جمہوریت قائم ہوگئی ہے، زمین داری ختم کی جا رہی ہے اور اب کوئی کسی کا بندھوا مزدور بن کر نہیں رہے گا۔ اس طرح سیاسی انقلاب کاشت کاری کے نظام کی اصلاح کر رہا ہے۔ یہ گویا دورِ جدید کی ایک برکت اور نعمت ہے۔

''کرماں والی'' کے متعلق ناول نگار نے ''کتھا یاترا'' کے عنوان سے دیباچے میں تشریح کی ہے

> ''اس ناول کا موضوع تقسیم ہے وہ محرومی اور کسک ہے جس کا احساس اس نسل کے لوگوں کو تھا (اور اب بھی ہے) جو پاکستان چلے گئے اور ان کے خانداں کے کچھ افراد ہندوستان میں ہی رہ گئے یا کچھ لوگ ہندوستان میں آگئے لیکن ان کے کچھ عزیز پاکستان میں رہ گئے۔''

یہ بہ یک وقت ہندو مسلم سکھ فرقے اور اتحادوں کی کہانی ہے، تفرقے سیاست دانوں نے پھیلائے، جب کہ عوام متحد رہنا چاہتے تھے، اس لئے کہ صدیوں سے ایک ہندوستانی سماج مشترکہ معاشرتی مسائل اور تہذیبی اقدار کے ساتھ بن چکا تھا اور ہر مذہب و فرقہ کے لوگوں کی جڑیں ایک ایسی زمین میں جمی ہوئی تھیں جس پر سبھی کے آبا و اجداد کے پسینے بہے تھے لہٰذا ان کے درمیان کے نتیجے میں نوجوانوں کی تعداد جس تیزی سے کم اور سن رسیدہ لوگوں کی تعداد اسی تناسب سے زیادہ ہو رہی ہے اس کی طرف بھی ناول کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مصنف نے پیش لفظ ''آؤ بات کریں'' میں اشارہ کیا ہے

> ''یہ گیپ ان قدروں کی دین ہے جو دو نسلوں کی روایات اور مجبوریوں اور سچوائشنز کے کارن پیدا ہوا ہے۔ دونوں نسلوں کی اپنی اپنی مجبوریاں ہیں اور مجبوریوں میں سمجھوتوں کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ میرے اس ناول کی بنیاد یہی قدریں، یہی پرم پرائیں اور یہی مجبوریاں ہیں جنہیں کردار بھی اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے اور اس

لئے شاید انہیں قبول بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کا وجود اٹل ہے۔ اس مسئلے کا ایک دوسرا پس منظر بھی ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں خاص طور سے اور کسی حد تک ترقی پذیر ملکوں میں بھی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لئے کارگر قدم اٹھائے جا رہے ہیں۔ لہذا چھوٹے بچوں اور جوان عمر کے لوگوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس بڑی عمر کے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے

ہندوستان نے اپنے تہذیبی ورثے میں بزرگوں اور بوڑھوں کی عزت اور ان کی مناسب دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی پائی ہے، جب کہ جوائنٹ فیملی سسٹم ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں اب بھی بزرگوں کو سنبھالنے کی پرم پرا قائم ہے۔ دیہات میں ان سینیر شہریوں کو اب بھی عزت اور وقار سے جینا میسر ہے۔ لیکن شہروں میں ہمارا یہ تہذیبی ورثہ کٹتا جا رہا ہے۔''

اس ناول کی نئی نسل کا ہیرو، برکت رام، اپنے باپ دینا ناتھ، کی طرح ایک لائق اور خوش اخلاق انسان ہے۔ اس کی ماں راجو بھی بہت سلیقہ مند اور نیک ہے، لیکن اس کی محبوبہ اور بیوی، انجلی نئے زمانے کی وہ فیشن ایبل عورت ہے جو صرف اپنے خاوند کو لے کر ایک الگ گھر بسانا چاہتی ہے۔ برکت اس بدخلقی اور کم ظرفی کا روادار نہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کی کاوش کی گئی ہے

''میرے اس ناول کا مرکزی خیال وہ انسانی رشتے ہیں جن کا سہارا لے کر ہی ہمارا سماج آگے بڑھ سکتا ہے۔ انسانی سماج کا مسئلہ کوئی بھی ہو، اس کا حل تلاش کرنے کے لئے ہمیں ان سمبندھوں کو جوڑنا ہوگا جو ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں اور جن پر ہماری نظر نہیں پڑتی۔ یہ چھوٹے چھوٹے انسانی رشتے آپس میں جڑ جائیں تو جدوجہد کی ایک مضبوط زنجیر بن سکتی ہے۔''

چنانچہ ناول کا ہیرو، شیتل، ایک فوجی، جب محاذ جنگ سے اپنی ایک ٹانگ گنوا کر اپنے گاؤں میں لوٹتا ہے تو ہیروئن کیرتی ایک جواں بیوہ کے ساتھ مل کر سماجی کارکنوں کا ایک ایسا گروہ بنالیتا ہے جس کی مصلحانہ اور رفاہی وفلاحی جدوجہد سے ایک نہایت پسماندہ دیہات کے مسائل حل ہونے لگتے ہیں، پانی کا میٹھا کنواں بھی بن جاتا ہے، جس کی سخت ضرورت تھی۔ اور جوان بیواؤں کے عقد ثانی کا راستہ بھی کھل

جاتا ہے، جو ہیرو اور ہیروئن کی شادی سے نمودار ہوتا ہے۔ یہ ناول انسانی رشتوں کو اس حد تک جوڑتا دکھائی دیتا ہے کہ گاؤں کا زمیندار ٹھاکر بھی، جسے اس کے کارندوں کی غلط کاریوں کے سبب ظالم سمجھا جاتا تھا، نیک کاموں میں شریک ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے غلط کار کارندے بھی بالآخر راہ راست پر آجاتے ہیں۔ یہ مختلف طبقات کے درمیان باہمی مفاہمت و مصالحت کا ایک سبق ہے۔

''ڈوبتے سورج کی کتھا'' کا سفر دیہات سے شروع ہو کر شہر میں ختم ہو جاتا ہے۔ تقسیم ہند میں ایک گاؤں سے اجڑے ہوئے لوگ بالآخر ایک نئے شہر میں آباد ہو جاتے یا پناہ لیتے ہیں۔ اس پس منظر میں نئی اور پرانی نسلوں کی وہ کش مکش بھی دکھائی گئی ہے جو جدید تمدن میں روز بہ روز تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے اور اس کی وجہ سے قدیم تہذیب کی اچھی قدریں بھی تباہ ہو رہی ہیں، شرافت، مروت، رواداری اور غم خواری کے اعلیٰ اخلاق برباد ہو رہے ہیں۔ صنعت و تجارت کی بڑھتی ہوئی ترقیات میں یہ انسانیت کا زوال و نقصان ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے خصوصیت کے ساتھ آج کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے خاندان میں بوڑھوں کا مسئلہ اٹھایا ہے اور اس کے حل کے لئے جو بوڑھوں کے آشرم کی تجویزیں مغرب کے ساتھ ساتھ اب مشرق میں بھی پیش کی جارہی یا روبہ عمل آرہی ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی، ایک انسانی بھائی چارہ قائم ہو چکا تھا اور وہ بھائیوں کی طرح مل جل کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک تھے۔ لیکن سیاست وقت نے اس دوستی کو دشمنی میں تبدیل کردیا اور قوم کے رہنماؤں نے قوم کا شیرازہ بکھیر دیا۔ چنانچہ تاریخ انسانی کا ایک نہایت دردناک المیہ برصغیر میں برپا ہوا۔ اسی المیے کی ایک علامتی کردار کرماں والی ہے، جو ایک مسلم خاتون ہے، اور اس کا بیٹا اس سے بچھڑ کر ہندوستان ہی میں رہ گیا ہے جب کہ وہ خود شوہر کے ساتھ پاکستان چلی گئی ہے اور وہاں ایک بچی کو جنم دیتی ہے، پھر بیٹی اپنا گھر بسا لیتی ہے اور شوہر مر جاتا ہے۔ کرماں والی بہر حال مسلسل بیٹے کو یاد اور تلاش کرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ اس کو پالیتی ہے۔ وہ ہندوستان میں ایک سکھ کے گھر میں پرورش پا کر اپنی جگہ خوش و خرم ہے، لیکن کرماں والی کا خاندان تقسیم ہو چکا ہے۔ بیٹی ہند پاک سرحد کے ایک طرف ہے اور بیٹا دوسری طرف۔ اس طرح ایک ماں کی اولاد وطنیت کے اعتبار سے تقسیم ہو چکی ہے۔

''دھرتی سدا سہاگن'' گاؤں کی زمین کی آفاقی حیثیت اور ابدی اہمیت کا افسانہ ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے بجا طور پر تمہید میں ''مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے پریم چند کی عظیم روایت کا حوالہ دیا ہے:

''منشی پریم چند کے بعد کافی مدت کے لئے اردو ناول دیہات کی زندگی اور اس کی

سمسیاؤں سے کٹ گیا تھا۔ اردو افسانے اور ناول کی توجہ شہری زندگی، اس کی زندگی سے الجھتے ہوئے کرداروں اور اس کے ذہنی کرب کی عکاسی پر ہی مرکوز ہوگئی۔ لیکن اب پھر کچھ عرصے سے ادب کو دیہات سے جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے اور قلم کاروں میں یہ احساس پھر سے جاگ اٹھا ہے کہ انہیں اپنی تخلیقات کے لئے جاندار کردار دیہات سے بھی مل سکتے ہیں جو کھلی دھوپ اور کھلی ہوا اور کھلے کھیتوں میں پرورش پاتے ہیں اور جن کے ذہنوں پر چمنیوں کے دھوئیں کی کالک نہیں جمی ہوتی۔ ادیبوں کی یہ کوشش اردو ادب میں ایک نیا تجربہ ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ پرانے تجربے کا ہی ایک نیا روپ ہے۔ ''دھرتی سدا سہاگن'' ایسی ہی ایک کوشش ہے۔''

اس کوشش کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں ٹوٹے یا ٹوٹتے ہوئے ''انسانی رشتے'' جوڑنے کو ساتھ رکھ کر اس کی خدمت تو کرتا ہے، اپنے چچا درگا داس اور چچی سوما کو بھی، جن کا فرزند نالائق اور آوارہ ہے، خود سے الگ کرنے کے لئے تیار نہیں، یہاں تک کہ اپنے والدین کی موت کے بعد بھی چچا اور چچی کو اس اولڈ پیلپس ہوم میں داخل کرانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا جس کی تعمیر، ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے، اس کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ برکت رام اپنے بزرگوں کو اپنے خانداں کے لئے رحمت نہیں، رحمت سمجھتا ہے اور اپنے مضبوط کردار سے اپنی محبوب بیوی کو بھی گویا یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے لئے مجبور کر دیتا ہے کہ زندگی کا مقصد محض خود غرضی اور تنگ نظری پر مبنی ذاتی عیش و عشرت نہیں، انسانیت اور شرافت کا فروغ ہے۔ بوڑھوں کے لئے آشرم یقیناً بے سہارا لوگوں کے لئے ایک عمدہ پناہ گاہ ہے۔ مگر جن معمر لوگوں کے عزیز ان کو سنبھالنے کے لئے موجود ہوں اس کی فطری اور مناسب جگہ ان کا خاندان ہی ہے۔

ان ناولوں کے موضوعات پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار ایک بہت حساس، باشعور اور فلاح پسند انسان ہے۔ وہ اپنے زمانے کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے، تاریخ پر اچھی نظر رکھتا ہے، موجودہ سماج کے مسائل سے اس کی دلچسپی بہت گہری ہے اور وہ ان کے حل کے لئے بے قرار ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اعلیٰ انسانی و تہذیبی قدریں بے حد عزیز ہیں۔ لیکن یہ ساری خوبیاں محض رومانی جذباتیت پر مبنی نہیں، بلکہ ان کا سرچشمہ ایک زبردست حقیقت پسندی ہے، جو ایک پسندیدہ آدرش کو روبہ عمل لانا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول نگار اپنی زمین سے بڑی مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ نہ صرف دیہات کی کھلی، صاف اور روشن فضا کا شیدائی ہے، بلکہ گاؤں کی مشکلات سے بھی

واقف ہے۔ چنانچہ وہ پسماندہ، جاہل اور سادہ لوح عوام کے احساسات کی بخوبی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی اشد ضروریات پر روشنی ڈالتا ہے اوران ضروریات کی تکمیل کی راہیں بھی تجویز کرتا ہے۔ لیکن ماحول کی بہتری کے لئے ناول نگار جدوجہد کے جو راستے دکھاتا ہے ان میں تشدد آمیز انقلاب کے نعرے نہیں، مختلف طبقات کے درمیان مفاہمت ومصالحت کے اشارے ہیں۔ یہ ایک اصلاحی وفلاحی نقطۂ نظر ہے، جو اردو افسانہ وناول میں پریم چند کا ورثہ ہے۔

جناب کشمیری لال ذاکر اپنے ایک اعتراف کے مطابق ہی، جس کا حوالہ قبل دیا جا چکا ہے، اردو فکشن میں اس کے ایک عظیم فن کار پریم چند کی روایات کے امانت دار اور علم بردار ہیں۔ اس لئے انہوں نے شہر سے دیہات کی طرف واپسی کا راستہ اختیار کیا ہے اور چھوٹے کسانوں کی زندگی سے بحث کی ہے۔ یہ گویا صنعتی انقلاب سے پہلے کے زراعتی ہندوستان کے معاشرے کی تصویر کشی ہے۔ لیکن اسے ایک سادہ سی دہقانیت نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ جس ہندوستانی سماج کی مرقع نگاری جناب کشمیری لال ذاکر نے کی ہے وہ تقسیم ہند کے آس پاس اس کے بعد یعنی بیسویں صدی کے دوسرے نصف کا جدید ہندوستان ہے، جس نے ہر قسم کی سیاسی، معاشی، سائنسی، صنعتی اور تکنیکی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ اس نصب العین کے اثرات کا علم بھی ناول نگار کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیقات کے موضوعات اور کردار رنگ زمانہ سے متاثر ہو کر ہی اصلاح احوال کا نقشہ پیش کرتے ہیں، خواہ وہ نئی آزاد بستیاں بسانے کی بات ہو، عقد بیوگان ہو، بوڑھوں کا آشرم ہو، یہ سب نکات دور جدید کی ذہنی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ البتہ ان تبدیلیوں کو جن اخلاقی حدود کا پابند اور تہذیبی قدروں کا آئینہ دار دکھایا گیا ہے وہ دور قدیم کی خوبیاں ہیں۔ اس طرح جناب کشمیری لال ذاکر نے قدیم وجدید کے درمیان توازن وتعاون کی ایک اچھی کوشش کی ہے۔

تقسیم ہند کا المیہ تاریخ انسانی کے نہایت دردناک اور ہلاکت خیز واقعات میں سے ایک ہے۔ یہ ہندوستان کی آزادی کی سیاست کا نتیجہ تھا، جس کی ذمہ داری کا تعین بحث طلب اور سخت نزاعی امر ہے۔ حقیقت یہ ہے، جیسا اب دستاویزی طور پر ثابت ہوگیا ہے۔ (ملاحظہ ہو، ایچ، ایم، سیروائی کی کتاب Partition of India کہ آخری برطانوی وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے اپنی حماقت وشرارت سے ہندو اور مسلمان، کانگریس اور لیگ دونوں کو بے وقوف بنا کر انہیں مجبور کر کے برطانوی سامراج کی آخری لات آزادی کے لئے تڑپتے ہوئے برصغیر کے منہ پر ماری اور تقسیم کی جس پالیسی پر برطانیہ کا سو سالہ اقتدار ملک میں کاربند تھا ٹھیک اس کے مطابق ہی ہندوستان کو دو حصوں میں اس عیاری سے باٹا کہ

سرحدوں کے دونوں طرف قتل و غارت کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اس تہلکے میں انسانیت تباہ ہوئی، لاکھوں انساں اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے، اپنی جان و مال و آبرو گنوا بیٹھے۔ وحشت و بربریت کی اس عام فضا میں بہرحال کچھ افراد ایسے بھی تھے جنھوں نے تہذیب کی بچی کھچی قدروں کی حفاظت کی۔ جناب کشمیری لال ذاکر نے 'کرماں والی' اور 'ڈوبتے سورج کی کتھا' میں ایسے ہی انسانیت دوست کرداروں کو، جو ہندو بھی ہیں، سکھ بھی، مسلمان بھی، ایک ولولہ انگیز خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے تاریکی میں چمکتی ہوئی تحلیوں کی منظر نگاری کی ہے۔ یہ ایک مثبت اور تعمیری مطمع نظر ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار قنوطیت پسند نہیں، رجائیت پسد ہے۔ وہ کسی تشکیک میں مبتلا نہیں، وہ انسان سے مایوس نہیں ہوتا، رندگی کے اعلیٰ تصورات پر اس کا ایمان پختہ ہے، اسے امید ہے کہ حالات بہتر ہوں گے۔ تقسیم ہند کے موضوع پر جناب کشمیری لال ذاکر کی کاوشیں اس سلسلے میں تخلیق کئے گئے اردو فکشن میں بیش قیمت اضافے ہیں، جن کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان میں جانبدارانہ و فرقہ وارانہ سیاسی پروپیگنڈے سے کام نہیں لیا گیا ہے، صرف ماجی صورت حال پیش کر کے انسانیت کے درد و داغ و جستجو و آرزو کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایسی عکاسی سے فرقہ وارانہ مفاہمت میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسی حقیقت پسدی بھی ہے جو واقعات کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ اس کو حق پسندی یا صداقت پسندی سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح فن کار نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

''انگوٹھے کا نشان'' اور ''دھرتی سدا سہاگن'' میں جناب کشمیری لال ذاکر نے نہ صرف یہ کہ ہندوستانی دیہات میں فطرت کی خوب صورتی اور انساں کی سادگی کا دل کش ماحول پیش کیا ہے، بلکہ اس ماحول کے جو مسائل ہیں اور ان کے حل کے لئے جو جدید رحجانات پیدا ہو رہے ہیں ان کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ناول نگار محض ایک گزرے ہوئے دور کی شیریں یادوں میں امیر نہیں، آنے والے دور کے خوش گوار حواب بھی دیکھتا ہے۔ اس طرح وہ ماضی سے رشتہ برقرار رکھتے ہوئے مستقبل کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں رمانہ حال کے ساتھ اس کی وابستگی کا ثبوت بھی ملتا ہے، اس لئے کہ اس کی ساری فکر عصر حاضر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی عصری حسیت ہے جس میں روشن خیالی کا عنصر فقط نظریات پر مشتمل نہیں واقعات پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث قصوں میں سب سے نمایاں نکتہ رمین کی حقیقی صورت حال سے فن کار کی گہری اور وسیع واقفیت ہے۔ اس واقفیت کی بنا پر ناولوں میں دیہات کے مناظر کی ٹھوس تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس نقاشی میں کاشت کاری کی جزئیات کے ساتھ ساتھ کاشت کاروں اور دیگر دیہاتی کرداروں کے عادات و خصائل بھی شامل ہیں۔ حالات پر کرداروں کا

رد عمل اور ان کی گفتگو کا انداز ہ بالکل قدرتی ہے۔ اس سے ماجرا کے ارتقا میں استناد پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی واقعیت ہے جس میں فطرت نگاری Naturalism اور حقیقت نگاری Realism کا ایک مرکب سامنے آتا ہے اور فنی برتاؤ میں متانت و دبازت رونما ہوتی ہے، سنجیدگی اور تہ داری نمودار ہوتی ہے۔

جناب کشمیری لال ذاکر ایک بامقصد فن کار ہیں، جن کا عہد تہذیبی اور اعلیٰ انسانی اقدار کے ساتھ استوار ہے۔ وہ کچھ ایسے اجتماعی افکار و خیالات رکھتے ہیں جو ایک سنجیدہ مطالعہ حیات پر مبنی ہیں۔ ان کا عوامی جذبہ Public Spirit اُنہیں عام انسانوں کی فلاحی جدوجہد میں ذہنی اعتبار سے شریک ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ لہٰذا وہ حق اور ناحق کی کش مکش میں غیر جانب دار نہیں رہ سکتے، نتیجتاً ظلم کے خلاف عدل کا پرچم بلند کرتے ہیں اور شر کے مقابلے میں خیر کے مبلغ بن جاتے ہیں، ایک مہم سر کرنا چاہتے ہیں، ایک مشن کی تکمیل انہیں مقصود و مرغوب ہے۔ چنانچہ فکشن کے ذریعے وہ ایک پیغام دینا چاہتے ہیں۔ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی ان کا مطمح نظر ہے اور ان کا فن ایک فکر کا آلۂ ترسیل ہے۔ یہ مقاصد کی بلندی ہی ہے جو فن کار کو اظہار و ابلاغ کے لئے خوب سے خوب تر کی جستجو کی طرف مائل کرتی ہے۔ اسی لئے وہ ایسے وسائل کی تلاش کرتا ہے جو اس کے قارئین پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہوں۔ تاثیر بیان کی اس کوشش کے سبب ہی زیر مطالعہ ناولوں میں ایک منظم ماجرا اور ایک محکم اسلوب کا سراغ ملتا ہے۔

چاروں ناولوں میں ماجرا کی ترتیب، بغیر کسی ابہام و اشاریت کے، بالکل واضح طور پر کی گئی ہے۔ کسی قسم کی علامت نگاری Symbolism اور چشمۂ خیال Stream of Consciousness کی کوشش کے بجائے ماجرا Plot کا ارتقا مسلسل و مربوط طریقے پر، سیدھے سادے انداز سے ہوتا ہے۔ چنانچہ شروع سے آخر تک قصے کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور کہانی کے مختلف مراحل کے متعلق تجسس برابر قائم رہتا ہے۔ قاری کی توجہ واقعات پر مرکوز رہتی ہے۔ یہ ناول نگاری یا افسانہ نگاری کی سب سے بڑی فنی کامیابی ہے، جو جناب کشمیری لال ذاکر کو پوری طرح حاصل ہوئی ہے۔ وہ بہت چابک دست فن کار ہیں اور اپنے ناولوں کے پلاٹ سوچ سمجھ کر، ایک منصوبے اور معین نقشے کے مطابق، بُنتے اور مرحلہ بہ مرحلہ، ایک فطری رفتار سے آگے بڑھاتے ہیں، گویا ایک خوبصورت عمارت تیار کر رہے ہوں۔ ''انگوٹھے کا نشان'' اور ''کرماں والی'' کے پلاٹ تو بالکل سیدھے سادے ہیں، حالاں کہ اول الذکر کے برخلاف، جس میں ایک ہی بستی کا قصہ ہے، ثانی الذکر میں دو ملکوں کی کہانی ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ دھرتی ایک ہی ہے، سارے کردار ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں، ان کا خمیر ایک ہی قسم کے آب و گل سے اٹھا ہے، خواہ سیاست وقت کی لکیر نے سرحدیں تقسیم کر دی ہوں۔ کرماں والی کی داستان حیات تقسیم کے جھلکے کے

دو حو ایک ہی انداز سے اُبھرتی، پھیلتی اور ختم ہو جاتی ہے، اس کی زندگی کے نشیب و فراز ایک ہموار زمین پر رونما ہوتے ہیں، وہ ہندوستاں کی ایک نیک، مانوس اور محبت کرنے والی عورت ہے جس کی نفسیات میں زمانے کے انقلابات گرہیں نہیں ڈالتے، اس کے شعور میں کوئی ناقابل حل پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی، ماحول کی مشکلات سے اس کے ذہن میں کوئی ایسی الجھن نہیں آتی جو اس کے حقیقی کردار کو مسخ کر دے۔ اس لئے اس کی زندگی کا ماجرا معمولی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور عبرت انگیز ہے۔

''دھرتی سدا سہاگن'' کا ماجرا تو اتنا مربوط اور اس کا ارتقا اتنا منظم ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نظم لکھی گئی ہے، ایک محل تراشا گیا ہے، اس کے اجزا کی ترتیب اور عناصر کی ترکیب ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی تعمیر کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ناول کی ہیروئن، کیرتی گاؤں کی ایک ایسی ہونہار بیٹی ہے جو بیوہ ہونے کے باوجود زندگی کا حوصلہ برقرار رکھتی ہے اور عوامی خدمت کے ولولوں سے معمور بلکہ سرشار ہے۔ وہ جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی نیک سیرت۔ اس کے گفتار و کردار میں ایک وقار ہے۔ گاؤں کا ہونہار بیٹا شیتل، جنگ میں ایک ٹانگ کھو کر جب گاؤں لوٹتا ہے تو ہر لحاظ سے کیرتی کا رفیق بن جاتا ہے۔ اس کی مردانہ جرأت میں بصیرت بھی ہے۔ اسے بھی جسمانی طور پر قدرے معذور ہونے کے باوجود ایک نشاط کار ہے، جس کی بنا پر اپنے خلوص اور تحمل کے سبب وہ بستی کا قائد بن کر عوام کے سامنے آتا ہے۔ کیرتی اور شیتل کے تھمے تھمے جذبات اس کے معنی خیز مکالمے اور ان کے دل نواز طور طریقے ایک پس ماندہ دیہات میں قابلِ رشک حد تک حسین ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ ناول نگار نے اس ماحول کی تصویر کشی جن لکیروں اور رنگوں سے، انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ کی ہے وہ بہت سُبک، سُحل اور سڈول ہیں، سرگرمیوں کا ہر پہلو برمحل، مکالموں کا ہر فقرہ چست، اور کرداروں کی ہر جنبش موزوں ہے۔ قصّے کی سب جہتیں اس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں کہ گاؤں کے اُبھرتے ہوئے نئے نقشے سے جن کرداروں کو اختلاف ہے وہ بھی بالآخر اپنے آپ کو بدل کر نقشے کے اندر ایک مناسب جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ نیکی رام، ٹھاکر دولت کا کا، گلابی جیسے چھوٹے چھوٹے کردار بھی ایک تناسب سے اپنی اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ سب چھوٹے بڑے اشخاص مل کر اپنے قول و فعل سے ایک متوازن مجموعے کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایسے سانچے میں ڈھلے ہوئے ناول کم لکھے گئے ہیں۔ اجتماعی عمل میں انفرادی سوز و گداز کا ایسا مرقع بھی زیادہ نہیں ملتا۔ اس ناول میں فکر و فن کی پیوستگی نے زندگی کے سنگلاخ کو پگھلا کر شعر میں تبدیل کر دیا ہے۔

''ڈوبتے سورج کی کتھا'' کا ماجرا بھی دوسرے ناولوں ہی کی طرح منظم اور واضح ہے۔ لیکن فن کار نے اس میں کچھ جدت کی ہے۔ بعض مقامات پر دو ابواب کے درمیان شاید زمان و مکان اور نسلوں کے

فاصلے طے کرنے یا ان کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے لئے چند اشارات سے کام لیا ہے، حالاں کہ اس
ضرورت نہیں تھی اور اس سے کسی وضاحت کے بجائے تھوڑا سا ابہام پیدا ہوتا ہے، جب کہ عمومی طور
ابواب کی تقسیم بجائے خود ماجرا کے مسلسل ارتقاء کے لئے کافی ہے۔ بہر حال اس ناول میں دو نسلوں
قصے یکے بعد دیگرے بیاں کئے گئے ہیں، ایک طرف پہلی نسل کے درگا داس سوماں، دینا ناتھ اور را
ہیں، دوسری طرف دوسری نسل کے برکت رام، انجلی اور ولایتی لال ہیں، پھر پہلی نسل میں بھی بڑے بھا
اور چھوٹے بھائی الگ الگ ایک عرصے تک گویا متوازی لکیروں پر چلتے ہیں، گرچہ بعد میں آکر ایک
دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تقسیم ہند کی لکیر بھی کرداروں اور ان کے قصوں کو ایک دوسر
سے کاٹ کر الگ کرتی ہے۔ یہ سب باتیں پلاٹ میں تھوڑی سی پیچیدگی پیدا کرتی ہیں اور غالباً اس کو حل
کرنے کے لئے ناول نگار نے ابواب کے دوسرے کچھ نیم شاعرانہ اشارات کا استعمال کیا ہے، مگر دراصل
فن کار کی مربوط داستاں سرائی پیچیدگی کو قصے کی رفتار ترقی میں اپنے آپ کو حل کر لیتی ہے۔ البتہ دیہات
کے اُجڑے ہوئے ماقبل تقسیم کے کردار جب آزادی کے بعد ایک نئے شہر میں جمع ہوتے ہیں تو معلوم ہو
ہے کہ زمانہ بدل رہا ہے اور تاریخ کی رَو آگے بڑھ رہی ہے۔ ارتقا کے اس عمل میں مستقبل کے ساتھ ماضی
کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے فن کار نے ایک معنی خیز واقعہ اس طرح پیش کیا ہے کہ بوڑھوں کے آشر
کی تعمیر کے باوجود وہ اپنے سن رسیدہ چچا اور چچی کو اپنے ساتھ ہی ایک مشترک خانداں میں رکھتا ہے۔

زیر بحث ناولوں میں کردار نگاری بھی واضح اور موثر طور پر کی گئی ہے، نہ صرف رام پھل اور کلی را
(انگوٹھے کا نشان)، کرماں والی اور فیصے (کرماں والی)، کیرتی اور شیتل (دھرتی سدا سہاگن)، اور در
داس، سوماں، دینا ناتھ، راجو اور برکت رام جیسے بڑے کردار زندگی سے بھرپور، فعال اور سرگرم ہیں، بلکہ
بھگتو (انگوٹھے کا نشان)، اکبر خان، نوری، حوشیا، گرنتھی (کرماں والی)، دولت کا کا، نیکی رام، گلابی او
ٹھاکر (دھرتی سدا سہاگن) اور پھمی، اللہ دتا، انجلی اور ولایتی لال (ڈوبتے سورج کی کتھا)، جیسے چھوٹے
کردار بھی منفرد و ممتاز اور اہم ہیں۔ ان میں اکثر کردار مثبت، تعمیری اور صالح ہیں، جب کہ منفی، تخریبی او
مفسد اشخاص بھی بالآخر اگر بدلتے نہیں تو بے اثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ فن کار صرف
اچھے عناصر کی موثر کردار نگاری کر سکتا ہے اور برے عناصر کی کردار نگاری اس کے بس کی بات نہیں
''دھرتی سدا سہاگن'' میں مراری اور رام سیوک کے علاوہ ''ڈوبے سورج کی کتھا'' میں پھمی اور ولایتی لال
کے کردار ثابت کرتے ہیں کہ ناول نگار کا قلم روشنی کے ساتھ ساتھ سائے کی تصویر کشی بھی بخوبی کر سکتا ہے
پھمی کا کردار تو لافانی ہے، اس کا نفسیاتی انحراف Perversion اسے بدی کا ایک فرشتہ یا بدروح evil

Genius بنا کر پیش کرتا ہے، وہ گویا مجسم شر ہے، جس نے ایک پورے خانداں کو برباد کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے یہاں تک کہ اپنے بھائی درگا داس اور اس کی بیوی سوماں جیسے فرشتہ صفت جوڑے کے اکلوتے فرزند، ولایتی، کو اس نے ماں باپ کے راستے سے ہٹا کر اپنے راستے پر لگالیا ہے اور چھمی کی غلط شخصیت کا اثر اتنا زبردست ہے کہ گویا دلی کے گھر میں ولایتی جیسا شیطان پیدا ہوتا ہے۔

جناب کشمیری لال ذاکر کا اسلوب نگارش سادہ و پُرکار ہے وہ عام طور پر چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال بڑی سلاست سے کرتے ہیں اور یہ جملے اپنے سیاق و سباق میں بہت معنی خیز اور خیال انگیز ہوتے ہیں، بعض اوقات تو کرداروں کے مکالمے اشعار کی طرح موروں، چست اور ایسے برجستہ فقروں پر مشتمل ہوتے ہیں جس سے مضمرات اور اشارات کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں خاص کر ''دھرتی سدا سہاگن'' میں شیتل اور کیرتی کی گفتگو نہایت دلچسپ، حسین اور پراثر ہے۔ دونوں کی محبت کا اظہار اس گہرائی سے ہوتا ہے کہ اس کی ہر بات تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ عام طور پر ناول نگار کا طرز بیاں نکتہ سنجیوں سے معمور ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ جابجا دیہاتی فضا کی خوبصورتی کا نقشہ کھینچتا ہے تو ایک مصور کی طرح مختلف کیفیات کی عکاسی و نقاشی کرتا ہے۔ یہ بہر حال سادگی کا حسن ہے جسے حسن معنی یا فطری حسن کہنا چاہیے۔ اس لئے کہ اس میں آرائشگی کے زیوروں کا استعمال کم سے کم ہوتا ہے۔ کہاں جاسکتا ہے کہ ناول نگار کے اسلوب میں اس دھرتی کی بوباس ہے جس کی تصویر کشی اس کا مقصود ہے۔ اس اسلوب کی ارضیت ان مکالموں سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو ہر قسم اور ہر طبقے کے کردار اپنی ٹھیٹ زباں میں ادا کرتے ہیں، وہ بلا تکلف پوری روانی کے ساتھ پنجاب کے کسانوں اور مزدوروں کی بولی بولتے چلتے جاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً پنجابی کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناول نگار نے متعدد الفاظ پنجابی محاورے میں ادا کیئے ہیں۔ اس سے انداز تحریر میں مقامی رنگ و آہنگ کی چاشنی پیدا ہوتی ہے اور حقیقت نگاری کا احساس ابھرتا ہے۔ لیکن پنجابی فضا میں ہندی کا استعمال جس کثرت سے کیا گیا ہے وہ بہت موروں نہیں اور اس سے بعض اوقات سلاست میں فرق آتا ہے، گرچہ اس کے سبب مجموعی طور پر خوبی تحریر زیادہ مجروح نہیں ہوتی

> ''مزدوروں کے واپس آجانے سے زندگی ایک بار پھر لوٹ آئی تھی۔ دھرتی کے اس ٹکڑے پر شاید پہلی بار عورتوں کے قہقہے گونجے تھے اور بچوں کی کلکاریوں کی پھلجھڑیاں فضا میں چھوٹی تھیں اور لڑکیوں کی کلائیوں میں پڑی کانچ کی چوڑیاں کھنکی تھیں۔ یہی تو ہیں زندگی کے آثار۔ دل کی دھڑکن، قہقہوں کی گونج، بچوں کی

مسکراہٹ، رخساروں کی دمک، گیسوؤں کی خوشبو اور اب زندگی نے اپنی بانہیں پھیلا کر انسانوں کے ایک ہجوم کو اپنے میں سمیٹ لیا تھا۔ زندگی کی بانہوں میں مضبوطی بھی تھی اور لچک بھی۔ اس میں حرارت بھی تھی اور خنکی بھی۔ اس میں سورج کی آگ بھی تھی اور برف کی ٹھنڈک بھی۔ زندگی کی یہی متضاد کیفیتیں ہی تو اسے رنگ اور سدرتا اور دلکشی بخشتی ہیں۔"　　(ص ۲۶ 'انگوٹھے کا نشان')

"ہندو اور سکھ اپنے پڑوسیوں سے گلے مل کر انہیں الوداع کر رہے تھے اور رو رہے تھے۔ جانے والے بنا اپنی منزل کے صحیح تصور کے اپنی مرضی سے جا رہے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہی تو ایک مشترکہ دولت تھی جسے جانے والے فراخ دلی سے بانٹ رہے تھے اور جو نہیں جا رہے تھے وہ ان موتیوں کو بیش بہا خزانہ سمجھ کر سمیٹ رہے تھے اپنے دامنوں میں کہ یہی وہ کھلیان تھے جو اس طرح کی فصلوں کے پک جانے پر سمیٹے جاتے ہیں۔ وداع کرنے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ یہ سب اپنے اپنے حساب چکا رہے تھے۔ کسی کے سر پر کوئی قرضہ نہ تھا۔ سب سرخرو تھے۔ لیکن جس کے سر پر قرضے کا بوجھ لدتا جا رہا تھا اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ وہ تھا پرانا، بوڑھا اور پارینہ کلچر جو گاؤں کی آخر حد پر اُگے صدیوں پُرانے برگد کے درخت کی طرح خاموش کھڑا تھا اور جس کی لمبی لمبی جڑیں زمین کا رس چوس کر نئی نئی شاخوں کی شکل میں دھرتی کی امانت کو سنبھالے اس لمحے کا انتظار کر رہی تھیں جب اکثریت اور اقلیت کے نام پر تاریخیں نہیں لکھی جائیں گی بلکہ ان قدروں کے نام پر مرتب کی جائیں گی۔ جن قدروں سے انسانیت کو بقا ملتی ہے۔"

(ص ۶۹۔۶۸ اکرماں والی)

"سردیوں کا موسم ہونے کے کارن دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ شیتل نے ریلوے اسٹیشن کے دونوں طرف آنکھ بھر کر دیکھا۔ کھیتوں میں سرسوں پھول رہی تھی۔ فصلیں جوان ہو رہی تھیں۔ فصلیں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہر موڑ سے گزرتے ہوئے خوبصورت لگتی ہیں۔ بیج جب مٹی کی گیلی گیلی تہوں سے نکال کر پھنگیوں کو باہر اچھالتے ہیں تو رات دن کام کرنے والے کسانوں کی آرزوئیں جاگ جاتی ہیں اور جب دن

کی دھوپ، رات کی چاندنی اور پچھلے پہر کی شبنم پی کر فصلیں پروان چڑھتی ہیں تو ان کی سرسراہٹوں سے کنواریوں کے سپنے تشکیل پاتے ہیں اور جب یہ اناج کی بالیوں کے بوجھ سے لد کر جھکتی ہیں اور اس کی رنگت پک پک کر سونے کا روپ دھار لیتی ہے تو دھرتی کے بیٹوں اور بیٹیوں کے سپنے جواں اور مضبوط ارادوں سے اُبلنے لگتے ہیں، پہاڑی جھرنوں کی طرح جس میں صاف اور شفاف پانی گنگناتا رہتا ہے۔"

(ص ۹ دھرتی سدا سہاگن)

" لیکن کچھ لوگ اب بھی ایسے تھے جنہیں یہ یقین تھا کہ اگر ملک تقسیم بھی ہو گیا تو دل تقسیم نہیں ہوں گے۔ روایات نہیں مٹیں گی۔ رشتوں کے ٹکڑے نہیں ہوں گے۔ انسانی قدروں کو نہیں مانا جائے گا۔ کیوں کہ انسانی قدریں ہی انسانی تہذیب کی امانت دار ہیں اور یہ وہی لوگ تھے جو اپنا گھر چھوڑ کر نہیں گئے تھے اور نہ ہی انہوں نے ریفیوجی کیمپ میں پناہ لی تھی۔ ان کی پناہ گاہ تو انساں کی وہ عظمت تھی جس سے زیادہ محفوظ پناہ اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔ ان چند لوگوں میں درگا داس بھی تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود بھی وہ انسانی رشتوں کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔"

(ص ۱۵۴ اڈوبتے سورج کی کتھا)

یہ اقتباسات جناب کشمیری لال ذاکر کے فکر و فن دونوں کے غماز ہیں۔ پہلے اور تیسرے اقتباسات میں جو حوش ہے وہ ناول نگار کی اپنی زمین کے ساتھ محبت اور اپنے سماج سے عشق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عوام کی دوستی کا ایک ولولہ بھی اس میں شامل ہے اور حسن فطرت کا احساس بھی۔ دوسرے اقتباس میں فرقہ وارانہ اتحاد کا وہ جذبہ نمایاں ہے جو انسانی اقدار کے احترام پر مبنی ہے۔ چوتھا اقتباس بھی اس عظمت انسانی پر دلالت کرتا ہے، جو اولادِ آدم اور ابنائے وطن کی وحدت پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا عبارتوں میں جو کچھ بھی ہے فن کار کے حقیقی تجربات اور خیالات کا اظہار ہے۔ اس لئے اصلیت، خلوص اور صداقت کا مظہر ہے۔ لفظوں اور جملوں کی سادگی اور روانی اسی عنصر کے سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیان گداز اور شیرینی ہے، اس کے ساتھ ہی متانت و صراحت ہے۔ یہ بامقصد معنی آفرینی ہے، محض فن کی لفاظی نہیں۔ ایک اچھی زندگی کی تڑپ ہر سطر سے ہویدا ہے۔ اس انداز تحریر سے ایک دلچسپ، کارآمد اور پُر اثر اسلوب نگارش کا سراغ ملتا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر جناب کشمیری لال ذاکر عصر حاضر میں اردو کے ایک اہم ناول نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ان کے ناول یقیناً مختصر ہیں اور بعض ناولٹ بھی کہے جاسکتے ہیں، جیسے ''دھرتی سدا سہاگن'' مگر اس اختصار کے باعث ان کی فنی خوبیوں میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی، صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے زمانے کی زندگی کی داستاں سرائی نہیں کی ہے۔ لہٰذا ان کی تخلیقات میں وسعت اور شرح وبسط کی کمی ہے، لیکن دیکھنے کی اصل بات یہ ہے کہ اپنے ناولوں میں فن کار نے جس موضوع پر روشنی ڈالی ہے وہ موضوع بھی اہم ہے اور روشنی بھی اس پر اچھی طرح پڑی ہے، یعنی موضوع کے انتخاب میں سلیقے کے ساتھ ساتھ اس کا حق ادا کیا گیا ہے۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ ناول نگار کا مطمح نظر پنجاب کی سرزمین اور اس کے عوام کا مطالعہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک محدود موضوع و مواد ہے، لیکن یہ ایک معین موضوع مواد ہے، جس سے فن کار پوری طرح واقف ہے اور اس کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ یہ اس کی کامیابی کی دلیل ہے اور اس کی تخلیقات میں تاثیر کا راز بھی ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ناول نگاری سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ ماجرا کی ترتیب میں زیادہ مشکل نہیں پیش آئی اور فکشن کے بہت واضح ہیولے خوب صورتی کے ساتھ تشکیل دیئے گئے۔ انہی حدود میں اور انہی کمالات کے ساتھ چند یادگار کردار تخلیق کئے گئے جن کے اقوال وافعال سے چند کارنامے منسوب ہوئے۔ ان کرداروں کے بیانات و اقدامات ایسے واقعات کی تصویر کشی کرتے ہیں جو انسانی تاریخ میں کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس تصویر کشی میں ان اعلیٰ قدروں کی نشان دہی کی گئی ہے جو زندگی کے وقار و اعتبار کی ضامن ہیں اور جس کے بغیر تہذیب کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ سب سے بڑھ کر زباں وبیاں کا وہ انداز ہے جس سے نثر کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نکات واضح کرتے ہیں کہ جناب کشمیری لال ذاکر نے اپنے ناولوں میں مقصد کی متانت کو فن کی نفاست کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی ان کی ناول نگاری کا کارنامہ ہے۔

کشمیری لال ذاکر کا تازہ ترین ناول ''میرا شہر ادھورا سا'' جس کے مطالعے کا موقع مجھے مذکورہ بالا سطور لکھنے کے کچھ دنوں بعد ملا، نہ صرف یہ کہ موصوف کا سب سے بڑا تخلیقی شاہکار ہے بلکہ اس کا شمار اردو کے بہترین ناولوں میں کیا جانا چاہئے۔ اس کا پورا ماجرا آزاد ہندوستان کے نوتعمیر شہر چنڈی گڑھ کی آبادی و زندگی کے گرد گھومتا ہے اور اس میں دکھایا گیا ہے کہ جدید تمدن نے انسانی تہذیب پر کتنا غلط اثر ڈالا ہے۔ گرچہ انسانی قدریں ابھی بعض افراد اور خاندانوں میں باقی ہیں، مگر نئی نسل بے مہار آزادی کی ایک ایسی راہ پر چل پڑی ہے جس کی منزل ترقی نہیں، تباہی ہے۔ اس طرح یہ عظیم ناول پرانی نسلوں کے مقابلے سے سماج پر پڑنے والی روشنی اور اس کے داغوں کا عکاس بھی ہے۔ ناول میں فطرت کے مناظر کی تصویر کشی

بھی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ لیکن ایک خوبصورت قدرتی ماحول میں بسنے اور رہنے والے انسان کس طرح طبقوں اور حلقوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے بیگانہ ہو رہے ہیں اس کی منظر نگاری بھی کی گئی ہے۔ یہ گویا ایک عمرانی و معاشرتی مطالعہ ہے، جس کے پس منظر میں معمول کے مطابق ذاکر کے فکشن کا وہ خاص عنصر بھی موجود ہے جو تقسیم ہند کے المیے اور تہلکے پر مبنی ہے۔

یہ ناول کا حقیقت پسندانہ تناظر ہے، اس لئے کہ فکشن ہمیشہ اپنے دور اور ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس تناظر میں ذاکر نے انسانی تعلقات کے وہ پیچ وخم اور نشیب وفراز دکھائے ہیں جن سے آفاقی قدروں کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ رَچنا اور سیما دو جواں جدید تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں جو آج کے نئے ماحول میں پرواں چڑھی ہیں، گرچہ ان کے طبقاتی پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اس لحاظ سے ذہنیتیں بھی مختلف۔ رچنا کے والدین متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جب کہ سیما کے اعلیٰ طبقے سے۔ رچنا کے خانداں میں روشن خیالی ہے۔ مگر آزادروی نہیں، مگر سیما کے خانداں میں آزادروی ہے۔ چنانچہ رچنا بہت محتاط، متین اور میانہ رو ہے، لیکن سیما بے پروا، شعلہ مزاج اور بے راہ رو ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیما بھٹک کر بکھر جاتی ہے اور رچنا ایک سیدھے راستے پر چلتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالے رہتی ہے۔

بہرحال، ایک المیہ دونوں کی زندگی میں رونما ہوتا ہے۔ سیما کو تو ہر وہ مرد دھوکا دیتا ہے جس سے اس کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ گویا اپنی سیماب وشی کا شکار ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ وہ دل سے نسل انسانی کی حفاظت اور پرورش کرنا چاہتی ہے۔ رچنا کا محبوب ہند پاک جنگ کا لقمہ بن جاتا ہے اور وہ بجھ کر رہ جاتی ہے، گرچہ اس کی سلیم الطبعی میں کوئی فرق نہیں واقع ہوتا۔ دونوں لڑکیاں دوسروں کے لئے ہمدردانہ جذبات رکھتی ہیں اور دردمندی ان کے مزاج سے بڑھ کر ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

قصے کی گہری دلچسپی کے ساتھ ناول میں عمدہ ماحول سازی اور کردار نگاری بھی ہے، گرچہ بعض وقت زمانے کے نئے رجحانات کی عکاسی کے لیے کہیں کہیں ہلکی سی عریانی بھی پیدا ہوگئی ہے، جس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ اس طرح زباں و بیاں کے حسن کے باوجود جا بہ جا ہندی کے بعض ثقیل الفاظ کا استعمال بلاضرورت کیا گیا ہے اور اس وجہ سے سلاست میں تھوڑا فرق آگیا ہے۔ ممکن ہے یہ شمالی ہند میں دیوناگری ہندی کے سیاسی غلبے کا اثر ہو، مگر ادبی اعتبار سے اس کا کوئی جواز اور فائدہ نہیں۔ ناول کا انجام ذرا مبہم ہے۔

اس ناول کو پڑھ کر ڈکنز کا ناول A Tale of two Cities یاد آتا ہے، گرچہ ذاکر کے چنڈی گڑھ کا افسانہ بالکل اور بیجل اور انگلستان یا فرانس کے بجائے اس میں ہندوستان کا خاص ماحول جلوہ فگن

ہے۔ اس میں کسی انقلاب کی داستان نہیں، مگر زمانے کی تبدیلیوں کا نقش ضرور ملتا ہے اور اس کے مطالعے سے عصری حسیت کا سراغ ملتا ہے۔ پورا قصہ ایک مخصوص ماحول میں آج کے انساں کے شعور اور کردار کی کش مکش کا ایک آئینہ ہے۔ اس قصے سے برصغیر ہند و پاک کے ذہین افراد کو عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ چنڈی گڑھ کا ادھورا سا شہر غیر منقسم ہندوستان کی بربادی سے آباد ہوا ہے اور اس کے بعض شہریوں کا المیہ ہند پاک جنگ کی وجہ سے رونما ہوا ہے۔ اس طرح ہندوستاں یا پاکستان کے موجودہ سماج پر دونوں کی باہمی چپقلش سایہ فگن ہے۔ آنے والی نسلیں اگر باہمی مفاہمت و مصالحت سے اس سائے کو روشنی میں تبدیل کرسکیں تو شاید ادھورا سا شہر کبھی اور کسی حد تک پورا ہو جائے، گرچہ عصر حاضر میں اقدار کی تباہی کا مسلسل عمل کس طرح بند ہوگا اور تعمیر کے رخ پر آئے گا، اس سوال کا جواب ناول سے نہیں ملتا اور نہ شاید جواب دینا ناول نگار کا مقصد تھا، وہ صرف ایک سوال اٹھانا چاہتا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ یہی ناول کی کامیابی اور اس کے فن کی عظمت کی دلیل ہے۔

ہارون ایوب

''سیندور کی راکھ'' — میری نظر میں

ناول کو عہد جدید کا رزمیہ کہا جاتا ہے اور یہ بالکل سچ بھی ہے کیونکہ آج کا ناول زندگی کے جن پیچ و خم سے دوچار ہے، اس کا اظہار صرف ناول میں ہی ممکن ہے کسی اور صنف میں نہیں۔ ناول ہی وہ صنف ہے جو اپنے اندر بہت کچھ سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اُردو ناول نگاری کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اس کی مقبولیت کسی دوسری صنف سے کم نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء ہماری زندگیوں میں ایک بہت اہم سال ہے، جسے ہم صدیوں تک فراموش نہیں کر سکیں گے۔ اس کا اثر ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا، جس کے نتیجہ میں ناول بھی متاثر ہوا۔ اور لاتعداد ناول تقسیمِ وطن، قتل و غارت گری اور خون ریزی کے موضوع پر لکھے گئے لیکن جب یہ دور دورا تھا تو ہمارے ناول نگاروں نے دوسرے مسائل کی طرف توجہ کی اور قارئین کو زیادہ گہرے شعور اور تجربات سے روشناس کرایا۔

جو ناول ۱۹۵۵ء کے آس پاس لکھے گئے، ان کا مقصد تھکے ہوئے ذہنوں کو تفریح کا سامان مہیا کرنا تھا۔ لیکن اسی زمانے میں ہمارے ناول نگاروں نے ایسے دل سوز واقعات پر بھی قلم اُٹھایا، جن کو پڑھ کر دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور وہ ناول ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ کشمیری لال ذاکر کا ناولٹ ''سیندور کی راکھ'' ان میں سے ایک ہے۔ یہ آپ کا ناولٹ ہے حالانکہ آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ۱۹۴۰ء میں کیا تھا اور جب سے برابر افسانے لکھ رہے تھے۔ لیکن اس ناولٹ کے منظرِ عام پر آتے ہی اُردو دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی کیونکہ نہ صرف اس کا موضوع نیا تھا بلکہ اس میں جو تکنیک اختیار کی گئی تھی، وہ اس وقت تک اتنی عام نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے بڑا نیا پن محسوس کیا گیا کیونکہ ذاکر صاحب نے سرگذشت اور ڈائری کی تکنیک کو ملا کر، اپنی زندگی کے سچے واقعات کو پیش کیا ہے کہ قاری اس میں بند ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ صرف اُسی وقت آزاد ہو پاتا ہے، جب ناولٹ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ ایک تاثراتی ناول ہے، جس میں کشمیری لال ذاکر صاحب نے اپنے دلی جذبات اور تاثرات کو پیش کیا اور یادداشت کا سہارا لیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ واقعات سچے اور حقیقی ہیں وہ سب کچھ ہے جو اُن کی زندگی میں پیش آیا ہے۔

اصل موضوع شریک حیات کے بچھڑ جانے کا غم ہے۔ جب ان کی ایک برسی کے موقع پر اس کی یاد آتی ہے تو پھر آتی چلی جاتی ہے اور غم شدید سے شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے جس کو ذاکر صاحب نے ناولٹ کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ہر قاری اس میں اپنی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا عکس دیکھ لیتا ہے، جو اس کی غم پسندی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

''میں نہیں جانتا کہ ان اوراق کو کہانی کہوں یا ناولٹ کہوں یا اپنی زندگی کی ایک جھلک کہوں۔ میں تو بس اس زخمی ہرن کی طرح ہوں، جس کے جسم میں شکاری کا تیر ہے اور وہ اس تیر کو لئے درد سے تڑپتے ہوئے بھاگے جا رہا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ میری روح کا تمام کرب میری انگلیوں کے پوروں میں سمٹ آیا ہے اور درد سے نڈھال انگلیاں خود کو گھسیٹتی جا رہی ہیں۔ میری گھائل شخصیت پناہ ڈھونڈتی پھرتی ہے اور جب اسے کوئی ایسا لمحہ یاد آتا ہے جب اسے کوئی شفیق سایہ میسّر آیا ہے تو پل بھر کو وہ جیسے جی اُٹھتی ہے کچھ ایسا ہی احساس ہو رہا ہے مجھے یہ صفحات لکھتے ہوئے۔''

(دیباچہ 'سیندور کی راکھ')

کشمیری لال ذاکر نے اس بات کا اعتراف اپنے دیباچہ میں کیا ہے کہ شریک حیات کے انتقال کے چند دن کے بعد مجھے یہ خیال آیا تھا کہ میں اس کی باتوں اور جذبات کو قلم بند کروں اور ایک ناول کی شکل میں پیش کروں لیکن اس وقت چند صفحات سے زیادہ نہ لکھ سکا تھا اور اب انتقال کے ۴ سال بعد اس کی یاد نے اس طرح گھیرا کہ میں برداشتہ قلم لے کر بیٹھ گیا — اور لکھنا شروع کر دیا — اس برجستہ اور قلم برداشتہ ناولٹ کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ پلاٹ میں کہیں جھول محسوس نہیں ہوتا۔ تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے کبھی سرگزشت کے انداز کو اپنایا ہے تو کبھی ڈائری کی تکنیک اختیار کی اور اپنی شریک حیات کی ڈائری کے صفحات نقل کئے ہیں تو کبھی سوچتے سوچتے ایک بار میں سے دوسری بات اس طرح پیدا کی ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ یہی اس ناولٹ کی سب سے اہم خوبی ہے۔

ناولٹ میں جن حادثات، واقعات اور تاثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ سب کے سب وہی ہیں جن کا سیدھا تعلق اُن کی بیگم ''شیلا'' سے ہے۔ شیلا کا کردار تراشتے ہوئے ذاکر صاحب نے بہت ہی حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ یعنی اگر وہ چاہتے تو اسے اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی کا ایک فرد بنا کر پیش کر سکتے ہیں، وہ اس کو ایک بہت ہی ذہین اور اعلیٰ سوجھ بوجھ والی خاتون کی حیثیت سے بھی پیش کر سکتے تھے، لیکن انہوں

ے حقیقت اور سچائی کو قائم رکھتے ہوئے ایک متوسط طبقے کی خاتون کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کیا ہے۔ اس حقیقی انداز اور فنکارانہ صلاحیت نے نہ تو کردار کو کمزور ہونے دیا ہے اور نہ ہی خوبیوں کا ایسا پتلا بنا دیا ہے، جو عام انسان میں نہیں پائی جاتی ہیں بلکہ ایک عام، چلتا پھرتا، جیتا جاگتا کردار بن کر قاری کے سامنے آتی ہے، جو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت کرتی ہے، اس کی لکھی ہوئی چیزوں کو پسند کرتی ہے، غرض اس میں عام ہندوستانی عورت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ذاکر صاحب چاہتے تو شیلا کے کردار کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتے تھے لیکن پھر ناولٹ حقیقت کے دائرے سے نکل جاتا۔ شیلا کے کردار کے علاوہ شکنتلا اور خود ذاکر صاحب کا اپنا کردار ناولٹ کے اہم کردار ہیں۔ شکنتلا کا کردار تو برسبیل تذکرہ درمیان میں آ گیا ہے۔ البتہ ذاکر صاحب نے خود اپنے کردار کو سنوارنے پر محنت نہیں کی ہے۔ دلچسپ اتفاق ہے کہ ذاکر صاحب آج جیسے ہمیں نظر آتے ہیں، بالکل ویسے ہی وہ اس ناولٹ میں بھی محسوس ہوتے ہیں— ساری توجہ شیلا پر مرکوز کردی ہے کیونکہ درد کی شدت اور شیلا کی کمی کا احساس اس بری طرح سے مصنف کے دل و دماغ پر غالب رہا ہے کہ اس کی وجہ کسی دوسری طرف گئی ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ذاکر صاحب خود کو ہیرو بھی نہیں بنا سکے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر نے اس ناولٹ کو آگے بڑھانے اور قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لئے میاں بیوی کی بے تکلف گفتگو کا سہارا لیا ہے، جو ناولٹ کو حقیقت سے بہت قریب کر دیتا ہے اور قاری کے جذبات میں ایک نئی ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔

> ''ذاکر! تم نے کس شان سے میرا نام لیا تھا۔ اتنے سلیقے سے شاید مجھے کبھی کسی نے نہیں پکارا، اب کوئی پکارے گا بھی نہیں۔ تمہاری آواز کا جادو، اور احساس کی گرمی کہاں سے لائے گا۔ تمہارے لہجہ کا گداز اور زبان کا لوچ کسے نصیب ہوگا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ نام لیتے ہوئے تمہارا سر آسمان سے اونچا ہو گیا تھا۔''

کشمیری لال ذاکر نے بڑی جرأت مندی سے ازدواجی زندگی کے شیریں اور طرب انگیز رموز پر سے پردہ اُٹھایا ہے کہ قاری پر ایک لطیف، شیریں خواب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ناولٹ ''سیندور کی راکھ'' اُس وقت اس کے ہاتھ سے چھوٹتا ہے، جب وہ ختم ہو جاتا ہے۔

> ''تم میری حرکات پر حیرت زدہ ہو رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس طرح بیٹھے

رہنا برا لگ رہا تھا۔ اب تمہاری پلکیں نیند کے بوجھ سے دبی جارہی تھیں۔ کلاک نے چار بجائے۔

لمحے ایک بار پھر آپس میں ٹکرائے۔

تم نے ایک دم چونک کر آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھا۔ ان میں جانے کتنے ہی جذبات گھٹے ہوئے تھے۔

میں آہستہ سے اُٹھا، سگریٹ کا آخری کش لیا اور اسی طرح فرش پر پھینک دیا اور اُسے پاؤں سے مسل ڈالنے کا خیال نہ آیا۔۔ کمرے میں اگر قیمتی قالین بچھا ہوتا تو یقیناً جل جاتا، کمرے کی دوسری چیزیں بھی جل جاتیں۔ تمہارا پلنگ، تمہارا سرخ ریشمی لباس، تمہاری بندی، تمہارا سہاگ، لیکن یہ برے خیال جانے کیوں میرے دماغ میں گھسنے لگا اور مجھے اس بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرے گھر میں قیمتی قالیوں کا نہ ہونا کتنا اچھا تھا۔۔۔ ورنہ تمہارا سہاگ۔''

جہاں تک ناولٹ ''سیندور کی راکھ'' میں منظر نگاری کا تعلق ہے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں ایسے مواقع بہت کم آئے ہیں جہاں مصنف کو منظر نگاری کے جوہر دکھانے کا موقع ملتا البتہ ذاکر صاحب نے ضرورت کے مطابق چھوٹے چھوٹے برجستہ جملوں سے اس طرح مناظر پیش کئے ہیں کہ پورا ماحول مکمل کر سامنے آجاتا ہے۔

''میں نے چاند کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے اُفق کی طرف بھاگ رہا تھا، جیسے کوئی اس کا انتظار کر رہا ہو اور اسے اشاروں سے اپنے پاس بلا رہا ہوں۔ میں تمہارے اور قریب سرک گیا۔ تمہارے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر۔۔۔ اور پھر۔۔۔!''

اس طرح کشمیری لال ذاکر نے ہلکی سی منظر نگاری کا سہارا لے کر ایک بہت حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، جو ناول میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر نے اس ناولٹ ''سیندور کی راکھ'' کا تانا بانا بہت سادہ اور عام فہم زباں میں بنا ہے۔ لیکن ناول کے تاثر میں کوئی فرق نہیں آنے دیا ہے۔ جو بات کہی ہے اس کا اندار اتنا دلکش ہے کہ وہ سیدھی دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ غرض اس ناولٹ میں آپ کو جگہ جگہ ایسے اقتباسات ملیں گے جو

حذبات نگاری کے بہترین سونے ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی دلکش جسے کہے جاسکتے ہیں، جو قاری کی توجہ ناولٹ سے ہٹنے نہیں دیتے ہیں۔

"اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ متوسط گھرانے کی ایک عورت جسے زندگی کا بوجھل چھکڑا دھکیلنا ہو، اپنی انگلیوں اور ناخنوں کی نفاست کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ اُن کی نفاست اور سُندرتا اس کے جیون کے میلے بھدے اور بے سلیقہ گھروندے میں دلکشی کا اضافہ نہیں کر سکتی، لیکن میں تمہارے ناخنوں کی خوبصورتی سے کتنا متاثر ہوتا تھا۔ یہ بھی تم جانتی ہو، تمہاری لمبی لمبی تراشی ہوئی انگلیاں کسی چیز کو پکڑتے سمے جب ذرا تھرتھرا جاتی تھیں تو فضا جیسے مرتعش ہو کر گنگنا اُٹھتی تھی ماحول میں جیسے ایک سنگیت سا بھر جاتا تھا۔ ذہن میں ایک نغمگی سی آنکھیں ملنے لگتی تھی۔"

الغرض "سیندور کی راکھ" میری نظر میں ایک ایسا ناولٹ ہے، جس میں سرگزشت اور ڈائری کے انداز میں لکھے جانے والے ناولوں کی تکنیک سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کشمیری لال ذاکر نے اپنی پرانی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ یہ ناولٹ کشمیری لال ذاکر کے تمام ناولوں سے بہت مختلف ہے کیونکہ فنی اعتبار سے، زبان و بیان کے لحاظ سے، اور منظر نگاری و جزئیات نگاری کی بنا پر یہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اور اُردو ناول نگاری میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

کشمیری لال ذاکر

اس صدی کا آخری گرہن

کومل آنند اور اجیت رندھاوا پریس روم میں بیٹھے آج کے اخباروں کی اہم خبروں کے تراشوں کو دیکھ رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ یہ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا۔

''اس کا مطلب ہے آج کا سورج گرہن اس صدی کا آخری مکمل گرہن ہوگا۔'' اجیت رندھاوا ایک نیوز کلپنگ کو غور سے پڑھنے کے بعد بولا۔

''ہاں، اور اگلے ڈیڑھ سو سال تک ایسا گرہن لگے بھی نہیں۔'' کومل آنند نے جواب دیا۔

''تو اس گرہن کو تو ہمارے پڑپوتے ہی دیکھ پائیں گے۔''

''اگر کبھی پڑپوتوں کے وجود میں آنے کا سانحہ دیا پر گزرا، تبھی تو۔''

''تمہارا خیال ہے ہمارے پوتے، بے اولاد ہی رہ جائیں گے؟''

مجھے تو لگتا ہے کہ خود ہمارا ونش بھی ہمارے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔''

''آثار تو ایسے ہی ہیں۔''

''دیکھو تمہیں تو صرف اپنی ماں ہی کو راضی کرنا ہے۔''

''اور تمہیں؟''

''مجھے اپنی ماں اور اپنے باپ دونوں کو۔''

''میں تو اپنی ودھوا ماں کو کسی نہ کسی طرح منالوں گی لیکن تمہارے سہاگ ردہ ماں باپ کبھی راضی نہیں ہوں گے۔

''وہ اپنی ذات برادری سے باہر نہیں جانا چاہتے۔''

''یہ بات تمہیں مجھ پر ڈورے ڈالنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔''

''تو اب کیا کروں؟''

''شام ہوتے ہی اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو جاؤ اور دوربین لے کر سورج گرہن کو دیکھنے کی کوشش کرتے رہو، جو ہندوستان کے کسی حصے میں بھی نظر نہیں آئے گا۔''

''مگر کیا کیا جائے؟''

'کینٹین کا چھوکرا چائے لے کر آرہا ہے، چائے پیو اور شادی وادی کا چکر چھوڑ دو۔''

یہ کہہ کر کومل ہنسی اور کینٹین کے چھوکرے سے چائے کے دو گلاس لے لئے، ایک اپنے سامنے رکھ لیا اور دوسرا اجیت رندھاوا کے سامنے سرکا دیا۔ اسی لمحے کئی دوسرے رپورٹر بھی پریس روم میں داخل ہوئے۔ سب نے ایک دوسرے کو وش کیا اور چائے کے ساتھ ساتھ اپنا اپنا بھاشن بھی جھاڑنے لگے، جیسا کہ پریس رپورٹر اکثر کرتے ہیں۔

الگ الگ موضوعات پر بات کرنے کے بعد سب نے ایک ہی مسئلے پر بات کرنا شروع کر دی اور وہ تھا آج کا سورج گرہن۔

ہزاروں کی تعداد میں سائنس داں اور گرہن کا نظارہ کرنے والے لوگ ہوائی اور میکسیکو میں جمع ہو رہے تھے۔ یہ سورج گرہن سب سے طویل وقفے کا گرہن ہوگا اور اس کے راستے کی چوڑائی ۲۵۶ کلومیٹر اور لمبائی ۱۴۹۹۶ کلومیٹر ہوگی، جہاں سے گرہن نظر آئے گا۔ انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق گرہن رات کو دس بج کر اٹھاون منٹ سے لے کر گیارہ بج کر دو منٹ تک سورج کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لے گا۔ اور چار منٹوں تک دن پوری طرح رات میں بدل جائے گا۔ امریکہ اور جنوبی کناڈا میں گرہن کا صرف کچھ ہی حصہ نظر آئے گا۔ البتہ کیلی فورنیا کے کچھ حصے میں سورج گرہن کی مدت سات منٹ تک ہوگی۔ یعنی کیلی فورنیا میں گیارہ جولائی ۱۹۹۰ء کی صبح سات منٹوں کے لیے بھرپور رات میں تبدیل ہو جائے گی۔

سب رپورٹرز کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ اس صدی کے اتنے بڑے آسمانی سانحے کو نہ دیکھ سکیں گے اور جب اگلی صدی کے نصف میں کبھی یہ سانحہ پیش آئے گا تو اس وقت تک ان کی جگہ ان کی تیسری نسل آجائے گی اور پھر جب تک شاید ایسے آسمانی سانحوں کی نوعیت ہی بدل گئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اگلے گرہن کو دیکھنے کے لیے سائنس داں بجائے دنیا کے کسی حصے میں جانے کے کسی سیارے کی سطح پر کھڑے ہو کر اس حیران کن نظارے کو دیکھیں اور اس کی نئی نئی تصوریاں پیش کریں۔

پھر کومل آنند اور اجیت رندھاوا اپنے اخبار کی نئی تعمیر ہوئی عمارت سے باہر نکلے۔ اپنے اپنے کیمرے کندھے پر فٹ کئے اور اسکوٹر اسٹینڈ کی طرف چل دیئے۔ دونوں نے اپنا اپنا اسکوٹر نکالا اور انہیں اسٹارٹ کرنے سے پہلے چند لمحوں کے لیے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

''آج وشو جن سنکھیا دوس کا فنکشن بھی تو ہے۔''

''ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ والوں کا نا؟'' کومل آنند نے پوچھا۔

"ہاں۔شام کو ساڑھے تین بجے، چلوگی؟"

"ڈی پینڈز۔"

"ڈی پینڈ اون واٹ؟"

"تمہارے پیرینٹس کی رضامندی پر۔"

"مگر فنکشن میں جانے کے لیے اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ فنکشن جن سکھیا کا ہے۔اور جس سکھیا کا سمبندھ ہم سے ہے۔"

"دیکھو بات یہ ہے اجیت، میری مدر پر دباؤ پڑ رہا ہے کہ میں شادی کے لیے رضامندی کا اظہار کر دوں۔میں صرف تمہاری وجہ سے فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔"

"اس کا فیصلہ ہونا آج ہی ضروری ہے کیا؟"

"ہاں، کیوں کہ کل وہ لوگ آنے والے ہیں۔"

"تمہاری مدر کا کیا خیال ہے میرے بارے میں؟"

"یہ میری ذمہ داری ہے،تم اپنے پیرینٹس کی بات کرو۔"

"آج ہی؟"

"ہاں،فنکشن سے پہلے،وہیں ملیں گے۔بائی؟"

یہ کہہ کر کومل آنند نے اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور گیٹ سے باہر نکل گئی۔

اجیت رندھاوا اسکوٹر کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے کچھ لمحے وہیں کھڑا رہا۔ایک عجیب سے دوراہے پر چھوڑ گئی تھی کومل اُسے۔سوچنے کی طاقت ہی ختم ہوگئی تھی جیسے۔دو گھنٹوں میں وہ اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتا تھا۔اُس کے ماں باپ تو کبھی نہیں مانیں گے۔ماں تو شاید مان بھی جائے لیکن ڈیڈی تو بڑے ضدی قسم کے آدمی تھے۔وہ کسی بھی صورت میں فیصلہ اُس کے حق میں نہیں دیں گے۔خود وہ اتنا بولڈ نہیں تھا کہ اپنے ماں باپ کی رضامندی کے بغیر کومل آنند سے شادی کر لے۔

یہاں کھڑا رہنا بھی اسے مناسب نہ لگا۔چنانچہ اُس نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر آ گیا۔وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس وقت وہ کہاں جائے۔گھر جانے کی کوئی تک نہیں تھی، اس وقت اپنے ماں باپ سے شادی کے مسئلے پر بات کرنے کا کوئی لاجک نہیں تھا۔چنانچہ وہ کچھ دیر صرف اس لیے سڑکوں پر گھومتا رہا کہ وہ سوچ سکے کہ تین بجے سے پہلے کا سے وہ کہاں گزارے۔پھر خیال کی کسی رو کے تحت وہ نردیک کے بیئر بار میں پہنچ گیا۔اُس وقت بار میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔وہ کونے کی ایک

الگ سی میز پر بیٹھ گیا اور بیئر پینے لگا۔ ٹھنڈی بیئر سے اُسے بہت راحت ملی۔ اُس نے اپنے اور کومل آنند کے بارے میں گہرائی سے سوچنا شروع کیا۔ کومل آنند نے تو اپنا فیصلہ اُسے بتا دیا تھا۔ فیصلہ تو اب اُسے کرنا تھا۔ کومل آنند کو نہیں۔ اُس کے پاس وقت اتنا کم تھا کہ وہ کسی دوسرے کی مدد بھی نہیں لے سکتا تھا۔

کوئی دوسرا اس معاملہ میں اُس کی کیا مدد کر سکتا تھا؟ بیئر کی ایک بوتل کے بعد اُس نے دوسری بوتل منگوائی۔ لگاتار کئی سگریٹ بھی پھونکے۔ اگر ایک لڑکی بنا کسی کی مدد کے اپنا فیصلہ خود کر سکتی ہے تو کیا وہ اتنا گیا گزرا ہے کہ خود کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ بہت دیر تک وہ اپنے آپ سے سنگھرش کرتا رہا اور جب وہ کاؤنٹر پر بل کی رقم ادا کر کے بار سے باہر نکلا تو گرم ہوا کا ایک ریلا اُس کے ماتھے سے آٹکرایا۔ اس نے رومال سے اپنا ماتھا اور چہرا پونچھا اور اسکوٹر اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ اُس نے بغیر کسی دوسرے شخص کی مدد کے اپنا فیصلہ کر لیا تھا۔

ابھی فنکشن شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔

کومل آنند، اجیت رندھاوا سے پہلے پہنچ گئی تھی اور اپنے جاننے والے کچھ لوگوں سے گفتگو کر رہی تھی۔ اسی لیے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی ڈائریکٹر رنجنا اگروال کی سفید ایمبیسڈر رُکی۔ رنجنا اگروال نے کار سے باہر نکلتے ہی کومل آنند کو ہیلو کیا اور ایک آدھ منٹ کے لیے اُس کے پاس رُکی بھی۔ وہ اس وقت بڑی ہی خوبصورت اور گریس فُل لگ رہی تھی۔ کومل کو ڈاکٹر رنجنا اگروال بہت اچھی لگتی تھی۔ اُسے بھی کومل کی تحریریں پسند تھیں۔ وہ عام پریس رپورٹرز سے بہت مختلف تھی۔ ڈاکٹر رنجنا اگروال ہال کے اندر چلی گئی۔

اجیت رندھاوا ابھی تک نہیں آیا تھا۔

پھر کومل آنند فنکشن میں آنے والوں کا جائزہ لینے لگی۔ سرکاری فنکشنوں کا ایک ہی طرح کا پیٹرن ہوتا ہے۔ کچھ سرکاری افسر، کچھ اس محکمے کے کرمچاری، جس محکمے کا فنکشن ہو، کچھ سیاسی لوگ، کچھ اُس کیٹیگری کے لوگوں کے نمائندے، جس کیٹیگری سے وہ محکمہ جڑا ہو، اور کچھ ایسے لوگ جن کی فنکشن سے واقعی دلچسپی ہو۔ ایسے لوگ ہمیشہ ہی بہت کم گنتی میں ہوتے ہیں۔ اس فنکشن کا پیٹرن بھی لگ بھگ ویسا ہی تھا۔

جبھی ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی تین چار بسیں ایک ساتھ رُکیں اور اُن میں سے لیبر کالونیوں اور جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والی عورتیں باہر نکلیں۔ ایک ہی جیسے رنگ روپ اور لباس والی عورتیں۔ جن کی پرانی خریدی ساڑیوں کے پھیکے پڑے رنگوں کی طرح ان کے چہروں کے رنگ بھی بہت پھیکے تھے۔ یہ وہ عورتیں تھیں جن میں خون کی کمی تھی اور جن کے لیے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ والے یونی سیف کے ساتھ مل کر

انیمیا کنٹرول اور ایمونائزیشن کے پروگرام اکثر آرگنائز کرتے رہتے تھے۔ جن میں وہ ان عورتوں کو بڑے خوبصورت چھپے ہوئے پمفلٹ اور بروشر پلاسٹک کورز میں تقسیم کرتے تھے، جن کا ایک لفظ بھی وہ عورتیں نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ ایسے پروگراموں کے بعد ان عورتوں کو بہت اچھا ریفریشمنٹ دیا جاتا تھا اور پھر انہیں اُن ہی گاڑیوں میں اپنے اپنے گھروں میں چھوڑا جاتا تھا جہاں سے فنکشن میں حصہ لینے کے لیے اُنہیں اکٹھا کیا جاتا تھا۔

جب یہ مانگے پر اکٹھی ہوگئیں عورتیں گاڑیوں سے اُتر کر حال کی طرف بڑھنے لگیں تو کومل آنند نے اپنے کیمرے سے ان کی کئی تصویریں اُتار لیں۔

اُس نے آخری تصویر لے کر کیمرہ کندھے سے لٹکایا ہی تھا کہ اجیت رندھاوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

''ان تصویروں کے بہت اچھے رزلٹ نکلیں گے۔''

''تم یہ بتاؤ کہ تمہارے رزلٹ کا کیا ہوا؟''

''امتحان کی فیس پوری نہیں بھری تھی۔ رزلٹ لیٹ اوں ہے۔''

''مجھے معلوم تھا، یہی ہوگا۔ تم بہت بودے آدمی ہو۔''

''مجھے اب پیرینٹس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا فیصلہ خود کر لیا ہے؟''

''واہ رے میرے رُستم، کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں اس سنڈے کو تم سے شادی کر رہا ہوں۔''

''پھر۔''

''پھر اپنے پیرینٹس کو چھوڑ دوں گا اور الگ مکان میں رہوں گا۔''

''میرا کیا ہوگا؟''

''تم میرے ساتھ رہوگی۔''

''اگر مجھے یہ منظور نہ ہو؟''

''''تو جہنم میں جاؤ۔'' اجیت رندھاوا کے چہرے پر واقعی ایک ایسا تاثر تھا جسے کومل آنند نے آج تک نہیں دیکھا تھا مگر وہ تاثر اُسے اچھا لگا۔

پھر وہ دونوں ہال کے اندر آ گئے اور پریس والوں کی ریزرو سیٹوں پر اگلی قطار میں ساتھ ساتھ دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دونوں ایک دم خاموش تھے۔ گفتگو ایک دم رُک گئی تھی البتہ سوچ کا عمل جاری تھا۔

کچھ ابتدائی کارروائی کے بعد فنکشن شروع ہوگیا۔

لیبر کالونیز اور جھگی جھوپڑیوں سے آئی عورتیں ہال میں ایک طرف بیٹھی، سامعین سے بالکل الگ کٹی کٹی سی الگ رہی تھیں۔ جیسے اس تمام فضا کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی اُن عورتوں کی الگ شناخت تھی۔ جیسے ہر عورت کے ماتھے پر اُس کی تقدیر لکھی ہو۔ اس لکھاوٹ کو پڑھ کر ہر کوئی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ عورتیں جہالت کا سمبل تھیں اور وہی سمبل ان کی شناخت بن چکا تھا۔

ڈاکٹر رنجنا اگروال موضوع پر بولتے ہوئے سامعین پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہندوستان میں لگاتار بڑھتی ہوئی آبادی ملک کے لیے ایک بہت بڑا پرکوپ تھا۔ اس پرکوپ سے مکتی حاصل کرنے کے لیے ایک مضبوط ارادے اور طاقتور سنگھرش کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے آبادی کے تازہ ترین اعداد و شمار کا بھی بڑے زوردار انداز میں ذکر کیا۔ ڈاکٹر رنجنا اگروال نے بتایا کہ جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا تھا ہماری کل آبادی صرف چونتیس کروڑ تھی۔ ۱۹۹۱ء میں ہماری آبادی چوراسی کروڑ سے زیادہ ہوگئی تھی اور جب ہمارا ملک اکیسویں صدی میں داخل ہوگا تو یہ آبادی بڑھ کر ایک سو کروڑ ہو جائے گی اور اس کے صرف پینتیس سال بعد یعنی ۲۰۳۵ء میں ہندوستان کی آبادی ... سو کروڑ ہو جائے گی۔ اس نے اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا، ہندوستان کے حصے میں ساری دنیا کی زمین کا صرف ۲ فی صد حصہ آیا ہے اور اس چھوٹے سے حصے میں تمام دنیا کی آبادی کا پندرہ فی صد حصہ بستا ہے۔ ہندوستان کی زمین تو ایک انچ بھی اور نہیں بڑھ سکے گی لیکن ہماری آبادی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ جب ڈاکٹر رچنا اگروال نے بتایا کہ جتنی دیر میں یہ فنکشن ختم ہوگا، ہندوستان میں چھ ہزار بچے جنم لے چکے ہوں گے۔ کیوں کہ ہر منٹ میں اکتیس بچوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تو جھگی جھوپڑیوں سے آئی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں ایک عجیب طرح کی ہلچل ہونے لگی۔ یہ احساس کی رمق کا پہلا ارتعاش تھا۔

ڈاکٹر رچنا اگروال نے اپنا کلیدی ایڈریس ختم کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح آج کا سورج گرہن اس صدی کا آخری سورج گرہن ہوگا، اسی طرح ہندوستان کی ہر لحہ بڑھتی ہوئی آبادی بھی اس صدی کا آخری گرہن ہے۔ اگر ملک کے سورج کو آبادی کے گرہن سے بچانے کے لیے وار لیول پر اقدامات نہ کیے گئے تو اگلے سورج گرہن تک ہندوستان کے آسمان کو آبادی کا گرہن پوری طرح نگل چکا ہوگا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے گا۔ انسانی آبادی کے بچاؤ کے سبھی امکانات ختم ہو چکے ہوں گے۔ بقا کے لیے آخری کوشش کی ضرورت تھی۔

جب ڈاکٹر رنجنا اگروال مائیک سے ہٹ کر اپنی کرسی کی طرف بڑھی تو ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔

سب سے زیادہ زور کی تالیاں اُسی طرف سے تھیں جہاں اپنی اپنی الگ شناخت لیے پسماندہ طبقے کی عورتیں بیٹھی تھیں۔

کچھ تقریریں اور ہوئیں اور پھر سامعین میں سے کچھ لوگوں کو بولنے کے لیے کہا گیا۔ آخری تقریر کومل آنند نے کی تھی۔ کومل آنند کی تقریر بیحد مختصر تھی۔ اُس نے کہا

''میں ڈاکٹر رجنا اگروال کی تقریر سے بے حد متاثر ہوئی ہوں، میں بھی اس بات پر زور دیتی ہوں بڑھتی ہوئی آبادی کا پرکوپ ہندوستان کی سلامتی کے لیے اس صدی کا آخری گرہن ہوگا۔ میں اس موقع پر پرتگیا کرتی ہوں کہ اس صدی کے ختم ہونے تک کسی بچے کو جنم نہیں دوں گی۔''

تقریر کے درمیان ہی پریس رپورٹرز میں سے ایک نے ٹوک دیا۔

''ابھی تو نو سال پڑے ہیں، اس صدی کو ختم ہونے پر۔''

''اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہی میں نے اپنی پرتگیا کی ہے۔'' کومل آنند نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور ایک ہلکا سا قہقہہ فضا میں لہرا گیا۔

اپنی الگ شناخت والے ہجوم میں سے ایک پتلی سی سانولی عورت نے اُٹھ کر کہا۔

''لیکن یہ فیصلہ تو ہمارے سماج میں مرد کرتے ہیں۔ عورتوں سے کون پوچھتا ہے؟''

''یہ فیصلہ میرا مرد نہیں میں کروں گی۔''

''اور اگر آپ کا مرد نہیں مانا؟''

''تو میں اُسے طلاق دے دوں گی۔''

ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اُٹھا۔ تالیوں کا زور اَب کی بار بھی اُن عورتوں کے ہجوم سے تھا جنہیں خاص طور پر اس فنکشن میں شریک ہونے کے لیے اُن کے گھروں سے لایا گیا تھا۔

تالیوں کے اس شور میں کومل آنند، اسٹیج سے اُتر کر اپنی خالی کرسی کی طرف بڑھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُس نے دیکھا اجیت رندھاوا کا ماتھا پسینے کے قطروں سے شرابور تھا۔

''اپنا پسینہ پونچھ لو۔'' اُس نے مسکرا کر اجیت رندھاوا کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا، اُن کے پیچھے بیٹھا ہوا رپورٹر ہنس دیا۔ شاید اُس نے کومل آنند کی بات سن لی تھی۔

اگلے دن کے اُسی اخبار کے پہلے صفحے پر جس کی کومل آنند رپورٹر تھی، کومل آنند کی تصویر چھپی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

''اس صدی کے آخری گرہن کی ساکھشی۔''

کشمیری لال ذاکر

پھولاں پتھیرن

راج موہن میرا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔

۳۰/اپریل کی شام کو وہ مجھے ہریانہ بھون میں ملا، میں اسی شام دہلی سے چنڈی گڑھ واپس آ گیا۔ اور وہ روہتک چلا گیا۔ پانی پت تک اس نے میرے ساتھ سفر بھی کیا تھا۔

اچانک پہلی مئی کی رات کو ٹیلی فون آیا کہ راج موہن کا شام کو میڈیکل کالج میں انتقال ہو گیا۔ کارن تھا شدید قسم کا ہارٹ اٹیک۔ میں ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ رات ہی کو کار سے روہتک روانہ ہو گیا اور صبح ہونے سے بہت پہلے پہنچ گیا۔

راج کا مردہ سفید چادر سے پوری طرح ڈھکا کمرے کے فرش پر رکھا تھا اور جسم کے اردگرد برف کی سلیں رکھی تھیں۔ میں نے چادر ہٹا کر اُس کا چہرہ دیکھا، ایک دم شانت تھا —— لگتا تھا دن بھر کے کام کے بعد دیر میں سویا ہو، اور تھوڑی دیر میں جاگ جائے گا۔ لیکن تھوڑی دیر تو کیا وہ دوپہر تک بھی نہیں جاگا۔ مردہ جسم کہاں جاگتے ہیں؟

راج موہن میرے دوسرے بھائی کے ساتھ اینٹوں کے بھٹے کا کاروبار کرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کاروبار میں پورے علاقے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ دو ایک بار میں خود بھی اس کے بھٹے پر گیا تھا اور بھٹے کی تمام ورکنگ دیکھی تھی۔ کچی مٹی کی کھدائی، کچی اینٹوں کی نکاسی، کوئلے کو کئی کئی جگہ سے بھٹے میں لگاتار ڈالنا، مزدوروں کی چوکسی، جو لکڑی کی موٹی موٹی کھڑاویں پہن کر دن رات جلتے ہوئے بھٹے کی اوپر کی سطح پر چکر لگاتے رہتے تھے۔ کچی اینٹیں بنانے والوں کو پتھیرے کہتے ہیں۔ اور عورتیں پتھیرنیں کہلاتی ہیں۔ اینٹوں کے بھٹے کا کام مرد اور عورتیں مل کر کرتے تھے۔ اس لیے بھٹے کے پاس ایک چھوٹا سا گاؤں بن جاتا ہے۔ اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں جن میں مزدور اور ان کے کنبے رہتے ہیں۔ کوئی کوئی مزدور تو گائے بھی رکھ لیتا ہے، جس کا دودھ وہ دو چار جھونپڑیوں میں بیچ دیتا ہے۔ پاس کے کسی گاؤں کا کوئی آدمی وہاں ایک چھوٹی موٹی دکان بھی بنا لیتا ہے، جہاں سے مزدور لوگ اپنی روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں بھی خریدتے ہیں اور یہ سارا کام اُدھار پر چلتا ہے۔ مزدوروں کو ہر اَماوس اور پورنماشی

کے دن ان کے حساب کے مطابق مزدوری کا بھگتان ہوتا ہے۔ بھٹے کا منشی ان دنوں میں بڑی اہم شخصیت کا مالک ہوتا ہے کیوں کہ مزدوروں کی مزدوری روٹی کا سارا کھاتہ منشی جی کے پاس ہوتا ہے۔ بھٹے کا مالک مہینہ بھر چاہے کہیں رہے لیکن اماوس اور پورنماسی کے دن بھٹے پر اس کی حاضری ضروری ہوتی ہے۔ یہی دو دن مزدوروں کے جشن کے ہوتے ہیں۔ رات بھر گاتے ہیں اور دارو پیتے ہیں اور چار دن کے بعد دُکاندار سے اُدھار پر آٹا، دال، چاول خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا کہ راج موہن چاہے کہیں ہو اماوس اور پورنماشی کے دن ضرور ہی بھٹے پر موجود ہوتا تھا۔ بعض اوقات اسے مزدوروں کی اُجرت ادا کرنے کے لیے رقم کا انتظام کرنے میں پریشانی بھی ہوتی تھی۔

لیکن بھٹے کے سبھی مزدور جن کی کل آبادی چار سو کے قریب تھی، راج موہن کا بیحد احترام کرتے تھے اور اس سے بنا جھجک اپنی مشکلات اور اپنے مسائل کا ذکر کرتے تھے۔ ان سب کا یہ کہنا تھا کہ ان کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جسے راج موہن نے حل نہ کر دیا ہو۔ وہ ایک طرح سے اس کی بستی کا مکھیا تھا۔

بھٹے پر دو ایک بار جانے کے بعد میں نے مزدوروں کی زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے کی کوشش کی۔ بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی کا ڈھانچہ دوسرے مزدوروں کے لائف پیٹرن سے مختلف نظر آیا۔ ان مزدوروں کو کام دلانے کے لیے بھی ایک تیسرا شخص ہوتا ہے جو نمبردار کہلاتا ہے۔ وہ بھٹے کے مالک سے مزدور سپلائی کرنے کا ایگریمینٹ کرتا ہے۔ وہ دونوں پارٹیوں سے کمیشن لیتا ہے۔ مالک سے بھی اور مزدور سے بھی۔ یہ روایت اتنی پرانی ہے کہ بعض بھٹوں پر تو بندھوا مزدوروں کی پرتھا چل پڑی ہے۔ نمبردار اور بھٹے کے مالکوں نے آپس میں ایک گہری سازش کے تحت مزدور اور اُس کے خانداں کو ایک طرح سے اپنا غلام بنا لیا ہے۔ وہ چاہیں بھی تو بھٹہ چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ نمبردار نے دھیرے دھیرے وِلن کا رول لے لیا اور اس سارے ڈرامے کو اپنی مرضی سے سے ڈائریکٹ کرنے لگا۔ اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے مزدوروں کا لگ بھگ یہی طریقہ کار ہے، جہاں مالک زیادہ لالچی نہیں اس عمل میں لچکیلا پن پیدا ہو گیا ہے — اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کے استحصال کو میں نے محسوس کیا اور اس موضوع پر کئی بار میں نے راج موہن سے بات بھی کی۔ راج موہن بہت زیادہ پڑھا لکھا نوجواں نہیں تھا لیکن زندگی کے مکتب میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے رہنے کے بعد اس کے پاس بڑی پریکٹیکل نالج آ گئی تھی۔ وہ فطرتاً بڑا سادہ، حساس اور نرم دل تھا اس لیے اس کی طرف سے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ اسے ادب سے لگاؤ تھا اور اُردو میں چھپی کہانیاں اور کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ کبھی کسی کہانی یا ناول کے بارے میں مجھ سے گفتگو کر لیا کرتا تھا، یہ جبھی ہوتا تھا جب اس کا چنڈی گڑھ آنا

ہوتا تھا یا میں کسی کام سے روہتک جاتا تھا۔ مجھے راج موہن کی دو باتیں پسند تھیں۔ اُردو ادب سے اس کی گہری دلچسپی اور پس ماندہ طبقے سے رفاقت کا اظہار۔ اس لیے چاروں بھائیوں میں سے مجھے راج موہن سے زیادہ محبت تھی۔ اور وہ ہم سب سے عمر میں بھی چھوٹا تھا۔

ایک دن گفتگو کے دوران اُس نے مشورہ دیا کہ میں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں پر ایک چھوٹا سا ناول لکھوں۔ اس کی بات سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے اس موضوع پر مجھے بہت سا مواد بھی دیا۔ کچھ کرداروں کے خاکے بھی دیئے، ان کے مسائل پر بھی طویل گفتگو کی۔ اُس دن راج موہن بہت موڈ میں تھا۔ اُسے کسی قسم کی کوئی بری عادت نہیں تھی، البتہ سگریٹ بہت پیتا تھا۔ اُس دن اُس نے باتیں بھی بہت کیں۔ بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں اور پتھیروں کے بھی بہت سے قصے سنائے، غرض اُس نے مجھے اچھے خاصے ناول کا مواد دے دیا اور ڈھیروں سگریٹ پھونک ڈالے۔

پھر اُس نے مسکرا کر کہا۔

''اپنے ناول کا ہیرو مجھے رکھ لیجیے۔''

''رکھ لیا۔''

''تو کب سے ناول لکھنا شروع کریں گے۔''

''بس ہیروئن تلاش کر لوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں اس میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔'' اس نے جواب دیا۔

بات یہیں ختم ہو گئی۔

اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے مزدوروں پر ناول لکھنے کا منصوبہ تو میں نے بنا لیا لیکن ناول نہیں لکھ سکا۔ ناول کے لیے ہیرو کی ٹکر کی ہیروئن نہیں ملی۔ ہیروئن ملتی تو ناول کی روپ ریکھا بنتی، ہیرو بہت مضبوط تھا۔ اُس جیسی مضبوط ہیروئن ملتی تو بات آگے چلتی۔ ہیروئن نہ مل سکنے کے کارن ایک نئے اور اچھوتے موضوع پر لکھا جانے والا ناول تکمیل نہ پا سکا۔ بیچ میں دو ایک بار راج موہن نے ناول کے بارے میں پوچھا بھی لیکن سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ سوچا تو یہ تھا کہ اس ناول کا انتساب بھی میں راج موہن کے نام ہی کروں گا لیکن اب تو اُسے موت نے اپنے نام منسوب کر لیا تھا اور تمام داستان ہی ختم ہو گئی تھی۔

دوپہر تک راج موہن کی موت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ گھر کا لان اور ساتھ لگتی دونوں گلیاں لوگوں سے بھر گئی تھیں۔ ایک عام آدمی کی موت کا بھی یہ ردِ عمل ہو سکتا ہے، اس کا تجربہ پہلی بار ہوا تھا۔ جتنے لوگ اَرتھی میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے اُن میں آدھی سے زیادہ تعداد غریب، بدحال، میلے کچیلے

کپڑے پہنے مزدوروں کی تھی، جو راج موہن کے بھٹے کے علاوہ آس پاس کے بھٹوں پر کام کرتے تھے، وہ سب گلی میں خاموشی سے ایک طرف کھڑے تھے اور بار بار اپنی گیلی آنکھوں کو اپنے میلے کرتوں کی آستینوں سے پونچھ رہے تھے۔

یکم مئی کا دن پچھلے ایک سو برس سے لیبر ڈے کے حوالے سے منایا جا رہا ہے۔ اُس دن بھی سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیاں مزدوروں کی بہبود کے لیے خیالی اور کاغذی پروگرام بنا کر اُن کی دلجوئی کرتی ہیں۔ مزدور دنیا بھر میں اس روز ریلیاں آرگنائز کرتے ہیں، مجھے لگا کہ راج موہن کے گھر کے سامنے بھی مزدوروں کی ایک ریلی ہو رہی تھی، اپنے بھرپور اتحاد کی گواہی دینے اور اپنے لیڈر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے۔ وہ عقیدت جو وہ ایک دن پہلے نہیں پیش کر سکے تھے۔ راج موہن غیر شادی شدہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ اُس کی آخری رسومات کون ادا کرے اور اُس کی چتا میں آگ کون لگائے؟ اس بات کی طرف کسی نے اَب تک دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ آچاریہ آ گیا تھا، جو سامگری اُسے چاہیے تھی وہ بھی منگوالی تھی، تینوں بھائیوں کے بیٹے ادھر اُدھر کھڑے اپنی ماؤں سے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ تبھی میں نے دیکھا ششی، بے ماں کا میرا بیٹا آیا اور آچاریہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میں راج صاحب کا بھتیجا ہوں، چتا میں آگ میں لگاؤں گا۔''

میں نے یہ سنا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، جب سے میں یہاں پہنچا تھا مجھے رونا نہیں آیا تھا، اپنے بیٹے کی بات سن کر میں پھپھک پڑا۔

ششی، کوری دھوتی اور کوری بنیان لے کر نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا، دوسرے دونوں بھائیوں کے بیٹے اپنی ماؤں سے مشورہ کرنے کے بعد آ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔

اور پھر راج موہن کی اَرتھی کو گھر کے باہر لان میں رکھا گیا اور اُسی لمحہ گلی میں ایک طرف جمع مزدوروں کی بھیڑ اندر گھس آئی اور فضا دردناک چیخوں کی گونج سے تھرا گئی۔ ششی کوری دھوتی اور بنیان پہنے ہاتھ میں پانی کا لوٹا لیے اَرتھی کے اُٹھنے کا انتظار کرتے ہوئے بہت اُداس اور نڈھال لگ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میں ایک دم ٹوٹنے لگا ہوں، چند لمحوں کے بعد گھر کے اندر باہر گونجتی چیخوں کے درمیان میرے بھائی کی اَرتھی کو مزدور کندھا دیتے ہوئے اُس سڑک کی طرف بڑھنے لگے جو سڑک شمشان گھاٹ کو جاتی تھی اور جو ہر انسان کے سفر کی آخری کٹھن سڑک ہے، جس پر وہ اپنے پاؤں سے نہیں چلتا، دوسروں کے کندھوں کا سہارا لے کر یہ سفر طے کرتا ہے۔

میں بہت دیر تک گیٹ کے سہارے کھڑا رہا، پھر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گیا۔ میرے جاننے والے

دو ایک لوگ، جن میں بھٹے کا منشی ست لال بھی تھا، میرے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ سنت لال اندر سے پانی کا گلاس لے آیا، پانی پیا تو طبیعت کچھ سنبھلی۔

''آپ کار سے چلیں۔ شمشان بھومی یہاں سے کافی دور ہے۔'' سنت لال نے کہا، میں ابھی اس تجویز پر سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ ایک بوڑھی دیہاتی عورت میلا سا کرتا اور میلا سا سوتی لہنگا پہنے، دہاڑیں مارتی ہوئی گلی میں داخل ہوئی۔

''کہاں ہے میرا بیٹا؟'' وہ چیخی

اور پھر اُس نے منشی ست لال کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''بولتے کیوں نہیں، کت بھیج دیا میرے بیٹے کو؟'' وہ اور بھی زور سے چیخی

''پھولاں تائی، راج بابو کو تو شمشاں لے گئے ہیں۔''

''میرا بھی انتظار نہیں کیا جالموا''

اور پھر سب کے روکنے کے باوجود وہ بزرگ دیہاتی عورت ننگے پاؤں، اُس سڑک پر بھاگ کھڑی ہوئی، جو سڑک شمشاں کو جاتی تھی اور جو یہاں سے بہت دور تھا اور جہاں تک جانے کے لیے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے کار کے استعمال کا مشورہ دیا گیا تھا۔

''کون تھی یہ عورت؟'' میں نے منشی سنت لال سے پوچھا۔

ست لال نے اُس عورت کے متعلق جو تفصیلات بتائیں وہ اس طرح سے تھیں

اُس عورت کا نام پھولاں تھا، اس کے ماں باپ بھی بھٹوں پر پتھیروں کا ہی کام کرتے تھے، وہ بھی انہی کے ساتھ رہ کر پتھیرن کا کام کرتی تھی۔ وہ راجستھاں کے ایک گاؤں میں بنے بھٹے پر پیدا ہوئی تھی۔ اُن دنوں آس پاس کے کھیتوں میں سرسوں پھولی ہوئی تھی، جس دائی نے اسے بھٹے پر بنی ایک جھونپڑی میں جنم دلوایا تھا، اسی نے اُس کا نام پھولاں رکھا تھا، پھولاں جب جوان ہوئی تو بھوانی کے ایک گاؤں میں پتھیروں ہی کے ایک کنبے میں اس کا بیاہ ہو گیا تھا، پھولاں بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن اس کی دیہہ تگڑی تھی اور وہ کام سے نہیں گھبراتی تھی۔ بیاہ کے بعد پھولاں کی زندگی میں جو تبدیلی آئی وہ صرف اتنی تھی کہ وہ راجستھاں کے ایک بھٹے سے اُٹھ کر ہریانہ کے ایک گاؤں والے بھٹے پر آ گئی تھی، ویسا ہی ماحول تھا، ویسا ہی کام تھا۔ لگ بھگ ویسے ہی لوگ تھے، جس قسم کی زندگی اُس نے اَب تک گزاری تھی، ویسی ہی زندگی اسے یہاں ملی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس کے باپ کو کوئی عیب نہیں تھا اور یہاں اس کے خاوند کو دارو پینے کی لت تھی۔ شروع شروع میں تو سسرال والوں سے اس کا بہت جھگڑا ہوا، بلکہ ایک بار تو وہ اپنے

ماں باپ کے پاس بھی چلی گئی تھی۔ لیکن پھر پتھیروں کی پنچایت نے دونوں گھروں میں صلح صفائی کرا دی اور پھولاں سسرال کے بھٹے پر واپس آ گئی، لیکن اس کے خاوند نے دارو نہیں چھوڑی۔ اور آخر کار پھولاں نے ہار مان لی اور اُس ماحول سے سمجھوتہ کر لیا۔ پھر اُس کے خاوند کا اپنے ماں باپ سے جھگڑا ہو گیا اور ایک دن پھولاں پتھیرن اور اُس کا خاوند اپنے باپ کا بھٹہ چھوڑ چھاڑ کر کسی دوسرے بھٹے پر کام کرنے لگے۔ اس طرح دس بارہ سالوں میں اُنہوں نے کئی بھٹے چھوڑے اور کئی بھٹوں پر کام کیا۔ لیکن پھولاں جو بانجھ بھی تھی اور شاید اسی لیے تیز مزاج بھی ہو گئی تھی، ایک بھٹے پر زیادہ دیر نہ ٹکتی تھی، اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا، جس کی وجہ اس کے خاوند کی شراب نوشی اور دوسروں سے اُدھار لینے کی عادت تھی۔ جس بھٹے پر پھولاں پتھیرن اَب آئی تھی، وہ روہتک کے پاس ڈوب گاؤں میں راج موہن کا بھٹہ تھا۔ راج موہن نے یہ بھٹہ کسی دوسرے آدمی سے خریدا تھا۔ اور مزدوروں کا جو نمبردار اس بھٹے کے لیے پتھیرے اکٹھے کر کے لاتا تھا وہی نمبردار ہردیو اور اُس کی گھر والی پھولاں پتھیرن کو بھی کام کرنے کے لیے اس بھٹے پر لایا تھا۔ پھولاں اور ہردیو پچھلے دس برس سے راج موہن کے بھٹے پر ہی تھے۔ انہوں نے اس بھٹے کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلے جانے کی بات کبھی نہیں سوچی تھی۔ پھولاں اس بھٹے پر کام کرنے والی سبھی پتھیرنوں کی اگوان گئی تھی، کئی پتھیرے اپنے گھر والیوں سمیت راج موہن کا بھٹہ چھوڑ کر چلے جاتے تھے لیکن ناراض ہو کر یا تنگ ہو کر نہیں، اپنی کسی ذاتی مجبوری کے کارن۔ راج موہن اپنی بساط کے مطابق سب کی مدد کرتا تھا، اور کسی کو ناراض نہیں ہونے دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مزدوروں کے کئی کنبے برسوں سے اسی بھٹے سے جڑے تھے۔ کیوں کہ اینٹوں کے بھٹوں پر کام سیزنل ہوتا ہے، اس لیے جب برسات کا موسم شروع ہو جاتا تھا تو مزدور اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے اور جب بارشیں بند ہو جاتی تھیں تو کچھ مزدوروں کو چھوڑ کر باقی سب بھٹے پر واپس آ جاتے تھے۔

لیکن پھولاں کی بات دوسری تھی، اُس نے تو راج موہن کے بھٹے پر اپنی پکی جھونپڑی بنا لی تھی اور اُس جھونپڑی میں اینٹیں بھی اپنے ہی ہاتھ کی پکائی ہوئی نمبر ون کی استعمال کی تھیں۔ اُس نے ایک گائے بھی خرید لی تھی اور دودھ دہی کا انتظام بھی ہو گیا تھا۔ برسات کے دنوں میں پھولاں کا گھر والا ہردیو، آس پاس کے گاؤں میں سبزی بیچنے کا کام کرنے لگتا تھا اس لیے وہ بیروزگار نہیں رہتا تھا۔

راج موہن سے پھولاں پتھیرن کا ماں بیٹے کا جو رشتہ بنا اُس کی تفصیل منشی سنت لال نے بتاتے ہوئے ایک واقعہ کا ذکر کیا۔

گرمی بہت زوروں پر تھی، اور بھٹے میں اینٹوں کی پکائی ہو رہی تھی۔ ایک مزدور جب خالی جگہ سے

لوہے کا پترا اُٹھا کر بھٹے میں کوئلہ ڈالنے لگا تو جلتے ہوئے کوئلے کی نا قابل برداشت تپش کے ساتھ کچھ چنگاریاں یکلخت اُس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ وہ درد سے چیخا اور بھٹے کی گرم گرم مٹی پر گر پڑا۔ اس کے پاؤں سے لکڑی کی کھڑاویں بھی الگ ہو گئیں۔ اس کی چیخ سن کر کچھ مزدور اُس کی طرف لپکے، اس کا جسم بھی جھلس گیا تھا اور اُس کی آنکھوں میں بے پناہ جلن اور اذیت تھی۔ مزدور بڑی مشکل سے اُسے اُٹھا کر بھٹے سے نیچے لائے۔ اگلے دن اماوس تھی اور راج موہن اپنے منشی کے ساتھ مزدوروں کی اُجرت کا حساب کر رہا تھا اور بھٹے کے ایک طرف بنے اپنے دفتر میں بیٹھا تھا جو صرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور جس کی چھت سے لگا پنکھا گرم ہوا کے ریلے ان دونوں پر پھینک رہا تھا۔ مزدوروں کا شور سن کر راج موہن دفتر کے کمرے سے باہر نکلا۔ مزدور زمین پر بے ہوش پڑا تھا، اور اُس کی گھر والی رو رو زور سے چیخ رہی تھی۔

راج موہن نے مزدور کو اُٹھوا کر اپنے ٹرک میں رکھوایا، جو ابھی ابھی شہر میں اینٹیں ڈال کر واپس پہنچا تھا۔ کچھ مزدور بھی ٹرک میں بیٹھ گئے۔ ان مزدوروں میں پھولاں۔تھیرن کا گھر والا ہردیو بھی تھا۔ راج موہن بجائے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کے مزدوروں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ وہ ڈرائیور کو ہدایت دے رہا تھا کہ وہ سنبھل کر ٹرک چلائے۔ میڈیکل کالج کے بھی کئی ڈاکٹر راج موہن کے دوست بن گئے تھے کیوں کہ وہ اکثر کسی نہ کسی مزدور کو لے کر وہاں آتا رہتا تھا۔ مزدور چاہے کہیں کا ہو راج اُس کے دُکھ درد میں اس کے ساتھ تھا۔ بے ہوش مزدور کو بڑی احتیاط سے ٹرک سے اُتار کر ٹرالی پر لٹایا گیا اور پھر راج موہن خود ٹرالی کو دھکیل کر ایمرجنسی وارڈ میں لے گیا۔ اُس کی جان پہچان کے ڈاکٹر فوراً آگئے اور اُنہوں نے جلن اور درد سے تڑپتے مزدور کو سنبھال لیا، کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد اور پوری میڈیکل ایڈ کے مل جانے سے مزدور کی حالت خطرے سے باہر ہو گئی۔ راج موہن نے سب مزدوروں کو ٹرک میں بیٹھ کر بھٹے پر چلے جانے کو کہہ دیا۔ صرف ہردیوا اور اُس کا ایک اور ساتھی اسپتال میں رہ گئے۔

بہت دیر ایمرجنسی وارڈ کے باہر کھڑا راج موہن اور ہردیوا اور اس کا ساتھی مزدور تینوں تھک گئے تھے۔ رات بھی ہو گئی تھی، سگریٹ بیڑی پینے اور تازہ ہوا لینے کے لیے تینوں میڈیکل کالج کی بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔ اب گرمی کا پرکوپ کم ہو گیا تھا۔ ہوا تو خیر ابھی تک گرم تھی لیکن اماوس سے ایک دن پہلے کی کالی سیاہ رات دن کے مقابلے میں تو کم ہی گرم تھی۔ اس وقت اُنھیں دراصل چائے کی تلاش تھی اور وہ اسی غرض سے اسپتال سے باہر بازار کی طرف جا رہے تھے۔ جو بہت دور نہیں تھا۔ اسی وقت راج موہن کا ٹرک بھٹے سے دوبارہ اسپتال آ رہا تھا، اور ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر پھولاں۔تھیرن بیٹھی تھی۔

عین اُسی لمحہ ایک کار بہت تیز رفتار سے ان تینوں کے پاس سے گزری، شاید اس میں کوئی نازک

حالت والا مریض تھا اور راج موہن نے دیکھا کہ ہردیو اسڑک کے کنارے خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ سڑک سنسان ہو گئی، آس پاس نہ کوئی آدمی تھا نہ اسکوٹر رکشا تھی۔ راج موہن کو جانے کیا سوجھی، اُس نے ہردیو اکے ساتھی مزدور کی مدد سے زخمی ہردیو اکو اپنی بانہوں میں اُٹھایا اور مزدور ہی کے سہارے سے ہردیو اکے خون میں لتھڑے ہوئے جسم کو ہانپتے کانپتے اسپتال کے مین گیٹ تک لے آیا، وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے جنھوں نے بے ہوش ہردیو ے کو ٹرالی میں ڈال کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا۔ راج موہن کے کپڑے بازو اور ہاتھ خون سے تر تھے، اور وہ ایک دم خاموش تھا، جیسے اُس کے ہونٹ سل گئے ہوں، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیوار کے سہارے کھڑا دیکھے جا رہا تھا۔ راج موہن کے بیٹے کا ایک اور مزدور بھی تو ایمرجنسی وارڈ میں تھا۔

اس کا بہت خون نکل چکا تھا، ہردیو اکو فوراً خون کی ضرورت تھی، اب تو وہاں کوئی مزدور بھی نہیں تھا جو خون دینے کو تیار ہو جاتا۔ آدھی رات کے وقت بیڈ پر پڑا راج موہن، ہردیو ےتھیرے کے لیے اپنا خون دے رہا تھا اور پھولاں ٹھیرن اُس کے سرہانے کھڑی تھی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھولاں کو لگا جیسے اب وہ بانجھ نہیں رہی تھی، اس کا بیٹا تو عین اُس کے سامنے سکوں سے اپنی زندگی کے لمحے کسی اور کو دیے جا رہا تھا۔ وہ ایک دم کمرے سے باہر نکل گئی اور باہر آ کر زور زور سے رونے لگی۔

ہردیو ابچ گیا تھی۔

اور پھر پھولن جو تیس برس سے بانجھ تھی، اچانک ماں بن گئی تھی۔

میں اپنے بھائی کے گھر کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا اور اُس سڑک کو دیکھ رہا تھا جو ایک موڑ کے بعد اُس سڑک سے مل جاتی تھی جو سڑک شمشان بھومی کو جا رہی تھی اور ابھی کچھ دیر ہی پہلے پھولاں ٹھیرن جس کی طرف ننگے پاؤں بھاگی تھی، مجھے لگا کہ ستی کی رسم کی ایک اور پرتھا قائم ہونے والی تھی۔

ایک عورت اپنے خاوند کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے بیٹے کی لاش کے ساتھ چتا میں کود کر جلنے والی تھی، یہ ایک اور غلط پرتھا قائم ہونے والی تھی۔ ہندوستانی عورت کا مقدر کیا صرف جلنا ہی ہے؟ چاہے وہ بیوی ہو، چاہے ماں! ایسا نہیں ہونا چاہیے، میں نے منشی سنت لال کی بات مان لی کہ شمشان بھومی تک کار ہی میں جانا چاہیے، نہیں تو پھولاں ٹھیرن مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائے گی۔

میں نے دیکھا تپتی ہوئی سڑک پر بدحال پھولاں ٹھیرن ننگے پاؤں دوڑے جا رہی تھی لیکن لگتا تھا اب اُس کی رفتار کمزور ہو گئی تھی، جب ڈرائیور نے اُس کے قریب پہنچ کر کار کو روکا اور منشی سنت لال اور ڈرائیور دونوں نے مل کر اُسے کار میں بٹھا دیا تو اُس نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ وہ بہت نڈھال ہو گئی تھی۔

میں راج موہن کی موت کے چوتھے دن کی بات کر رہا ہوں، صبح سویرے سات بجے استھیاں چنی جانی تھیں۔ طے یہ ہوا کہ میرا اپنا ششی، استھیاں لے کر اپنے انکل کے ساتھ دیں سے ہری دوار چلا جائے گا۔ استھیاں چننے کے بعد وہ گھر واپس نہیں آئے گا۔

استھیاں چننے کی رسم ادا ہو رہی تھی، کوری دھوتی اور بنیان پہنے، ششی ننگے پاؤں ٹھنڈی ہو چکی چتا کے گرد چکر لگا رہا تھا اور اچاریہ منتروں کے اُچارن کے ساتھ ساتھ چتا کی راکھ پر کچی لسی کے چھینٹے مار رہا تھا، چتا کے ارد گرد دوستوں اور رشتہ داروں کی بھیڑ تھی اور اس بھیڑ میں زیادہ تعداد مزدوروں کی تھی جن میں ہردیوا اور اُس کے کئی مزدور شامل تھے جن کی مدد، راج موہن نے اُن گھڑیوں میں کی تھی جب وہ بالکل مایوس ہو چکے تھے۔

آچاریہ راج موہن کی ایک ایک استھی چن کر اور اسے کچی لسی سے دھو کر اُس تھالی میں ڈالے جا رہا تھا، جو چتا کی ایک طرف بیٹھے ششی کے ہاتھوں میں تھی، وہ استھیاں بھی تھالی میں ڈلوائے جا رہا تھا اور اُن پر اس کے آنسوؤں کا گنگا جل بھی گر رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں گنگا جل کے پوتر جل سے آنکھوں کے جھرنوں سے رِستا ہوا جل زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

پھر کورے سفید کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی میں راج موہن کی استھیاں سرخ مولی کے دھاگے سے باندھ دی گئیں اور تھیلی ششی نے دونوں ہاتھوں میں تھام لی اور شمشان بھومی کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ششی ایک دم خاموش تھا اور ننگے پاؤں چلتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا اور بڑی بے دردی سے روئے جا رہا تھا۔ گیٹ سے باہر سڑک پر کار کھڑی تھی جس میں وہ اپنے انکل کے ساتھ بیٹھ کر سیدھا ہری دوار چلا جائے گا اور اگلی صبح سورج چڑھنے سے پہلے راج موہن کی استھیاں گنگا کے پوتر جل کے سپرد کر دی جائیں گی۔

پھر ایک ایسی گھٹنا ہوئی جس کا مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔

شمشان بھومی کے گیٹ سے پھولاں پتھیرن داخل ہو رہی تھی، وہ بے حد کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ میرے علاوہ شاید کچھ ہی لوگوں نے اُسے دیکھا تھا۔

وہ ایک دم ششی کی طرف لپکی اور اُس کے ہاتھوں سے راج موہن کی استھیوں کی تھیلی چھین لی، ششی ایک دم بھونچکا سا اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، اس نے ایک بار رو رو کر سوجی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ شاید اُسے اطمینان ہو گیا کہ کچھ غلط نہیں ہوا تھا، بھیڑ میں سے کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ پھولاں پتھیرن سے کچھ کہتا۔ سب خاموشی سے اُسے دیکھ رہے تھے — پھولاں پتھیرن نے استھیوں والی تھیلی کو اپنی چھاتی کے ساتھ چمٹا لیا۔ وہ ایک دم خاموش تھی اور

اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔

میں نے دیکھا وہ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور اُس نے راج موہن کی استھیوں کی سفید تھیلی اپنی بغل، پرانی اور جگہ جگہ سے پھٹی اوڑھنی سے ڈھک کر اپنی چھاتی کے ساتھ لگا رکھی تھی۔

ششی اور اُس کا انکل کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے اور ششی نے ایک بار میری طرف دیکھا تھا، وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔ مجھے اُس کی دماغی اذیت کا اندازہ تھا لیکن کار جب ہری دوار سے لئے چلی تو مجھے لگا پھولاں دھیرن ایک بار پھر بانجھ ہو گئی تھی۔

کشمیری لال ذاکر

دوسرا مرد

میری زندگی میں آیا دوسرا مرد میرا بیٹا ہے۔

میں نے اسے مرد اس لئے کہا ہے کہ اب اس کی عمر بیس سے اوپر ہو گئی ہے۔ اور ایک آدھ برس میں اسے ووٹ ڈالنے کا بھی حق مل جائے گا۔

پہلا مرد جو میری زندگی میں آیا تھا، وہ میرا خاوند، پرم پال۔

میرا اپنا نام جگتار ہے۔ جگتار کا مطلب ہے جگ کا کلیاں کرنے والی۔ دنیا کا بھلا کرنے والی۔ میں دنیا کا بھلا کر سکتی ہوں یا نہیں لیکن اپنا آپ ضرور بگاڑ چکی ہوں۔ پینتیس برس پہلے والی جگتار تو اب پہچان میں بھی نہیں آتی۔ اس کا تو رنگ روپ ہی بگڑ گیا ہے۔ جیتو منڈی میں میرے ساتھ پڑھنے والی کوئی لڑکی کبھی مل جاتی ہے تو اس کا پہلا سوال ہوتا ہے۔

''جگتار تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

میں اُس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتی صرف ہنس دیتی ہوں اور یوں ہنستے ہوئے بھی کچھ ایسا لگتا ہے جیسے ایک جواں اور صحت مند عورت نہیں ہنس رہی بلکہ رڈی اخبار سے بنا ہوا ایک خالی لفافہ ہوا میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ عورت کبھی ایک بیکار خالی لفافہ بھی بن سکتی ہے اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوتا ہے جب میں ناری نکیتن میں ظلم اور ناانصافی کا شکار ہوئی کسی عورت کو خالی وقت میں رڈی اخبار کے کاغذوں سے لفافے بناتے دیکھتی ہوں۔ یہ اس کے خالی وقت کو اچھے ڈھنگ سے گزارنے، اسے مصروف رکھنے اور اس کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا ایک تعمیری ذریعہ ہے۔ ایسی ہی ایک عورت سے بات کرتے ہوئے ناری نکیتن کی ورث پر میں نے پوچھا تھا

''تم یہاں کیسے چلی آئیں؟''

''شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔''

''تقدیر تو آدمی خود بناتا ہے۔''

''بناتا ہوگا لیکن عورت تو صرف لفافے ہی بنا سکتی ہے۔ شریمتی جی۔''

میں اُس مجبور عورت کا جواب سن کر سکتے میں آ گئی تھی۔ اُس کا وہ تلخ لہجہ مجھے آج تک یاد ہے۔ اُس کی آنکھوں میں کھلا درد میرے تمام جسم میں سنسنی سی پھیلا گیا تھا۔

"مگر کیوں؟"

"عورت جب لُٹ جاتی ہے تو اُس کی اپنی حیثیت بھی ایک خالی لفافے کی طرح ہو جاتی ہے۔ رڈی کاغذ سے بنا ہوا رڈی سا لفافہ۔"

میں ناری نکیتن کی اس خوبصورت عورت سے زیادہ بات نہ کر سکی تھی۔ اپنے آپ کو ہاری ہوئی محسوس کرتے ہوئے لوٹ آئی تھی۔

اُس شام مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ وہ عورت جو کسی مرد کے بھروسے کو اپنا سب کچھ سمجھ کر اُسے اپنا پیار، اپنا وشواس، اپنا جسم اور اپنی آتما تک سونپ دیتی ہے وہ ایک دم لُٹ ہی تو جاتی ہے۔ پیار کے ایک بول کی ماری عورت جب لُٹ جاتی ہے تو ایک آدمی کیا اُسے سارا سماج قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ جسم کا لُٹ جانا شاید بہت بڑا حادثہ ہے۔ ایک عورت کی زندگی میں اور وہ عورت بڑی خوش نصیب ہے؟ میرا خیال ہے نہیں۔ اُس نے اپنا پیار دے کر عمر بھر کی غلامی خرید لی ہے۔ اس نے اپنا وشواس، اپنا پیار، اپنے خواب، اپنا تمنائیں، سبھی کچھ بیچ کر اپنے لئے ایک محفوظ چار دیواری خریدی ہے جو اس کے لئے آخر ایک غیر محفوظ قید خانہ بن جاتا ہے۔ یہ سودا کتنا مہنگا ہے۔

زندگی بھر کے خواب اور اُن کے عوض زندگی بھر کی غلامی!

یہ دوسرا مرد جو اچانک میری زندگی کو جھنجھوڑنے لگا ہے۔ میرا بیٹا ہے بلرام۔

لیکن اس وقت اس کی بات نہیں کروں گی۔

اس سے پہلے میں اپنے جیون میں آئے پہلے مرد کی بات کروں گی۔ جو میرا خاوند ہے، پرم پال۔

پرم پال اور میں دونوں جیتو منڈی کے رہنے والے ہیں۔ جیتو منڈی پنجاب میں ہے۔ کسی زمانے میں یہ قصبہ ریاست نابھ کے راجا کی جاگیرداری میں تھا۔ یوں تو اناج کی بڑی بھاری منڈی تھی یہاں، لیکن اس کی شہرت کی وجہ دوسری تھی۔ جیتو منڈی کے کچھ لوگوں نے اپنے راجہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ آزادی کا پرچم بلند کیا تھا۔ خوب سزائیں پائی تھیں۔ لیکن آخر راجہ کی غلامی سے نجات بھی تو حاصل کر لی تھی۔ ان لوگوں میں جنہوں نے راجہ کے خلاف بغاوت کی تھی میرے پتا جی بھی تھے۔ بغاوت کے عوض اُنہیں کئی برسوں کی قید ملی تھی۔ میں اُن دنوں پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔ پرم پال بھی اسکول جاتا تھا۔ پتا جی جیل گئے تو ایک دم مشہور ہو گئے اور ایک بڑے نیتا بن گئے۔ میری ماں اور پرم پال کی ماں دونوں

بہت اچھی دوست تھیں۔ اُنہوں نے آپس میں مشورہ کر کے اپنی دوستی پرم پال اور مجھ میں کر دی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اُس وقت نہ مجھے تھا نہ پرم پال کو۔ پر میں تھی بہت خوبصورت۔ شاید اسی لئے پرم پال کی سانولی بے ڈھب اور موٹی سی ماں نے مجھے آنگن کے لئے چن لیا تھا۔ اور یہ بات بھی سچ ہے کہ پرم پال کی ماں مجھے کبھی اچھی نہیں لگی، نہ بیاہ سے پہلے نہ بیاہ کے بعد۔

پرم پال اونچے قد کا خوبصورت لڑکا تھا۔ وہ اپنی ماں پر نہیں گیا تھا اور نہ اُس کا رنگ روپ اور طرح کا ہوتا۔ پرم پال جب اسکول سے نکلا تو مانو بچپن سے نکل کر یکدم جوانی کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اپنی عمر کے مقابلے میں زیادہ بڑے لگتے ہیں۔ پرم پال اُن ہی لوگوں میں سے تھا۔ وہ اب اکثر ہمارے گھر ہی آنے لگا تھا۔ میری میں نے کئی بار ٹو کا بھی لیکن وہ باز نہیں آیا۔

''میں تو تمہیں دیکھنے آتا ہوں۔ ماسی جی کے لئے تو نہیں آتا۔''

پرم پال نے ایک بار کہا تھا۔

''مجھے دیکھنے کیوں آتے ہو؟''

''تم مجھے اچھی لگتی ہو۔''

''میں تو تمہارے گھر کبھی نہیں جاتی۔''

''تم لڑکی جو ہو۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''لوگ برا مانتے ہیں۔''

''تمہارے یہاں آنے کا لوگ برا نہیں مانتے؟''

''میری اور بات ہے۔''

''تمہاری اور بات کیوں ہے؟''

''میں تمہارا منگیتر ہوں۔''

پرم پال نے یہ جواب دیا اور مسکراتے ہوئے ہمارے گھر سے باہر نکل گیا۔ پرم پال کی یہ مسکراہٹ میری زندگی کی پہلی ہار تھی۔ اُس سے میں نے اُسے ہار نہیں سمجھا تھا۔ اپنی جیت سمجھا تھا۔ پرم پال میرے لئے پاگل ہو رہا تھا۔ جیتو منڈی میں کالج نہیں تھا اس لئے پرم پال اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے پٹیالہ چلا گیا اور وہاں اُس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں دسویں کر کے گھر بیٹھ گئی۔ لیکن میرے پتا جی آزاد خیال آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے رتن اور پربھاکر کے امتحان پاس کرنے اور پھر پرائیویٹ طور پر

بی اے کرنے کی صلاح دی۔ نہ صرف صلاح ہی دی بلکہ خود ہی پڑھانے بھی لگے۔ پرم پال کالج میں پڑھ رہا تھا، میں گھر پر امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ بات پرم پال کو تو پسند تھی لیکن اُس کی ماں کو نہیں۔ اس نے اپنی تینوں بیٹیوں میں سے کسی کو بھی آٹھویں درجے سے آگے نہیں پڑھنے دیا تھا۔ کئی بار اس نے میری ماں سے بھی کہا کہ وہ مجھے کیوں پڑھا رہی ہے؟ ماں اُسے ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیتی کہ یہ فیصلہ اُس کا نہیں میرے پتاجی کا ہے۔ یہ ایک اور وجہ تھی جس سے میرے اور پرم پال کی ماں میں بعد میں من مٹاؤ ہو گیا تھا۔ وجہیں تو خیر کئی تھیں۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس کی اپنی بیٹیاں نہ خوبصورت تھیں نہ پڑھی لکھی۔ اس لئے اُن کے بیاہ کی بھی بہت بڑی سمسیا تھی۔

اُدھر پرم پال نے بی اے کیا تو اُس نے شادی کا تقاضہ شروع کر دیا۔ میں نے بھی بی اے انگلش کر لیا تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ پرم پال کی شادی سے پہلے اُس کی کم سے کم دو بیٹیوں کی تو شادی ہو جائے۔ کوشش تو وہ سر توڑ کر رہی تھی لیکن جہاں بھی بات چلتی کسی نہ کسی کارن ٹوٹ جاتی۔ لڑکیوں کا زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونا ایک بڑا کارن بن جاتا۔ پرم پال کچھ مہینے تک اپنی ماں کا ساتھ دیتا رہا اور اپنی بہنوں کے لئے لڑکے تلاش کرتا رہا۔ لیکن آخر وہ تنگ آ گیا۔ ایک دن جب وہ بہت پریشان تھا تو ہمارے گھر آیا۔ اتفاق سے ماں اُس وقت گھر پر نہیں تھی۔

''ماں گھر پر نہیں ہے تم چلے جاؤ۔'' میں نے بڑی رُکھائی سے کہا تھا۔

''لیکن تم میری بات تو سنو۔''

''ماں کی غیر حاضری میں تم مت آیا کرو۔''

''تم اپنی ماں سے آخر کب تک چوکیداری کرواتی رہو گی؟''

''جب تک میں اس گھر میں ہوں۔''

''اس کے بعد؟''

''پھر تو تمہاری ماں میری چوکیداری کرے گی ہی۔''

''میں نہیں چاہتا کہ کوئی پھر بھی تمہاری چوکیداری کرے۔'' پرم پال نے کہا تھا۔

وہ اب تک کھڑا ہی تھا۔ میں نے اُسے بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا تھا اور نہ ہی میں چاہتی تھی کہ وہ بیٹھے ہی۔

''تم جلدی سے کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''پانی وانی بھی نہیں پلواؤ گی؟'' پرم پال کے ہونٹ واقعی سوکھ رہے تھے۔

میں جب رسوئی سے پانی لینے گئی تو پرم پال کمرے میں رکھی ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس کی سیٹ پر ابھی دو دن پہلے میں نے کم روئی ڈال کر ایک ہلکی سی گدی رکھی تھی۔ میں نے ٹوکا نہیں پرم پال کو واقعی بہت پیاس لگی تھی۔ اُس نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا تھا۔

''اور پانی لاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں!'' اُس نے اپنی قمیص کے بازو سے ہی اپنے گیلے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔

''تو اپنی بات کہو۔''

''ششکتار میں چاہتا ہوں کہ جلدی ہی ہم دونوں کی شادی ہو جائے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے اس کا فیصلہ تو میرے اور تمہارے گھر والے کریں گے۔ تمہارے چاہنے سے کیا ہوگا؟'' میں نے کھڑے کھڑے ہی جواب دیا۔ پانی کا خالی گلاس بھی میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ دراصل میں پرم پال کے اس بچھاؤ کے لیے تیار نہیں تھی۔

''جہاں تک میری ماں کا سوال ہے، تو وہ پہلے اپنی بیٹیوں کی شادی کرنا چاہتی ہے۔''

''اس میں غلط بات کیا ہے؟ اُن کی شادی تو پہلے ہونی ہی چاہیے۔''

''میں بیشک بوڑھا ہو جاؤں؟''

''نہیں! تم اتنی جلدی بوڑھے نہیں ہو گے۔'' میں مسکرا دی تھی۔

ماں کی غیر حاضری کے کارن میرے من پر جو بوجھ تھا اب کچھ ہلکا ہو چکا تھا۔

''تو تمہیں جلدی نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''دو کارن ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہیں اپنے لئے کوئی کام تلاش کرنا چاہیے۔ بیکار آدمی کو شادی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔''

''دوسرا کارن یہ ہے کہ جب گھر میں تین جوان لڑکیاں ہوں تو گھر کا ماحول خوشگوار نہیں ہوتا۔''

''تو کیا کروں؟''

''ان دونوں مسئلوں کا حل سوچو۔'' میں نے جواب دیا۔

پرم پال ایک دم اُداس ہو گیا تھا۔ اسے یہ اُمید نہیں تھی کہ میں اس کی تجویز نہیں مانوں گی۔ اور اُسے کسی نئی اُلجھن میں ڈال دوں گی۔ وہ چپ چاپ اُٹھ کر جانے لگا تو میں نے کہا۔

"تم ناراض نہ ہو پرم پال، شادی میں تمہیں سے کروں گی۔ تھوڑا اور انتظار کرو۔"

پرم پال رونے کے انداز میں مسکرایا اور چلا گیا۔ میں نے اسے ناراض تو نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ مایوس ضرور تھا۔

پرم پال نے اپنے لئے ملازمت تلاش کر لی تھی۔

ایک دن اُس کی ماں لڈو لے کر آئی تھی، ہم سب کے لئے ہم سب خوش تھے۔ میں اور بھی زیادہ خوش تھی کہ پرم پال نے میری بات مان لی تھی۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے اپنی ماں کو کیسے راضی کر لیا تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ اس دن پرم پال کی ماں شادی کی تجویز لے کر آئی تھی۔

اور پھر پرم پال سے میرا بیاہ ہو گیا۔

اس سے کچھ پہلے زمانہ اچھا تھا۔ لڑکی کی شادی کے لئے بہت جہیز کی مانگ نہیں ہوتی تھی۔ اب کی طرح اخباروں میں ہر روز کسی نئی بیاہتا لڑکی کے تیل چھڑک کر جلا دینے یا مجبور ہو کر خودکشی کر لینے کی خبریں نہیں چھپتی تھیں۔ چنانچہ نہ تو پرم پال کے گھر والوں کی طرف سے جہیز کی مانگ ہوئی اور نہ ہی میرے پتا جی نے شادی پر فضول خرچ کیا۔ معمولی لوگوں کی شادی تھی، جو سادھارن ڈھنگ سے ہوتی تھی۔ دکھاوا کم تھا، رَکھ رکھاؤ زیادہ تھا۔ پرم پال کی بہنوں نے میرا پورا سواگت کیا جیسے میں غیر نہیں تھی۔ ان کی سگی تھی۔ ان کا کھلا پیار مجھے بہت اچھا لگا۔

پرم پال نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پولیٹیکل سائنس میں پرائیویٹ طور پر ایم اے کی بھی تیاری شروع کر دی تھی۔ میں نے بھی بی اے کے باقی پرچوں میں امتحان دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پرم پال کی دونوں بڑی بہنوں نے بھی رتن کا امتحان دینے کے لئے کتابیں خرید لی تھیں۔ کچھ کتابیں میرے پاس تھیں جو میں نے انہیں دے دی تھیں۔

گھر کا واتاورن اچھا تھا۔ بیچ بیچ میں پرم پال اور میں پتا جی سے اور ماں سے ملنے بھی چلے جاتے تھے۔ حالات ٹھیک ٹھاک تھے اور کہیں کوئی اُلجھن نہیں تھی۔ ہاں پرم پال کی ماں کا مزاج کچھ سخت تھا۔ لیکن میں اس کی چھوٹی موٹی باتوں کو برداشت کر لیتی تھی۔ آپسی رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے بردباری بہت ضروری ہے۔

اڑھائی تین سال کا عرصہ بہت پُرسکوں گزرا۔

میری بیاہتا زندگی کا یہی مختصر سا واقعہ میری زندگی کا سب سے زیادہ خوشگوار عرصہ تھا۔ پھر تو حالات تیزی سے بدلتے گئے تھے۔ پرم پال نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر لیا تھا اور اسے سنگرور کے کالج

میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی تھی۔ میں نے بی اے کے بعد بی ٹی کا امتحان پاس کر لیا تھا اور لڑکیوں کے ایک اسکول میں ملازمت کرنے لگی تھی۔

پرم پال کی دونوں بہنوں نے بھی رتن کا امتحان پاس کر لیا تھا لیکن ان کی شادی کی بات کہیں بھی سرے سے نہ چڑھی تھی۔

اُدھر میرے پتا جی کا انتقال ہو گیا تھا اور ماں بیمار رہنے لگی تھی۔

پرم پال چونکہ ہفتے میں کئی روز گھر نہیں رہتا تھا۔ اس لئے اس کی ماں مجھے تنگ کرنے لگی تھی۔ اسے میرا اسکول میں نوکری کرنا بھی پسند نہیں تھا۔ پرم پال جب سنگرور سے آتا، اس کی ماں شکایتوں کی پوٹلی کھول دیتی۔ شروع شروع میں ماں بیٹے کی تکرار ہوتی۔ پھر پرم پال کی بہنیں ماں کی طرفداری کرتیں لیکن میں خاموش رہتی۔ حالانکہ جھگڑا میری ہی کسی بات کو لے کر ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے لڑائی کا محاذ بدلا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ گھر کے سبھی افراد ایک طرف ہو گئے اور میں ایک دم اکیلی رہ گئی۔ بات کہیں سے بھی شروع ہوتی، ختم آخر ہوتی مجھ پر۔ کماں کہیں بھی تنتی تیر مجھے ہی لگتے۔ سبھی حملوں کا نشانہ میں ہی تھی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ پرم پال جس کے منہ میں زبان نہیں تھی اور میرے پیار میں پاگل ہو گیا تھا ایک دم گندی گندی گالیاں بکنے لگے گا۔ میں نے اکیلے میں جب بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی وہ اور بھی زیادہ بدمزاجی سے پیش آنے لگا۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔

یہ دوسرا مرد جو میرا بیٹا بلرام اُن دنوں بنا نام اور بنا کسی روپ کے میری کوکھ میں کونپل کی طرح پھوٹ رہا تھا اور جب کونپل پھوٹتی ہے تو بہار کا پیغام آتا ہے۔ چاندنی کی رمق تھرکتی ہے۔ اور خوشبوؤں کے قافلے چلنے کو ہوتے ہیں۔ اور مندروں میں گھنٹیاں گونجتی ہیں اور مسجدوں میں اذانیں اُبھرتی ہیں، اور گرجا گھروں میں مقدس باپ کے نغمے گائے جاتے ہیں۔ اور اس پیغام کو اور گھنٹیوں کو اور اذان کو اور مقدس باپ کی حمدوں کو صرف وہ عورت سنتی ہے جو ماں بن رہی ہے۔ جس کے اندر ایک نیا انسان ڈھل رہا ہے۔ دوسرا کوئی نہیں سن سکتا، اس پوتر پیغام کو بہار کا اور مستقبل کا اور امن کا اور حسین دَور کا پیغام ماں اس لئے درد سہتی ہے کہ اس درد کے بطن سے ایک نیا خدا جنم لیتا ہے جو انسان کا آخری سہارا ہے۔

میرے علاوہ میری روح میں کسمساتا نئے دَور کا پیغام اور کوئی نہیں سن رہا تھا۔ سب میرا اُبھرتا ہوا جسم دیکھتے تھے، اس کے اندر تخلیق ہوتا ہوا وجود کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ یہ وجود پرم پال کو بھی نظر نہیں آتا تھا جسے میرے انگ انگ پر ہر قسم کے چھوٹے چھوٹے سے نشان کا بھی گیان تھا۔

اُس روز میں لیڈی ڈاکٹر کو دکھلا کر آئی تھی، جس نے بتایا تھا کہ بچے کی پوزیشن کچھ ٹھیک نہیں ہے، اس کے لئے اُس نے کچھ دوائیں بھی دی تھیں، میں چاہتی تھی کہ ڈاکٹر سے ہوئی ہر اک بات پرم پال کو بتا دوں اور اُس کی رائے بھی لوں اور اس سے مشورہ بھی کروں۔

کمرے میں ہم دونوں ہی تھے۔ شام کا وقت تھا میں چائے بنا کر لائی تھی۔ چائے کی ایک پیالی اُسے دی اور دوسری پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

"پال ڈیئر! تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

"تمیز سے مخاطب کرو میں تمہارا خاوند ہوں۔" اُس نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں سناٹے میں آ گئی تھی۔ کیا میں جانتی نہیں کہ تم میرے خاوند ہو؟"

"نہیں! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" اُس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"مجھے تم کہہ کر مت مخاطب کیا کرو، عزت سے پیش آیا کرو۔"

"میں تمہاری عزت نہیں کرتی کیا؟"

"اپنے دل سے پوچھو۔"

"اپنے دل ہی سے پوچھ کر تو تمہیں زندگی کا ساتھی بنایا تھا۔"

"یہ سب بکواس ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پرم پال کے رویے میں پچھلے کچھ دنوں سے تبدیلی آ گئی تھی۔ میں نے اُس کی وجہ گھر کی پریشانیاں سمجھ کر دھیان نہیں دیا تھا لیکن حالات تو قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔

"تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے آج کل؟"

"میری ماں نے مجھ پر جادو کر رکھا ہے۔ وہ کالی ڈائن تمہارا گھر اُجاڑ رہی ہے، یہ کہتی پھرتی ہو تا لوگوں سے؟" وہ چیخا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم۔ کس سے کہا ہے کچھ میں نے؟"

"سب سے کہتی پھرتی ہو ایسی بے ہودہ باتیں۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

"تمہاری قسم میں نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں نکالا زبان سے۔"

"تو یہ لڑکیاں جھوٹ بولتی ہیں؟" اُس کا اشارہ اپنی بہنوں کی طرف تھا۔

"ہاں۔"

''میری ماں بھی جھوٹ بولتی ہے؟''

''بالکل جھوٹ بولتی ہے۔''

''میری ماں کو جھوٹی کہتی ہے حرام زادی۔'' وہ ہاتھ اُٹھا کر میری طرف لپکا۔ میں ایک طرف ہو گئی۔ اس خیال سے کہ دوسرے کمرے میں اس آپسی تکرار کی آواز نہ جائے، میں دروازہ بند کرنے کو ہوئی تو دیکھا کہ پرم پال کی ماں دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی، مجھے دیکھتے ہی ہٹ گئی۔

''دروازہ کیوں بند کر رہی ہو؟'' وہ بولا۔

مجھے غصہ تو بیحد تھا لیکن میں خاموش رہی۔ پرم پال نے میری خموشی کو اپنی بے عزتی سمجھا۔ اس کو میری کمزوری بھی سمجھا کہ میں نے خاموشی سے اتنی بڑی گالی برداشت کر لی تھی۔ مجھے کمزور سمجھ کر پرم پال شیر ہو گیا۔

''دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دوں گا۔''

''تو تم اپنی ماں اور بہنوں کے کہنے میں آ کر اپنا گھر برباد کرنا چاہتے ہو؟''

''ہو جائے دو برباد میں اور گھر بسا لوں گا۔''

''تو بات یہاں تک آ پہنچی ہے۔ بہنوں کے لئے تو آج تک کوئی لڑکا ملا نہیں۔ خود دوسری بار گھر بسانا چاہتے ہو۔ شرم کرو پرم پال۔'' پرم پال پر تو جیسے بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے کرسی سے اُٹھ کر مجھے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ اور پھر میز پر پڑی ہوئی چائے کی پیالی زور سے مجھ پر ماری۔ چائے تو پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ لیکن پیالی کا کونہ پورے زور سے میرے ماتھے کے عین درمیاں میں لگا۔ ماتھے سے خوں بہنے لگا۔ پرم پال کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ چلا رہا تھا۔

''حرام زادی تماشہ دیکھ لو تم۔'' وہ اپنی بہنوں کو مخاطب کر رہا تھا۔

وہ گھر سے باہر نکل گیا اور پھر نہیں لوٹا۔

کئی دنوں تک گھر میں مرگھٹ جیسی خاموشی رہی۔

کئی دنوں تک میرے ماتھے کا زخم نہیں بھرا۔

اور کئی دنوں تک میں اسکول سے چھٹی پر رہی۔

میری زندگی کی یہ دراڑ پھر نہیں بھر سکی۔ اُس دن کے بعد بھی نہیں جس دن میں نے بلرام کو جنم دیا تھا۔ میں کٹ گئی تھی، اپنے گھر سے، اپنے ماحول سے، اپنے حالات سے اور خود اپنے آپ سے بھی۔ اگر عورت کو اس طرح ذلیل ہو کر جینا ہے تو میں نہیں جی پاؤں گی۔ اگر جیوں گی تو ذلیل نہیں ہوں گی۔ جنم سے

پہلے میرے پیٹ میں بلرام کی پوزیشن ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن پیدا ہونے کے بعد اُس نے میری پوزیشن ایک دم ٹھیک کر دی تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بلرام کے بعد اب میرے کوئی اولاد نہیں ہوگی۔

میری کوکھ میں اب کوئی نیا انساں پرورش نہیں پائے گا۔

وہ مقدس باپ اب میری سکوت میں کوئی صلیب نہیں گاڑے گا۔

میں اب کسی کو بھی کسی اور آنے والی بہار کا پیغام نہیں دوں گی۔

میرے ماتھے کا زخم تو بھر گیا لیکن زخم کی جگہ ایک جلتی ہوئی گرم مہر میری جلد کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔ میں جب بھی آئینہ دیکھتی میرے ماتھے پر چپکی مہر جلنے لگتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ تپش کی ایک جھلس دینے والی رو میرے تمام جسم میں پھیلنے لگی تھی۔

بلرام ابھی دس ہی دن کا تھا کہ میں نے پرم پال کا گھر چھوڑ دیا۔

پرم پال سنگرور گیا ہوا تھا۔ یہاں ہوتا تو یقیناً روکتا اور ہو سکتا ہے میں رُک بھی جاتی اور میرا ارادہ ڈگمگا جاتا۔ اچھا ہوا وہ یہاں نہیں تھا۔ میں نے پرم پال کی کالی کلوٹی جھگڑالو ماں کو چھوڑ دیا۔ میں نے اُس کی بہنوں کو بھی چھوڑ دیا جو مستقل بے کاری اور کنوارے پن کی وجہ سے اپنا دماغی توازن کھوتی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنی ماں کو بھی چھوڑ دیا جو ان دنوں بہت بیمار تھی، میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔

اور یوں میں نے بیس برس کا بن باس کاٹا ہے۔ سب سے ایک دم کٹ کر، سب سے الگ ہو کر۔

اُس حبس بھری چار دیواری سے دور جس کے تحفظ نے مجھے ڈرپوک اور بزدل بنا ڈالا تھا۔

اور یوں میری زندگی میں آیا میرا پہلا مرد پرم پال میرے نہ چاہنے پر بھی میری زندگی سے آپ ہی آپ نکل گیا۔ مجھے اُس کے لئے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ ہو سکتا ہے اُس نے دوسری بار اپنا گھر بسا لیا ہو جس کے طعنے وہ اکثر دیا کرتا تھا۔

میں نے بلرام کو اپنی مرضی کے مطابق سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کی ہے۔

میں سمجھتی ہوں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہوں۔

لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک عجیب سانحہ ہوا ہے۔

بلرام اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس نے کبھی مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے اس لڑکی سے تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

''ماں! یہ میری دوست رنجو ہے۔'' اور اُس لڑکی نے بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''نام ٹھیک سے بتاؤ بلرام۔'' میں نے اس لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے ذرا تیکھے انداز سے کہا۔

''رنجنا، ماں جی۔'' لڑکی نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

بلرام ایک طرف کھڑا مسکرا رہا تھا۔ گھبراہٹ نہیں تھی اُس کے رویے میں بڑا آتم وشواس تھا اُس میں۔

''ہم دونوں نے اکٹھے ہی امتحان دیا ہے۔'' بلرام بولا۔

''پہلے کیوں نہیں لائے کبھی اسے اپنے ساتھ؟''

''ہمارا ایک فیصلہ تھا ماں جی۔'' رنجنا بولی۔

''کیا؟''

''جب تک ہم بی اے کا امتحان نہیں دے لیتے آپ سے نہیں ملیں گے۔''

''آج ہمارا آخری پرچہ تھا اور آج میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔'' بلرام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا تم نے۔''

''ماں میں رنجنا سے شادی کر لوں؟'' بلرام نے آنکھیں جھکا کر بڑے ادب سے پوچھا۔

''نہیں!'' میرا بس ایک ہی لفظ کا مختصر جواب تھا۔

''کیوں؟'' اس نے اپنی جھکی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ بڑے یقین کے ساتھ۔ اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ رنجنا میرے بازوؤں میں کانپ سی گئی تھی۔

''تم دونوں کا آپسی تعلق کہاں تک بڑھا ہے؟''

میرے اس سوال پر رنجنا ایک دم لرز گئی۔

''بس یہیں تک۔'' بلرام بولا۔

''کس حد تک؟''

''آج میں پہلی بار اسے یہاں تک لایا ہوں۔''

''اس کے علاوہ؟''

رنجنا پسینے سے بھیگ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازوؤں کا گھیرا مضبوط کر لیا تا کہ اُسے تحفظ کا احساس ہو۔

''اس کے علاوہ کچھ نہیں۔'' بلرام نے جواب دیا۔

''شادی کے بعد اسے کہاں رکھو گے؟''

''تمہارے پاس اور کہاں؟''

''قید کرنے کے لئے؟''

''نہیں، تمہاری سیوا کرنے کے لئے۔''

''اسے غلام بنانا چاہتے ہو؟''

میرے اس سوال کا جواب بلرام کے پاس نہیں تھا۔ وہ کچھ لمحے ایک ٹک مجھے گھورتا رہا اور پھر بولا۔

''میں نے رنجنا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''کیا بتا دیا ہے تم نے۔ تم ایک دم گدھے ہو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

بلرام مجھے ایک دم گھورے جا رہا تھا خاموشی سے اور رنجنا پسینے سے بھیگتی جا رہی تھی۔

''میرے بارے میں بات کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا تم نے؟''

''یہ میری غلطی ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

مجھے لگا بلرام کے جواب پر میرے ماتھے کا ابھرا ہوا زخم ایک دم بڑی شدت سے جلنے لگا تھا۔

''تمہیں کسی کے بارے میں بنا اس کی اجازت کے کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماں جی۔'' پسینے میں بھیگی رنجنا نے اپنی آنکھیں اونچی کر کے مجھے مخاطب کیا۔

''رنجنا نے تمہیں اپنی ماں کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟'' میں نے بلرام سے سوال کیا۔

''میری ماں نہیں ہے ماں جی۔'' رنجنا سلگ اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے تو وہ اور زور سے رونے لگی۔

''مجھے افسوس ہے رنجنا۔'' میں نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

میں جب چائے بنا رہی تھی تو رنجنا چپ چاپ رسوئی میں کھڑی رہی۔ پھر اس نے پیالیاں صاف کر کے میز پر رکھیں اور پھر خود ہی گرم پانی کیتلی میں ڈالا اور اس میں چائے کی پتی اور پھر مجھ سے پوچھا۔

''کتنی شکر ڈالوں آپ کی پیالی میں ماں جی؟''

''آدھی چمچ۔''

''میرے پتا جی بھی آدھی چمچ پیتے ہیں۔''

''کیا کرتے ہیں تمہارے پتا جی۔''

''اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔''

جب وہ تینوں پیالیوں میں چائے بنا چکی تو صوفے پر بیٹھ گئی۔ میری پیالی میرے ہاتھ میں دینے کے بعد وہ چائے پینے لگی۔ بلرام نے اپنی پیالی خود ہی اُٹھالی تھی۔

''تم بلرام سے بہت پیار کرتی ہو؟''

''جی۔'' اس نے آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔

''میں بھی بلرام کے پتا جی سے بہت پیار کرتی تھی۔''

میری بات سن کر رچنا خاموش رہی۔

''جانتی ہو عورت کو اس کے پیار کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وشواس، ماں جی۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''نہیں۔'' یہ صرف عورت کی آرزو ہوتی ہے۔ اسے وشواس نہیں ملتا صرف عمر بھر کی غلامی ملتی ہے۔

بلرام بڑی ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

مرد عورت کا وشواس خریدتا ہے ایک چھوٹی سی گھٹن بھری چار دیواری کے بدلے میں۔ اور ایک دن اُسی چار دیواری کی رہر بھری سڑاند میں وہ دم توڑ دیتی ہے۔

''ایسا نہ کہو ماں جی۔'' بلرام نے مجھے ٹوک دیا۔ کتنا اتھاہ درد تھا اُس کی آواز میں۔

''مگر ایسا ہوتا ہے میرے بیٹے۔ ایسا ہی ہوا تھا میرے ساتھ، ایسا ہی ہو رہا ہے ہزاروں عورتوں کے ساتھ۔ مرد اُسے ایندھن بناتا ہے۔ عورت مرد کی بنائی ہوئی بھٹی میں عمر بھر تل تل جلتی رہتی ہے۔'' میں نے بلرام کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''کیا تم رچنا کو بھی ایسی ہی بھٹی میں جلانا چاہتے ہو؟'' میں نے بڑے تیکھے لہجے میں بلرام سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں ماں ہرگز نہیں۔'' وہ زور سے چیخا اور پھر صوفے سے اُٹھ کر میرے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے اُس کے چہرے کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

''تم وعدہ کرو کہ رچنا کو غلام نہیں بناؤ گے۔ اُس کی آزادی پر پہرے نہیں بٹھاؤ گے۔''

''میں تمہاری قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں۔'' اُس نے مجھے زور سے جھنجھوڑ دیا۔

اُس لمحہ رچنا میرے پاؤں پر گر پڑی۔

"اتنا کڑا امتحان نہ لو اپنے بیٹے کا ماں جی۔" اس کے گرم گرم آنسو میرے ٹھنڈے پاؤں کو بھگو رہے تھے۔

میں نے بلرام کو اور رنجنا کو اُٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا۔

"اپنے پتا جی سے کہنا میں اُن سے ملنے آؤں گی۔" میں نے رچنا سے کہا۔

"سچ!؟" رچنا کی آنسو بھری آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔

"جاؤ اسے گھر چھوڑ آؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔" میں نے بلرام سے کہا اور ساتھ ہی اس کے گال بھی تھپتھپا دیئے۔

بلرام اور رنجنا ابھی ابھی گئے ہیں۔

اور میں اپنی زندگی میں آئے دوسرے مرد کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ جو میرا بیٹا ہے۔

کاش میری زندگی میں آئے پہلے مرد کا سایہ تک نہ پڑے دوسرے مرد پر۔۔۔ دوسرا مرد میرا بڑا ہی معصوم اور پیارا بیٹا ہے۔

بلرام!

کشمیری لال ذاکر

ڈبل شفٹ

میری عمر اَب چالیس سے اوپر ہے اور میں تین بیٹوں کی ماں ہوں۔ میری بیٹی کوئی نہیں اور اس کی مجھے خوشی ہے ورنہ وہ بھی میری طرح زندگی کو شروع سے ہی ڈبل شفٹ میں گزارنے لگتی۔ جس کا مجھے بیحد دُکھ ہوتا۔ اس لئے کہ میں نے خود زندگی بھر ڈبل شفٹ میں کام کیا ہے بچپن سے لے کر آج تک جب کہ میں خود ایک بھری پری گرہستن ہوں۔

میری زندگی کا دائرہ بہت محدود ہے۔ بہت گھومی پھری بھی نہیں ہوں۔ گنتی کے یہی پانچ سات چھوٹے چھوٹے شہر دیکھے ہیں میں نے۔ ودیس کی بات تو چھوڑیں میں نے اپنے ملک کے بمبئی، مدراس، کلکتہ جیسے بڑے بڑے شہروں کے نام بھی صرف اخباروں میں پڑھے ہیں۔ انہیں قریب سے جا کر نہیں دیکھا۔ دہلی میں صرف ایک ہی بار گئی تھی۔ وہ بھی شروع شروع میں جب میری شادی ہوئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ بڑے بڑے شہروں میں لوگ کیسے جیتے ہیں، خاص طور سے عورتیں۔ میری ہی طرح جیتی ہوں گی بے چاری۔ ان کی تقدیریں بھی تو اُس نے لکھی ہوں گی جس نے ہم سب کی تقدیریں لکھی ہیں۔ اس نے تقدیروں میں فرق کہاں رکھا ہوگا؟ وہ بڑا ہوشیار تقدیر سار ہے۔

میں نے کبھی بہت سنجیدگی سے نہیں سوچا ہے۔ اپنی زندگی کے بارے میں، نہ ہی کبھی زیادہ بات بھی کی ہے جو زیادہ بولتے ہیں لوگ اُنہیں سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ جو کم بولتے ہیں، لوگ اُن پر اعتبار نہیں کرتے۔ انہیں گھنّے سمجھتے ہیں، اس لئے نہ زیادہ بولتی ہوں نہ بہت کم۔ صرف کم۔ مطلب کی بات کرتی ہوں اور شاید یہی میری غلطی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ غیر تو کیا اکثر میرے اپنے لوگ، میرے سگے سمبندھی، میرا خاوند، میرے بچے، میرے کولیگز بھی میری بات نہیں سمجھتے حالانکہ بات مطلب کی ہوتی ہے۔ شاید ان کے مطلب کی نہیں ہوتی، اس لئے وہ غلط سمجھتے ہیں میری بات کو۔ یہی تو ہو رہا ہے پچھلے کئی دنوں سے میرے ساتھ۔

میرا بڑا لڑکا شرت پری انجینئرنگ کر رہا ہے۔ شرت اچھے قد کاٹھ والا ذہین لڑکا ہے اور مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔ بڑا معصوم اور ایمان دار قسم کا ہے۔ پچھلے اتوار کپڑے دھونے لگی تو جینز سے اُس کی

پتلونیں اور بش شرٹیں اُتاریں۔ غسل خانے میں پھینکنے سے پہلے پتلون کی جیبیں دیکھنے لگی۔ ایک پتلون کی جیب میں سے تہ کیا ہوا پیڈ کا ایک کاغذ نکلا۔ کل شام ہی تو نیا پیڈ لایا تھا وہ۔ کاغذ کھولا۔ شرت کی ہی لکھاوٹ تھی۔ صاف صاف سیدھے الفاظ کے حرفوں کی کروز بالکل پوری۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ صاف صاف سیدھے انداز سے لکھنے والے لوگ ایماندار اور پرخلوص اور سچے ہوتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کیوں کہ شرت بڑا ایماندار لڑکا ہے۔ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اُس نے مگر اس سے گھر پر نہیں تھا۔ کسی دوست سے ملنے گیا تھا تھوڑی دیر پہلے۔ میں اُس کے کپڑے اُٹھا کر غسل خانے میں لے گئی اور وہیں غسل خانے سے باہر کھڑے ہو کر پیڈ کے کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے لگی۔

کل شام کی ہی تاریخ تھی خط پر کسی لڑکی وندنا کو لکھا تھا اُس نے۔ خط میں نے پڑھ کر خط الماری میں رکھ دیا اور کپڑے دھونے لگی۔ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔ میں اس کی اسٹیج سے نہیں گزری تھی۔ دسویں کی تھی کہ شادی ہو گئی تھی میری۔

کوئی مرد زندگی میں نہیں آیا تھا، سوائے اس کے جس کے ساتھ سات پھیرے دلوا کر ماں باپ نے گھر سے بھجوا دیا تھا۔ اس لئے مجھے اپنے ہی گھر میں ہوئی اس واردات سے پریشانی ہوئی۔ شرت نے واپس آ کر اپنی پتلوں تلاش کرنا شروع کی۔ پتلون ہینگر میں نہیں تھی۔ بڑا بوکھلا رہا تھا۔ بنا مجھ سے پوچھے غسل خانے میں پڑے کپڑوں کو ادھر اُدھر پھینکنے لگا۔ کچھ دھلے کچھ اَن دھلے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ میں اُسے دیکھ کر حیران نہیں ہو رہی تھی۔ صرف اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ڈھونڈھ رہے ہو شرت؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ایک پینٹ تھی۔''

''کون سی پینٹ؟''

''تھی ایک۔'' اُس نے جھجھلاتے ہوئے کہا اور کپڑے دوبارہ ادھر اُدھر پھینکنے لگا۔

''کپڑے کیوں خراب کر رہے ہو بیٹے؟''

''اپنی پینٹ تلاش کر رہا ہوں۔'' اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔

''دو پتلونیں باہر تار پر ڈال دیں ہیں۔''

میری بات سن کر وہ فوراً صحن کی طرف لپکا اور تار پر ٹنگی ملیوشیڈ کی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ پتلون میں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ میں غسل خانے سے جھانک کر دیکھ رہی تھی بے چارے کا برا حال ہو رہا تھا۔

''ڈیم اٹ۔'' وہ چیخا

''کیا ہوا بیٹے؟''
''تم مجھ سے پوچھے بغیر کیوں میرے کپڑے الماری میں سے نکالتی ہو ممی۔''
''اس لئے کہ تم صاف کپڑے پہن سکو۔''
''آئی ڈونٹ لائک اٹ۔'' وہ بولا۔
''مجھے زیادہ انگریزی نہیں آتی۔ لیکن تمہاری باتیں مجھے پسند نہیں۔''
میں نے غصے میں آ کر آہستہ سے کہا۔
''ممی!'' وہ چیخا۔
''میں نے سنبھال کر رکھ لیا ہے وہ تمہارا لو لیٹر۔''
شرت میرا جواب سن کر ایک دم بجھ گیا۔ اس کا چہرہ پسینے سے نچڑنے لگا تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔
''یہ لڑکی کون ہے؟''
''میری کلاس فیلو۔'' اُس نے بڑی ایمانداری سے جواب دیا۔
''کیا کرتا ہے اس کا فادر؟''
''انجینئر ہے۔''
''اور تمہارا باپ؟''
''ہیڈ کلرک۔''
''کہاں؟''
''اُسی کے آفس میں۔''
''فرق سمجھتے ہو؟''
''لیکن ــــ!''
''ایماندار آدمی کو اپنی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔'' میں اتنا کہہ کر غسل خانے میں آ گئی اور شرت صحن میں کھڑا سوچتا رہا۔ اُس کا ہیڈ کلرک باپ اندر چارپائی پر لیٹا انگریزی اخباروں کے سنڈے ایڈیشن پڑھ رہا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ رات دیر سے گھر آیا تھا اور خوب پئے ہوئے تھا۔ اس کی یہ عادت اس کے اپنے بیٹے کو بھی پسند نہیں تھی۔ وہ بھی اپنی حیثیت کو نہیں سمجھتا تھا۔
کچھ ہی روز پہلے شرت نے بتایا تھا کہ اس کی کلاس کے اسٹوڈینٹس اسٹڈی ٹور پر جا رہے ہیں۔

بمبئی اور گوا سے ہو کر وہ دہلی میں دو دن رکیں گے۔ اس نے بھی اجازت چاہی تھی اور پانچ سو روپے بھی مانگے تھے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے ڈیڈی سے بات کرے لیکن یہ کام بھی اُس نے میرے ہی ذمہ لگایا تھا۔ شرت، آشیش اور دگی جانے کیوں اپنی سبھی باتیں مجھ سے کہتے ہیں، اپنے ڈیڈی سے نہیں۔ میں دفتر سے تھک ہار کر آئی ہوں۔ ان کے بستر ٹھیک کرنے سے لے کر انہیں رات کو پڑھنے کے لئے جگانے تک سبھی کام مجھے کرنے ہوتے ہیں۔ ان کے ڈیڈی اپنے بیٹوں کے کسی بھی کام کے حصے دار نہیں۔ اس سے مجھے کبھی کبھی پریشانی بھی ہوتی ہے۔ اس دن سونے سے پہلے میں نے شرت کے ڈیڈی سے کہا۔

''شرت اسٹڈی ٹور پر جانا چاہتا ہے۔''

''کہاں؟''

''بمبئی اور گوا۔''

''تم نے کبھی یہ جگہیں دیکھی ہیں؟''

''نہیں! آپ نے دیکھی ہیں؟''

''نہیں!''

''اگر ہم نے کچھ نہیں دیکھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے بچے بھی کچھ نہ دیکھیں۔'' میں نے کہا۔

''ضرور دکھاؤ۔ مجھے کیا تکلیف ہے۔''

''آپ کی اجارت تو ضروری ہے۔''

''تمہارے بیٹوں کو تو صرف تمہاری اجازت چاہیے۔ میری کیا پرواہ کرتے ہیں وہ۔''

''آپ کتنی پرواہ کرتے ہیں اُن کی۔ کبھی سوچا بھی ہے آپ نے اپنے بیٹوں کے بارے میں؟''

''وہ آنچل تو تمہارا پکڑے رکھتے ہیں ہر وقت۔''

''آپ اپنی پتلون کا پائینچہ پکڑا دیجئے۔''

''بہت لمبی زبان ہو گئی ہے تمہاری۔''

''کیوں کہ میں صرف مطلب کی بات کرتی ہوں۔''

''اور تو سبھی بکواس کرتے ہیں نا؟''

''مجھے معلوم نہیں۔ شرت کو جانے کے لئے کہہ دوں کہ نہیں؟''

''اسے کچھ رقم بھی تو چاہیے ہوگی۔''

''پانچ سو روپئے مانگتا ہے۔''

''میرے پاس تو پانچ روپئے بھی نہیں۔''

میرا من چاہا کہ کہوں شراب کے لئے تو روپئے آجاتے تھے کہیں نا کہیں سے۔ لیکن اپنے بچوں کی کوئی مانگ پوری کرنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا اُن کے پاس۔ لیکن میں نے اس لئے بات کو نہ بڑھایا کہ بیکار کا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔ اس لئے بات کو ختم کرنے کے خیال سے کہا۔

''میں جو ڈبل شفٹ لگاتی رہی ہوں آفس میں اس کے پانچ سو روپئے ملیں گے۔ وہی شرت کو دے دوں گی۔''

''وہ کیسے دے دوگی شرت کو؟''

''اور کیا کروں؟''

''اس رقم سے تو ہاؤسنگ بورڈ کے مکاں کی قسط دی جائے گی۔''

''اس رقم سے کیوں دی جائے گی؟''

''اس لئے کہ تمہارے سورگیہ پتا لالہ دینا ناتھ جی میرے نام کوئی اور رقم نہیں لکھ گئے ہیں، بس یہ ڈبل شفٹ والی رقم ہی تو ہے۔''

یہ کہہ کر اُنہوں نے سگریٹ سلگائی اور دھوئیں کا ڈھیر سا میری طرف پھینک دیا۔ نشے کا بوجھ ابھی چھایا ہوا تھا۔

''کون پلاتا ہے ہر روز آپ کو، آپ کبھی ہوش میں نہیں ہوتے۔''

''تمہارا پتا سورگیہ دینا ناتھ۔'' اُنہوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔

''شرم آنی چاہیے آپ کو۔'' میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور اُنہوں نے مجھے پیٹنے کے لئے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

میں بستر سے اُٹھ کھڑی ہوگئی۔

''ٹھہر کمینی۔'' وہ بستر سے اُٹھنے کی کوشش میں لڑکھڑا گئے۔

میں دروازے سے باہر نکل آئی۔ دوسرے کمرے کی روشنی بھی بجھی ہوئی تھی۔ بچے سو چکے تھے۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ میں جب بھی کسی معاملے میں بات کرتی ہمارا جھگڑا ہو جاتا۔ شروع شروع میں تو بچوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن اب وہ اپنے ڈیڈی کی عادت جان گئے تھے۔ ان کی مرضی کے خلاف ذرا سی بات کہوں تو وہ جھگڑے پر اُتر آتے۔ یہ اُن کا حق تھا کہ بنا مجھ سے پوچھے میری الماری سے رقم اُٹھا

لیں یا پرس سے پیسے نکال لیں اور میں اگر کبھی پوچھ بیٹھوں تو مرنے مارنے پر تیار۔ اب ان کی یہ بات بچوں کو بھی ناگوار گزرنے لگی تھی۔

لیکن اُس رات اُنھوں نے بار بار میرے پتا جی کا ذکر کر کے میری بڑے بے عزتی کی تھی۔ میں اگر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آتی تو وہ آدھی رات کو ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور سارا محلّہ جاگ جاتا۔ میں چپ چاپ چھوٹے سے ڈرائینگ روم میں آ گئی اور کشن کو سر کے نیچے رکھ کر صوفے پر ہی لیٹ گئی۔ جانے کیوں آج مجھے اپنی ماں اور اپنے پتا بہت یاد آنے لگے۔ کچھ شیریں اور ترش یادوں کی پرچھائیاں میرے ذہن میں اُبھرنے لگیں۔

ماں بہت بیمار ہے اس کے بچنے کی اُمید بہت کم ہے۔

میں سب سے بڑی لڑکی ہوں۔ میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن ہے۔ ان کی عمروں میں بھی زیادہ فرق نہیں لیکن گھر کو سنبھالنا میرا ہی کام ہے۔ مجھے اپنے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہے۔ پتا جی بہت پریشان ہیں۔ ہمارے مالی حالات بہت اچھے نہیں۔ ایک اسکول ماسٹر کے مالی حالات اچھے ہو بھی کیسے سکتے ہیں۔ اسکول کا کام، حکیموں اور ڈاکٹروں کے چکر۔ ان کی صحت بھی تو بہت اچھی نہیں۔ گھر بھی دیکھتی ہوں ماں کو بھی سنبھالتی ہوں۔ اور بہن بھائیوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہوں۔ محلے والے بھی ترس کھاتے ہیں میری حالت پر۔ اور پھر ایک دن ماں ہم سب کو چھوڑ جاتی ہے۔ ایک بھونچال ہی تو آ گیا ہے گھر میں سب کچھ ڈھ گیا ہے، کچھ بھی تو نہیں بچا۔ ہمارے ڈھانچے ضرور بچ گئے ہیں ورنہ زندگی کی نیو ہل گئی ہے۔

پتا جی ہردوار گئے ہیں۔ اور ہم چار بہن بھائی گھر میں دہاڑیں مار رہے ہیں۔ گلی محلے کی عورتیں سنبھال رہی ہیں سب کو۔ وہ جب کبھی آپس میں بات کرتی ہیں تو میرا کلیجہ ہل جاتا ہے۔

''گھر اُجڑ گیا ماسٹر جی کا۔''

''کیا عورت تھی بھاگونتی۔''

''کون سنبھالے گا ان یتیموں کو۔''

''بڑی لڑکی کی جون خراب ہو گئی۔''

میری تو واقعی جون خراب ہو گئی تھی۔ بچپن میں کولھو میں جت گئی۔

زندگی کا پہلا سبق ملا کہ بے غرض ہو کر اپنا آپ قربان کر دو دوسروں کے لئے۔ میں دیتی رہی اپنی قربانی۔

وقت گزرتا گیا۔

پتا جی کی عمر بھی بڑھنے لگی اور ہم سب کی بھی۔ ہم سب اسکول جاتے تھے اور گھر کا کام بھی کرتے تھے۔ پتا جی کا بستر بچھانے سے لے کر گھر میں جھاڑو دینے کا کام میرے ذمے تھا۔ بہن بھائی بھی مدد کرتے تھے لیکن ساری ذمہ داری میری ہی تھی۔ زندگی کئی شعبوں میں بٹ گئی تھی۔

ادھر میں نے دسویں پاس کی اُدھر پتا جی نے میرا بیاہ کر دیا۔ میں نے بہت روکا——

''گھر نہیں چلے گا پتا جی آپ سے۔''

''گھر بھگواں چلائے گا بیٹی۔ تو جا۔''

'میرے بہن بھائی رُل جائیں گے۔''

''بھگواں راکھا ہے سب کا۔''

بھگوان پر اتنا اٹوٹ وشواش کہ کوئی توڑ ہی نہیں۔ پتا جی کی سیکھ پلے باندھ کر پوٹلی سی بنی گھر کی دہلیز پار کر کے چلی آئی پردیس میں۔

پھر لمحوں کی بوچھاڑ دھاڑم دھاڑ۔

سب کچھ بہہ گیا۔

دھیرے دھیرے یادداشت بھی مٹنے لگی۔

گھٹنوں گھٹنوں گارا، پاؤں نکالنے کی کوشش کروں تو اور نیچے کو دھنستی جاؤں اور لگا جیسے سب کچھ دُھل گیا تھا ذہن سے۔ ماں باپ کا گھر جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ جیسے میں کبھی بچی تھی ہی نہیں۔ ایسی کی ایسی پیدا ہوئی تھی گویا محنت مشقت کے ہاتھوں پالی گئی تھی۔

سسرال والوں کا گھر۔

ایک پرائی لڑکی کو پال لیا تھا بڑے پیار سے۔

ماں کی کمی پوری ہو گئی پتا جی کی نہیں۔ یہاں بھی بھائی بہنوں کی بھرمار تھی۔ لگتا ہے غریب گھرانوں میں بچے جنگلی پودوں کی طرح اُگتے ہیں۔ کسی کا بھی تو قابو نہیں اُن پر۔ عورتیں بے حیائی سے پیٹوں کے ڈھول اُٹھائے پھرتی ہیں گلی گلی، بہت برا لگا شروع شروع میں۔

اور پھر ایک دن اپنا پیٹ بھی ڈھول بن گیا جسے چھپائے چھپائے پھرتی۔ ادھر میرا پہلوٹھی کا لڑکا شرت پیدا ہوا، اُدھر میری ساس چل بسی۔ بڑی منحوس بہو تھی اولاد بھی ایسی جنی کہ گھر کی مالکن ہی چلتی بنی۔

''صرف نام کی بھاگونتی ہے۔''

"مرنے والی نے سب کچھ ٹوکرے میں ڈھک رکھا تھا۔"

"سب کچھ بکھر جائے گا اب۔"

بیٹے کو چھاتی سے لگائے گھر کی دیواروں کے ساتھ لگی سن رہی تھی۔ کانوں کو چیرتی ہوئی تیروں جیسی یہ آوازیں۔

نئے شہر میں لے آیا تھا مجھے میرا آدمی اور دفتر میں بھرتی کرا دیا تھا۔ یہ زندگی گزارنے کا تجربہ تھا۔ میرے دفتر میں ہی کام کرنے والی تین چار عورتوں نے ایک بوڑھے کو اُن کے بچوں کی دیکھ بھال کا کام سونپ رکھا تھا۔ میرا بیٹا بھی اسی گروپ میں شامل کر دیا گیا۔ دن بھر اُس پر کیا بیتتی مجھے کیا پتہ۔ شام کو دفتر سے جا کر اُسے سمیٹتی اور گھر پہنچ جاتی۔ شرت بے چارا تو پلا بھی ڈبل شفٹ میں۔ پہلی شفٹ تو دفتر کی بھینٹ ہو جاتی تھی۔ بچہ تو اوور ٹائم میں پل رہا تھا۔ من کو بہت مارنا پڑا۔ تھوڑے سے پیسوں کے موہ میں گھر چوپٹ ہو گیا تھا۔

"مجھ سے کیا بچے گا یہ سب کچھ۔" میں نے ایک دن شرت کے ڈیڈی سے کہا۔

"تو چھوڑ دو، لیکن میں گھر چلانے کے لئے ایک پیسہ نہیں دوں گا۔"

"اور کون دے گا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

تکرار کرنے کا رواج نہیں تھا اس گھر میں جہاں سے میں آئی تھی۔ اس لئے میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور یوں تکرار نہ کرنے کی عادت مجھے توڑتی گئی اندر ہی اندر سے۔ مجھے ریزہ ریزہ کرنے میں میرے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بچے پیدا ہوئے میرے تینوں بیٹوں کا بھی حصہ تھا۔ شرت کے بعد آشیش اور اس کے بعد وکی اور میں نے روکنا چاہا اس کے ڈیڈی کو، گھر میں بھیڑ نہ جمع کرنے کے لئے اور وہ بے قابو ہو گئے۔

"تو آپریشن کروا لو مجھے ہی کیوں روکتی ہو؟"

"آپ کروا لو نہ آپریشن۔"

"میں تو نہیں کراؤں گا۔"

"کیوں؟"

"میری مرضی۔"

"میں اپنے پنڈے کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔"

''یہ بھی کر دیکھنا۔''

''آخر مجھے ہی ہارنا پڑا۔ آپریشن بھی میں نے ہی کرایا۔ ڈر تھا پتی ہاتھ سے نکل نہ جائے بیچاری عورتوں کو کتنے محاذوں پر لڑنا پڑتا ہے۔ سماج نے انہیں شکست دینے کے لئے سینکڑوں محاذ کھول رکھے ہیں۔ کہیں تو آخر ہارے گی ہی عورت۔ کب تک لڑے بنا ہتھیاروں کے۔ عورتوں کو ہتھیار رکھنے کے بھی لائسنس نہیں ملتے کہاں تک حفاظت کر سکتی ہے، اپنے جان مال کی۔ ایک طرف دشمنوں کی ہتھیار بند فوج اور دوسری طرف ایک اکیلی ناری۔ بے چاری ستی تو ہو سکتی ہے لڑ نہیں سکتی۔''

مجھے لگتا ہے کہ دنیا کی ہر عورت ڈبل شفٹ ہی میں کام کرتی ہے۔ چاہے وہ ڈولپڈ (Developed) ملک کی رہنے والی ہو، چاہے انڈر ڈولپڈ ملک کی۔ ہر عورت کی تقدیر یہی ہے کہ وہ ہوش سنبھالنے سے لے کر مرنے تک اپنے بھاؤ تاؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسروں کو زندہ رکھنے کے لئے ڈبل شفٹ میں بلکہ ملٹی شفٹ میں کام کرے، زندگی بھر کی اس کی کڑی ریاضت کا صلہ ہے وہ کھوٹی دھات کا تمغہ جو جنم لیتے ہی اس کے گلے میں ڈالا جاتا ہے اور جس پر زندگی بھر مبہم اور ذو معنی عبارتیں تحریر کی جاتی ہیں اور ان تحریروں کو نقش کرنے والوں میں اس کے اپنے خاندان کے لوگوں سے لے کر دنیا بھر کے دانشور شامل ہیں۔ ان تمام تحریروں کے معنی ایک ہی ہیں عورت چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں کسی بھی روپ میں زندہ ہے فقط دوسرے درجے کی شہری ہے کیوں کہ ڈبل شفٹ میں کام کرنے والے لوگ اعلیٰ درجے کے شہریوں میں شمار نہیں ہو سکتے۔

پچھلے دو مہینوں سے دفتر میں بہت کام ہے۔

جانے کہاں کہاں کے پرانے ریکارڈ چیک کئے جا رہے ہیں۔ شام کو روز ہی دیر سے گھر آتی ہوں میرے چہرے پر تو نحوست چپی ہوئی ہے۔ مجھے تو خیر اُوور ٹائم کرنا پڑتا ہے اور ڈبل شفٹ لگانا پڑتی ہے۔ لیکن شرت کے ڈیڈی دن بھر دفتر میں سوائے سگریٹ اور چائے پینے کے کچھ نہیں کرتے اور پھر بھی ہر روز دیر سے گھر لوٹتے ہیں اپنے ہوش و حواس گنوائے ہوئے کئی برسوں سے ہیڈ کلرک ہیں پرموشن نہیں ہوا۔ سالانہ رپورٹیں خراب ہیں۔

ایک نیا جھنجھٹ مول لیا ہے۔ کئی مہینوں سے ہاؤسنگ بورڈ کا ایک بنا بنایا فلیٹ لے لیا ہے۔ ہیڈ کلرک صاحب نے۔ فلیٹ ان کے نام ہے۔ قسطیں بھرنے کا کام میرے ذمہ ایک اچھی خاصی رقم تو شروع میں ہی جمع کرا دی۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب لے گئے۔ اب میری بینک بک بھی اُن کے پاس رکھی ہے۔ جس میں کل ایک سو تین روپے پچپن پیسے باقی رہ گئے ہیں۔ یہ میری زندگی کی ساری کمائی ہے اور

شرت خط لکھ رہا ہے ان کے باس کی لڑکی کو مور کھ ماں مور کھ بیٹا۔ خالی بینک ٹکوں پر لو لیٹرز لکھا کر بیٹے۔ قیمتی پیڈ کے خوبصورت کاغذوں کا کیوں ناس مار رہا ہے۔ ایک طرف فلیٹ کی قسط جمع کرانے کا نوٹس ہے اور دوسری طرف شرت کی اسٹڈی ٹور پر جانے کا تقاضا۔

رات بھر سر کو کشن پر رکھے اور صوفے پر ٹانگیں جوڑ کر لیٹے میری بند آنکھوں کے سامنے قسط جمع کرانے کا نوٹس اور وندنا کے نام شرت کا لکھا ہوا خط، دونوں پھڑ پھڑاتے رہے جیسے بہت تحت حکڑ میں کاغذ کے یہ پتے ایک دوسرے سے اُلجھ کر میری آنکھوں سے ٹکرا رہے ہوں۔ کاغذوں کی یہ مار کھاتی رہی اپنے چہرے اور اپنی آنکھوں پر رات بھر اور نڈھال ہو کر جانے کب اور کیسے سو گئی۔ کمزور اور ہارے ہوئے لوگوں کی آخری پناہ نیند کی خندق ہوتی ہے۔

صبح بہت جلد جاگ گئی۔

یہی ہوتا ہے اکثر میرے ساتھ، رات کو دیر تک جاگتی ہوں تو صبح اور بھی جلدی اُٹھ جاتی ہوں۔ جی بھر کر پانی گرایا اپنے پنڈے پر، نہانے سے دماغ پر پڑا بوجھ ڈھل گیا۔ بوجھ تھا بھی تو بہت۔

کچن میں جا کر چائے بنائی اور چائے کی پیالی لے کر بچوں کے کمرے میں آ گئی۔ شرت بس جاگا ہی تھا ابھی ابھی، آشیش اور روگی سو رہے تے۔ کتنے پیارے لگ رہے تھے اس طرح سوتے ہوئے۔ میں نے چائے کی پیالی شرت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو چائے۔''

''آئی ایم سوری ممی۔'' اس نے اچانک چونک کر کہا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ چائے کی پیالی لیتے ہوئے اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''تم اسٹڈی ٹور پر صرف بمبئی اور گوا دیکھنے کے لئے جانا چاہتے ہو۔''

''نہیں۔''

''اور کس لئے۔''

''وندنا جا رہی ہے اس لئے۔'' کتنی ایمانداری سے بول پڑا تھا میرا بیٹا۔

''اسٹیٹس کے فرق کا خیال کیا ہے تم نے۔''

''ابھی نہیں۔''

اس کے جواب کے بعد میں پل بھر خاموش رہی۔ اتنے بڑے سماجی فرق کا احساس اسے میرے کہنے سے نہیں ہوگا۔ تجربے سے ہی ہوگا۔ تکرار فضول ہے۔

''تو جاؤ۔'' میں نے کہا۔

"تھینکس ممی۔"

"پانچ سو روپے مجھ سے لے لینا۔"

مجھے لگا صرف اس کی آنکھیں ہی نہیں بھری پڑی تھیں گلا بھی بھر گیا تھا۔ وہ بول نہیں سکا۔ ایک شبد بھی، صرف اپنا سر گھماتا رہا۔

جیسے بار بار شکریہ ادا کر رہا ہو میرا۔

میں کمرے سے باہر نکلنے کو ہوئی تو شرت نے ایک بار آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی لرز رہی تھی۔ اس سے اس کی چھلکتی آنکھوں سے کئی آنسو ایک ہی بار میں ٹپ ٹپ کر کے چائے کی پیالی میں گر گئے۔

"میں دوسری پیالی لاتی ہوں تمہارے لئے۔" میں نے چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس میں سے ایک گھونٹ لیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

"آج چائے نہیں بنے گی؟"

شرت کے ڈیڈی کی آواز آ رہی تھی بیڈ روم سے۔ رات کا نشہ ٹوٹ رہا تھا شاید۔

کشمیری لال ذاکر

ڈریم لینڈ

میں کل یہاں آیا تھا۔ بس سے اُترا تو بارش ہو رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے بارش ہی میں میرا سامان کمرے میں رکھا تھا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ میں سڑک سے ریسٹ ہاؤس تک پہنچنے میں ہی بالکل بھیگ گیا تھا۔ لیکن گرمی کے موسم میں بارش کی بوندیں خوشگوار لگتی ہیں، خصوصاً اُسے جو میدانوں کی تپش سے بھاگ کر کسی پہاڑی مقام پر آیا ہو۔ میں نے بال تولیے سے پونچھے۔ چہرے سے پانی کے قطرے صاف کیے اور ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں کھڑا ہو کر سامنے کی پہاڑیوں سے گھٹاؤں کے ریلوں کو گھاٹی میں لہراتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کرپال نے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کو سب ضروری ہدایتیں دے رکھی تھیں۔ چنانچہ اُس نے برآمدے میں آرام کرسی بچھا دی اور تپائی سامنے رکھ دی۔ تپائی پر بچھا ہوا میز پوش گندہ تھا، اسے میں نے اُٹھا دیا۔

''کل ایک صاحب جو یہاں ٹھہرے تھے، اسے خراب کر گئے ہیں، آج دھوبی میز پوش دے جائے گا تو میں بدل دوں گا۔'' چوکیدار نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''تم اس کی فکر نہ کرو۔'' میں نے جواب دیا۔

چوکیدار چلا گیا، میں نے سگریٹ سلگایا اور خنک ہوا کے جھونکوں کے راحت بخش لمس کا لطف لینے لگا۔

یہ ریسٹ ہاؤس اس علاقے کا بہترین ریسٹ ہاؤس سمجھا جاتا ہے۔ ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک الگ سی پہاڑی پر زمین میں سڑک کے کنارے یہ ریسٹ ہاؤس واقعی بڑا خوبصورت ہے۔ میں اس ریسٹ ہاؤس میں پہلی بار ٹھہرا تھا۔ چیل کے درختوں سے گھری ہوئی سرخ رنگ کی عمارت، جس کی ڈھلوان چھت دور ہی سے نظر آ جاتی تھی، ہریالی کے اس جنگل میں ایک دلکش پھول کی طرح دکھائی دیتی تھی، جیسے کسی پہاڑی دوشیزہ نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں ایک بڑا سا جنگلی سرخ پھول اُڑس رکھا ہو۔

میں ماحول کی دلکشی میں ڈوبا آرام کرسی میں بیٹھ گیا اور کرسی کی ٹیک سے پیٹھ ٹیک کر اپنے گیلے کپڑوں کی ہلکی ہلکی ٹھنڈک محسوس کرنے لگا۔ کئی روز کے بعد گھٹا کا یوں کھل کے برسنا، اور ایک خاموش جگہ

پر اکیلے اپنے آپ میں ڈوب جانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چوکیدار نے چائے کا ساماں میز پر رکھ دیا۔

''اس وقت چائے کی بہت ضرورت تھی مجھے، چوکیدار۔''

''صاحب کہہ گئے تھے چائے میں پلاؤں، شام کو وہ خود آ کر باقی انتظام دیکھیں گے۔'' اُس نے کہا۔

''اچھا شکریہ، تم جاؤ چوکیدار۔''

چوکیدار چلا گیا۔ اس وقت کسی کا بھی میری سوچ میں مخل ہونا مجھے اچھا نہ لگ رہا تھا بلکہ میں چاہ رہا تھا کہ کرپال بھی اگر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے آئے تو بہتر ہے۔

میں نے چائے کی پیالی بنائی، تازہ سگریٹ سلگایا۔ گرم گرم چائے کا لمس لبوں پر محسوس کیا اور اُس کی ہلکی سی مٹھاس کو سگریٹ کے دھوئیں کی کڑواہٹ سے سہلاتے ہوئے سامنے کی گھاٹی کو دیکھنے لگا، جس پر چھائی گھٹاؤں کی تہیں ہلکی ہوتی جا رہی تھی اور کہیں کہیں کوئی کچا پہاڑی مکان نظر آنے لگا تھا۔ ایسے اوقات جب مجھے بلندی نصیب ہو اور تنہائی کا ماحول ہو اور شہر کی مصنوعی فضا سے الگ کہیں کچھ سے گزارنے کو مل جائیں تو میں زندگی کی بنیادی قدروں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں اور پھر جانے کیسے میری ماضی کی کچھ یادیں دبے پاؤں میرے ذہن کی سطح پر چلنے لگتی ہیں اور میری سوچ ایک طویل سفر پر چل نکلتی ہے۔ ایسا سفر جس کی کوئی منزل نہیں، جس میں صرف راستے ہی راستے ہیں۔ کہیں کہیں پڑاؤ بھی ہیں، جہاں دن کے اُجالے میں درختوں کی چھاؤں مل جاتی ہے اور جہاں رات کی تاریکی میں ایک آدھ چراغ جل کر ہمت بندھائے رکھتا ہے۔ ایسی گھڑیوں میں مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے میں ایک سرکاری دفتر میں کام کرنے والا ایک عام کرمچاری نہیں بلکہ سُقراط جیسا بہت بڑا آدمی ہوں اور زندگی کی تلخیاں ڈر ڈر کر چکھنے کے بجائے زہر کا بھرپور پیالہ ہونٹوں سے لگا کر اُسے ایکدم ختم کر سکتا ہوں۔ زہر کے پیالے پینے والے میرے جیسے کئی اور بھی ہوں گے۔ ایسے اور بھی بہت سارے لوگ ہیں جو زندگی کا زہر دھیرے دھیرے انجانے میں پیتے رہتے ہیں اور جن کے سینوں میں وہ زہر کینسر کی طرح پھیلنے لگتا ہے اور کسی صبح اُن کے حصے میں زہر کی مقدار ختم ہو جاتی ہے۔ ان کا پیمانہ بھر جاتا ہے اور وہ اپنے ہونٹوں پر زہر خند کی تلخی کھنڈائے اپنے رشتہ داروں، اپنے دوستوں، اپنے ساتھیوں اور اپنے محبوبوں کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں اور تعلقات کے مارے ہوئے ان کے ساتھی اُن کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں یا ان کی تصویروں کو اپنے مینٹل پیس پر رکھ کر کبھی کبھی اُنہیں یاد کر لیتے ہیں۔ یہی زندگی ہے، یہ ہستی کا سارا پروسیس ہے، یہی انسانی تواریخ کی داستان ہے، یہی دنیا بھر کے کلچر اور ادب کی روح ہے۔ انسان مر جاتا ہے لیکن اس کی روح زندہ رہتی ہے

اور کبھی کبھی اپنی چھوڑی ہوئی سکھیوں اور الگ ہوئے دوستوں کو تنگ کرتی ہے اور اُس سے محبت کا دام بھرنے والے اُسے بھوت پریت کا نام دے کر اُس سے پیچھا چھڑانے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کی یہ تصویر کتنی دردناک ہے لیکن یہی اس کی اصلی تصویر ہے۔

وہیں برآمدے میں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی تھی۔ میں جب اپنی سوچ کے سمندر سے باہر نکلا تو محسوس ہوا کہ جیسے میرے اردگرد پھیلی ہوئی ریت کے ذرّات انسانوں کے وہ ارمان تھے جو تشنہ رہ گئے تھے اور اب شام کے دُھندلکے میں سمندر کی طرف اپنی پیاس بجھانے کے لیے دوڑ رہے تھے اور تشنہ ارمانوں کے اس ہجوم میں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکیں، لمحہ بھر کو تو سوچ کا توازن ٹھیک نہ ہوا۔ پھر مجھے اپنے ماحول کا احساس ہوا، میں تو ایک پہاڑی ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھا تھا جو سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا اور کہیں کوئی ریت کا ذرہ نہ تھا۔ یہاں تو سمندر کی لہروں کی آواز نہیں، چیل کے درختوں میں سے سنساتی ہوئی ہوا کا شور تھا۔ میں نے دیکھا سامنے سے کرپال آ رہا تھا، گھٹائیں کب کی پہاڑیوں کے دامن میں سو چکی تھیں۔ آسماں نکھر گیا تھا اور دور بستی کے مکانوں میں روشنیاں جلنے لگی تھیں لیکن ریسٹ ہاؤس کے کمروں میں اندھیرا تھا کیونکہ چوکیدار نے ابھی بجلی نہیں جلائی تھی۔

کرپال میرا پرانا دوست ہے، بہت پرانا تو خیر نہیں۔ اچھا آدمی ہے، مجھے اپنے محکمے کے لوگ کچھ زیادہ پسند نہیں۔ وہی عام قسم کے لوگ جو اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی رنجشوں اور کڑواہٹوں کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ جو ایک دوسرے کی چغلی کرتے ہیں، ان کی پرائیویٹ زندگی کے بخیے اُدھیڑتے ہیں اور جب آمنے سامنے ہوں تو بناوٹی مسکراہٹوں سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ کرپال بھی میرے محکمے کا آدمی ہے لیکن اُن سے مختلف ہے۔ وہ اپنی ذاتی رنجشوں سے باہر بھی نکل سکتا ہے۔ اور دوست کو دوست سمجھ کر بھی ملتا ہے، میں دوسرے چوتھے مہینے ان پہاڑوں کی طرف نکل آنے کی کوشش کرتا ہوں، یہی دو ایک دن کی مہلت لے کر، لیکن یہ مہلت بھی کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہے۔ اکثر نہیں، کرپال اس سب ڈویژن کا انچارج ہے، اس لیے اس کی ڈویژن کے ریسٹ ہاؤس میں ایک آدھ دن گزارنے کا انتظام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جب کبھی میں اِدھر آیا ہوں اسی کا مہمان رہا ہوں اور اَب بھی اُسی کا مہمان ہوں، وہ کافی وقت میرے پاس رہا اور میرے ساتھ کھانا کھا کر اپنے گھر چلا گیا جو ریسٹ ہاؤس سے قریباً ایک میل دور تھا۔ اگلی صبح اِتوار تھا اس لیے اُس کے آنے پر اِدھر اُدھر گھومنے کا پروگرام تھا۔

صبح اُٹھ کر ریسٹ ہاؤس کے وسیع احاطے میں نکل آیا۔ اب نظارہ ہی بالکل دوسرا تھا، پہاڑیاں جیسے نہا دھل گئی تھیں۔ چیل کے درخت ایک دم تر و تازہ لگ رہے تھے۔ آسمان کی نیلاہٹ بہت ہی گہری ہو گئی

تھی۔ چڑھتے سورج کی کرنیں پہاڑیوں کی چوٹیوں کو چھوتی ہوئی دھوپ کی سیڑھیوں سے اُتر کر ادھر اُدھر پھیلنے کی کوشش میں مصروف تھیں، مجھے لگا جیسے میرے ذہن پر چھایا ہوا کسل بھی قدرے کم ہو گیا تھا اور میری سوچ کے آنگن میں بھی دھوپ پھیل رہی تھی اور میں اپنے آپ میں بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر باہر گھوم کر میں اندر آ گیا، نہا دھو کر تیار ہوا، چوکیدار نے میز پر ناشتہ لگا دیا تھا، ناشتہ کر چکنے کے بعد میں برآمدے میں آ گیا اور سامنے بستی کے مکانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو دیکھتا رہا۔ بستی اسی طرح آبادی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی، ڈھلوان والی چھتوں کے مکانوں کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے دھوپ میں چمک رہے تھے، ایسے ہی کسی جزیرے میں کرپال بھی رہتا تھا اور وہ اس جزیرے سے نکل کر اور اس جیسے کئی اور جزیروں کو پار کرتے ہوئے میرے پاس آنے والا تھا۔ تا کہ ہم گھومنے نکل سکیں اور جی چاہے تو کسی جزیرے میں داخل ہو کر کچھ لمحوں کے لیے وہاں کی زندگی کا حصہ بن جائیں۔

اور پھر کرپال کی جیپ ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئی اور کرپال مسکراتے ہوئے میری طرف لپکا۔

''ہیلو راجندر، کیا حال ہے؟''

''فائن۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا ارادہ ہے؟ یہیں بیٹھیں یا کہیں گھومنے چلیں۔''

''گھومنا چاہیے۔''

''دوپہر کا کھانا تمہیں میرے ساتھ کھانا ہے، گھر میں۔''

''ایز یو لائک۔'' میں نے کہا۔

''جیپ لے چلیں؟''

''نہیں پیدل چلیں گے، ڈرائیور سے کہہ دو جیپ لے جائے گا۔''

کرپال نے ویسی ہی عادتاً ایک چکر ریسٹ ہاؤس کا لگایا۔ منٹ دو منٹ چوکیدار سے بات کی اور پھر ہم دونوں باہر سڑک پر آ گئے۔

''کس طرف چلیں؟'' کرپال نے پوچھا۔

''جدھر تمہارا جی چاہے۔''

''ہمارے یہاں واٹر سپلائی کا ایک نیا ٹینک بن رہا ہے، مکمل ہو گیا تو شہر میں پانی کی قلت مستقل طور پر ختم ہو جائے گی۔ وہ سائٹ بھی اچھی ہے، کچھ نئی کوٹھیاں بنی ہیں، کچھ لوگ اپنے آرچرڈ بھی بنا رہے ہیں، کہو تو اُس طرف چلیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

تنگ سڑک پر چلتے ہوئے ہم نے اپنے اپنے سگریٹ جلائے اور باتیں کرتے ہوئے بڑے مزے چال سے چلنے لگے۔

''آج کل کس چھوکری سے رومانس چل رہا ہے؟''

''ان دنوں کڑکی کا زمانہ ہے۔'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

''شادی کرلو یار اَب۔''

''کبھی کبھی تو میں بھی اس معاملے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں، جب بھی توجہ کسی لڑکی پر جمتی ہے اور اُسے اس زاویئے سے دیکھنے لگتا ہوں کہ وہ کیسی بیوی ثابت ہوسکتی ہے تبھی کوئی نہ کوئی ایسی بات جاتی ہے کہ معاملہ ایک دم ٹھپ ہوجاتا ہے۔''

''کوئی اور لڑکی ٹکرا جاتی ہے؟''

''کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے لیکن عام طور سے تو وہ محترمہ جسے میں بیوی کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں لمحہ بھر میں کوئی ایسا پہلو اُجاگر کر دیتی ہے کہ میں اُس سے اگلے روز اُس سے ملنا چھوڑ دیتا ہوں۔''

''بیوی کا کیا تصور ہے تمہارے ذہن میں؟''

''جس پر اکثر بیویاں پوری نہیں اُترتیں۔'' میں ہنس دیا۔ ''چھوڑ یار کیا کھیڑا لے بیٹھا ہے۔''

''تو آج کل تنگی کا زمانہ ہے۔''

''کبھی کبھی عشق بھی کالے بازار کی چیز بن جاتا ہے۔ ڈھونڈنے سے ملتا ہی نہیں کم بخت۔''

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک کار ٹھسا ٹھس لڑکیوں سے بھری قریب سے گزر گئی، جیسے میرے دعوے کو جھٹلا رہی ہوں۔

اسی طرح کی لائٹ ٹاک کرتے ہوئے ہم اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں کئی نئے بنگلے بنے تھے، یہ پرانے بنگلے پرانے مالکوں کی ملکیت سے نکل کر نئے مالکوں کے پاس آگئے تھے، جنہوں نے انہیں چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ کر کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ سڑک کے بائیں طرف دور تک ایک کھائی سی چلی گئی تھی جہاں ایک پہاڑی نالہ بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ نالے کے اوپر بنگلوں کی ملحقہ پہاڑی کے حصے پر لوگ سیب کے آرچرڈ ڈیولپ کر رہے تھے۔

''اگلے دو تین سال میں یہ ساری گھاٹی خوبصورت آرچرڈز سے بھر جائے گی اور بڑے اچھے سیب

ہوں گے۔"

"سستے بھی ہوں گے کبھی؟"

"نہیں، عام آدمی کے لیے نہیں۔"

"کیا عام آدمی کے لیے کبھی بھی کوئی چیز سستی اور فراواں نہیں ہوگی؟"

"کم سے کم اس نسل کی زندگی میں تو نہیں۔" کرپال نے کہا۔

"اس نسل کے بعد کوئی اور نسل ہوگی کیا؟"

"ہوگی کیوں نہیں، لیکن اس کی نسبت زیادہ ٹارمینیڈ اور کہیں زیادہ سفوکیٹیڈ۔ ایک ماریڈ نسل جو کی ریت پھانکے گی اور ایٹم بموں کی زہریلی گیسوں میں سانس لے گی۔"

"ایمان سے، کیا بات کہہ دی ہے تم نے۔" میں نے کرپال کے کندھے کو تھپتھپایا۔

"راجندر، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان کی موت اس کے اپنے ارتقا کے ہاتھوں ہوگی۔ وہ اپنے ں خلا میں بنائی جانے والی سولیوں پر لٹکے گا اور اُس کی لاش گریوٹی کی کھینچا تانی میں نہ زمین پر گر سکے ، نہ کوئی اور سیارہ ہی اُسے اپنی طرف کھینچ سکے گا۔"

مجھے آج محسوس ہوا کہ کرپال بھی کبھی کبھی میری طرح سقراط بنتا ہوگا اور زہر کے پیالے کو غٹا غٹ ماتا ہوگا۔

اور چلتے چلتے میں ایک بنگلے کے لکڑی کے بنے چھوٹے سے گیٹ پر رُک گیا، گیٹ کے باہر لکھا تھا ریم لینڈ۔" میرے ذہن میں جانے کیوں ایک ضدی سی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ دماغ کی نسیں تن گئیں۔

"ڈریم لینڈ۔"

"یہاں ایک ریٹائرڈ کرنل رہتا ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ جو عمر میں اُس سے کم سے کم تیس برس ٹی ہے۔ ان لوگوں نے کوئی پانچ برس پہلے یہ بنوایا تھا۔"

"کہاں سے آئے تھے یہ لوگ؟"

"کسی ریاست میں تھے، ان کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"کیسی باتیں؟" مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے دماغ کی نسیں اور بھی زیادہ تن رہی تھیں۔

"یہی کہ کرنل کی بیوی اس کی بیوی نہیں، کہیں سے ہتھیائی ہوئی ہے اور کرنل کے پاس جو روپیہ ہے ی چوری کا ہے۔"

"چوری کا کیسے؟"

''اُس کا تعلق کسی گروہ سے تھا، یہ لوگ یہاں کسی سے ملتے نہیں جاتے۔ نہ ہی ان سے کوئی ملنے آتا ہے۔ باہر کے لوگ ہی ان کے پاس آتے ہیں اور یہ بھی اکثر باہر جاتے رہتے ہیں۔''

''تم کرنل کو جانتے ہو کیا؟''

''دو ایک بار بنگلے کی ایکسٹینشن کے لیے ڈیزائن بنوانے کے لیے مشورے کے واسطے بلایا تھا اُس نے۔ ظالم نے گھر بڑا خوبصورت بنا رکھا ہے۔''

''کیا اس سے ملا جا سکتا ہے؟''

''کہہ نہیں سکتا، لیکن تم کیا کرو گے اس سے مل کر۔''

''میرے دماغ کی نسیں بہت تن گئی ہیں شاید ڈھیلی پڑ جائیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''مجھے کرنل سے ملوا دو۔''

''آؤ ٹرائی کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر کرپال نے ''ڈریم لینڈ'' کا گیٹ کھولا اور جب ہم دونوں اندر داخل ہو گئے تو گیٹ بند کر دیا۔''

کرپال آگے بڑھا اور میں اُس کے پیچھے کیونکہ راستہ تنگ تھا اور راستے کے دونوں طرف جنگلی پھولوں کے انبار تھے، اور فضا میں ایک عجیب سی بو رچی ہوئی تھی، ہم جب بنگلے کے برآمدے میں پہنچے تو ایک نوجوان لڑکی برآمدے میں رکھی کرسیوں کو جھاڑ رہی تھی، غالباً وہ کوئی پہاڑی لڑکی تھی جو اُس کے گھر میں کام کرتی تھی۔

''کرنل صاحب اندر ہیں۔'' کرپال نے اُس لڑکی سے دریافت کی۔''

''جی نہیں، وہ کچھ دیر پہلے کہیں باہر گئے ہیں۔'' لڑکی کی تیکھے اور نرم نقوش کی طرح لہجہ بھی تیکھا لیکن نرم تھا۔

لڑکی کا جواب سن کر کرپال نے میری طرف دیکھا۔

''مسز کرنل گھر میں ہیں؟'' میں نے لڑکی سے پوچھا۔

''جی ہاں، آپ بیٹھیے، میں اُنہیں بھیجتی ہوں۔'' لڑکی نے برآمدے میں پڑی اُن کرسیوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں وہ جھاڑ چکی تھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

کچھ لمحوں تک کوئی نہ آیا، میں برآمدے میں کھڑے کھڑے باہر ہی سے گھر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا، لیکن میرے دماغ کی نسیں اُسی طرح تنی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ہمارے سامنے

مسز کرنل کھڑی تھیں۔
''ارے انجینئر صاحب! آپ تو کئی دنوں کے بعد نظر آئے۔''
''جی بس یوں ہی مصروف رہا۔'' کرپال نے جواب دیا، میں اُس عورت کے سراپا کو غور سے دیکھ رہا تھا۔
''یہ میرے دوست ہیں مسٹر ملہوترہ، پنجاب میں انجینئر ہیں۔'' مسز کرنل نے ایک بڑی توجہ سے مجھے دیکھا۔
''لگتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔'' میں نے اَب کی اُسے اور بھی دھیان سے دیکھا۔ انسان کی شخصیت کی کچھ ایک بنیادی چیزیں وقت کے ساتھ بھی نہیں بدلتیں، وہ چاہے کتنا بدل جائے، اس کے جسم میں کیسی بھی تبدیلیاں رونما ہو جائیں، لیکن ایک نہ ایک پہلو ایسا رہ جاتا ہے جو فوراً پہچانا جا سکتا ہے۔
''جی ہاں! مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔'' مسز کرنل نے جب اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے آنکھیں جھپکیں، تو دو گہری نیلی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے ہوا کرتے تھے ایک دم میری نگاہوں کے سامنے چمک اُٹھیں۔ بیس برس پہلے کی گرد کی تاریکی میں جیسے کوئی شمع جل اُٹھی ہو، اچانک اور غیر متوقع طور پر!
''او، ماسٹر جی!'' اور اُس نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔
''کتنا زمانہ گزر گیا، ہم دونوں کتنے بدل گئے ہیں۔ ماحول اور حالات کتنے تبدیل ہو گئے ہیں، میں نے ایک بار پھر اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو ایک دم زیادہ نیلی اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں اور جن میں ایک عجیب طرح کی چمک اُبھر آئی تھی۔ اس کے بازو کی گرفت بھی مضبوط ہو گئی تھی۔
''انجینئر صاحب میں ان کی اسٹوڈنٹ رہی ہوں۔ ہائے کیا زمانہ تھا وہ، میں ان پر کتنا ڈیپنڈ کیا کرتی تھی۔ اِن دنوں سوائے ان کے میرا کوئی راز دار نہیں تھا، کوئی دوست نہیں، کوئی ایڈوائزر نہیں، ان کا مجھ پر بہت بڑا احساں ہے۔''
''آپ اندر آئیے۔ واٹ اے اسٹوپڈ لیڈی آئی ایم۔'' وہ مسکرائی۔
پھر اُس نے دروازہ کھولا اور ڈرائنگ روم میں لے گئی اور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی، میرے دماغ کی نسوں کا تناؤ ویسا ہی تھا۔
''لالہ رُخ!'' اُس نے آواز لگائی اور وہی پہاڑی لڑکی لمحہ بھر کے بعد کمرے میں آ گئی۔
''بہت بڑھیا قسم کی چائے بناؤ۔''
لڑکی چلی گئی۔

"" آپ کو یاد ہے میں اپنے نوکروں سے کتنا تنگ تھی اُن دنوں۔ آپ سے میں نے کہا تھا کہ میں کسی خوبصورت لڑکی کو ملازم رکھوں گی اور اُسے لالہ رُخ کے نام سے پکاروں گی۔"

"جی ہاں یاد ہے۔"

"تو اس لڑکی کا اصلی نام لالہ رُخ نہیں۔" کرپال نے پوچھا۔

"اصلی نام تو بے چاری کا کلو ہے۔ لیکن ہمارے اصلی نام کب تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ہم اپنے اصلی ناموں سے چھٹکارا پانے کی ہمیشہ ہی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ماسٹر جی جب مجھے پڑھاتے تھے، راجندر ناتھ تھے، اب انجینئر ملہوترہ بن گئے ہیں میں کبھی رکمنی دیوی ہوتی تھی، پھر رکمنی گپتا بنی، پھر سروج بھاردواج بنی اور اب مسز کرنل ہوں۔ یہ نام میں نے اپنی مرضی سے ہی بدلا ہے۔ کسی اور کے کہنے سے تو نہیں۔"

"لالہ رُخ نام بہت پیارا ہے۔" کرپال نے کہا۔

"لڑکی کم پیاری ہے کیا؟" وہ ہنس دی۔ اور میں نے محسوس کیا تھا جیسے ایک ساتھ کئی عورتیں ہنسی تھیں۔ رکمنی دیوی، رکمنی گپتا، سروج بھاردواج اور مسز کرنل۔ کئی شخصیتیں ہنسی تھیں، کئی ماحول، کئی فضائیں، کئی لمحے، کئی زمانے ہنسے تھے۔ ایک ہی لمحہ میں ایک ساتھ کتنے لوگ ہنس سکتے ہیں ایک ہی ہنسی میں، کتنے لوگ رو سکتے ہیں ایک ہی آنسو کی نمی میں۔ کتنی آہیں سُلگ اُٹھتی ہیں ایک ہی آہ میں۔ ایک انسان کے مرنے یا جینے سے کتنے ہی انساں مریا جی جاتے ہیں۔

مجھے لگا میرے دماغ کی نسیں ٹوٹ جائیں گی۔

"آؤ ماسٹر جی آپ کو میں اپنا گھر دکھاؤں۔"

میں صوفے سے اُٹھا۔ کرپال بیٹھا رہا اور اُس نے اُسے اُٹھنے کو کہا بھی نہیں۔ جیسے وہ ایکدم مجھے دیکھ کر کسی دوسرے شخص کے وجود سے غافل ہو گئی تھی۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر کھانے والے کمرے کی دیواروں پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ مجھے دوسری طرف کے برآمدے میں لے آئی۔ جس کے سامنے وہ چھوٹی سی خوبصورت گھاٹی تھی جو اوپر سڑک سے نظر آتی تھی اور جس میں بہتے نالے کا پانی چمک رہا تھا۔ گھاٹی کے اوپر پہاڑیوں کا سلسلہ اور چیلوں کے درخت بھلے لگ رہے تھے۔

"یہ تمام پہاڑی وہ آرچرڈ ہے جسے ڈیولپ کرنے میں آج کل لگی ہوں۔ سب سے بڑھیا ورائٹی کے سیب ہیں یہ۔" برآمدے کے سامنے ایک خوبصورت لان تھا جو پھولوں سے بھرا تھا۔ برآمدے میں بیلوں کی اتنی بہتات تھی کہ وہ خوشبوؤں سے بھرا ایک کنج لگ رہا تھا۔ اُدھر سے گھوم کر وہ مجھے اپنے اسٹڈی روم

میں لے گئی۔ جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک بڑی صاف ستھری قیمتی میز تھی۔ جس کے ساتھ لگی کرسی کا زاویہ بدلا ہوا تھا، لگتا تھا جب ہم آئے تھے وہ کرسی سے اُٹھ کر گئی تھی اور کرسی کے سرکانے سے ہی زاویہ بدلا تھا۔ میز پر ایک اَدھ کھلی کتاب پڑی تھی جس کے ساتھ ایک سرخ رنگ کی پنسل تھی۔

''جیسا آپ نے مجھے بیس برس پہلے کہا تھا، میں کتاب کے کسی صفحے کو موڑتی نہیں، نہ ہی کتاب کو اُلٹا رکھتی ہوں۔ جو سطر پسند آتی ہے اُس کے نیچے سرخ لکیر کھینچ دیتی ہوں۔ کتاب کے پہلے صفحے پر اوپر والے حصے کے بجائے، سب سے نچلے حصے کے دائیں کونے میں اپنا نام لکھتی ہوں اور جگہ اور تاریخ درج کرتی ہوں، جہاں اور جب خریدی تھی یہی کہا کرتی تھے نہ آپ؟'' اُس نے میری طرف دیکھا اور پھر بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ میرے بالوں میں پھیر دیا۔

''ایسے ہی پھیرا کرتی تھیں نا ہاتھ میں آپ کے بالوں پر؟''

میں ایک دم خاموش تھا اور اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی گہری نیلی آنکھوں میں نیم گلابی مدھم ڈورے اور سرخ ہو رہے تھے۔

''ان کتابوں میں وہ کتابیں بھی موجود ہیں جو آپ نے مجھے دی تھیں اور جن پر آپ نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا تھا۔ میں نے اس سب کتابوں پر اپنے نام کے اوپر بعد میں آپ کا نام لکھ ڈالا تھا۔ ان کتابوں پر دو نام ہیں اور دونوں کی تحریریں مختلف ہیں۔ جس کا نام ہے اس کی تحریر نہیں اور جس کی تحریر ہے اس کا نام نہیں۔'' وہ مسکرا دی۔

''لیکن آپ تو ایک دم سیریس ہو گئے ہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایسی بات نہیں۔''

پھر وہ مجھے کندھے پر ہاتھ رکھے گیسٹ روم میں لے گئی۔ نہایت خوبصورت ڈھنگ سے آراستہ۔

''لیکن آپ کا قیام یہاں نہیں ہوگا، یہ مہمانوں کے لیے ہے۔''

''میں مہماں ہوں کیا؟''

''بیس برسوں کے بعد آنے والا مہمان نہیں ہوتا۔''

''تو کیا ہوتا ہے وہ؟''

''وہ ایک خدائی نعمت ہوتی ہے، ایک فرشتہ ہوتا ہے، ایک حدا ہوتا ہے۔''

''سروج!'' میں جیسے چیخ اُٹھا تھا۔ ''تم بیس برس کے بعد بھی اتنی ہی جذباتی ہو۔''

''برا لگا تمہیں۔''

''کہہ نہیں سکتا۔''

''کیا تمہاری زندگی نے، تمہارے پروفیشن نے، تمہارے مسائل نے، تمہارے جذبات تم سے چھین لیے ہیں۔''

''نہیں! میں نے کسی کو ایسا نہیں کرنے دیا، کچھ لوگوں کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔''

اور پھر وہ مجھے اس کمرے میں سے نکال کر ایک اور کمرے میں لے آئی۔ یہ کرنل کا بیڈ روم تھا، جس میں فوجی تمغے، تین چار قسم کی بندوقیں، ایک پریس کی ہوئی پرانی فوجی وردی، تین چار جوڑے پالش کیے ہوئے جوتے اور سامنے دیوار پر ایک شیر کا اسٹفڈ سر ٹنگا ہوا تھا۔

مجھے ایک دم بیس برس پہلے کا منظر یاد آ گیا۔ جب میں پہلی بار سروج کو پڑھانے گیا تھا۔ وہ زمانہ کرنل کے اقتدار کا زمانہ تھا، جس کمرے میں مجھے بٹھایا گیا تھا وہاں بھی سامنے کی دیوار پر شیر کا اسٹفڈ سر لکڑی کے فریم سے جوڑا ہوا ٹنگا تھا۔ میں گریجویشن کر چکا تھا لیکن انجینئرنگ میں داخلہ لینے کے لیے روپے نہیں تھے، میں نے دو برس ٹیوشن ورک کر کے رقم اکٹھی کر لی تھی۔ سروج سے ملاقات بھی انہی دنوں ہوئی تھی۔ میں نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ ایک لڑکی نہیں تھی، بھرپور عورت تھی جسے کرنل کہیں سے بیاہ کر لایا تھا، اس کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں تھیں لیکن جس شخص نے میرا نام تجویز کیا تھا ٹیوشن کے لئے اُس نے میری بے حد تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ کرنل کی بیوی بی اے کا پرائیویٹ امتحان دینا چاہتی تھی، دو برس کے بجائے ایک برس میں، فیس معقول تھی میں نے حامی بھر لی تھی۔ لیکن گھر کا فوجی رکھ رکھاؤ دیکھ کر من کچھ بجھ گیا تھا۔ جب میں نے ٹیوشن شروع کی تو مجھے معلوم ہوا کہ سروج کا کہیں آنا جانا نہیں ہے، وہ تمام دن گھر پر ہی رہتی تھی، اس لیے اُس نے کئی برس کی چھوڑی ہوئی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سروج کی زندگی کی قدریں خاصی اُلجھی ہوئی تھیں، وہ شادی کر چکنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ آیا اُسے کرنا چاہئے تھا یا نہیں۔ اس کا پہلا خاوند مرے پانچ برس ہو گئے تھے اور اُس نے اس عرصہ کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ کرنل اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور اُس نے بھی دوسری شادی کی تھی۔ دونوں کی یہ دوسری شادی تھی۔ کرنل بڑا عیاش قسم کا انسان تھا اور اُس کے ساتھ شکی مزاج اتنا کہ گھر کے اردلی پر بھی اعتبار نہ کرتا تھا۔ سروج کو مجھ میں اتنی دلچسپی تھی کہ میرے علاوہ گھر میں اُسے کوئی نہیں ملتا تھا، اور کہ میں اُس سے ادب کی اور فن کی اور تصویروں کی باتیں کر سکتا تھا اور یہ دلچسپی رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گئی اور

اُس نے میرے ساتھ زندگی کے کئی اہم مسئلوں پر گفتگو کرنی شروع کر دی اور ایک ایسا وقت آ گیا جب میں اُس کا ہم نفس، ہمدم اور رازدار بن گیا۔

ایک دن اُس کا طرزِ عمل بڑا عجیب ہو گیا تھا۔ اُس دن اُس کا کرنل سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اُس دن اُس نے بیماری کا بہانہ کر کے مجھے باہر سے واپس کر دیا تھا اور میں واپسی پر سائیکل چلاتے ہوئے راستے بھر اُس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اور پھر میں کئی روز تک اُس کے ہاں نہیں گیا تھا اور پھر ایک روز اُس کا اردلی مجھے گھر سے لینے آیا تھا۔ میں جب اُس کے گھر پہنچا تو وہ برآمدے میں کھڑی منتظر تھی۔ اردلی میرے لیے گیٹ کھول کر بنگلے کے پچھواڑے میں اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ سروج نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی، کمرے کا دروازہ کھولا، مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا اور پھر کمرے میں آ کر مجھے ایک دم گھورنے لگی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

''کون ہو تم، اور یہاں کیا کرنے آئے ہو۔'' میں حیران سا اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

''بولتے نہیں، کون ہو؟'' وہ پھر بولی۔

''مجھے معلوم نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں خود نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔''

''لیکن میں جانتی ہوں، تم وہ شخص ہو جس نے مجھے کئی مہینوں سے بھٹکایا ہے، مجھے نیم بیہوشی کی حالت میں اُس ڈریم لینڈ میں دھکیلتے رہے جس کے دروازے باہر سے بند تھے۔''

''نہیں دروازے بالکل بند نہیں تھے، تمہاری آنکھیں بند تھیں۔'' میں نے کہا۔

'' اور کتنی خوبصورت ہیں تمہاری آنکھیں، ان میں سیکڑوں ڈریم لینڈ بکھر رہے ہیں، کبھی دیکھا ہے تم نے اپنی آنکھوں کو آئینے میں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں دیکھا ہے، تم اپنی فیس کا حساب کر لو، تم نے پچھلے چار ماہ سے فیس نہیں لی۔''

''مجھے سارا صلہ مل گیا ہے، مسز کرنل۔'' میں یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا، میں نے دیکھا میز پر میرے نام کا کٹا ہوا دستخط شدہ بنا رقم بھرے چیک پڑا تھا۔

''رُکو، یہ چیک لے جاؤ۔''

''اب نہیں، زندگی میں پھر کبھی ملا تو لے لوں گا۔''

میں یہ کہہ کر چلا آیا تھا۔ اور وہ برآمدے میں کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھی اور جب میں سڑک پر آ گیا تھا تو وہ پچھواڑے کی طرف کھلے ہوئے برآمدے میں کھڑی نظر آئی تھی۔

مجھے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر اُس نے کہا۔

''شیر کود کیے کرڈر گئے؟ یہ تو اسٹفڈ ہے۔''

''اُس دن بھی تو یہ اسٹفڈ ہی تھا۔'' میں نے کہا۔

''سو تو تھا ہی۔'' اُس نے جواب دیا اور ایک بار پھر ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک اور کمرے کی طرف مڑی، ڈرائنگ روم میں میز پر چائے کا ساماں رکھنے کی آواز آرہی تھی۔

''لالہ رُخ چائے لے آئی ہے۔'' میں نے کہا لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھے، وہ جس کمرے میں داخل ہوئی وہ اُس کا بیڈ روم تھا، دیوار سے لگا ہوا ایک ہی پلنگ جس کے بستر پر نہایت ہی خوبصورت بیڈ کور بچھا تھا۔ دیواروں پر نہایت خوبصورت تصویریں تھیں، سامنے کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے ہمالہ کی برف لدی چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔

''یہ ہے میرا ڈریم لینڈ۔'' اُس نے کہا اور مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر میرا ماتھا چوم لیا۔ ''میرے پرنس چارمنگ، گاڈ بلیس یو۔''

اور پھر باہر سے آواز آئی۔

''میم صاحب، چائے رکھ دی ہے۔''

اور پھر وہ بغیر کچھ کہے مجھے بازو سے تھامے ڈرائنگ روم میں لے آئی جہاں کرپال بیٹھا ہمارا انتظار کررہا تھا۔

چائے پی چکنے کے بعد کرپال نے اور میں نے جانے کی اجازت مانگی۔

''کرنل صاحب آتے ہی ہوں گے انجینئر صاحب۔'' اُس نے مخاطب کرپال کو کیا تھا مجھے نہیں۔

''پھر کبھی حاضر ہوں گا۔'' یہ کہہ کر کرپال نے دروازہ کھولا، میں بھی باہر آگیا۔

سروج ہم دونوں کو بنگلے کے باہر والے چھوٹے سے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ گیٹ سے باہر نکل کر لیچ بند کرتے ہوئے کرپال نے کہا۔

''آپ نے بنگلے کا نام بڑا خوبصورت رکھا ہے۔''

''جی۔'' وہ مسکرا دی اور پھر ایک دم بنگلے کی طرف پلٹ گئی اور میں نے دیکھا، اُس کی گہری نیلی آنکھوں میں جانے کتنے ہی ڈریم لینڈز کے جلتے ہوئے کھنڈروں کا دھواں سُلگ اُٹھا تھا۔

کرپال اور میں کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے جیسے ہمارے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ رہا ہو۔

جوں ہی ہم سڑک کے موڑ پر پہنچے تو میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا ایک پکی عمر کا شخص ہاتھ میں فوجی چھڑی لیے ڈریم لینڈ کا گیٹ کھول رہا تھا۔

کشمیری لال ذاکر

شام بھی تھی دھواں دھواں

آج کی شام بے حد اُداس تھی۔

اتنی اُداس شام تو شربتی نے کبھی نہیں دیکھی تھی اس سے پہلے۔ ایسی ایک شام اُس کی زندگی میں پانچ برس پہلے آئی تھی، جب اُس نے اپنا پیارا سا گاوں، سورکھی، چھوڑا تھا۔ اور ڈولی میں بیٹھی تھی اور اُس کی سہیلیوں نے اپنی درد بھری آواز میں گیت گا کر اُسے رلا دیا تھا۔

لیکن وہ شام بھی اتنی اُداس کہاں تھی۔

اس شام کے بعد تو ایک بہت ہی خوبصورت رات آنے والی تھی، اُس کی سہاگ رات جس کے بارے میں، اُس کی بھابھی لیلو نے اتنی ڈھیر ساری باتیں بتا رکھی تھیں، جنہیں سن کر اُس کا روم روم کھڑا ہو گیا تھا اور اُس کا گٹھا ہوا بدن پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ سارا پسینہ اُس کے گاڑھے رنگ کے موٹے کھدر کی قمیص میں جذب ہوا تھا اور اُس کی بھابھی لیلو کو قمیص میں پسینے کی ایک بوند بھی نظر نہ آئی تھی۔

اس کی دیہہ کے اندر تو جیسے صاحبی ندی پھر کر اُنڈ پڑی تھی ایک ہی بار۔ صاحبی ندی تو اُس کے گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی، جیٹھ، اساڑھ کے دنوں میں یہ ندی ریت کا ایک بہت بڑا پھیلاؤ بن جاتا تھا، جسے پار کرنے میں بیل گاڑیوں میں جُتے تگڑے تگڑے بیل بھی ہار جاتے تھے، جب برسات آتی تھی اور چھاجوں پانی برستا تھا تو صاحبی ندی، گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے کتھن کے انوسار، ایک سمندر بن جاتا تھا۔ ان دنوں آس پاس کے گاؤں ندی کے گدلے بھرے ہوئے ٹھاٹھیں مارتے پانی کو ندی کے کناروں پر کھڑے ہو کر دیکھتے تھے۔ یہ تلاطم خیز پانی اپنی لہروں کے دامن میں جانے کہاں کہاں کی کنواری مٹی سمیٹ کر لاتا تھا، جو وہ آس پاس کے کھیتوں میں ڈال دیتا تھا۔ اور جب پانی اُترتا تھا تو وہ کنواری مٹی بنجر دھرتی کی کوکھ میں اُتر جاتی تھی اور کھیتوں کی جھولیاں فصلوں کی اولاد سے آباد کر دیتی تھی۔ گاؤں کے مرد اور جوان لڑکے گدلے پانی کے اُچھالوں پر مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے مارتے تھے اور قہقہے لگاتے تھے۔ اور عورتیں ڈھلتی شام کے سایوں کی چادر اوڑھے کناروں پر بیٹھ کر مٹی کے دیے جلاتی تھیں اور ٹولیوں میں

اکٹھی ہو کر اپنی پاٹ دار آواز اور ٹھیٹھ ہریانوی لہجے میں ڈھیروں گیت گاتی تھیں۔

عورتوں کے گیتوں کی آواز صاحبی ندی کے ٹھاٹھیں مارتے پانی میں گھل کر ایک عجیب سماں باندھتی تھی۔

صاحبی ندی کے ٹھاٹھ ایک دم صاحبوں والے تھے، جی چاہے تو دمڑی دیتے وقت ہاتھ پیچھے کھینچ لے اور دل میں آئے تو اشرفیاں لٹا دیتے۔

سورکھی گاؤں کے لوگوں کا مزاج بھی ایسا ہی تھا، ایک دم صاحبوں والا، بڑا فراخ دل بھی اور بڑا کٹھور بھی، یہ وہ علاقہ تھا جہاں غدر کے دنوں میں مسلمانوں، راجپوتوں، اہیروں، برہموں، جاٹوں، بشنوئیوں، رانگڑوں، گوجروں سب نے مل کر انگریز کی مخالفت کی تھی۔ گوڑگاؤں، فیروزپور، جھرکا، بلبھ گڑھ، ریواڑی، جھجھر، نارنول یہ سارا علاقہ انگریزوں کے خلاف مر مٹنے کو تیار ہو گیا تھا، اسی علاقے میں تو راؤ تلا رام نے نصیب پور کی لڑائی لڑی تھی اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ اور بلبھ گڑھ کا راجہ ناہر سنگھ، نوح کا نواب احمد علی اور جھجھر کا نواب عبدالرحمٰن خاں، پھانسیوں پر لٹکے تھے، صاحبی ندی نے سر پر کفن باندھے ہریانہ کے جیالوں کو اپنا پانی بھی پلایا تھا اور اُنہیں اپنا تلاطم خیز مزاج بھی دیا تھا۔

شربتی کا نام بھی تو اُس کی ماں نے اُس روز رکھا تھا جس روز وہ صاحبی ندی کے کنارے پر گاؤں کی عورتوں کے ساتھ دیے جلانے گئی تھی۔

''کیا سربت (شربت) جیسا پانی ہے صاحبی کا!'' ایک عورت نے کہا تھا۔

''ہاں سچ۔ گڑ گھول رکھا ہو سارے گام (گاؤں) کا جیسے۔'' دوسری نے تصدیق کی تھی۔

''اس کا نکھرا (نخرا) بھی تو صاحبوں جیا سے (ہے)۔'' تیسری عورت بولی تھی۔

سب عورتیں اپنے دیوں میں روئی کی بتیاں تیل میں بھگو بھگو کر ڈال رہی تھیں۔ اور قہقہے لگا رہی تھیں، ادھر لڑکیاں الگ الگ ٹولیوں میں ہاتھ میں ہاتھ دیے ناچ رہی تھیں۔ تبھی شربتی کی ماں بولی تھی۔

''میں تو اپنی چھوری کا نام ہی سربتی (شربتی) رکھوں گی۔''

اور ایک زوردار سنگیت بھرا قہقہہ صاحبی ندی کے ٹھاٹھیں مارتے پانی میں گھل گیا تھا۔

سورکھی گاؤں کے ایک کچے مکان کے آنگن میں سوئی پڑی اکیس دن کی تندرست لڑکی کا نام سسکار ہو گیا تھا۔ صاحبی ندی کے ٹھاٹھیں مارتے پانی کے کنارے پر بنا اُس سے پوچھے بچوں کے نام رکھتے سمے اُن سے پوچھتا تھوڑی ہے کوئی۔

اُس کی ماں نے بھی ڈھلتی شام کے سایوں پر اپنی بیٹی کا نام لکھ دیا تھا۔ شربتی!

یہ بات برسوں بعد شرتی کی ماں نے اُسے بتائی تھی۔ جب اُس نے ایک دن ویسے ہی پوچھا تھا کہ جب گاؤں کی کسی بھی لڑکی کا نام شرتی نہیں تھا تو اُس کی ماں نے اُس کا یہ نام کیوں رکھا تھا۔

اُس دن سے شرتی کو اپنے نام سے پیار ہو گیا تھا۔

صاحبی ندی کے مزاج میں گھلا نام۔

اور من ہی من میں اُس نے بھگوان سے یہ ور مانگا کہ اُسے خاوند بھی کسی پیارے سے نام والا ہی ملے۔ ساگر کی طرح وسیع اور اُس کے پانیوں کی طرح گمبھیر!

آج کی شام صرف اُداس ہی نہیں، بلکہ خوف ناک بھی تھی۔

آج صبح اُس کی ساس سُکھونتی، اُسے میڈیکل کالج روہتک لے گئی تھی۔ وہیں سے وہ دونوں لوٹی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے ایک دم ٹوٹی اور ہاری ہوئیں، وہیں دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد ڈاکٹروں نے سُکھونتی کو اسپتال کی پرچی دی تھی، جس پر لکھا تھا کہ شرتی کو کینسر تھا۔

سُکھ ونتی نے تو اُسے کُھلے طور پر نہیں بتایا تھا، ڈھکا چھپا کر بات کی تھی لیکن اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ اُسے کینسر ہے۔

صبح جب وہ اپنی ساس اور دیور کے ساتھ اپنے گاؤں پیتا واس سے بس میں بیٹھ کر روہتک گئی تھی تو ہر طرف ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور کھیتوں میں اُگی فصلوں پر شبنم کے موتی چمک رہے تھے۔ اُس نے بہت دنوں کے بعد سِلک کا وہ کاسنی رنگ کا سوٹ پہنا تھا، جو پچھلے برس اُس کا خاوند گوہاٹی سے لایا تھا۔ بڑی پیاری لگ رہی تھی وہ، اُس کا گٹھیلا بدن تو خیر پگھل گیا تھا، اَب اور اُس کے چہرے پر بھی وہ رونق نہیں رہی تھی۔ ایک سال کی بیماری نے اُسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا، جب سے اُس کا لڑکا پرسُوت کے دنوں میں ہی مر گیا تھا، وہ جبھی سے بیمار ہو گئی تھی۔ لیکن اب پچھلے کئی مہینوں سے تو اُس کی صحت بڑی تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ پیتا واس کے پرائمری ہیلتھ سینٹر میں مہندر گڑھ کے سِول اسپتال اور ساتھ ہی گاؤں کے پرانے حکیم پنڈت کیدار ناتھ سے تو وہ علاج کراتی ہی رہی تھی لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا تھا۔ اور اب سب نے یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ میڈیکل کالج روہتک کے ڈاکٹروں کو دکھائے اور اُن سے علاج کرائے۔ جب وہ صبح اپنے دیور امر چند اور ساس سُکھ ونتی کے ساتھ بس کے اڈّے تک تھوڑا چل کر، پھر تھوڑی دیر رُک کر پہنچی تھی تو اُس نے اپنی روح کے ایک کونے میں اُمید کا ایک دیا جلا لیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ جب تک وہ لوگ روہتک سے واپس آئیں گے شام ہو چکی ہوگی اور وہ اپنی روح میں جلائے ہوئے اس دیے کی جوت کو ذرا اونچی کرے گی اور اگر کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے گاؤں کے راستے میں اندھیرا ابھی ہو گیا تو وہ اُس

دیے کی روشنی میں گھر پہنچ جائے گی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں تھا، ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ جو ہم سوچیں وہی ہو۔

جب امر چند اور سکھ وتی اور وہ روہتک سے مہندر گڑھ جانے والی بس سے پنتا داس کے اڈے پر اُترے تھے تو اُس میں ایک قدم بھی چلنے کی سکت نہیں تھی۔

اور جب اُس نے اپنی روح میں جلائے ہوئے چراغ کو ٹٹولا تو وہ بجھ رہا تھا، اُس کی لو بہت دھیمی ہو گئی تھی۔

بس شربتی کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے چراغ کا دھواں گھل گیا اور اُس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو آ گئے۔ وہ بس اڈے کی چائے کی دکان کے سامنے رکھے ہوئے مُڈھے پر ڈھیر ہو گئی۔

''مجھ سے اب نہیں چلا جاتا اُمرو۔'' اُس نے ہانپتے ہوئے اپنے دیور سے کہا۔

سُکھ وتی نے اُسے اپنی بانہوں میں لے لیا اور وہ پوری کی پوری اُس پر جیسے گر گئی۔

''پیدل نہیں جا سکے گی سرتی اب۔'' اُس نے کہا۔

''کوئی سکوٹر دیکھتا ہوں۔''

جب تک اُمرو ایک اسکوٹر والے سے بات کر کے آیا، جو مہندر گڑھ جا رہا تھا، سکھ وتی نے شربتی کو سنبھال لیا تھی۔ شربتی کا سِلک کا کاسنی سوٹ جو اُس کا گھر والا پچھلے برس گوہاٹی سے لایا تھا اور جس میں وہ صبح گاؤں چھوڑتے سمے بڑی پیاری لگ رہی تھی، اب ایک دم مسمسا گیا تھا، اس پر ڈھیروں گرد جم چکی تھی اور اُس کا رنگ مدھم پڑ گیا تھا۔

جب اُمرو اور سکھ وتی اپنے درمیان شربتی کو سنبھالے، سکوٹر سے اُدھڑ کھابڑ راستے سے گاؤں میں اپنے گھر کے سامنے پہنچے تو تیز ہوا کے جھونکوں کی تاب نہ لا کر شربتی کی رُوح میں دھیرے دھیرے جلتا ہوا چراغ ایک دم بجھ گیا تھا۔

اور جب شربتی کو اُس کا دیور اور اُس کی ساس سنبھال کر اپنے گھر کی ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوئے تو شربتی کی روح میں گھنا اندھیرا ابھر چکا تھا۔ روشنی کی آخری رمق بھی مر گئی تھی۔

''اب میں تُلسی ماتا کے سامنے کیا جلاؤں گی؟'' شربتی چارپائی پر گرتے ہوئے بڑبڑائی۔

سکھ وتی دیا جلانے کے لیے ماچس ڈھونڈ رہی تھی۔

''یہ لو ماچس ماں۔'' اُمرو نے اپنی جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور ماں کی طرف بڑھا دی۔

گھر میں اندھیرا تھا۔

لیکن اس سے زیادہ گہرا اندھیرا شربتی کی روح میں منڈلا رہا تھا۔
آج کی شام صرف اُداس ہی نہیں خوفناک بھی تھی۔
دھواں اُگلتی ہوئی کٹھور شام۔
جس کے آگے پہاڑ جیسی لمبی رات تھی۔
صبح کا مدھر اُجالا نہیں!
اُس کی آنکھوں کے سامنے گاؤں کا شمشان گھوم جاتا ہے۔
چتا کی لپٹیں لہرانے لگتی ہیں اُس کی نظروں کے سامنے۔
وہ زور سے چیخ اُٹھتی ہے، اور پھر کچھ بڑبڑاتے ہوئے بے ہوش ہو جاتی ہے۔
''اُسے بلوا لو، مرنے سے پہلے اسے ایک نظر دیکھ لوں، میرے پیٹ میں اُس کا بچہ ہے، وہ بھی تو مر جائے گا میرے ساتھ وہ بھی تو جل جائے گا آگ کے ان شعلوں میں۔''

اس گہرے اندھیرے میں کچھ پرچھائیاں اُبھر رہی تھیں۔
شربتی کی کھلی آنکھوں کے سامنے پچھلے پانچ سال کی کچھ تصویریں بڑے شوخ اور بڑے دھندلے خدوخال لیے گھومنے لگیں۔ اس شام کے دھندلکے سے لے کر جس شام وہ اس گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی تھی، لال سرخ گھاگھرا پہنے اور تاروں جڑی اوڑھنی اوڑھے، آج کی شام تک جب اُس کی سانس سکھ ونتی اور، یورامر چند اُس کی مری ہوئی سی دیہہ کو سکوٹر میں سے اُٹھا کر ڈیوڑھی کے اندر لائے تھے، شربتی اپنی مختصر بیاہتا زندگی کے کچھ لمحوں کی پرچھائیاں دیکھ رہی تھی۔ وہ لمحے جو اَب پرچھائیاں بن گئے تھے کبھی تو زندہ اور سانس لیتی ہوئی حقیقتیں بھی دیکھ رہی تھیں۔ ان لمحوں کو اس نے بھوگا بھی تھا، وہ ان میں جی بھی تھی۔ ان لمحوں کی لے کے ساتھ وہ گائی بھی تھی اور ان کی سوگوار دُھنوں کے ساتھ روئی بھی تھی۔ وہ لمحے اس کی زندگی کے گواہ بھی تھے اور اُس کے ساتھی بھی۔ ان کے ساتھ اُس نے زندگی کا اُمرت بھی پیا تھا اور کڑوا کسیلا زہر بھی چکھا تھا۔
ایک لمحہ، ایک پرچھائیں!
صاحبی ندی جیسے مزاج والی شربتی اور سمندر کی طرح وسیع اور گنبھیر مزاج والا وشال۔ شربتی کی ایک آرزو تو پوری ہو گئی تھی، اسے اپنے گھر والے کا نام بہت پسند تھا۔ وہ اُس کے نام ہی پر تو مر مٹی تھی۔
ہلکے ہلکے جاڑوں کی رات وشال کے پکے گھر کی چھت پر ایک کمرہ اور سامنے چھت پر پھیلی ہوئی

گلی گلی ہی چاندنی تھوڑی دیر پہلے ہی اُس کی ساس سُکھ ونتی اُسے کمرے میں چھوڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے تو محلے کی عورتوں اور لڑکیوں نے ہی شربتی کو گھیرے رکھا تھا۔ وہ لال رنگ کی اونچی پیڑھی پر دیوار کے سہارے بیٹھی بیٹھی بہت تھک بھی گئی تھی۔ لیکن کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔ گھر میں سوائے سکھ ونتی کے اور کوئی عورت بھی تو نہیں تھی۔ اس کی نہ تو کوئی نند تھی نہ دیورانی۔ وہ اپنی بات کہتی بھی کس سے، اس کی پریشانی میں ساتھ دینے والا تھا بھی تو نہیں کوئی۔ سکھ ونتی نے آخر ڈھیرے ڈھیرے سب کو بیسن کے لڈو دے کر وداع کر دیا تھا اور پھر شربتی سے بولی تھی۔

''چل بہو تجھے اوپر چھوڑ آؤں، تھکی تھک گئی ہو گی تو۔''

شربتی بنا جواب دیے پیڑھی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے من میں آیا کہ وہ ایک بھرپور انگڑائی لے کر اپنے بدن میں سمائی ساری تھکاوٹ اُتار دے۔ اس نے انگڑائی کے لیے بازو ذرا سے اُٹھائے بھی لیکن پھر نیچے کر لیے۔ اپنی ستاروں بھری اوڑھنی کو ٹھیک کیا اور پھر پاؤں میں بجی چاندی کی پائلوں کو چھکاتی ہوئی کمرے سے باہر آئی اور اپنی ساس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی، فضا میں پائلوں کا سنگیت گھلاتی۔

اسے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے سکھ ونتی نے کہا۔

''تھوڑی دیر آرام کر لے اب۔ میں کواڑ بھیڑ رہی ہوں۔''

''اچھا اماں جی۔''

سکھ ونتی چلی گئی، تو شربتی پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوگئی اور ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کلائیوں میں پڑی ہوئی ہاتھی دانت کی سرخ اور سفید چوڑیوں کو چھکا دیا۔ پھر اُس نے دیوار میں کیل سے لگے نئے آئینے کی طرف دیکھا، جس کی سطح پر ابھی کمپنی کا لیبل بھی چپکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ناخنوں سے اس لیبل کو اُتارنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک حصہ پھر بھی آئینے کی سطح سے ہی چپکا رہا۔ اور پھر اُس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ وہ تو بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی بھابھی لیلو نے اُسے سنوارنے اور سجانے میں کوئی کسر بھی تو نہ چھوڑی تھی۔ اس نے اپنی اوڑھنی کے پلّو سے اپنے چہرے کو پونچھا تو وہ اور بھی نکھر آیا۔ عین اُسی وقت بھڑے ہوئے کواڑ کھلے۔

''میں اندر آ سکتا ہوں؟'' وشال نے کمرے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

شربتی لمحہ بھر کے لیے گھبرا گئی۔

پھر اُس نے اپنے سامنے کھڑے وشال کی طرف دیکھا۔ اور اوڑھنی سے سر کو پوری طرح

ڈھانپ لیا۔

''بولوگی نہیں؟''

شربتی اسی طرح کھڑی رہی۔ آئینے کے سامنے سے بھی تو نہیں ہٹ سکتی تھی وہ۔

''تو نیچے چلا جاؤں؟'' یہ کہہ کر وشال پیچھے کی طرف ہٹا۔

''نہیں!'' شربتی ایک دم بولی۔

اور قہقہہ لگاتا ہوا وشال کواڑ کھڑا کر کمرے کے اندر آ گیا۔

اس نے بیچ کمرے میں، آئینے کے سامنے کھڑی شربتی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''جا تو میں بھی نہیں رہا تھا۔ صرف آزما رہا تھا تمہیں۔'' اُس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

''کوئی دیکھ لے گا۔'' شربتی نے وشال کی بانہوں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''سوائے آئینے کے اور کوئی نہیں دیکھے گا۔''

وشال نے اُسے اور بھی زور سے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اُس نے پھر کوئی مزاحمت نہ کی تھی اور رفتہ رفتہ اُس کے جسم کا تناؤ آپ سے آپ ختم ہو گیا تھا۔

آدھی رات تک جاگتے رہنے کے بعد جب شربتی سوئی تو اس کی نیند اُس وقت تک ٹوٹی جب سکھ ونتی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب شربتی نے اپنے کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے دروازہ کھولا تو سکھ ونتی نے کہا۔

''باہر نہیں چالو (چلو) گی بہو؟''

''چلوں گی ماں جی۔''

''تو نیچے آ جا۔ گرم چادر اوڑھ لیو۔ جاڑا ہو رہا سے۔''

''اچھا جی۔''

سکھ ونتی نیچے چلی گئی۔

اپنے مائیکے کے گاؤں سور کھی میں تو شربتی صبح کبھی جلدی نہیں جاگی تھی۔ صبح جاگنے اور گھر کا کام کاج سنبھالنے کی ذمہ داری اُس کی ماں کی تھی اور اُس کی بھابھی لیلو کی تھی۔ وہ تو کھلی چھت پر چادر تان کر پڑی رہتی تھی اور اُس وقت جاگتی تھی جب دھوپ ساری چھت پر پھیل چکی ہوتی اور اُس کا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا ہوتا۔ کبھی کبھی لیلو اُس سے کہا کرتی تھی۔

''شربتی اگر تمہیں اچھی ساس نہ ملی تو بڑی دُکھی ہو گی تو۔''

"تجھے تو اچھی ساس ملی ہے نا؟" وہ پوچھتی۔

"ہاں۔"

"مجھے بھی اچھی ہی ملے گی۔"

"اور نہ ملی تو؟"

"میں اُسے گھر سے بھگا دوں گی۔" وہ زور سے ہنسی تھی اور پھر اُس کی ہنسی میں لیلو کی ہنسی بھی شامل ہو جاتی تھی۔ اس کی بھابھی واقعی بہت اچھی تھی۔ اور اُس کا بہت خیال رکھتی تھی۔

اُس روز جب پہلی بار وہ اپنی سسرال کے گاؤں کے کھیتوں میں گئی تو گاؤں کی بہوئیں اُسے بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ انہیں میں سے کسی بانجھ بہو کی نظر اُسے کھا گئی تھی۔

یہی تو کہا کرتی تھی سکھ ونتی وشال سے۔

کسی کی نظر ہی تو لگی تھی اُسے، ورنہ اُس کا پہلا ہی بچہ کیوں مرتا اور پھر اُس کے بعد وہ کیوں کھاٹ سے لگ جاتی۔ کسی سیانے نے سکھ ونتی سے کہا بھی تھا کہ کسی بانجھ عورت نے اُس کی بہو کو شمشان کی راکھ کھلا دی تھی کسی میٹھی چیز میں۔ سکھ ونتی نے شربتی سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن اُسے یہ بات کسی اور کی زبانی معلوم ہو گئی تھی اور اَب تو اُسے خود بھی یقین ہو گیا تھا اس بات کا۔

رات کے گہرے اندھیرے میں ماضی کے اس لمحے کی پرچھائیں اندھیرے میں گھلتے گھلتے تاریکی کا ہی ایک حصہ بن گئی تھی۔ اب نہ وہ لمحہ رہا تھا نہ اُس کی پرچھائیں ہی رہی تھی۔

اَب ایک دوسرا لمحہ اُجاگر ہوا تھا، چنگاری کی طرح، گہرے اندھیرے کی مٹ میلی راکھ کی ڈھیری سے، ایک اور پرچھائیں اُبھر رہی تھی۔

وشال جا رہا تھا، گھر چھوڑ کر۔

اُس کی چھٹی ختم ہو رہی تھی اور اُسے واپس پہنچنا تھا۔ اپنی ڈیوٹی پر۔

"تم اُداس تو نہیں ہوؤ گی میرے لیے؟" وشال نے پوچھا تھا۔

"اُداس بھی ہوں گی اور تمہیں یاد بھی کروں گی۔"

"خط لکھو گی نا؟"

"خط تو لکھوں گی لیکن تمہارا پتہ کون لکھے گا لفافے پر؟"

"اُمرو سے لکھوا لینا۔"

"اگر اُس نے میرے خط بھی پڑھ لیے؟"

''وہ نہیں پڑھے گا۔''

''اگر اُس نے پڑھ لیے تو پھر؟''

''تم خط میں زیادہ پیار مت جتانا۔''

''اور کیا لکھوں گی خط میں؟''

''اپنی اور ماں کی صحت کے بارے میں اور اپنے ماں باپ کا حال اور تم کیا کرتی رہتی ہو دن بھر۔''

''اور ؟''

''بس اور کیا؟''

''سوچ لو؟''

''اپنے اس پیارے سے مکھڑے کے بارے میں بھی لکھنا۔''

''کیوں؟''

''اس سے مجھے روشنی ملا کرے گی رات کو جب میں اکیلا ہوؤں گا۔''

''میرا مکھڑا کوئی چاند ہے کیا؟''

''چاند سے بھی بڑھ کر روشنی ہے اس میں۔''

یہ کہہ کر وشال نے اُسے لیٹے لیٹے ہی اور کس لیا اپنی بانہوں میں اور اُس کا چہرہ گھما کر اُسے کھڑکی سے باہر آسمان پر آدھا چمکتا ہوا چاند دکھایا۔

''میں ٹھیک نہیں کہہ رہا تھا؟ دیکھو تمہارے چہرے کے مقابلے میں چاند کتنا مدھم نظر آ رہا ہے۔''

''صرف تمہیں مدھم نظر آ رہا ہے اور کسی کو تو نہیں۔''

''تمہیں بھی۔''

اور وشال نے اُس کے کھلے سینے پر اپنے ہونٹ جما دیے اور شربتی کو لگا کہ اُس کے ہونٹ اُس کی چھاتی کی ڈھلان میں اُترتے اُترتے وہاں پہنچ گئے تھے جہاں وہ اَب تک کبھی نہیں پہنچے تھے۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں کہ میرا بچہ پہلی بار دودھ کہاں سے پیے گا۔''

''بہت بے شرم ہو تم۔''

اور شربتی وشال کو پیچھے دھکیلنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئے اُس کے اور قریب سمٹ گئی تھی اور بھی قریب۔

اور پھر رات کا پچھلا پہر ہو گیا۔

اور شربتی نے نیچے کے دالان سے دودھ بلونے کی آواز سنی۔ اس کی ساس نے تو دودھ بھی بلونا شروع کر دیا تھا اور وہ ابھی تک سو رہی تھی۔

اس نے دیکھا وشال گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ بھڑا کر نیچے دالان میں آ گئی۔

''تم تو بہت سویرے جاگ گئی ہو ماں!''

''بہت سے کام نپٹانے سیں (ہیں)۔''

''مجھے بتاؤ کوئی کام۔''

''نہا دھو لے اور وشال کے لیے دو چار پراٹھے بنا لے، راستے میں کھا لے گا۔''

''اچھا۔''

''اتنی دیر میں اُمر دبھی جاگ جاوے گا۔''

اور پھر دن چڑھ آیا تھا۔

وشال بھی تیار ہو گیا تھا۔ اُس نے فوجی وردی پہن لی تھی اور اپنا سامان ٹرنک میں ڈال لیا تھا اور ایک خاکی رنگ کے تھیلے میں وہ سب چیزیں ڈال لی تھیں جو اُسے راستے میں چاہیے تھیں۔ پراٹھے اور اُچار کپڑے میں لپیٹ کر، شکھ ونتی نے اُس کے تھیلے میں ڈال دیے تھے۔

یہ بات پہلا واس گاؤں میں پہلی بار ہو رہی تھی۔

کل کی آئی بہو اپنے گھر والے کو بس کے اڈے تک چھوڑنے جا رہی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، کسی نئی بیاہی دلہن نے اپنے خاوند کے ساتھ گاؤں کی گلی میں بھی قدم نہیں رکھا تھا کبھی۔ اور شربتی جا رہی تھی وشال کے ساتھ۔ گھونگھٹ کاڑھے گاؤں کے بس اڈے پر، ہاں اُس کی ساس اور دیور بھی ساتھ تھے۔ لیکن پانی کے گھڑے سروں پر رکھے گلی میں سے گزرتی ہوئی عورتوں کو تو صرف شربتی اور وشال ہی نظر آ رہے تھے۔ شکھ ونتی اور امر چند کو تو دیکھ ہی نہیں رہی تھیں وہ۔

''کیا بے سرمی کا جمانہ آ گیا سے (ہے)!''

''مھارے (ہمارے) گام (گاؤں) میں تو یہ بات کبھی نہیں ہوئی سے (ہے)۔''

''کل جگ آ گیا سے۔''

"اور کیا! بہوئیں جائیں گی گھر والوں کو چھوڑ نے اَب۔"

جتنے گھڑے اُتنے ہی تیکھے جملے۔ شاید زیادہ ہی تھے۔ کچھ ایک آدھا جملہ سکھ ونتی کے کانوں میں بھی پڑا۔ اُس نے سنی اَن سنی کر دی۔ گاؤں والوں کا تو یہ وطیرہ ہی تھا۔

چار حسوں کی چھوٹی سی قطار گاؤں سے نکل کر کھیت کھیت ہوتی ہوئی بس کے اڈے پر پہنچ گئی تھی۔

وشال اور امر چند ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔

سکھ ونتی اور شربتی در اہٹ کر نیم کے پیڑ کے سہارا لے کر کھڑی ہو گئیں۔ بس کے آنے تک وشال اور امر چند تو باتیں کرتے رہے لیکن سکھ ونتی اور شربتی خاموشی سے کھڑی رہیں۔ گھونگھٹ کے اندر شربتی ڈھیرے ڈھیرے آنسو بہا رہی تھی۔ یہ تو جب وہ سوں سوں کرتی اوڑھنی سے آنکھیں پونچھنے لگی تو سکھ ونتی کو معلوم ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ بہت برس پہلے جب اُس کی شادی ہوئی تھی اور اُس کا گھر والا لام پر گیا تھا تو وہ بھی تو اسی طرح روئی تھی۔ رونے پر روک تھوڑی لگا سکتا ہے کوئی۔

اور پھر بس آ گئی تھی اور وشال ایک بار اپنی ماں اور شربتی کی طرف دیکھ کر جلدی سے بس میں بیٹھ گیا تھا اور امر چند نے اُس کا ٹرنک بھی پچھلے دروازے سے بس کے اندر ہی رکھ دیا تھا۔ اور پھر بس چل پڑی تھی۔ اور شربتی کو وشال کہیں نظر نہ آیا تھا۔ بس میں بھیڑ بہت تھی اور وشال کو بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی۔ وہ سیٹوں کے درمیاں کھڑا تھا اور اپنے آپ میں کڑھ رہا تھا کہ بس پکڑنے سے پہلے شربتی سے ایک شبد بھی نہ کہہ سکا تھا۔ یہ کڑھن جب تک وہ بھوانی نہ پہنچ گیا اُسے جلاتی رہی۔

اپنی اوڑھنی میں خاموشی سے ڈھیروں آنسو جذب کرتی ہوئی شربتی گھر واپس آ گئی تھی۔ پہلا خط جو شربتی نے وشال کو لکھا اُس میں اُسے بڑا کٹھور اور ظالم کہا اور لکھا کہ جانے سے پہلے تو رات بھر اُس سے پیار بھری باتیں کرتا رہا تھا اور بس پر چڑھنے سے پہلے اُس سے ایک شبد بھی نہ بولا تھا۔ بہت ہی کٹھور ہو تم۔ شربتی نے لکھا تھا۔

لفافے پر ایڈریس امر چند نے ہی لکھا تھا اور اُسی نے خط ڈاک میں ڈالا تھا۔

اُس رات تو وہ اکیلی ہی سوئی تھی چھت کے اوپر والے کمرے میں اور جاگتی رہی تھی رات بھر اور ساری رات ڈرتی رہی تھی وہ۔ اگلی رات وہ نیچے چلی آئی تھی۔

"میں تو یہیں سوؤں گی تمہارے پاس۔" اُس نے سکھ ونتی سے کہا۔

"کیوں؟"

"اکیلی کو ڈر لگتا ہے۔"

''میں تو ساری رات کھانسوں گی۔''

''تم کھانستی رہنا، میں سوتی رہوں گی۔''

اور پھر یہ ہوا کہ شربتی اپنی ساس کے سنگ، گھر کے اندر والے کمرے میں سونے لگی، اُس کی ساس رات بھر کھانستی رہتی اور وہ کھاٹ پر پڑی لیٹی رہتی کچھ روز تو یہی عالم رہا لیکن پھر وہ عادی ہو گئی اور دھیرے دھیرے اُسے لگنے لگا کہ سکھ وتی اب رات کو نہیں کھانستی تھی اور آرام سے پڑی سوتی رہتی تھی۔

شربتی نے گھر سنبھال لیا تھا اور رام چند نے اپنی بارانی زمین کا وہ ٹکڑا خود کاشت کرنا شروع کر دیا جس میں زیادہ چنے اُگتے تھے اور اگر وقت پر بارش ہو جاتی تھی تو فصل بہت اچھی ہوتی تھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ بیج کے دانے بھی ریتیلی زمین پر پڑے پڑے سوکھ جاتے تھے۔ جیسے سنسان راتوں میں شربتی کے خوابوں کے بیج جدائی کی کڑی دھوپ میں جھلسنے لگتے تھے۔

وِشال جب دہلی پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔

جب قلی اُس کا سامان اُٹھانے کے لیے آیا تو اُس نے پوچھا۔

''کہاں جائیں گے حوالدار صاحب؟''

''بھوانی جانا ہے مجھے، کوئی ٹرین ملے گی اس وقت؟''

''پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔''

''تو لے چلو۔'' ۶

کالے روغن والا بڑا سا ٹرنک اُس نے قلی کے سر پر رکھنے میں اُس کی مدد کی اور اُس کے اوپر ہولڈال رکھوا دیا، ایک چھوٹا سا بیگ تھا جسے وشال نے اپنے ہاتھ میں اُٹھا لیا تھا۔ جب وہ قلی کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے دوسرے پلیٹ فارم پر جانے کے لیے پُل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اُس نے ٹرنک کے کالے روغن پر سفید حروف میں لکھا اپنا نام پڑھا جس کے آگے اُس کی پلٹن کا نام بھی لکھا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا سے کاٹ کر دوسری دنیا سے جوڑ رہا ہے جس کے رہنے والے الگ تھے۔ جس کا نظام الگ تھا، جس کے رسم و رواج الگ تھے، جس دُنیا میں وہ اَب جا رہا تھا وہ اس کی جانی پہچانی دنیا تھی۔ جس میں سادھارن لوگ رہتے تھے، جن کے رہنے اور سوچنے کا انداز اسی دھرتی کی دین تھا جس دھرتی کی کوکھ سے اُنہوں نے جنم لیا تھا۔

اُسے اپنی مصنوعی بائیں ٹانگ کے کارن پُل کی سیڑھیاں چڑھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ قلی

ہت آگے نکل گیا تھا۔ سیڑھیوں پر بھیڑ بھی بہت تھی۔ اس کی رفتار بھی دوسروں کی نسبت بہت کم تھی، نہ تو وہ نی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ سکتا تھا جس تیزی سے دوسرے لوگ چڑھ رہے تھے۔ اور اپنے اپنے سامان کے ساتھ رہنے کی کوشش کر رہے تھے اور نہ ہی وہ اپنے قلی کو آواز ہی دے سکتا تھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں یشان ہو گیا، اُس نے سیڑھیوں کے ساتھ لگی ریلنگ کا سہارا لیا اور ایک سیڑھی پر سیدھا کھڑا ہو گیا کہ اپنے لی کو پہچانے۔ لیکن وہ قلی کو نہیں پہچان سکا۔ قلی شاید بہت آگے نکل چکا تھا۔ اُس نے قلی سے آہستہ چلنے کو کہا ی تو نہیں تھا، وہ اُسے کہہ بھی کیسے سکتا تھا کہ اُس کی مصنوعی ٹانگ کو لگے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور وہ یادہ تیز نہیں چل سکے گا۔ ہر ہینڈی کیپ آدمی کا یہی کمپلیکس ہوتا ہے، یہ لوگ اپنے ہینڈی کیپڈ ہونے کی شہیر نہیں کر سکتے اور شاید اسی کارن دُکھ بھی بھوگتے ہیں۔

مانٹو کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔

یہ بات مانٹو نے ایک دن اُسے خود بتائی تھی۔

مانٹو دراصل بڑا شرمیلا آدمی تھا۔ اس کا تعلق غریب گھرانے سے تھا اور وہ اپنی ماں کے زیرِ اثر تھا۔ ہ فوج میں بھی اسی لیے بھرتی ہوا تھا کہ وہ اپنے گھر کے حالات سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا باپ دن ات نشے کی حالت میں رہتا تھا اور اُس کی ماں کو پیٹتا تھا، جب مانٹو نے وشال سے اپنے باپ کی موت کا کر کرتے ہوئے کہا، ''جس روز میرا باپ مرا میری آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔''

تو وشال بھونچکا رہ گیا۔

''سچ کہہ رہے ہو مانٹو؟''

''ہاں۔''

''تمہیں کوئی صدمہ نہیں ہوا تھا اپنے باپ کی ڈیتھ کا؟''

''بالکل بھی نہیں۔''

''مگر کیوں؟'' وشال نے چیخ کر پوچھا تھا۔

''میں چند دنوں میں مر جاؤں گا۔ کسی کو شاید معلوم بھی نہیں ہوگا کہ مانٹو نام کا کوئی سپاہی محاذ پر لڑتے ہوئے مر گیا تھا، اس لیے تم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم سے اپنا دُکھ کہہ سکتا ہوں۔''

''تم نہیں مروگے مانٹو، مجھے یقین ہے۔''

''ہم دونوں کے یقین مختلف ہیں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔''

''نہ پڑے فرق اگر تم یہ تو بتاؤ تمہیں اپنے باپ کی موت کا کیوں افسوس نہیں ہوا تھا؟''

"اس لیے کہ اُس نے میری ماں کو دھوکا دیا تھا اور اُس سے یہ بھی توقع کی تھی کہ وہ تمام عمر اُس دھوکے کا ذکر کسی سے نہ کرے اور دن رات جہنم میں جلتی رہے۔"

"کیا دھوکا دیا تھا تمہارے فادر نے تمہاری ماں کو؟"

"وشال مت پوچھو! بڑا ظالم تھا میرا فادر۔"

"پھر بھی بتاؤ مانو۔"

اور پھر مانو نے جو بات کہی تھی وشال سن کر لرز گیا تھا۔

"میرا فادر امپوٹینٹ تھا اور اُس نے میری خوبصورت اور نہایت ہی معصوم اور غریب ماں کو محبت کا فریب دے کر پھانس لیا تھا۔ میری ماں کو ٹارچر کرتا تھا وہ کمینہ آدمی کہ وہ اس راز کو چھپائے رکھے۔ پھر اُس نے میری ماں کو مجبور کیا کہ وہ کسی دوسرے شخص سے ناجائز تعلقات قائم کرے۔ وشال میرا امپوٹینٹ فادر میرا باپ نہیں ہے، میں ناجائز اولاد ہوں اور مجھے اپنے باپ کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ میں حرامی ہوں۔ اور سنو گے کچھ؟ خاموش کیوں ہو گئے ہو ایک دم؟ تمہاری زبان تو نہیں کاٹ لی میں نے؟ بڑے بہادر بنے پھرتے ہو ایک ہی وار میں چت ہو گئے۔ بس آگے سنو۔"

وشال منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔ اُس نے اپنی حیرت بھری آنکھیں مانو کے چہرے پر گاڑ دیں جو اسپتال کے وارڈ میں اب بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"پھر میں نے بھی وہی کیا جو میرے باپ نے کیا تھا۔ میرے فادر سے میری نفرت کی ایک وجہ میں خود بھی ہوں۔ میں بھی امپوٹینٹ ہوں، میں نے بھی اپنے باپ کی طرح ایک لڑکی کو فریب دے کر اُس سے شادی کر لی اور شادی کے بعد کئی روز تک گھر نہیں گیا۔ ڈرتا تھا کہ میرا راز کھلے گا تو قیامت آ جائے گی۔ اور پھر وہ قیامت آ گئی، ایک دن میری بیوی نے خود مجھے بستر پر گرا لیا اور میرے کپڑے اُتار دیے۔ اس سے جو کچھ ہو سکتا تھا مجھے ایکسائیٹ کرنے کے لیے کیا، لیکن میں تو برف کی سِل کی طرح پڑا رہا اور اُس کے جوان جسم کی بھرپور آگ بھی مجھے نہ پگھلا سکی۔ اور پھر جانتے ہو کیا ہوا؟"

"کیا؟" وشال نے بڑی مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اگلے ہی دن میری کنواری بیوی مجھے چھوڑ گئی اور پھر دوبارہ مجھے نہیں ملی۔ جانے اَب وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ میری ماں مجھے بار بار پوچھتی رہی کہ وہ کیوں چلی گئی تھی لیکن میں نے اُسے کچھ بھی نہ بتایا اور اپنا راز اپنے دل میں چھپائے رکھا اور جب ذہنی طور پر بہت پریشاں ہو گیا تو گھر سے بھاگ گیا۔ اور پھر جنگ چھڑ گئی اور مجھ سا امپوٹینٹ آدمی بھی بھرتی کر لیا گیا۔ وہاں تو گولیوں کا نشانہ بننے کی

بات تھی، بیکسی کی تھوڑی تھی۔"

یہ کہتے ہوئے مانٹو ورسے ہنسا تھا اور اُس کی ہنسی میں وہ تمام ربر گھلا ہوا تھا جو اتنے برس تک لاوے کی طرح اُس کی شخصیت کے اندر سلگتا رہا تھا اور اُس دن اچانک پھوٹ پڑا تھا۔ ●

وشال ریلوے پُل کی سیڑھیوں پر ریلنگ کا سہارا لیے کھڑا تھا اور اُس کا قلی بہت آگے نکل چکا تھا اور اُس کا دھیان مانٹو کی کہی باتوں میں اُلجھ گیا تھا۔ مانٹو نے اپنی ساری زندگی صرف اپنے ایک ہینڈی کیپ کے کارن برباد کر ڈالی تھی اور جب وشال نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے اپنے پاؤں اگلی سیڑھی پر رکھنے کی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور سیڑھیوں پر سے نیچے لڑھک گیا، اس کی مصنوعی ٹانگ اُسے سنبھال نہ سکی، اور وہ سیڑھیوں پر لڑھکتے لڑھکتے اُسی پلیٹ فارم پر آ گرا جہاں سے وہ کچھ دیر پہلے قلی کے پیچھے اُس سے اپنا سامان اُٹھوا کر پُل کی طرف بڑھا تھا۔

لوگوں نے اُسے سنبھال لیا۔ اُس کے بازو پر کافی چوٹ لگی تھی، اور اَب اُس سے اپنا بیگ بھی نہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔

جب ایک مسافر اُسے سنبھال کر اُس پلیٹ فارم پر لایا جہاں کھوالی جانے والی ٹرین کھڑی تھی تو وشال نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُس کی نگاہ اُس قلی پر پڑی جو ٹرین کے ایک ڈبے کے سامنے اُس کا ٹرنک اور ہولڈال پلیٹ فارم پر رکھ کر اُسے تلاش کر رہا تھا۔

گاڑی چلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

وشال نے پلیٹ فارم پر ہی سے چائے کے دو گلاس اپنے مگ میں ڈلوائے اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا ڈبے میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے چائے کا مگ سیٹ پر رکھا اور سگریٹ سلگا لیا۔ سگریٹ سلگانے کے لیے جب اُس نے ماچس کی تیلی جلانے کی کوشش کی تو اُسے اپنے دائیں بازو کی کہنی میں بہت درد محسوس ہوا۔ سگریٹ تو اُس نے سلگا لیا لیکن اپنے بائیں ہاتھ سے دُکھتی ہوئی کہنی کو دبانے لگا۔ پھر اُس نے بائیں ہاتھ سے مگ اُٹھایا اور دھیرے دھیرے چائے سڑکنے لگا۔ پھر اُس نے پیٹھ سیٹ کی بیک سے لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

گاڑی چلی تو اُس نے کچھ دیر کے لیے دہلی جنکشن کے پلیٹ فارموں پر نظر گاڑے رکھی اور جب سبھی پلیٹ فارم گزر گئے تو اُس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر بچا ہوا آخری ٹکڑا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

اپنے گاؤں تو وشال چھ مہینے پہلے آ رہا تھا۔ اُس نے چھٹی بھی منظور کروالی تھی۔

پر اچانک سرحد پر جنگ چھڑ جانے کے امکاں پیدا ہو گئے اور سب فوجیوں کی چھٹیاں کینسل کر دی گئیں جو فوجی چھٹی پر تھے انہیں بھی واپس بلانے کے احکام جاری ہو گئے تھے۔ امن کے دنوں میں تو فوج کے بارے میں کوئی سوچتا بھی نہیں۔ بس فوجیوں کے وجود کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ امن کے دنوں میں فوج کی اہمیت کو کون پہچانتا ہے؟ لیکن سرحدوں پر جنگ کا خطرہ پیدا ہو جائے تو اس وقت سب کی نگاہیں فوجیوں پر ہی مرکوز ہوتی ہیں، وہی سرحد پر کھڑے دُشمن کی گولیوں کا سامنا کریں، اپنے ملک کے لیے خون بہائیں، جنگ میں مر جائیں تو اُن کی بیویاں بیوہ اور اُن کے بچے یتیم ہو جائیں۔ فوجی یا سول افسر جلسوں میں اُن کے غم اور دُکھ کی ماری ہوئی بیویوں کو چمکتے ہوئے تحفے دے دیں۔ سلائی کی مشینیں پیش کر یں اور ایک معمولی سی پنشن کے طور پر اُن کے نام لگا دیں اور پھر اُنہیں بھول جائیں، جنگ کی دوبارہ تیاریاں کی جائیں۔ سرحد پر کام آنے والے نئے جوانوں کو بھرتی کیا جائے، اُنہیں ٹریننگ دی جائے اور جب وہ اپنے اپنے ٹرنک اُٹھائے چھٹی لے کر گھر آئیں تو چند دنوں کے لیے اُن کے دُور چھوٹے چھوٹے گھر کچھ دنوں کے لیے آباد ہو جائیں۔ اس کے لیے لڑکیاں چنی جائیں جن کے نام ایک لمبا انتظار لکھ دیا جائے اور وہ گاؤں کی حدوں پر کھڑی اُس صبح کی پرتیکشا کرتی رہیں جب وہ اپنے گھر والوں کا دیدار کر سکیں اور اگر جنگ چھڑ جائے تو مزاروں پر جا کر اُن کی سلامتی کی دُعائیں مانگتی رہیں اور رات کی تنہائیوں میں اکیلی روتی رہیں اور کسی کو اپنے دُکھ میں شریک بھی نہ کر سکیں۔

جنگ آج عجیب قسم کا ہوا ہے، جو ہارتا ہے وہ تو خیر ہارتا ہی ہے لیکن جو جیت جاتا ہے وہ بھی ہارتا ہے۔ ہر جنگ چاہے وہ کسی بھی ملک اور کسی بھی سرحد پر لڑی جائے اپنی جگہ پر مہابھارت کی جنگ ہے۔ مہابھارت کی جنگ کا آغاز تو صرف ایک درو پدی کو داؤ پر لگانے سے ہوا تھا لیکن ہر جنگ میں جانے کتنی درو پدیاں داؤ پر لگتی ہیں اور کتنے ہی دریودھن اُنہیں اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔ آج کے دَور میں درو پدی ایک سمبل بن گئی ہے، انسانی قدروں کا، سماجی استحصال کا، اقتصادی بحران کا اور ایک بے اطمینانی، خوف اور تناؤ کا۔ جنگ کسی بھی ملک میں اور دنیا کے کسی بھی حصے میں لڑی جائے سینکڑوں درو پدیاں داؤ پر لگتی ہیں۔ انسانی قدریں ہی تو وہ درو پدیاں ہیں جو ہر جنگ میں ہارتی ہیں۔ جنگ جیتنے والا بھی انساں کے مستقبل کو اتنا ہی تاریک کرتا ہے جتنا کہ ہارنے والا۔

لیکن جنگیں پھر بھی ہوتی ہیں۔

گاؤں کے بانکے جوان گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں۔

ان کی بے گناہ معصوم بیبیاں بیوہ ہوتی ہیں۔ ان کا سیندور اُجڑتا ہے۔ ان کے بچوں کے پیارے

پیارے ہونٹوں سے ادھ کھلی مسکراہٹیں چھنتی ہیں۔ ان کی بہنوں کے ہاتھوں سے راکھیاں ٹوٹ کر بکھرتی ہیں۔

اور اُن کی مائیں اپنی جوت گنواتی آنکھوں سے دن رات آنسو بہاتی ہیں۔ ملک گیری کی ہوس انسان کی میراث ہے۔ کسی بھی ملک کا کوئی بھی انسان اپنے اس شراپ سے مکتی نہیں پا سکتا۔

انساں لڑے گا کہ درندگی کا عنصر اس میں موجود ہے۔

وہ ایک طرف چاند ستاروں پر نئی نئی بستیاں بنانے کا منصوبہ بنائے گا اور دوسری طرف اس دھرتی کو جہنم بنا دے گا جہاں وہ رہتا ہے۔ وہ ایک بے بنیاد دُنیا کی تخلیق کی ہوس میں اپنے گاؤں میں بنا چھوٹا سا پرسکوں گھر تباہ کر ڈالے گا۔ اپنے خوابوں میں گلاب اُگانے کی اُمید میں اپنے گاؤں کے کھیتوں میں اُگی بھرپور فصلوں کو جلا ڈالے گا۔

کتنا بڑا بہروپ بھرتا ہے انساں۔ کس طرح ٹھگتا ہے اپنے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی۔ کیا اُن متضاد ارادوں کے درمیان دنیا سلامت رہ سکے گی؟ یہ سب باتیں بھوانی جانے والی ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں جنگ سے واپس لوٹا وشال نہیں سوچ رہا۔ آج کا انسان سوچ رہا ہے۔ وشال بھی آج کا انساں ہے جس کے اپنے ذہن میں بھی وسوسے ہیں۔ اس کی سمسیائیں بہت بڑی نہیں، اُس کی اپنی نجی سمسیائیں تو بہت معمولی ہیں لیکن یہ سب چھوٹے چھوٹے ذاتی مسئلے بڑے بڑے انسانی مسئلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ وشال کی سمسیا اُس وقت بس اتنی ہے کہ وہ جلدی سے جلدی اپنے گاؤں پہتا واس پہنچے اور اپنی بیوی شرتی کو دیکھے جو بہت دنوں سے بیمار چلی آ رہی ہے۔ اور وشال نہیں جانتا کہ اُسے کینسر ہے اور اب وہ ایسی اسٹیج پر ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔ اور وہ کسی وقت بھی مر سکتی ہے۔ وشال کے سامنے صرف ایک ہی سوال ہے اس وقت۔

وہ کتنی جلدی اپنے گاؤں پہنچ سکتا ہے؟

سڑک سے گاؤں تک اس کا سامان کون اُٹھا کر لے جائے گا؟

بھوانی پہنچ کر وہ پہتا واس کیسے جائے گا؟ بس تو صبح سات بجے سے پہلے نہیں ملے گی اُسے۔

اس وقت وشال کے ذہن میں نہ اُس کی مصنوعی ٹانگ کا مسئلہ ہے، نہ مانٹو کا۔ اس وقت نہ اُسے اس جنگ کی ہولناکی کا دھیان ہے جس میں وہ لڑا ہے اور نہ اُس خون کا جو اُس کے جسم سے نکلا تھا۔ کتنی سمٹ گئی ہے اس کی دنیا۔ انسان کا اپنا ذاتی دُکھ اُسے کتنا چھوٹا کر دیتا ہے۔ ہر چیز سکڑ جاتی ہے۔ اس کے خواب، اس کی اُمیدیں، اس کے مسئلے، اس کی خواہشیں سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ وہ نقطہ اس

کا اپنا ذاتی اور وقتی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس مسئلے کے سامنے دُنیا کی سنگین سے سنگین حقیقت اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ یہی کچھ ہو رہا تھا اس وقت وشال کے ساتھ بھی۔

اپنی پیٹھ سیٹ کی بیک سے لگائے ہوئے ہی وشال نے اپنی جیب میں سے تین خط نکالے جو پچھلے چھ مہینوں سے اس کے چھوٹے بھائی امر چند نے اُسے لکھے تھے۔ شادی کے کوئی ایک برس تک شربتی اُسے خط لکھتی رہی تھی۔ پھر اُس نے خود خط لکھنے بند کر دیے تھے۔ امر چند ہی خط لکھتا تھا جب سے۔ دراصل شربتی خط تو لکھتی تھی لیکن اُس پر وشال کا ایڈریس اُسے امر چند سے لکھوانا پڑتا تھا۔ انگریزی میں وہ ایڈریس نہیں لکھ سکتی تھی اس لیے اُسے ہمیشہ ہی اپنے دیور کی مدد لینی پڑتی تھی، پھر اچانک ہی اسے یہ بات کھٹکنے لگی کہ خط تو وہ لکھے اور پھر اُسے ایڈریس کے لیے امر چند کے حوالے کر دے۔ امر چند ویسے تو اچھا لڑکا تھا۔ اس سے ایڈریس لکھوانے میں کوئی رائی نہیں تھی لیکن جانے کیوں شربتی کو یہ بات بری لگنے لگی اور پھر اُس نے وشال کو خط لکھنا چھوڑ دیا۔ امر چند ہی گھر کے حالات کے ساتھ ساتھ وشال کو شربتی کے بارے میں بھی لکھ دیتا تھا۔ اور جب سال چھ مہینے میں وشال چھٹی پر گھر آتا تو شربتی اُسے دنیا بھر کی باتیں بتا دیتی اور دُنیا بھر کی باتیں اُس سے پوچھ لیتی۔ دونوں نے اَب ایک دوسرے سے خط نہ لکھنے کے شکوے کرنے چھوڑ دیے تھے۔

ڈبے کی مدھم سی روشنی میں وشال نے جو خط سب سے پہلے کھولا، اتفاق سے وہی سب سے آخر والا خط تھا۔ اسی خط نے تو وشال کو پریشان کیا تھا۔ امر چند نے لکھا تھا کہ شربتی کی طبیعت سنبھل نہیں رہی تھی اور میڈیکل کالج روہتک میں ڈاکٹروں کو دکھانے کے بعد سے اُس کی حالت اور بھی زیادہ بگڑ گئی تھی۔ امر چند نے وشال کو فوراً آنے کو لکھا تھا، پر یہ خط بھی دو مہینے پہلے کا تھا۔

وشال نے خط کا ایک ایک لفظ دوبارہ پڑھا اور پھر اُسے تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ دوسرے دونوں خط اُس نے بنا پڑھے ہی جیب میں ڈال دیے۔ چھٹی کی درخواست تو وشال نے بھائی کا خط ملتے ہی دے دی تھی۔ لیکن اس سے پہلے اُس کے کئی اور ساتھیوں نے بھی چھٹی کی درخواست دے رکھی تھی۔ سب کو تو ایک ساتھ چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ اس کو چھٹی پر جانے کی اجازت اب ملی تھی جب کہ دو مہینے گزر چکے تھے۔ اس دوران امر چند نے اُسے ایک خط اور بھی لکھا تھا لیکن وہ اسے اب تک نہیں ملا تھا۔ وہ خط مل جاتا تو وشال اور بھی زیادہ پریشان ہوتا کیوں کہ اس میں امر چند نے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ شربتی کو کینسر ہے اور اب وہ زیادہ دن نہ جی سکے گی، اس لیے وشال کو فوراً آ جانا چاہیے۔ ایک تار بھی تو دیا تھا امر چند نے

اس کے بعد وہ تار بھی وشال کو نہیں ملا تھا۔ اس لیے وشال کو شربتی کی صحت کے بارے میں جو خبر ملی تھی وہ دو مہینے پرانی تھی۔ اس کے بعد تو شربتی پر قیامت گزر چکی تھی۔ اب تو اُس کا بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ اور نا قابلِ برداشت درد کے کارن وہ رات کو سو بھی نہ سکتی تھی۔ صرف ایک آس کے سہارے زندہ تھی وہ کہ وشال ضرور آئے گا اور وہ اُس کی گود میں سر رکھ کر جان دے گی۔ معصوم شربتی کی معصوم آرزو!

پھر وشال نے کالے روغن والا اپنا ٹرنک سیٹ کے نیچے سے باہر کھینچا۔ اسے کھولا اور اُس میں پڑی کچھ چیزیں نکال کر سیٹ پر بچھے فوجی کمبل پر ڈال دیں۔ صرف اپنی تسلّی کے لیے، ورنہ اس کا کیا فائدہ تھا؟

''چھٹی پر جا رہے ہو حوالدار؟'' سامنے کی سیٹ پر بیٹھے مسافر نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں جی۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔''

''کہاں ہے آپ کا گاؤں؟''

''ضلع مہندر گڑھ میں۔''

''کیا نام ہے آپ کے گاؤں کا؟''

''پیتا واس۔''

''بھوانی سے کیسے جاؤ گے؟''

''کسی ٹرک ورک میں چلا جاؤں گا۔''

''یہ سب چیزیں کیوں سجا رہے ہو سیٹ پر حوالدار؟''

''صرف ایک نظر دیکھ رہا ہوں انہیں اپنی تسلّی کے لیے۔'' وشال مسکرایا۔

''بہت دنوں میں لوٹے ہو گھر؟''

''ہاں، سب کے لیے کچھ نہ کچھ لانا ضروری تھا۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے شربتی کے لیے لائے ہوئے کپڑوں کی طرف خاص طور سے دیکھا۔ وہ بہت خوش ہو گی یہ کپڑے دیکھ کر وشال نے سوچا۔ اور پھر سب چیزیں سمیٹ کر اُس نے دوبارہ ٹرنک میں ترتیب سے رکھ دیں اور ٹرنک کو سیٹ کے نیچے سرکا دیا اور پھر سیٹ پر بچھے کمبل پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

سامنے کی سیٹ پر بیٹھا مسافر بھی آنکھیں موند کر لیٹ گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وشال کی آنکھ لگ گئی۔
جب ٹرین بھوانی پہنچی تو آدھی رات ہو چکی تھی۔

رات کا پچھلا پہر
گہرے نیلے آکاش میں چمکتے ہوئے تارے۔
پورنماشی کے کئی دن بعد کا ڈھلتا ہوا چاند اور اُس کی چاندنی خاموش اور ساکن فضا اور اس میں گھلی ہلکی سی خنکی۔

اور پنیتا داس گاؤں سے کوئی دس میل دور سڑک کے کنارے اپنے کالے روغن والے بڑے سے ٹرنک پر بیٹھا ہوا وشال حواس زیادہ دیر تک اپنی مصنوعی ٹانگ کے سہارے کھڑا نہ رہ سکتا تھا۔

مہندر گڑھ کی طرف جانے والے تین چار ٹرک اُس کے سامنے سڑک سے گزر چکے تھے، اس کے بار بار ہاتھ دینے کے باوجود کوئی ٹرک نہ رکا تھا۔

جس ٹرک سے وہ بھوانی سے چرخی دادری تک آیا تھا اسے وہاں کی سیمنٹ فیکٹری میں جانا تھا۔ سیمنٹ کے کٹے لادنے کے لیے اگر ٹرک کو آگے جانا ہوتا تو ڈرائیور اسے یقیناً ساتھ لے جاتا اور وشال کی سمسیا حل ہو جاتی۔ لیکن اب اس کی سمسیا کے حل کا کوئی امکان نہ تھا۔ اُسے لگا جیسے اب وہ سورج نکل آنے کے بعد بھی اپنے گاؤں نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ چرخی دادری کے قصبے کے باہر بائی پاس پر کھڑا تھا۔ اب تو جو بس صبح بھوانی سے چلے گی وہی اُس موڑ پر رُکے گی جہاں وہ کھڑا تھا۔ اور اُسے سات بجے سے پہلے کوئی بھی بس نہ مل سکے گی۔ یہ سوچ کر وشال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنی بے بسی اور مجبوری پر۔ اس طرح کے آنسو تو اس روز اُس کی آنکھوں میں آئے تھے جب ملٹری اسپتال میں اس کی ٹانگ کٹی تھی۔ مجبوری بے چارگی اور بے بسی کے آنسو تھے وہ بھی۔

وشال کو لگا جیسے آج اس کی دوسری ٹانگ بھی کاٹ دی گئی تھی ورنہ وہ رات بھر پیدل چل کر بھی اپنے گاؤں پہنچ سکتا تھا۔ اتنا دور تو نہیں تھا اس کا گاؤں کہ وہ کبھی پہنچ بھی نہ سکتا وہاں۔ اس نے اپنی خاکی قمیص کی آستین سے آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ اسی لمحہ ایک اور ٹرک گزر گیا تھا، اس کے سامنے سے، لیکن اس نے اسے ہاتھ دے کر روکا نہیں، اب وہ سڑک پر سے گزرتے ہوئے کسی بھی ٹرک کو نہیں روکے گا۔ اسی موڑ پر اپنے کالے روغن والے ٹرنک پر بیٹھا آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتا رہے گا اور ویران نظروں سے مرتی ہوئی چاندنی کا کفن اوڑھے سنسان سڑک کی لاش کو دیکھتا رہے گا۔

اسی شام کی ڈھلتی ہوئی رات تھی یہ جو شربتی پر بھاری تھی۔ اسی دھواں دھواں شام کے دھندلکوں میں ہی تو اٹکی رہی تھی اس کی سانس اور اب جب کہ پورنما کے کئی دن بعد والا چاند ڈوبنے لگا تھا اور ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی گھلنے لگی تھی، دھندلکوں میں اُلجھی ہوئی شربتی کی سانسیں دھیرے دھیرے کھلنے لگی تھیں۔ سانسوں کی جس ڈوری سے اُسے آخری گھڑیوں میں وشال کے واپس آ جانے کی اُمید سے باندھ رکھا تھا۔ اب اُس ڈوری کی ایک ایک گانٹھ کھل رہی تھی۔ اب تھوڑی ہی دیر میں شربتی کی ایک ایک ٹوٹتی ہوئی سانس بکھر جائے گی وراس کے سارے بندھن ٹوٹ جائیں گے اور وہ ایک ہی پَل میں مکت ہو جائے گی۔

اور پھر بھور کا ہلکا ہلکا مٹمیا اُجالا فضا میں پھیلنے لگے گا اور اُس اُجالے میں پیتا واس گاؤں کی اوبڑ کھابڑ جگہوں کی لکیریں بھی واضح ہونے لگیں گی۔

اور وشال اپنے کالے روغن والے ٹرنک سے اُٹھ کر ایک بار پھر سڑک کے کنارے کھڑا ہو جائے گا۔ شاید بھوانی سے آنے والی پہلی بس کا ڈرائیور اپنی بس کو اس موڑ پر روک دے جہاں وہ اپنی مصنوعی ٹانگ کے سہارے آدھی رات کے بعد سے کھڑا تھا اور ڈھیروں آنسوؤں کے انگارے اپنی خاکی قمیض کی استیں میں سلگا چکا تھا۔

پیتا واس گاؤں سے باہر سرسوں کی پیلے پیلے پھولوں سے بھرے کھیتوں پر سورج کی پہلی کرنوں کا اُجالا نرت کر رہا تھا۔ دھواں دھواں شام کی سحر ہو گئی تھی۔

بھور کے پوتر کھشنوں میں شربتی کی سانسوں کی اُلجھی ہوئی ڈوری کی لحہ لحہ ڈھیلی ہوتی ہوئی گانٹھیں ایک دَم کھل گئی تھیں۔ کمزور ڈوری جس نے شربتی کو زندگی سے باندھ رکھا تھا اب پوری طرح سے ٹوٹ گئی تھی۔ آخری گانٹھ جب کھلی تھی تب شربتی کی ساس سکھ ونتی نے اُس کے منہ میں نئی چمچ سے گنگا جل ڈالا تھا، جو اُس نے کئی برسوں سے دارو کی ایک خالی صاف بوتل میں سنبھال کر رکھا تھا، اس کی نیم مردہ دیہہ گوبر سے پُتے کمرے کے فرش کے ایک حصے پر پڑی تھی۔ شربتی کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا منہ بھی سکھ ونتی نے گنگا جل ڈالنے کے لیے بڑے جتن سے کھولا تھا۔ شربتی کا دیور امر چند پاس بیٹھا گیتا کا پاٹھ کر رہا تھا جس کا ایک شبد بھی شربتی کے کانوں میں نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کے سرہانے گیلے آٹے کے دیے میں گھی سے تر روئی کی بتی جل رہی تھی۔ سانس کی کمزور ڈوری کی جب آخری بے آواز گانٹھ کھلی تو شربتی کو اُس کا بالکل بھی احساس نہیں ہوا۔ گانٹھ کے کھلنے کی پُر اسرار آواز صرف سکھ ونتی نے ہی نے سنی تھی۔ امر چند نے بھی یہ آواز نہیں سنی تھی کیوں کہ وہ تو گیتا کا پاٹھ کرنے میں مصروف تھا۔ سکھ ونتی کی ایک زوردار چیخ کمرے میں گونجی،

یہ سن کر امر چند نے پاٹھ کرنا چھوڑ دیا اور گیتا کو سنبھال کر سامنے طاق میں رکھ دیا۔

شرطی بند ہ ٹمکت ہو کر کمرے کے فرش پر پڑی تھی اور سکھ ونتی نے اُس کے جسم پر ہلکے سرخ رنگ کی ایک چادر ڈال دی تھی۔ اور پھر آس پاس کے گھروں سے عورتیں سکھ ونتی کے گھر آنے لگیں اور چپ چاپ فرش پر بیٹھتی گئیں، ان میں سے کچھ تو رو رہی تھیں اور کچھ خاموش تھیں۔ گلی محلّے پر سناٹا چھا گیا تھا۔

شاید ان ہی لمحوں میں بلوانی بس اسٹینڈ سے مہندر گڑھ جانے والی پہلی بس اسٹارٹ ہوئی تھی۔

یہ پہلی بس تھی شاید اسی لیے اس میں بہت سی سواریاں نہیں تھیں۔ راستے میں جہاں کہیں بھی کوئی سواری ہاتھ دیتی، بس کا کنڈکٹر بس رُکوا لیتا۔ جب چرخی دادری کے بائی پاس پر کھڑے وشال نے ہاتھ کا اشارہ کیا، بس رُک گئی۔

''کہاں جاؤ گے حوالدار؟'' کنڈکٹر نے پوچھا۔

''بھٹا واس۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' کنڈکٹر نے اشارہ کیا، جب اُس نے دیکھا کہ وشال کو ٹرنک اُٹھانے میں مشکل ہو رہی تھی تو کنڈکٹر نے خود ہی ٹرنک کھینچ کر بس کے اندر رکھ دیا۔

''بہت بھاری ٹرنک ہے حوالدار۔''

''ہاں۔'' وشال نے مسکرا کر کہا، اور زیادہ وضاحت نہیں کی۔

کنڈکٹر نے ٹکٹ کاٹی اور وہیں پچھلی سیٹ پر وشال کے پاس بیٹھ گیا۔

''چھٹی آئے ہو؟''

''ہاں۔''

''لمبی چھٹی؟''

''بس دو مہینے کی۔''

''کتنے بچے ہیں تمہارے۔''

''ابھی کوئی نہیں۔'' وشال نے مسکرا کر کہا۔

''شادی کب ہوئی؟''

''کچھ (بہت) دن ہو گئے۔''

بس قریب قریب خالی تھی۔ کنڈکٹر کو سڑک پر کھڑی ایک سواری نظر آئی۔ اس نے وسل دے کر بس رُکوائی اور وشال کے پاس سے اُٹھ کر سواری کے لیے بس کا پچھلا دروازہ کھول دیا، پھر وہ ٹکٹ کاٹنے میں

مصروف ہو گیا۔

یہ مہندر گڑھ کی سواری تھی، بس کا ٹرمینس مہندر گڑھ ہی تھا۔ وشال کے ساتھ جس سیٹ پر پہلے کنڈکٹر بیٹھا تھا اُسے وہاں یہ نیا پسنجر بیٹھ گیا۔

''مجھے پیتا واس اُترنا ہے میرا ٹرنک اُتروا دینا۔'' وشال نے اُس سے کہا۔

''ہمبے۔'' (اچھا) یہ کہہ کر اس پسنجر نے سر بھی ہلا دیا اور پھر بیڑی کے پیکٹ سے بیڑی نکال کر سلگانے لگا۔ اس نے ایک بیڑی وشال کی طرف بھی بڑھائی۔ لیکن اُس نے انکار کر دیا۔

وشال کی نظریں تو سڑک پر گڑی تھیں۔ کب پیتا واس آئے اور کب کنڈکٹر بس رُکوائے۔

کنڈکٹر نے وسل دی، بس رُک گئی۔

وشال نے باہر جھانکا، اُس کا گاؤں آ گیا تھا، وہ اپنی مصنوعی ٹانگ کے سہارے بس کے پچھلے دروازے ہی سے اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔

کنڈکٹر نے اُترنے میں اُسے مدد کی، اور اس کے ساتھ بیٹھے پسنجر نے اُس کا ٹرنک بس کے اندر سے گھسیٹ کر نیچے اُتارا اور پھر اُسے اُٹھا کر نیم کے پیڑ کے نیچے رکھ دیا۔

''دھنیہ واد چودھری صاحب۔'' وشال نے کہا۔

چودھری مسکراتا ہوا بس کے اندر داخل ہو گیا۔ کنڈکٹر نے وسل دی اور بس اسٹارٹ ہو گئی۔ وشال گھنی چھاؤں والے نیم کے پیڑ کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے اسے پہچان رہا ہو۔ اس پیڑ کو وہ بہت دِنوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔ جب وہ ابھی بچہ تھا یہ پیڑ جب بھی موجود تھا لیکن اس وقت اس کا تنا اتنا موٹا نہیں تھا اور اس کی شاخیں بھی اتنی زیادہ اور اتنی موٹی نہیں تھیں۔ اب تو نیم کا وہ پیڑ جو جوانی کی حدوں سے بھی آگے گزر گیا تھا اور سب کو گرمی کے دِنوں میں اپنی چھاؤں کا سہارا دیتا تھا۔ ادھر وشال تھا کہ وہ جوانی کی حدوں سے نکلتے ہی ایک دم ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ایک ایسا پیڑ تھا جس کے تنے کا ایک مضبوط حصہ جنگ نے بے رحمی سے کاٹ دیا تھا۔ اس کی شاخیں بھی کمزور ہو گئی تھیں اور اس کی چھاؤں بھی چھدری ہو گئی تھی۔ اس سمے جب اس کے سموچے خاندان کو اس کے سہارے کی ضرورت تھی، وہ عین اسی وقت اپنی تمام صلاحیتوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ایک سرسبز پیڑ کی جگہ اب وہ سوکھا ہوا ایک ٹھنڈ بن ہو چکا تھا۔

دھوپ نکل آئی تھی لیکن اس میں گرمی زیادہ نہیں تھی، اسے پیڑ کی چھاؤں میں بلکہ کچھ ٹھنڈ محسوس ہونے لگی۔ اس نے بیگ سے تولیہ نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا، اپنی ہلکی سبز رنگ کی قمیض اور پتلون پر جمی گرد جھاڑی۔ قمیض کی جیب سے چھوٹی سی کنگھی نکال کر بال ٹھیک کیے۔ رات بھر کے ذہنی تناؤ اور جسم کی

تھکاوٹ کا احساس اب ہونے لگا تھا۔ جب چوٹ لگتی ہے تو خون گرم ہوتا ہے، اس وقت درد کی شدت کا احساس نہیں ہوتا، کچھ وقت کے بعد جب خون اتنا گرم نہیں رہتا تو درد سارے جسم کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بس وہی نازک وقت آ گیا تھا وشال کے سامنے۔ اب ایسا ہی وقت تھا جب وہ اپنے آپ کو بری طرح نڈھال اور مضمحل محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت اگر اسے گرم گرم چائے مل جاتی جسے وہ اپنے مگ میں ڈلوا کر دھیرے دھیرے پیتا رہتا تو اسے بڑا سکھ ملتا۔ اس نے رگھو چاچا کی چائے کی دکان کی طرف نظریں اُٹھائیں، دکان بند تھی، رگھو چاچا ویسے بھی نشہ کرنے والا آدمی تھا۔ وہ رات کو تو دیر تک جاگ سکتا تھا، لیکن صبح سویرے جاگنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور پھر اتنی صبح اس کی دکان پر چائے پینے بھی کون آتا تھا اس کی دکاں تو اُس وقت اپنے پورے عروج پر ہوتی تھی جب نارنول اور مہندر گڑھ سے بسیں چرخی دادری بھوانی، ریواڑی اور روہتک اور دہلی کی طرف جاتی تھیں اور پھر ان ہی شہروں سے نارنول، مہندر گڑھ پلانی اور کوٹ پتلی کی طرف آتی تھیں۔ اس سمے تو رگھو چاچا بادشاہ ہوتا تھا۔ وشال سے اس کی بڑی دوستی تھی، وہ جب بھی چھٹی پر اپنے گاؤں آتا، رگھو چاچا اپنی گدی سے اُتر کر اُسے اپنی بانہوں میں لے لیتا اور اس کا سامان اُٹھوا کر دکاں پر لے آتا۔ اسے موڑھے پر بٹھاتا اور گرم گرم چائے اس کے اپنے مگ ہی میں پلواتا۔ پھر اُس سے کہتا کہ وہ گاؤں چلا جائے اس کا ساماں وہ خود ہی اس کے گھر پہنچا دے گا، اب سے پہلے وہ جتنی بار بھی چھٹی پر گھر آیا تھا وہ ایک بھرپور نوجوان تھا، ہنستا کھیلتا، قہقہے لگاتا اور رگھو چاچا سے چھیڑ چھاڑ کرتا نوجوان۔ وہ جب بھی آتا، رگھو چاچا کے لیے چھوٹا موٹا تحفہ ضرور لاتا۔ وہ آج بھی اس کے لیے فارن کے دو سگرٹ کے پیکٹ لایا تھا، رگھو چاچا کو فارن کے سگرٹوں کا بڑا شوق تھا، لیکن اس وقت رگھو چاچا موجود نہیں تھا۔۔۔ سگرٹوں کے پیکٹ تو وہ اسے کل وَل پہنچا دے گا لیکن اس وقت تو مسئلہ اس کا ٹرنک اور فوجی بیگ اُٹھا کر اُس کے گھر تک پہنچانے کا تھا۔ رگھو چاچا کی دکاں کھلی ہوتی تو وہ اپنا تمام سامان وہاں رکھ دیتا اور گاؤں تک جانے کی کوئی سبیل کرتا۔

وشال ایک بار پھر اپنے کالے رنگ کے ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ جس پر اس کا نام سفید پینٹ سے لکھا تھا۔ اور جس کے اندر وہ تمام سامان بند تھا جسے ایک رات پہلے وہ ٹرین کی برتھ پر پھیلا کر دیکھتا رہا تھا اور من ہی من خوش ہوتا رہا تھا۔

اب اسے شرتی کا خیال اپنی بھرپور شدت سے آ رہا تھا۔ اسے بڑی چنتا ہو رہی تھی، وہ اسے ملنے کو بری طرح سے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ شرتی کے لیے چوڑیاں، فارن کا صابن، پاؤڈر، بسکٹ لایا تھا اور اس کے لیے تین سوٹ بھی لایا تھا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ وہ کب گھر پہنچے اور اسے اپنی بانہوں میں لے کر

کہہ کہ وہ اس بار اُس کے لیے اتنی خوبصورت چیزیں لایا تھا کہ وہ انہیں دیکھ کر ایک دم خوش ہو جائے گی۔ اس بار تو وہ یہ بھی سوچ کر آیا تھا کہ شربتی کو اور امرو کو چرخی دادری لے جائے گا اور انہیں پکچر بھی دکھائے گا۔ اس بار تو وہ یہ بھی طے کر کے آیا تھا کہ امرو کے لیے کوئی لڑکی بھی دیکھے گا اور اس کی شادی کی بات بھی پکی کر دے گا۔ وہ اس کے لیے بھی تو بڑھیا کپڑے لایا تھا۔ وہ اپنی ماں سکھ ونتی کے لیے بھی بہت بڑھیا قسم کا سوٹ لے کر آیا تھا، اس بار تو اس کے من میں بڑے منصوبے تھے۔

وہ اپنے ٹرنک پر بیٹھا سگرٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں اُجلے اُجلے خوابوں کے مکمل ہوتے ہوئے خاکوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور بھول گیا تھا کہ اَب وہ ایک اپاہج انسان تھا اور کسی کے سہارے کے بغیر تو اَب وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ اب میڈیکل رپورٹ کے بعد شاید اسے ڈسچارج بھی کر دیا جائے۔ اور شاید اب اس کی کہیں پوسٹنگ بھی نہ ہو۔ اس کی اطلاع تو اسے چھٹی کے دوران ہی مل جائے گی۔ اس سے اسے ایک طرح کا سکون بھی تھا کہ وہ اپنے گاؤں ہی میں رہے گا اور اپنے بھائی امرو سے مل کر اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال کرے گا۔ اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرے گا اور بیمار شربتی کا اچھے سے اچھا علاج کروائے گا۔ ہاں اب وہ مانو سے نہیں مل سکے گا کبھی، جو ایک ایماندار اور حوصلے والا شخص تھا۔ جس کی ایمان دارانہ باتیں اسے بے حد پسند تھیں، اس لیے کہ وہ خود ایک ایماندار آدمی تھا۔ سگرٹ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی دھوئیں کے مرغولے بھی فضا میں گھل گئے۔ اور وشال کے خوابوں کے خاکے بھی مٹ گئے۔ اَب پھر وہ حقیقی دنیا میں آ گیا تھا جہاں سکھ کم تھا دُکھ زیادہ تھا۔ جہاں ناانصافی زیادہ تھی انصاف کم تھا۔ جہاں جھوٹ کی ماترا سچ کی ماترا سے کہیں زیادہ تھی، جہاں لوگ امن کے بارے میں کم اور جنگ کے بارے میں زیادہ سوچتے تھے۔

اب سڑک پر تھوڑی بہت آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ بھوانی سے مہندر گڑھ جانے والی دوسری بس ابھی ابھی پنیتا واس کے اڈے پر رکی تھی، صرف دو سواریاں اُتری تھیں۔ جنہیں وشال نہیں جانتا تھا۔ ان میں سے ایک مرد تھا دوسری عورت تھی۔ ٹرنک عورت نے اپنے سر پر اُٹھا رکھا تھا، اور ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ مرد نے اپنے کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ وشال جہاں بھی گیا تھا اس نے یہی دیکھا تھا کہ مرد کے بجائے زیادہ بوجھ عورت ہی اُٹھاتی تھی۔ جسمانی بھی اور دماغی بوجھ دونوں ہی۔ ہریانہ بھی تو اسی دنیا کا حصہ تھا، جہاں عورت کو دوسرے بلکہ کہیں کہیں تیسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ وہ سنسار سے الگ کیسے رہ سکتا تھا۔ بس سے ابھی اُترے دونوں مسافر گاؤں کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ وشال کے بہت بعد آ کر بھی اس سے پہلے چلے گئے تھے۔ وہ اپاہج ابھی تک اپنی جگہ سے نہیں ہل سکا تھا۔ اگر یہی عالم رہا تو جانے کتنی اور

بسیں اس کے سامنے سے گزر جائیں گی اور کوئی بھی اُسے اُس کے گھر تک نہیں پہنچا سکے گا۔ وہ اپنے کالے ٹرنک پر بیٹھا قیامت تک انتظار کرتا رہے گا۔

اور اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قیامت تو گزر بھی چکی تھی۔

وشال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اُسے لگا کہ اب وہ زیادہ دیر تک نیم کے پیڑ کے نیچے نہیں بیٹھ سکے گا۔ اُس نے اپنی قمیص کی آستین سے ہی اپنے آنسو پونچھے اور ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کاش رگھو چاچا ہی آجاتا اس وقت اب تو بسوں کا آنا جانا شروع ہو چکا تھا۔ وشال نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ گاؤں کے کھیتوں میں سرسوں کے پھول دھوپ کی سنہری کرنوں میں سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ کھیتوں میں اس وقت مانو اشرفیاں لٹ رہی تھیں۔

ایک بار پھر اُس نے سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ ایک تھری ویلر اس کے قریب آ کر رُک گیا تھا۔ اس میں بڑے بڑے پیکٹ لدے تھے، شاید یہ کسی دکاندار کا سامان تھا جسے تھری ویلر کا ڈرائیور کسی اگلے گاؤں میں لے جا رہا تھا۔

''پیتاواس جاؤ گے حوالدار؟'' تھری ویلر کے ڈرائیور نے اس سے پوچھا۔

''ہاں بھائی۔''

''چلو میں چھوڑ آتا ہوں، دس روپے دے دینا۔''

''دے دوں گا۔''

تھری ویلر کے ڈرائیور نے پیکٹوں کو ادھر اُدھر سرکا کر وشال کے بیٹھنے کی جگہ بنا دی۔ ٹرنک کو اُس نے اس طرح رکھا کہ اس کا اگلا حصہ تھری ویلر کے اندر تھا اور باقی باہر تھا۔

''ٹرنک کو پاؤں سے سنبھال لوں گا گرے گا نہیں۔'' ڈرائیور نے وشال کی تسلی کے لیے کہا۔

تھری ویلر کو اسٹارٹ کرنے سے پہلے ہی وشال نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھما دیا کہ تھری ویلر سے اُتر کر اُسے ذرا دیر بھی نہ رُکنا پڑے۔ وشال گاؤں کے ہرے بھرے کھیتوں پر نظریں جمائے خاموش بیٹھا رہا اور اوبڑ کھابڑ راستے اسے ہچکولے دیتے رہے اور اس کے خوابوں کی بنیادیں لرزتی رہیں۔

تھری ویلر گاؤں کے باہر پہنچا ہی تھا کہ وشال نے دیکھا کہ ایک ارتھی گاؤں کی حدوں سے باہر شمشان کی طرف جا رہی تھی۔ ارتھی کے ساتھ بہت بھیڑ تھی۔ وشال نے تھری ویلر رُکوا لیا۔ اتنے فاصلے سے

وہ گاؤں کے کسی بھی آدمی کو نہ پہچان سکا۔ وہ بڑی مشکل سے تھری ویلر سے اُتر کر او بڑ کھابڑ راستے پر کھڑا ہو گیا۔ اور فوجی رواج کے مطابق اُس نے ارتھی کی عزت کے لیے سر جھکا دیا۔ اور سیلوٹ کے لیے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا دیا۔ سنا یہ جانے کہ یہ کون اپنا [illegible] گھر چھوڑ کر سویرے سویرے ان اشرفیاں لٹاتے ہوئے کھیتوں میں چتا کی آگ میں جلنے کے لیے چلا آیا تھا۔

ہریانہ کے رواج کے مطابق ارتھی میں شامل ہر آدمی اپنے کندھے پر ایک بڑی سی لکڑی اُٹھائے ہوئے تھا۔ انہی لکڑیوں سے مرنے والے کی چتا بنے گی۔

تھری ویلر کا ڈرائیور بھی اپنی سیٹ سے اُتر کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنی مصنوعی ٹانگ کے سہارے کھڑے [illegible] کو دیکھ رہا تھا جس کا سر جھکا ہوا تھا اور سیلوٹ کے لیے اُٹھا دایاں ہاتھ اُس کے ماتھے کو چھو رہا تھا۔

کشمیری لال ذاکر

کورے تہمد کا درد

تقسیم ملک کے بعد جب وہ ڈیرہ غازی خاں کے موضع رامن سے نکل کر ریفیوجی کیمپ میں آیا تو اُسے لگا جیسے وہ جس دھرتی کو چھوڑ رہا تھا، اس میں اپنی زندگی بھی دفن کیے جا رہا تھا۔ اپنے گاؤں سے وہ نہیں جا رہا تھا بلکہ اُس کی لاش ایک ٹرک سے لد کر جا رہی تھی۔ اور پھر امیر چند مکڑ کی لاش پاکستان کی سرحد کو پار کر کے ہندوستان کی سرحد میں پہنچ گئی۔ اور پھر کچھ لوگوں نے مل کر اُس لاش کو اس ریفیوجی ٹرین میں ڈال دیا جو دہلی جا رہی تھی۔ وہ ہندوؤں کے اس آخری مختصر ڈبّے میں تھے جو آخری وقت تک اپنے گھروں اور اُن کی دیواروں اور اُن کے آنگنوں سے چمٹے رہے تھے اور اُنہیں جیسے کاٹ کر اپنی ان وابستگیوں سے الگ کیا گیا تھا۔ ورنہ اُس کے سبھی گھر والے کئی ہفتے پہلے اپنا گاؤں چھوڑ کر ہندوستان جا چکے تھے۔

جس صبح ریفیوجی ٹرین دہلی جنکشن پر پہنچی تو اُس کے ڈبوں سے سڑے ہوئے خون، پیشاب اور پاخانے کی ملی جلی سڑاند اور گندے کپڑوں اور جسموں پر جمے ہوئے پسینے اور تیل کے کوئلے کی بدبو نکل رہی تھی۔ امیر چند مکڑ جو دریائے سندھ کے کناروں کی تازہ ہوا اور کھلے میدانوں میں پروان چڑھا تھا، اس بدبو کی تاب نہ لا سکا اور پلیٹ فارم پر پاؤں دھرتے ہی اُسے بڑے زور کی قے ہوئی جیسے اس کے اندر بھی تعفّن سے بھرا ہوا کوئی ڈھیر سڑ رہا تھا جو اَب پورے زور سے باہر اُبل پڑا تھا۔ وہ دیر تک دہلی جنکشن کے اتنے بڑے اسٹیشن کو دیکھتا رہا۔ جہاں سینکڑوں کی تعداد میں پناہ گزیں پڑے تھے اور اس چھوٹے موٹے سامان کو سنبھال کر رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے جو وہ پاکستان سے بڑی مشکل سے بچا کر لا سکے تھے۔ امیر چند مکڑ کے پاس ایک قمیص اور ایک تہمد اور ایک پگڑی تھی۔ اور ایک انگوچھا تھا، جسے باندھ کر اُس نے امرتسر اسٹیشن پر اپنے تینوں کپڑے پانی میں سے نکال کر سکھائے تھے۔ اس کے پاس تو سنبھال کر رکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ یادوں کی ایک پوٹلی تھی جسے وہ اپنے دل کے نہاں خانے میں، سب کی آنکھوں سے بچا کر، ساتھ لے کر آیا تھا۔ اور اس رات ریلوے پلیٹ فارم پر اپنا انگوچھا بچھا کر جب وہ ڈھیر سارے پناہ گزینوں کے درمیاں ایک طرف ہو کر لیٹا، دیر تک یادوں کی پوٹلی کو اپنے سامنے کھول کر ہر یاد کو ٹٹولتا رہا۔ رہ رہ کر اُسے رحمتاں موچن کے نرم اور گدار جسم کی یاد آتی رہی تھی اور اس کے بوسوں کی لذت یاد آتی

رہی تھی جو پکے ہوئے باجرے کے کھیت کے عین درمیان اُسے ملی تھی۔ اور اُن آنسوؤں کے انگاروں سے اُس کے گال جلنے لگے تھے، جو رحماں کی آنکھوں سے بہے تھے۔ اُس رات جس کی صبح اُسے رحماں سے الگ کردے گی۔ رحماں موچن تھی تو کیا ہوا، وہ امیر چند مکڑ کے لیے بڑی خوب صورت اور نرم جوتیاں بناتی تھی اور اُنہیں اپنے ہاتھوں سے اُس کے پاؤں میں پہنا کر اُس کی طرف دیکھتی تو وہ بڑے پیار سے پوچھتا

''یہ جوتیاں ٹوٹ گئیں تو پھر کیا ہوگا رحماں؟''

''رحماں اپنے یار کے لیے اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا دے گی۔''

''سچ کہتی ہو؟''

''رحماں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔''

رحماں نے تو شاید جھوٹ نہیں بولا تھا، لیکن ان تمام لوگوں نے جھوٹ اور مکاری سے کام لیا تھا جو اپنے آپ کو سچ اور انصاف کے دعوے دار کہتے تھے۔ اُن میں کچھ مسلماں تھے، کچھ ہندو تھے، کچھ سکھ تھے، لیکن ان میں سے انساں کوئی نہیں تھا۔ وہ سب لیڈر تھے اور لیڈروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور ان بے مذہب لوگوں نے امیر چند مکڑ اور رحماں کو نہیں ملکہ سندھ، چناب اور جہلم اور ستلج اور بیاس کے پانیوں کو بھی الگ کر دیا تھا اور سورج کی روشنی کو ختم کر دیا تھا اور چاند کی چاندنی بانٹ ڈالی تھی اور ہوا اور شبنم اور دھوپ کو بھی تلوار کی تیز دھار سے لہولہان کر دیا تھا۔

اگلی صبح امیر چند مکڑ جب دہلی جنکشن کے دم گھونٹ دینے والے ماحول سے باہر نکلا تو اسٹیشن کے باہر اونچی بُرجی پر لگا کلاک سات بجا رہا تھا۔ اور باہر بھی وہی حوصلہ شکن منظر تھا جسے وہ اندر پلیٹ فارموں پر دیکھ کر آیا تھا۔ اس نے اپنے کرتے کی جیب کو ٹٹولا، اُس کے پاس پچیس روپے تھے اور وہ کچھ دن دہلی میں گزار سکتا تھا۔ اسے اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ جانے کی جلدی نہیں تھی، جن کے ساتھ وہ آیا تھا۔ وہ سب گوڑ گاوہ کے علاقے میں جانے والے تھے، کیوں کہ اُنہیں بتایا گیا تھا کہ ان کے گاؤں کے بہت سے لوگ وہیں گئے تھے۔ اسے کہیں بھی جانے کی جلدی نہیں تھی — جلدی ہوتی تو جب اُس کے بڑے بھائی اور اُس کے بچوں اور اُس کی ماں نے گاؤں چھوڑا تھا، وہ بھی چھوڑ دیتا لیکن اسے تو رحماں موچن کے کورے تہمد کے نفعے نے اپنے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ وہ کیسے آتا۔ امیر چند مکڑ دہلی جنکشن سے الگ نہ ہو سکا۔ اس نے ایک بار اپنے انگوچھے سے رحماں کی بنائی ہوئی جوتی کو پونچھا، راستے کی گرد اور بارش کے پانی نے اس کا رنگ خراب کر دیا تھا۔ اب ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ وہی نرم اور نفیس جوتی تھی، جسے رحماں موچن نے بنایا تھا اور اس پر سچے تلّے کی کڑھائی کی تھی اور نوک کے اوپر سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے

بھر نے لگائے تھے۔

بے شمار پناہ گزینوں کے آجانے سے دہلی جنکشن سے باہر والی سڑک پر جس کے ساتھ لگتے باغ کو پار کر کے، چاندنی چوک کا بازار آجاتا تھا اور باغ سے ملحقہ پبلک لائبریری تھی، بیسیوں ڈھابہ نما ہوٹل کھل گئے تھے۔ بانس کی سیڑھیاں لگا کر اور عمارتی تختوں کو جوڑ کر، یہ سب ہوٹل دو منزلہ بنا دیے گئے تھے۔ چارپائی اور بستر آٹھ آنے میں مل جاتے تھے اور ہوٹلوں سے سستا کھانا مل جاتا تھا۔ رفع حاجت کے لیے ان ہوٹلوں کے پیچھے، نالیوں کے کنارے پبلک لیٹرینز تھیں اور نہانے کے لیے اسٹیشن کے باہر، آمنے سامنے کئی پبلک نلکے تھے۔

امیر چند مکڑ نے سڑک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کے فاصلے کو ماپا۔ سبھی ہوٹلوں کو دیکھا جن کے باہر، اسی کی طرح لٹے پٹے لوگ چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے، یا وہیں بیٹھے بدذائقہ اور گھٹیا قسم کی چائے پی رہے تھے، جس کے بعد وہ ویسا ہی گھٹیا کھانا کھائیں گے اور ہوٹل کے مالک کو نقد پیسے چکائیں گے کیونکہ ان ہوٹلوں میں سے کسی بھی ہوٹل میں اُدھار نہیں چلتا تھا۔ یوں چلتے چلتے وہ ایک ہوٹل کے سامنے رُک گیا۔ ہوٹل کا مالک ایک اونچے قد اور تگڑے ڈیل ڈول کا آدمی تھا جس نے لٹھے کا تہبند پہن رکھا تھا اور اس کی قمیص اور لمبی لمبی مونچھیں اس پر خوب کھلتی تھیں۔ رحمتاں موچن کا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ لمحہ بھر کے لیے تو اسے لگا کہ رحمتاں کا باپ ہی اس کے سامنے کھڑا ہے۔ بلکہ وہ تو آگے بڑھ کر پوچھنے ہی والا تھا۔

''چاچا، رحمتاں کہاں ہے؟''

لیکن کوئی گاہک اس سے بات کرنے لگا اور امیر چند مکڑ کو معلوم ہوا کہ وہ رحمتاں کا باپ نہیں تھا، بلکہ ہوٹل چلانے والا ایک دُکاندار تھا، جیسا کہ اس کے اپنے گاؤں میں تھا جو کم بولتا تھا اور زیادہ دام لیتا تھا۔

''آؤ ملک جی چاہ پیو۔''

ہوٹل کے مالک نے اسے مخاطب کیا۔

امیر چند مکڑ اُس کے قریب گیا۔

''کتھوں آئے ہو؟''

''تونسہ شریف ضلع ''

''میرا وطن میانوالی ہے۔ میری گھر والی پنڈ وچ ای ماری گئی۔ میں نس آیا۔'' امیر چند مکڑ اس کی بات سن رہا تھا جس کے سامنے اس کی بیوی مر گئی تھی اور عین ممکن ہے اس کے سامنے اُس کی عزت بھی لوٹی گئی ہو اور وہ بے غیرت آدمی وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی خاطر جان پر نہیں کھیلا تھا۔ اور اُسے

لگا کہ اس میں اور اُس کے سامنے کھڑے اس پہلوان نما آدمی ہوٹل کے مالک میں ایک بہت بڑی مطابقت تھی۔ وہ اپنی بیوی چھوڑ کر یہاں آیا تھا اور امر چند مکڑ اپنی محبوبہ کو، دونوں ہی بزدل تھے۔ اس لیے دونوں کی ایک ہی برادری تھی۔ جیسے طاقتوروں کی ایک برادری ہوتی ہے، ویسے ہی کائروں اور ڈرپوکوں کی بھی ایک برادری ہے۔ اس میں کہیں مذہب اور ملت کا امتیاز نہیں۔ اس لیے وہ سامنے پڑی ایک سستی سی قسم کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر میں چائے پینے لگا۔

یہ ہندوستان کے دارالخلافہ میں اس کی پہلی صبح تھی۔ ایک دم بے مروّت، بے حس اور بیجان!

اس نے دہلی جنکشن کے سامنے، فٹ پاتھ پر بنے، اس ہوٹل کے سائے میں کئی دن گزار دیے۔ وہ صبح قریب کے ایک پارک ٹیپ پر نہالیتا، پھر ہلکا سا ناشتا کرتا اور دہلی جنکشنوں کے پلیٹ فارموں پر گھومتا رہتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ بھیڑ کے ان ریلوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ پھر وہ فٹ پاتھ پر ہی لوٹ آتا۔ کچھ دیر ہوٹل والے کا اُردو اخبار پڑھتا اور پھر کسی کھری چارپائی پر پڑ کر سو رہتا۔ شام کو اُٹھتا تو ایک چکر دوبارہ پلیٹ فارموں پر لگاتا اور پھر اسی طرح بیچی نظروں سے، اپنی کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش کرنے میں لگ جاتا۔

ایک صبح جب وہ نہا چکا اور تہمد کو اپنے اردگرد لپیٹ کر، انگوچھے سے گیلا جسم پونچھنے کے بعد قمیض پہننے لگا تو اس کی نظر جیب پر گئی، اس کی جیب خالی ہو گئی تھی۔ کسی نے اس کی جیب سے ساری رقم نکال لی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ یہی تو تمام پونجی تھی اس کی، جسے وہ ہر دَم اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں ڈھیروں آدمی ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ وہ کس سے پوچھتا، وہ اپنے ہوٹل لوٹ آیا، اور جب ہوٹل والے نے اسے ناشتہ کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

"کیوں کیا بات ہے امیر چند مکڑ ولد کھلندر رام، سکنہ رامن، ضلع ڈیرہ غازی خاں؟"

اُسے رُلائی آ گئی، اس وقت اُسے مذاق اچھا نہیں لگا۔ حالاں کہ اب ہوٹل والا ایک طرح سے اُس کا دوست بن چکا تھا۔

"کسی نے میری ساری رقم نکال لی۔"

ہوٹل والے نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"تم بھی کسی کی جیب کاٹ لو۔ سینکڑوں لوگ گھوم رہے ہیں یہاں۔"

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر ناشتہ کرو۔"

''میرے پاس پیسے نہیں۔''

''اُدھار رہا۔''

ہوٹل والے نے اس دن امیر چند مکڑ کو دس روپے دیے اور کہا کہ اب وہ گوڑ گانوہ کے علاقے میں چلا جائے اور اپنے بھائی کو تلاش کرے۔ جب کبھی وہ دوبارہ دہلی آئے تو اُس کی رقم لوٹا دے۔ اس دن کتنی ہی مدت کے بعد، امیر چند مکڑ کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ وہ شکر گزاری کے جذبے کے آنسو تھے، جو اُس کے دل پگھل جانے کے بعد اور خون کشید ہونے کے بعد اس کی آنکھوں سے بہے تھے۔ اس نے ان آنسوؤں کو اپنے تہمد کے کونے سے پونچھ ڈالا۔ ہوٹل والا کسی گاہک سے بات کرنے کے بہانے اس کے پاس سے اُٹھ گیا تھا۔

اس شام امیر چند مکڑ پوچھتا پوچھتا کرتا مانڈی کھیڑا گاؤں پہنچ گیا جہاں اُس کا بھائی اور اُس کے بچے، کچھ دن پہلے ٹرک میں بیٹھ کر آئے تھے۔ اور جب وہ اپنے بھائی سے لپٹ کر رویا تو اُسے لگا جیسے اُسے اس کی کھوئی ہوئی زندگی واپس مل گئی تھی۔ اس نے اپنی بھابھی کے پاؤں چھوئے، بچوں کو اپنے ساتھ چمٹایا اور دیر تک اُنہیں پیار کرتا رہا۔ ان کے علاقے کے کچھ اور خاندان بھی اس گاؤں میں آ گئے تھے۔ اس شام جب وہ اکیلا دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اکیلا گھومتا ہوا بہت آگے نکل گیا تو اُسے لگا جیسے رحماں موچن کی نازک جوتی کی چرمراہٹ، اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ کھیتوں سے چڑیوں کا ایک غول پاس سے اُڑ کر اپنے ننھے منّے پنکھ پھیلائے ایک طرف نکل گیا۔

مانڈی کھیڑا سے گئے ہوئے مسلمانوں کے گھروں اور کھیتوں پر اُن لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا، جو پاکستان سے ادھر آئے تھے۔ امیر چند مکڑ اور اُس کے بھائی نے ایک پکّا دو منزلہ مکان لے لیا تھا۔ چونکہ آس پاس کی پہاڑیوں سے بہت پتھر نکلتا تھا، اس لیے گاؤں کے سبھی مکانوں میں پتھر استعمال کیا گیا تھا اور سبھی گھر پکے تھے۔ جو کھیت اُنہیں ملے تھے ان کی مٹی میں بھی بہت پتھر نکلتے تھے۔ اور جس کنوئیں سے وہ پینے کا پانی بھرتے تھے، اُس کی تہ میں بھی بڑے بڑے پتھر تھے لیکن دھیرے دھیرے اُنہوں نے اس نئے ماحول سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ دودھ کے لیے اُنھوں نے ایک بھینس بھی خرید لی تھی۔ ایک جوڑی بیل بھی لے لیے تھے۔ گیہوں اور چنے کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی، اور فیروز پور جھرکا کی منڈی میں اپنے اناج سے اُنہیں اچھی رقم وصول ہو گئی تھی۔ یہ ان کے نئے کھیتوں کی پہلی فصل تھی۔

اس بیچ میں امیر چند مکڑ ایک بار دہلی گیا تھا اور دہلی جنکشن کے باہر بنے اس ہوٹل کے مالک سے بھی ملا تھا، جس کی سرپرستی میں اس نے وہاں کئی دن گزارے تھے۔ اس نے اپنے اُدھار کی رقم واپس کی تھی اور

اُس کے لیے ایک چھوٹی سی مٹکی میں، اپنے گھر میں اکٹھا ہوا گھی بھی لے گیا تھا۔

"تم بہت کھرے آدمی ہو امیر چند مکڑ ولد کھلندرا رام، ساکن 　　۔　　؟ اب تو تمہاری جیب سے پیسے نہیں نکال لیتا کوئی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر بیاہ کرلو۔ رور جیب خالی ملے گی۔"

"تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے؟"

"ہاں، اسی لیے میں جیب میں بہت کم پیسے لے کر گھر جاتا ہوں۔"

"باقی رقم کیا کرتے ہو؟"

"بینک میں جمع کرتا ہوں۔"

پھر امیر چند مکڑ نے اُسی ہوٹل سے کھانا کھایا اور ہوٹل والے نے اس سے کھانے کے دام نہ لیے اور پھر بہت دیر چاندنی چوک میں گھومتا رہا اور اپنی بھابھی اور اس کے بچوں کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں خریدتا رہا پھر وہیں، دہلی جنکشن سے باہر، بس اسٹینڈ سے، اس نے "میوات بس" والوں کی ایک بس پکڑی اور مانڈی کھیڑا واپس پہنچ گیا۔ جب اس نے چاندنی چوک سے خریدی ہوئی چیزیں اپنی بھابھی اور بھتیجی بھتیجوں کو دیں تو وہ سب نہال ہو گئے۔

"اپنے لیے کیا لائے ہے؟"

"کچھ نہیں لایا۔" اس نے بھابھی کے سوال کا جواب دیا۔

"تو ہم تمہیں ایک چیز پیش کریں گے۔" اس کی بھابھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر چند دنوں کے بعد اسے مکندو پیش کر دی گئی۔

مکندو اُنہیں کے علاقے سے آئے ہوئے ایک ریفیوجی دکاندار کی اَن پڑھ لڑکی تھی، جسے اکثر اس نے کنویں پر پانی بھرتے ہوئے دیکھا تھا، امیر چند مکڑ کی شادی مکندو سے ہو گئی تھی۔ پہلی رات جب اس نے مکندو سے مل کر ایک نئی زندگی چلانے کی شروعات کی تو اسے لگا کہ تھہ ڈھیلا تھا۔ اس میں کساؤ اور چپچپا پن نہیں تھا۔ مکندو بائی کے بوسوں میں باجرے کی پکی ہوئی فصل کا ذائقہ نہیں تھا۔ اور اس کے جسم میں دریائے سندھ کے کناروں پر پھیلی ریت کی گرمی نہیں تھی اور اس کے اندر وہ تندی بھی نہیں تھی، جو دریائے سندھ کی لہروں میں تھی۔ یہ تو سب رحمتاں موچن ہی کے پاس تھا۔ اس رات اسے رحمتاں کی بہت یاد آتی رہی۔ وہ اپنے پہلو میں مکندو بائی کو لٹائے پڑا رہا، لیکن پیار رات بھر، اُس نے رحمتاں موچن سے کیا، جس

نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے یار کے لیے اپنی کھال کی جوتی بنا کر دے سکتی ہے۔ اور وہ سو گیا اور جب اگلی صبح اٹھا تو اس کی بھابھی نے کہا۔

''تم نے بے چاری کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔''

''کیسے؟''

''اُسے جو اُدھر دالان میں بے سدھ پڑی ہے۔''

اس کی بھابھی کھلکھلا کر ہنسی اور اسے ایک بار پھر رحمان موچن کی یاد آ گئی۔

اور پھر دن اور مہینے اور برس گزرتے گئے۔

اب امیر چند مکڑ کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا لڑکا دسویں کر چکا تھا، چھوٹا آٹھویں میں تھا، دونوں لڑکیاں اسکول جاتی تھیں۔ اس کا بھائی بوڑھا ہو گیا تھا اور اس کی شگفتہ مزاج بھابھی بھی دمہ کی مریض ہو گئی تھیں۔ اس کے بڑے بھتیجے کی شادی ہو گئی تھی اور اس کے ہاں ایک لڑکا بھی تھا۔ ایک بھتیجی ریواڑی کے ایک گاؤں میں بیاہی گئی تھی۔ مکاں وہی تھا، جس میں چھ آدمیوں کے بجائے اب بارہ آدمی رہ رہے تھے۔ کھیت بھی وہی تھا۔ لیکن فصلوں سے اچھی آمدنی ہونے کی وجہ سے، اب انہوں نے کچھ اور کھیت بھی خرید لیے تھے۔ اب کچھ میواتی جو اپنا گاؤں چھوڑ کر نہیں گئے تھے ان کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ غرض کہ امیر چند مکڑ کا گھر کھاتا پیتا سمجھا جانے لگا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ مصروف ہو گیا تھا اور اس کی توجہ اس بات پر رہنے لگی تھی کہ اس کے کھیتوں میں زیادہ اناج کیسے اُگ سکتا تھا اور وہ فیروز پور جھرکا کی منڈی میں اسے مہنگے داموں پر کیسے بیچ سکتا تھا۔ اس نے ایک ٹریکٹر بھی لے لیا تھا، لیکن اس کے مس میں اب بھی وہی پرانی مٹی کی باس تھی، جس میں عشق اور محبت کا خمیر تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے کھیتوں میں کام کرنے والی کسی میواتن سے عارضی معاشقہ بھی کر لیتا تھا۔ اس کی بیوی مکندو بائی کو بھی اس بات کا علم تھا، لیکن وہ اس بات کو لے کر گھر میں جھگڑا کھڑا نہیں کرتی تھی۔

اس کے لڑکے پریم کے لیے کئی جگہوں سے رشتے آ رہے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ وہ پریم کی شادی کر کے اسے الگ کر دے۔ کیوں کہ اُس سے اس کی زیادہ پٹتی نہیں تھی۔ اس نے چھوٹی عمر میں سگریٹ بیڑی پینا شروع کر دیا تھا اور کبھی کبھی آنکھوں میں ڈورے ڈالنے کا پروگرام بھی کر لیتا تھا۔ مکندو بائی بھی چاہتی تھی کہ اس کے لڑکے کی شادی ہو جائے لیکن وہ اپنے خاوند کی اس تجویز سے متفق نہیں تھی کہ شادی کے بعد اسے الگ کر دیا جائے۔ آخر اس کے بڑے بھائی کا لڑکا بھی تو شادی کر کے اسی مکان میں رہ رہا تھا۔ امیر چند مکڑ اپنے بھائی کی جگہ ہوگا تو اپنے لڑکے کی شادی کے فوراً بعد اُسے الگ کر دیتا لیکن اس کا

بھائی بڑا صلح کن قسم کا آدمی تھا اور اس نے زندگی میں کبھی یہ محسوس نہ کیا تھا کہ زندہ رہنے کے لیے گھر اور بیوی بچوں کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ کئی اور چیروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے، آدمی کو زندہ رہنے کے لیے، چنانچہ اس کے بھائی نے اپنے لڑکے کو الگ نہ کیا، اور گھر میں اودھم مچتا تو وہ کھلی چھت پر چڑھ جاتا۔ اور کھاٹ بچھا کر سو جاتا، اس کے بھائی کو نیند بھی تو بہت آتی تھی، امیر چند مکڑ کو نیند بھی کم آتی تھی ہاور اس میں سمجھوتہ کر سکنے کی بھی کمی تھی۔ اور اس لیے وہ اپنے گھر کے کسے ہوئے ماحول سے ناخوش تھا۔ کساؤ ہی دیکھا ہے تو پھر کھیت میں کام کرنے والی کسی جوان عورت کے جسم میں دیکھو، گھر کے ماحول میں کیوں تلاش کرو اُسے۔

اور پھر امیر چند مکڑ نے اپنے لڑکے پریم کی شادی کر دی اور جس رات اس کے گھر میں بہو آئی، اور پریم کے لیے ایک الگ کمرہ وقف کرنا پڑا تو اُس کی چارپائی دالان میں ڈال دی گئی۔ اُس رات اُسے یوں لگا کہ جیسے وہ ابھی ابھی ٹرین سے اُترا تھا، جس نے اسے آج سے تیس برس پہلے، دہلی جنکشن کے پلیٹ فارم پر لا پھینکا تھا اور وہ اپنے اردگرد پھیلی بھیڑ کے درمیاں، اپنا انگوچھا بچھا کر لیٹ گیا تھا اور اپنے دل کے اہم پوشیدہ کونے سے، اپنی یادوں کی پوٹلی نکال کر، اسے انگوچھے پر اُلٹ دیا تھا اور باجرے کے پکے کھیت کی مہک اُس کے تمام اردگرد پھیل گئی تھی، جس میں رحمتاں موچن کے بوسوں کی تلخ لذت تھی۔ وہ رات بھر بے چینی سے کروٹیں لیتا رہا اور اپنے آس پاس سوئے ہوئے اپنے گھر کے لوگوں کو دیکھتا رہا، جو زندگی اور اس کے تقاضوں سے بے پیار مُردوں کی طرح خاموش پڑے تھے۔ اس کی جی میں آئی، وہ ایک بار مکندو بائی کو جھنجھوڑ کر جگا دے اور اسے بتائے کہ جس طرح آج اس کا لڑکا اور اس کی بہو اپنے بند کمرے میں جاگ رہے تھے۔ اسی طرح ایک رات وہ بھی جاگے تھے اور اُس سے اگلی صبح، اس کی بھابھی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''تم نے تو بے چاری کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔''

لیکن اس نے مکندو بائی کو نہیں جگایا۔ اسے سویا رہنے دیا۔ اور خود اپنے تہمد کو کس کر باندھ کر، اپنی چارپائی سے اُترا۔ اپنی نئی خریدی ہوئی دیسی جوتی پہنی، پھر گھڑے میں سے ٹھنڈا پانی پیا اور آہستہ سے سیڑھیاں اُتر کر اپنے گھر کی ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا۔ اور گاؤں سے باہر بھرت پور سے دہلی جانے والی سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ شاید اسے دہلی جانے والے کسی ٹرک میں جگہ مل جائے۔

اور جب وہ دہلی جنکشن کے باہر ٹرک سے اُترا اور سامنے سپاٹ فٹ پاتھ پر نظر ڈالی، تو صبح ہو رہی تھی۔ اب وہاں کوئی بھی ہوٹل نہیں تھا۔ سبھی ہوٹل اُٹھا دیئے گئے تھے۔ اب وہاں کوئی کھری چارپائی نہیں

تھی، جس پر کوئی پناہ گزیں خاموش لیٹا، آنکھیں بند کیے، اپنے ماضی کی تصویریں دیکھ رہا ہو۔ اب کوئی پناہ گیر بھی نہیں رہا تھا۔ سب نے اپنی اپنی زندگیاں شروع کر لی تھیں۔ ایک نسل مٹتی جا رہی تھی، دوسری نسل جواں ہو رہی تھی اور تیسری نسل کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ وہ اب ایک مٹتی ہوئی نسل کا نمائندہ تھا، جو سرد لمحوں کی راکھ میں بجھتی ہوئی چنگاریاں تلاش کر رہا تھا۔ امیر چند کھڑ کی عمر اب پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔

وہ تھکے قدموں سے چلتے چلتے، اس پبلک ٹیپ پر پہنچا، جہاں آج سے تیس سال پہلے، ایک صبح وہ نہانے آیا تھا اور اس کی جیب میں سے کسی نے تمام رقم نکال لی تھی۔ نل کا پانی بہے جا رہا تھا، کسی نے اسے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ فٹ پاتھ پر اب پناہ گیروں کی جگہ اپنے سروں کے نیچے ٹوکریاں رکھے پلّے دار اپنی کھلی آنکھوں سے وقت کی رفتار کو ماپنے میں مصروف تھے۔ امیر چند کھڑ نے نل سے پانی پیا، منہ اور آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے، چہرے کو کورے تہمد سے پونچھا اور پھر دور تک پھیلے ہوئے فٹ پاتھ کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے لگا کہ یادوں کی جس پوٹلی کو وہ پچھلے تیس سالوں سے دل کے اندر چھپائے ہوئے تھا، اب وہ مسک گئی تھی۔ اور کسی بھی لمحہ کوئی قیمتی یاد رمیں پر آ گرے گی، جیسے پھٹی ہوئی جیب سے، کوئی سکہ دھیرے سے نکل کر سڑک پر آ گرتا ہے۔ اس کا دایاں ہاتھ، غیر ارادی طور پر اس کے بائیں پہلو میں، دل کے قریب جم گیا، جیسے وہ اپنی مسکی ہوئی پوٹلی کو سنبھال رہا ہو۔

اسلم پرویز

اَدھورے شہر کی ادھوری کہانی

''میرا شہر ادھورا سا'' کشمیری لال ذاکر کا نیا ناول ہے۔ اس ناول میں شہر سے مراد چنڈی گڑھ ہے۔ جسے ناول نگار نے 'ادھورا سا' شہر کہا ہے۔ ناول نگار کشمیری لال ذاکر چاہے ایسا سوچتے ہوں یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج چنڈی گڑھ اَدھورا سا شہر نہیں ہے۔ آج کا چنڈی گڑھ سیاست کے نیلام گھر میں اس مظلوم عورت کی طرح کھڑا ہے جو اس انتظار میں ہے کہ اس کی آخری بولی کس خریدار کے نام چھٹتی ہے۔ یہ المیہ شاید اُس برلن شہر سے بھی بڑا ہے جس کے بیچوں بیچ کھینچی ہوئی دیوار اب تہہ کر کے رکھ دی گئی ہے۔ جس طرح کویت، میں جلتے ہوئے تیل کے کنووں اور اُن سے رِستے ہوئے خام تیل نے پوری دنیا کا اکالوجیکل توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے جس کے نتیجے میں ہی شاید بنگلہ دیش قیامت خیز سمندری طوفانوں کی زد میں ہے اور فلی پائنز کے آتش فشاں چھ سو برس کی نیند سے بیدار ہو کر لاوا اُگلنے لگے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح چنڈی گڑھ بھی دنیا کے دوسرے مکمل شہروں کی طرح بارود کی بو سے معطر اور بندوق کی گولیوں کی پاپ میوزک سے سرشار ہے۔

چنڈی گڑھ ضرور ایک اَدھورا سا شہر تھا—اب سے کچھ دنوں پہلے تک۔ شہر کسی ماڈل کی طرح بنا کر نہیں رکھے جاتے وہ زمین کی کوکھ سے خودرو پودوں کی طرح پھوٹتے ہیں۔ اور پھر تاریخ کے لمبے سفر کے بعد وہ زمین پر اپنے وجود کی مہر ثبت کرتے ہیں۔ فطری عمل کے تحت پیدا ہونے والے بچے اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی میں جو فرق ہو سکتا ہے وہی دلّی، لکھنؤ، کلکتہ وغیرہ کے مقابلہ میں چنڈی گڑھ یا اسلام آباد جیسے شہروں کی حیثیت ہے۔ چنڈی گڑھ اور اسلام آباد تو امریکہ کے اس نیو انگلینڈ سے بھی بہت پیچھے ہے جو انگلستان سے ہجرت کر کے جانے والے سفید نسل باشندوں کے ناسٹلجیا کی بھینی بھینی خوشبو میں بسا ہوا ہے، اس اعتبار سے چنڈی گڑھ تو ابتدا میں محض اینٹ اور گارے ہی کا شہر تھا۔

''میرا شہر اَدھورا سا'' میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ ایک چوتھائی صدی پہلے سے بھی زیادہ کی ہے۔ ہندوستان میں یہ لال بہادر شاستری کا زمانہ تھا۔ لال بہادر شاستری ایک سچے، ایماندار اور کھرے انسان تھے۔ لیکن نہرو کے بعد کا ہندوستان جو دن دیکھنے والا تھا اور اسی اعتبار سے آگے چل کر وقت کی کوکھ سے

کتنی پیچیدہ، ٹیڑھی اور بجٹل شخصیتیں پیدا ہوئے تھیں وہ لال بہادر شاستری نہیں تھے اور اسی لئے تاشقند معاہدے پر دستخط کرتے ہی اُنہوں نے پران تیاگ دیئے۔ نہرو کے بعد کون؟ کا سوال نہرو کی زندگی ہی میں اُٹھنا شروع ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود نہرو کے بعد بغیر کسی خاص اُتھل پتھل کے ہندوستان نے لال بہادر شاستری کو اپنا وزیراعظم مان لیا۔ لال بہادر شاستری میں وزیراعظم بننے کی اہلیت تو تھی لیکن وزیر اعظم بن کر جینے کی طاقت نہیں تھی۔ اس اعتبار سے شاید اُن کی شخصیت اَدھوری تھی ٹھیک اُس طرح جس طرح اُن کے زمانے میں چنڈی گڑھ ایک ادھورا سا شہر تھا۔

شہر نیا ہو یا پرانا کلکتہ کی طرح مکمل ہو یا خورجہ اور ہاتھرس کی طرح اَدھورا اس میں بسے تو انسان ہی ہیں اور پھر چنڈی گڑھ جیسا شہر جسے کسی بہت بڑی سرکاری کالونی کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہو، جہاں کے سارے مکانات مختلف ٹائپس میں بنے ہوئے ہوں اور ہر ٹائپ کے مکانات کا اپنا ایک جدا قبیلہ، ایک جدا طبقہ ہو تو اس شہر کی سماجیات تو یقیناً دلچسپ ہوگی۔ چنڈی گڑھ کی اس دلچسپ اور پیچیدہ حقیقت کا ناول نگار نے گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کے بارے میں سوچا اور اس کا دانشورانہ اظہار اُنہوں نے اپنے پیش لفظ میں کیا بھی ہے لیکن ناول بجائے خود پیش لفظ میں بیاں کی گئی تمام زیریں لہروں کو چھوتا ہوا نہیں گزرتا اس کا سبب یہ ہے کہ ناول کے پیش لفظ میں تو ۱۹۹۱ء کی حسیت بول رہی ہے اور ناول کی کہانی ۱۹۶۵ء کے آس پاس گھوم رہی ہے۔ ناول کے تانے بانے میں لال بہادر شاستری کا سا اوراک ہے اور ناول کے پیش لفظ میں راجیو گاندھی کے عہد کی وہ حشر سامانیاں ہیں جنہوں نے راجیو گاندھی کو بھی نہیں بخشا۔ ناول کے متن کا پیش لفظ کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہاں یہ سوال البتہ اُٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا خود مصنف کی جانب سے ناول کا کوئی پیش لفظ ضروری ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اب تک جو کچھ کہا وہ محض جملہ معترضہ تھا اور اصل بات اب شروع ہوگی یا اصل بات میں کہہ چکا اور اب صرف جملۂ معترضہ باقی ہے۔

کشمیری لال ذاکر ایک منجھے ہوئے اور تجربے کار فکشن رائٹر ہیں۔ ناول نگار کی انسانی رشتوں اور اُن کی جزئیات پر جتنی گہری نظر ہونی چاہیے وہ ان کے ہاں ہے۔ کوئی ناول نگار اپنے ناول میں جو فضا پیش کرتا ہے اگر اس کا قاری اس فضا میں آسانی کے ساتھ سانس نہ لے سکے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ناول نگار کا اس فضا کے ساتھ کوئی حقیقی رشتہ نہیں تھا۔ وہ فضا اس کی زندگی کے تجربے اور مشاہدے کا کوئی حصہ نہیں تھی۔ وہ محض ایک خیالی دنیا تھی جس کے بارے میں اس نے ناول کے نام پر داستاں طرازی کر کے رکھ دی۔ اس اعتبار سے ''میرا شہر اَدھورا سا'' ایک حقیقی تخلیق ہے۔ اس لئے اس کا قاری ناول کی

فضا میں کھل کر سانس لے سکتا ہے۔

کوئی تخلیق سو فی صدی نادر ہی نہیں ہوتی۔ دراصل مروجہ چیزوں کو ندرت خیال کے ساتھ برتنے ہی کا دوسرا نام تخلیقیت ہے۔ مثال کے طور پر پانچ کا ہندسہ صرف تین اور دو کی جمع نہیں یہ وہ چار اور ایک کی جمع بھی ہے وہ دو اور دو، اور ایک کی جمع بھی ہے، وہ دو اور ایک اور ایک اور ایک کی جمع بھی ہے، یہاں تک کہ وہ ایک اور ایک اور ایک اور ایک کی جمع بھی ہے۔

یہ بات تو کشمیری لال ذاکر جانیں کہ یہ ناول بجائے ہیرو کے ہیروئن کا ہے لیکن دنیا میں ہیروئنوں پر مادام بواری اور وومن آف روم جیسے جو ناول لکھے گئے ہیں اس قبیل میں ایسے تمام ناولوں کو رکھا جاسکتا ہے۔ مجھے تو یہ ناول دراصل پلاٹ کے نقطۂ نظر سے دلچسپ دکھائی دیتا ہے۔ فکشن کی تنقید میں ایسی کوئی اصطلاح نہ سہی لیکن شاید میں اپنی بات کو سمجھانے کے لئے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ناول کی اصل دلچسپی اس کے تقابلی یعنی Comparative پلاٹ میں ہے جس کے ایک جو کھٹے میں رَچنا ہے اور دوسرے میں سیما۔ لیکن یہ چوکھٹے کانکریٹ طور پر بالکل علیحدہ علیحدہ بھی نہیں، اس پلاٹ کے فریم کی درمیانی پنجر دونوں پلاٹوں کے درمیاں مشترک ہے جس میں رچنا اور سیما کو ایک ہی ساتھ مگر علیحدہ علیحدہ دیکھا جاسکتا ہے۔ رچنا، سیما کا آئیڈیل ہے مگر پیچ دار بات یہ ہے کہ سیما خود رچنا سے کہیں زیادہ جاندار اور بھرپور کردار ہے۔ یعنی اگر ناول کے Comparative Plot کی درمیانی پنجر ہم نکال پھینکیں تو سیما کے لئے اماں ہی اماں ہے لیکن رچنا کے لئے خطرات ہی خطرات۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ خود ناول نگار رچنا اور سیما کے بارے میں غیر جانب دار ہے یا اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کا رویہ روادارانہ ہے۔ لیکن ایک اعتبار سے اس ناول کا وی آئی پی کردار تو سیما ہی ہے۔ جب سیما ناول کے اُفق پر نمودار ہوتی ہے تو رَچنا اس کے استقبال کو وہاں پہلے سے موجود ہے۔ اور جب سیما ناول کے اس افق سے رخصت ہو رہی ہے تو بھی رچنا اُسے الوداع کہنے کو کھڑی ہے اور رچنا اور سیما کی اس آخری ملاقات میں، رَچنا کی زندگی کے وہ تمام اندوہناک حادثات جو اس پر سیما کے ساتھ اس آخری ملاقات سے کچھ ہی پہلے گزر چکے تھے، آؤٹ آف فوکس ہی نہیں بالکل آؤٹ آف فریم رہتے ہیں تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناول دو ہیروئنوں کا نہیں صرف، ایک ہی ہیروئن کا ہے، سیما کا۔

بلونت سنگھ

نیا عہد نامہ

(کشمیری لال ذاکر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'جب کشمیر جل رہا تھا' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں شامل تمام افسانوں کا پس منظر ہندو۔ مسلم فسادات تھے۔ خاص کر کشمیر کے فسادات۔ زیرِ نظر مضمون اس مجموعے کے تعارف کے بطور لکھا گیا تھا　　مدیر)

ہندوستان کے چند باہمت ترقی پسند نوجوان ادیبوں نے ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ جس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس میں پہلے پہل تخریبی عناصر بہت زیادہ نمایاں تھے۔ وہ بھی باغیانہ بیباکی کے ساتھ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک کے بارے دو۔ میں ہی اس کے خلاف خاصہ مضبوط محاذ قائم ہو گیا۔ حالانکہ جاننے والے بخوبی اندازہ لگا سکتے تھے کہ احتجاج اور بغاوت کے بادل چھٹنے کے بعد تو یہ پورا صحت مند طور پر چہار جانب پھیل جائے گا۔ لیکن وہ بادل چھٹنے بھی نہیں پائے تھے کہ ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی۔ اور سر میں ہند پر انساں کی کجروی اور بہمیت کا ایسا دردناک ڈرامہ کھیلا گیا کہ جس کی نظیر تاریخ دنیا کے اوراق میں شاید ہی مل سکے۔

ذاکر سنجیدہ طبع نوجواں ہیں۔ عام طور پر ان کی کہانیوں میں انسانی ذہن کی گہری اور گوناں گوں کیفیات کا تذکرہ ملتا ہے۔ انہیں علم انسانیت سے خاص شغف ہے اس لئے ان چیزوں کو کمال چابکدستی سے نبھاتے ہیں جن مسائل پر انہوں نے موجودہ کتاب میں قلم اٹھایا ہے وہ بظاہر ان کے بس کا روگ نظر نہیں آتا۔ لیکن ان کہانیوں کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ کس طرح ہنگامی موضوع حقیقی فن کار کے موئے قلم کی جنبش سے اچھوتی اور تابناک تخلیق بن سکتا ہے۔

مثال کے طور پر مجموعے کا افسانہ ''افق'' ہی لیجئے فسادات کی بات جتنے افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے بہت کم اس کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے خاندان کی کہانی ہے سیدھے سادے انداز میں کہانی کی پُر زور اٹھان قابل تعریف ہے۔ اور بالآخر انتہائی نقطہ جب میاں بیوی انساں کی بے حس فطرت اور پاگل پن کا شکار ہو کر اسپتال میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ منظر بجائے

خود بہت دردناک ہے۔ میاں بیوی کی خاموش نظریں آخری مرتبہ ملتی ہیں اور پھر ان پر ان نگاہوں میں صرف موت کی خاموشی، تھکن، ویرانی اور سوگواری تھے۔ اور چار پھٹی پھٹی آنکھیں ایک دوسرے پر جمی تھیں مایوس لڑکھڑاتی روتی بسورتی ہوئی انسانی زندگی کا اس سے بہتر منظر پیش نہیں کیا جاسکتا والدین کی موت کے بعد یتیم بچہ اپنے والدین کو دیکھ رہا تھا جنھوں نے اس کی زندگی سے اچانک اپنا خنک سایہ چھین کر اسے یتیمی کے تپتے ہوئے صحرا میں پھینک دیا تھا۔ اور اس کی معصوم شفاف آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں ایک اُفق لرز رہا تھا۔ ایک ایسا اُفق جو خونی کے داغوں، خنجر کی دھاروں اور آگ کے شعلوں سے روشن تھا۔

کوئی بتائے کہ آخر وہ کون سا ارفع مذہب تھا۔ وہ کون سا آسمانی اصول تھا۔ ایسا کون سا پاکیزہ سیاسی نظریہ تھا جس کے تحت ایک معصوم روح کو تنہائی کا اس قدر شدید احساس ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مشینی دور کے انسان کے ذہن کی کم فہمی اور اس کے دل کی بے بضاعتی اور مجبوری کو بیان کرنے میں ذاکر کو خاص ملکہ حاصل ہے۔

جہاں ''اُفق'' فنکار کی سادگی اور پُرکاری کا ایک دلکش نمونہ ہے اور جہاں مرکزی نقطۂ نظر اور شدت تاثیر کے لحاظ سے یہ کہانی ممتاز ہے وہاں ''جنم سے جیت تک'' ایک ایسا حسین و جمیل مرقع ہے جس میں درد و کسک اور نشاط مسرت عجب فنکارانہ دلربائی کے ساتھ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جیل، ہوا، مایوسی اور امید کے دلکش امتزاج سے یہ فن پارہ باقی افسانوں کے بغیر ایک خاص ہیئت رکھتا ہے۔ کشمیر کی وادی گیاہ وگل میں چلتے پھرتے معصوم انسانوں کی ضروریاتِ زندگی کی دوڑ میں ان کی تنگ ودوان کے بجھے بجھے دل، اُن کے خیالی رنگ محل اور پھر مذہبی جنون اور خون کے دریا میں ڈوب کر رفتہ رفتہ اُبھرتے ہوئے انسانوں کے اس کارواں کا جائزہ لینے میں ذاکر نے حیرت انگیز ذکاوتِ حس اور فسوں کاری کا ثبوت دیا ہے۔

گویا ایک حساس دل کی درد انگیز چیخ ہے۔ سر زمین کشمیر کی گود میں پلا ہوا ایک نوجوان جس نے مادرِ وطن سے بڑی شدت کی محبت کی ہے۔ جس نے اس خطۂ زمین کے کھیتوں میں کسان کے گاڑھے پسینے کو جذب ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ جسں نے اس رنگین اور پُر بہار وادی میں بھوک کے بلکتے ہوئے بچوں اور ضرورت احتیاج کے ہاتھوں مجبور انسانوں کے دُکھتے ہوئے دلوں کا جائزہ لیا ہے اور جس نے سرمایہ داروں اور مذہب کے اجارہ داروں کی ریشہ دوانیوں کے باعث لکھوکھا انسانوں کو نڈھال اور لاچار ہو کر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔

'آج کی رات' تاریخ ہندوستان کے اس تاریک ترین اور مہیب دور کا ایک ورق ہے جسے مشکل ہی سے بھلایا جا سکتا ہے اپنی دھرتی ماتا کی خاطر جان کی بازی لگا دینے والا ایک نوجوان اپنی محبوبہ کو ایک تاریک رات کی کیفیت لکھتا ہے۔ ایک دوسرے سے کالے کوسوں دور دو دل کس طرح موت اور بربادی سے بھی ہوئی فضا میں بھی ایک ہی تال پر دھڑکتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سورج کی روشنی شاید اب کبھی زمین تک پہنچے گی ہی نہیں۔ اور پھر 'آج کی رات' ہمارے ملک کے لئے کتنی اہم رات ہے۔ اس رات کے اندھیرے میں ہمارا مستقبل سانس لے رہا ہے۔ کیا پہلے کبھی محبت کے متوالوں کو اس قسم کے حالات پیش آئے تھے؟ شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسی پنوں میں کسی نے بھی ایسی گھٹی گھٹی فضا میں اکھڑے اکھڑے سانس لئے تھے۔ اور پھر افسانے کے اختتام پر یاس و حسرت کی بے پناہ تاریکی میں موہوم امید کی ٹمٹماتی ہوئی آنے والی پربھات جو شاید پُر سکون ہو۔ اور جس میں تمہیں کسی ایسے زخمی کے سرہانے نہ بیٹھنا پڑے جو تمہیں میرے متعلق سوچنے پر اکسائے۔

تمثیلچے اگر چہ خوب ہیں لیکن برجستہ مکالموں کے بغیر چیزیں نبھتی نہیں۔ اس لئے کتابی زبان کا جاننا کافی نہیں ہے۔ بلکہ روزمرہ پر عبور لازمی ہے۔ افسانوں کے مقابلے میں تمثیلچے قدرے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر ذاکر کا نقطۂ نظر وہی ہے جو ہندو یونین کے ایک ترقی پسند ادیب کا ہو سکتا ہے اور ہونا بھی یہی چاہئے۔ لیکن جو نتائج پیش کئے گئے ہیں وہ کسی خاص مذہب، فرقے یا جماعت کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ ان فسادات میں مظلوم نہ مسلمان تھے نہ ہندو نہ سکھ۔ اگر کوئی مظلوم تھا تو وہ تھی انسانیت۔

ذاکر نے ہمیں ایک مرتبہ پھر دعوت عمل دی ہے آج پھر ہم اپنے عہد کو تازہ کر سکتے ہیں کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی نیکی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے ہر فرد کو پیٹ بھرنے کے لئے اناج، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور دھوپ بارش سے بچنے کے لئے اس کے سر پر آسمان کے علاوہ کوئی چھت بھی مہیا ہونی چاہئے۔ ہم یک زبان اعلان کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی بلند ترین مذہب، اعلیٰ ترین سیاسی اصول، پاکیزہ ترین سیاسی نظریہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی خاطر زندہ بچوں کو دروازوں کے ساتھ میخوں سے جڑ دیا جائے، یا معصوم دوشیزاؤں کی نوخیز چھاتیوں کو کاٹ کر قہقہے لگائے جائیں۔ مردوں کے سامنے ان کی پردہ نشین عفت مآب عورتوں کی عصمت دری کی جائے۔ ہری بھری لہلہاتی کھیتیوں کو پھونک کر تالیاں بجائی جائیں۔ اگر ایسا کوئی اصول، کوئی مذہب، کوئی نظریہ معرض وجود میں آچکا ہے تو ہم اس سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں اور اس پر نفرین بھیجتے ہیں۔

("فن و شخصیت" کے کشمیری لال نمبر سے اقتباسات دہلی، دسمبر ۱۹۴۸ء)

جوگندر پال

ذاکر صاحب

کشمیر لال ذاکر سالہا سال پہلے اپنے ادبی سفر پر نکلے تھے اور چونکہ اپنی منزل اُن کے ذہن میں بڑے واضح خطوط میں منقش تھی اس لئے وہ نہایت وثوق اور وقار سے اتنے سہج سہج چلتے رہے کہ ایک مدت تک نظروں سے اوجھل نہ ہوئے، اور پھر جب اُن کے اوجھل ہونے کا احساس ہونے لگا تو وہ اپنی دُھن میں مدستور سہج سہج اپنی منزل سے بھی بہت آگے جا پہنچے تھے اور شاید پریشاں سے ہونے لگے تھے کہ دن ڈھل رہا ہے مگر منزل آنے میں نہیں آتی۔

نامعلوم وہ کب تک اپنی پریشانی میں منزل کی تلاش میں منزل سے آگے ہی بھٹکتے رہے مگر اس اثنا میں یہ ہوا کہ جو لوگ اُن کی منزل پر اُن کے استقبال کے لیے پھولوں کا ہار لئے کھڑے تھے وہ بھی فکر مند ہونے لگے کہ آنحضرت ابھی تک کیوں نہیں پہنچے۔ آخر وہ انہیں ڈھونڈنے کے لئے نکل پڑے چند پیچھے کے جانب مگر چند اور، حور یادہ عقلمند تھے، آگے کی جانب، اور یوں وہ ڈھونڈنے میں آئے اور اسی طرح جو ہار لوگوں کے ہاتھوں میں سوکھ رہے تھے وہ کشمیری لال ذاکر کے گلے میں سج دھج کر پھر ہرے بھرے دکھنے لگے۔

میں فقیر حقیر بھی کشمیر لال ذاکر کے دریہ چاہنے والوں میں سے ہوں، میرے پاس کوئی گلدستہ ہے نہ ہار، بس اک اپنی چاہ ہے۔ سو اسے ہی اُن کے گلے میں لپیٹنے کے لئے اپنی بساط سے بھی اتنی دور آں پہنچا ہوں، اس اُمید سے، کہ ہار تو بالآخر مرجھا جائیں گے، پھر ایک میری چاہ کی خوشبو سے ہی اُن کی خوشیوں کا اسباب ہوگا اور پھر ہم دونوں رات بھر ذاکر صاحب کی کہانیوں پر کان دھرے صبح کر دیں گے۔

میں نے اُن کی بیشتر کہانیاں پہلے ہی سن رکھی ہیں، مگر وہ روز مرہ کے معمولی واقعات کے مانند ہی اتنی غیر معمولی ہیں کہ جب جب پیش آئیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار ہی پیش آ رہی ہیں اور اس مانند ہم غیر محسوس طور پر بڑے ہوتے جا رہے ہیں اور ایک ہی رات میں بڑے ہو ہو کر بوڑھے ہو لئے ہیں اور صبح کیا ہوئی ہے ہم نے گویا اپنی ساری زندگی جی لی ہے۔

آیئے، ذاکر صاحب، سورج نکل آیا ہے—— آیئے، اب لمبی تان لیں—— کہانیاں جاگ رہی ہیں؟—— تو کیا ہوا؟—— آیئے، آپ کی ان بیدار کہانیوں کو خوابیدگی کے اُجالے میں جی لیں گے——!

خلیق انجم

ہمہ جہت شخصیت

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے مگر میں اُن کے ادبی مرتبے کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء میں اُن کے بہت سے ناول پڑھے تھے۔ لیکن جب میں تحقیق کے میدان میں آ گیا تو مجھے فکشن پڑھنے کے شوق کو خیر آباد کہنا پڑا۔ کئی سال پہلے میں چنڈی گڑھ گیا ہوا تھا، جناب وشوناتھ طاؤس کے ساتھ میرا قیام تھا۔ چنڈی گڑھ میں میری آمد پر ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ذاکر صاحب سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی۔ ذاکر نے شام کو مجھے کھانے کی دعوت دی جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔ میں سات بجے ان کے گھر پہنچ گیا، بارہ بجے تک اُن سے بے شمار موضوعات پر گفتگو کی۔ اس رات پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کیسے ذہین، حساس اور باشعور اور معقول انساں ہیں۔ اسی موقع پر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے صرف اُردو ادب یا محض ادب کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ مختلف انسانی اور سماجی علوم پر بھی اُن کی گہری نظر ہے۔

ذاکر صاحب صرف ناول نگار یا افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ادب کی کئی اصناف پر اُنہیں قدرت حاصل ہے۔ تخلیقی فنکار عام طور سے فن میں ایسا گم ہوتا ہے کہ اُس مادّی دنیا کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ لیکن جیسا کہ ذاکر صاحب کے سوانحی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف فن میں صفِ اوّل کے اساں ہیں بلکہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں بھی انہوں نے غیر معمولی ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے منتظم ہیں۔ اگرچہ ۱۹۷۷ء میں سرکاری ملازمت سے سکدوش ہو چکے تھے۔ لیکن سبکدوشی سے لے کر آج تک مختلف عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ ہریانہ میں اُردو کا چلن بہت کم ہے اس کے باوجود ہریانہ اُردو اکادمی کی کارکردگی کے اعتبار سے ہندوستاں کی بہترین اکیڈمیوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہریانہ اکیڈمی کی مثال ایک بنجر زمین میں سرسبز وشاداب درخت کی ہے۔ اس اکیڈمی نے کئی ایسے سیمینار منعقد کئے ہیں جو تمام علمی اور ادبی تنظیموں کے لئے قابلِ تقلید ہیں۔ ہریانہ اُردو اکادمی اتنی فعّال ہے کہ ہریانہ کی دوسری زبانوں کی اکیڈمیاں نہ صرف حسد کرتی ہیں بلکہ اسے نقصان کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔

ذاکر صاحب ایک طرف تو اکیڈمی کے ذریعے اُردو کی بقا، ترقی اور فروغ کے لئے جدوجہد کرتے

ہیں اور دوسری طرف اپنے دشمنوں سے انتہائی کامیابی کے ساتھ نبرد آزما رہتے ہیں۔ اُن کی عمر کے تقریباً تمام ادیبوں کی قلم کی سیاہی سوکھ چکی ہے، لیکن ذاکر صاحب اپنے فرائضِ منصبی کی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود آج بھی تخلیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ تقریباً ۹۰ سال کے ہو گئے ہیں، لیکن اُن کی فکر، احساس اور جذبہ آج بھی جوان ہے۔۔

ذاکر صاحب سے جب ہریانہ اکیڈمی کے سکریٹری مقرر ہوئے تو میں اکیڈمی کا ممبر تھا۔ اس لئے اکیڈمی کی مختلف میٹنگوں اور سیمیناروں میں اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یہ ملاقاتیں رسمی ہوتی تھیں۔ ذاکر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ۱۹۹۰ء میں ملا۔ وہ اس طرح کہ ستمبر ۱۹۹۰ء میں مرکزی حکومت نے علی سردار جعفری صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا جائزہ لینا تھا۔ اس سلسلے میں چار سب کمیٹیاں بنائی گئیں اور ذاکر صاحب دو کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ ان کمیٹیوں کا مقصد مختلف ریاستوں میں جا کر یہ معلوم کرنا تھا کہ ریاستوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر کہاں تک عمل کیا ہے۔ دو سب کمیٹیوں کے رکن ہونے کی وجہ سے ہم نے کئی شہروں کا دورہ کیا۔ میری خوش نصیبی ہے کہ ان موقعوں پر مجھے ذاکر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ لگ بھگ ایک مہینے تک رات دن ساتھ رہے جس کی وجہ سے مجھے ذاکر صاحب کو اندر تک جھانک کر دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اس کی شخصیت کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ انتہائی ذہین اور معاملہ فہم ہیں۔ اپنے دوستوں کے لئے بہت مخلص ہیں۔ خود اپنے لئے کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کرتے، لیکن دوسروں کی خدمت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ دنیا کے اہم ترین معاملات میں وہ انتہائی عالمانہ رائے رکھتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست پر اُن کی گہری نظر ہے۔ ایک ماہرِ سیاسیات کی طرح وہ سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ بہت دور اندیش ہیں، معاملات کی تہہ تک بہت جلد اُن کی نظر پہنچ جاتی ہے۔ اس سب کے باوجود وہ بہت سیدھے سادے، بھولے اور معصوم انساں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معاملات میں انہیں آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ صرف اُن کی شرافتِ نفس ہے۔ وہ ہر آدمی پر آسانی سے بھروسہ کر لیتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کا سب سے زیادہ شاندار اور جگمگاتا ہوا پہلو اُن کا سیکولر رویہ ہے اور انساں دوستی ہے۔ مجھے ان کے ساتھ کافی دن تک رہنے کا موقع ملا لیکن میں نے کبھی اُن کے منہ سے فرقہ پرستی کی کوئی بات نہیں سنی۔ اُس کے تخلیقی فن میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو پوری تابناکی کے ساتھ اُجاگر ہوا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ہر مصنف کی ایک حیثیت بن جاتی ہے وہ ادب کے کسی بھی میدان میں کام کرے

لیکن اس کی شناخت اس حیثیت سے ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کے ذہن میں بن چکی ہوتی ہے اُردو ادب میں ذاکر صاحب کی شناخت ایک فکشن رائٹر کی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ذاکر صاحب کا شمار اُردو کے ممتاز ترین ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذاکر صاحب نے افسانوں اور ناولوں کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کے جو پیش لفظ لکھے ہیں وہ اُردو نثر کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ذاکر صاحب نے اعلیٰ درجے کے ڈرامے لکھے ہیں، ایسے ڈرامے بھی جو اسٹیج کیے گئے ہیں اور ایسے بھی جنہیں ریڈیو سے نشر کیا گیا ہے۔

یہاں میں اُن کے ایک ڈرامے کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی پورے ہندوستان میں شہرت رہی ہے۔ یہ ڈرامہ ہے ''کرماں والی''۔ یہ دراصل ناول ہے جسے نیشنل اسکول آف ڈرامہ کی فرمائش پر ذاکر صاحب نے ڈرامہ کا روپ دیا ہے۔ یہ، ناول یا ڈرامہ تقسیم کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ ہندوستان کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں نثر نگاروں اور شاعروں نے تقسیم کو موضوع بنایا ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ گو اس موضوع پر سینکڑوں ناول، ہزاروں کہانیاں اور نظمیں لکھی گئیں ہیں اور نثر نگاروں اور شاعروں نے تقسیم کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے۔ لیکن ایک خاص نفسیاتی موضوع تھا جس پر غالباً ذاکر صاحب کے علاوہ کسی اور نے نہیں لکھا۔ اس ڈرامے کا موضوع وہ درد، کرب اور احساسِ محرومی ہے جو اُن لوگوں کا مقدر تھا جو پاکستان چلے گئے لیکن اُن کے کچھ عزیز ترین رشتہ دار ہندوستان میں رہ گئے اور اسی طرح کچھ لوگ پاکستان سے ہندوستان آ گئے اور اُن کے بعض عزیز بلکہ جگر کے ٹکڑے پاکستان ہی میں رہ گئے۔ بقول ذاکر صاحب

> ''۱۹۴۷ء کی جونسل چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی اسے محرومی اور جدائی کا جو احساس ہوا، اُس میں ایک تیکھا درد، انوکھی کسک اور دم گھونٹ دینے والی تلخی تھی۔ یہ تلخی سرحد کے دونوں پار صف باندھے کھڑے اُن لوگوں کے دلوں میں رچ رہی تھی جو اپنی آنکھوں میں انتظار کے چراغ جلائے ایک ایسی صبح کے منتظر تھے جب اُن کے عزیز دوست، رشتہ دار، محبوب بنا کسی رکاوٹ کے اُن کے قریب آ کر اُن سے گلے ملیں گے اور خوشی کے بھرپور احساس سے نکلے آنسوؤں سے وہ خلیج بھر جائے گی جو اَب تک اُن کے درمیان پھیلی تھی۔''

''کرماں والی'' ایک ایسی ماں کی داستان ہے جو اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان چلی گئی تھی اور اُس کا بیٹا ہندوستان میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ ماں کے دل میں اپنے بیٹے کو کھونے کا درد تھا۔ طویل عرصہ گزرنے کے

باوجود وہ اپنے بیٹے کو فراموش نہیں کر سکی۔ اس کا ذہن ہمیشہ اپنے بیٹے کو تلاش کرتا رہا۔ ذاکر صاحب نے بڑے ماہرانہ انداز میں اُس عورت کے درد، کرب اور نفسیاتی اُلجھنوں کو پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے کو نیشنل اسکول آف ڈرامہ نے اسٹیج کیا ہے۔ یہ ڈرامہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مسلسل دکھایا جا رہا ہے۔

دراصل ذاکر صاحب صرف ناول نگار یا افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ وہ ادب کے مختلف میدانوں کے مرد ہیں۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں لیکن مشاعروں سے گریز کرتے ہیں اور رسالوں میں اپنا کلام چھپوانا پسند نہیں کرتے، اس لئے اُنہیں شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل نہیں ہو سکی۔

ذاکر صاحب بہت اچھے خاکہ نگار ہیں، اُنھوں نے خاصی تعداد میں خاکے لکھے ہیں۔ اس فن میں اُن کی خوبی یہ ہے کہ وہ مختصر سے الفاظ میں انسان کی پوری تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ ایسی تصویر جو ہمیشہ کے لئے دل و دماغ پر نقش ہو جاتی ہے۔ ذاکر صاحب کا ایک میداں اور ہے۔ مَیں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس میداں میں اں کی خدمات اتنی ہی اہم ہیں جتنی فکشن کے میدان میں اور وہ میدان ہے ادبی صحافت۔

ذاکر صاحب نے ادبی زندگی کے آغاز میں ''سویرا'' اور ''فردوس'' ناموں سے شائع ہونے والے رسالوں کی ادارت کی۔ جس زمانے میں اُن کی ادبی شخصیت پختہ ہو چکی تھی، انہوں نے ہریانہ اور پنجاب سے شائع ہونے والے ''تعمیر ہریانہ'' اور ''پاسبان'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ اور اب پچھلے کئی برسوں سے وہ ہریانہ اکیڈمی کے رسالے ''جمناتٹ'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

پچھلے چند برسوں میں ایڈس کی خوفناک بیماری دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ذاکر صاحب طویل عرصے سے ایڈس کی اس خوفناک بیماری کے بارے میں ہندوستاں اور ہندوستاں سے باہر کے ملکوں سے معلومات جمع کرتے رہے ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ دو سال کی محنت، جانفشانی سے ذاکر صاحب نے اس موضوع پر میٹریل اکٹھا کیا اور ''آخری ادھیائے'' کے نام سے ایک ناول لکھا جو ہندوستاں کے ایک بہت ہی ممتاز انگریزی کے پبلشر ''پینگوئن'' نے شائع کیا ہے۔ اس ناول میں، ایڈس سے مرنے والے اُن والدین کے بچوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جو اپنے بچوں کو اس دنیا کی مصیبتوں سے جوجھنے کے لئے تنہا، مجبور، بے حال اور بے بس یتیم سا کر چھوڑ جاتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ ذاکر صاحب اُردو کے ایسے صفِ اوّل کے ممتاز فکشن رائٹر ہیں جنھوں نے پچھلے تیس چالیس برسوں میں اپنے فکشن سے انسانی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

☆☆☆

رتن سنگھ

ذاکر کی کہانی

پہاڑیوں اور دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوئے ندی کے بہاؤ کی روانی دیدنی ہوتی ہے۔ اس کا پانی بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتا ہے، تو کبھی ان کے اوپر سے اور کبھی ان کے نیچے سے راستہ بناتا ہوا تیزی سے آگے بڑھتا ہے اور اونچی چٹانوں سے نیچے گہرائیوں میں گر کر پھر بلندیوں کی طرف پہلے سے دُگنی رفتار سے دوڑ پڑتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے ندی کے پانی کا جوش و خروش سنگیت بن کر پہاڑی وادیوں میں اس طرح گونجتا ہے جیسے وہ ماحول کے ذرّے ذرّے پر اپنی قوت کا اظہار کر رہا ہو لیکن پھر ندی سلجھے ہوئے عقلمند انسان کی طرح سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ اب اس کے پانیوں کی لہریں جب چلتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہزاروں لاکھوں رتکیاں پاؤں میں گھنگھرو باندھے شاستریہ سنگیت کی لے، تال اور سُر کا پورا دھیان رکھتے ہوئے قل قل کرتی بڑے نپے تلے قدموں سے چل رہی ہوں۔

کشمیری لال ذاکر کے کہانی کار کا سفر بھی کچھ ایسا ہوا ہے جو کشمیر کے علاقوں سے شور مچاتا ہوا نکلا اور رندگی کے میدانی علاقوں میں پہنچ کر اب اپنا سفر بڑی خاموشی سے طے کر رہا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کا مزاج بچپن ہی سے باغیانہ ہے۔ ریاست پونچھ جہاں ان کا جنم ہوا، جہاں ان کا بچپن گزرا، وہاں آزادی کے دَور سے پہلے مجرموں کو کوڑے مارنے کا رواج تھا۔ اور چونکہ کشمیری لال ذاکر نے معصوم لوگوں کو کوڑے پڑنے پر بلکتے اور تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس لئے ان دردناک واقعات کے تصور سے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں۔

یہ ارسٹوکریٹ باپ کے بیٹے تھے۔ بچپن میں انگریز بچوں کے ساتھ انہیں پڑھنے لکھنے اور اُٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا۔ اس رمانے میں جب لوگ حکمران انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ڈالیاں پیش کرنے آتے تھے تو بالکل لاشعوری طور پر انہیں سماج میں خاص اور عام آدمی کے بیچ کے فاصلے کا احساس ہو گیا تھا۔ اور یہ احساس درد کی ٹیس بن کر اُن کی کہانی میں موہن جوداڑو کی ایک لڑکی میں اُبھرتا ہے۔

"لیلا دھر نے بتایا کہ گاؤں کے درمیان ایک دیوار تھی جو عوام اور خواص کے گھروں کو تقسیم کرتی

تھی۔"

اور روپا سوچتی ہے، "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ کے اس زمانے میں بھی عوام و خواص کے درمیاں اتنا ہی فاصلہ تھی جتنا اب ہے۔"

لیلا دھر اور اُس کی آئی ایس آفیسر کے درمیان آج بھی وہی فاصلہ موجود ہے جو انسانی تاریخ کے آغاز سے شروع ہو کر موہن جوداڑو کی اُجڑی ہوئی بستیوں سے ہوتا ہوا ہمارے دور تک پہنچتا ہے۔ ان راستوں پر چلتے ہوئے انسانی زندگی کو لہولہان ہوتے دیکھ کر کشمیری لال ذاکر یہ سپنا دیکھنے لگتا ہے کہ اگر خواص و عام کے درمیاں یہ دوری کی دیوار مٹ جائے تو زندگی کے قدموں میں سکھوں کے پھول بچھ جائیں۔

کشمیری لال ذاکر کی ایک اور خوبصورت کہانی ہے "ڈری ہوئی لڑکی" یہ کہانی پڑھتے پڑھتے قاری کو جب یہ احساس ہوتا ہے کہ اس لڑکی کا ڈر اُس کا اپنا ڈر نہیں ہے، بلکہ یہ ڈر اُسے اس کی ماں سے ورثے میں ملا ہے، جو ملک کی تقسیم کے وقت درندگی کا شکار ہوگئی تھی تو دل میں خیال جاگتا ہے کہ کشمیری لال ذاکر منٹو کی 'کھول دو' کی آگے کی کہانی لکھ رہے ہیں۔ کسی ایک آدمی کا درد جب ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو جاتا ہے تو اُسے ایک تسلسل مل جاتا ہے اور دردمند کہانی کار جب پورے خلوص سے اُس درد کے تسلسل کی کہانی لکھتا ہے تو اس کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ، ہر حرف، احتجاج کا حرف بن جاتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کی کہانیوں کو ذرا درمیاں سے پڑھا جائے تو قاری جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ ان کے ہاں نہ ترقی پسندوں کی سی گھن گرج ہے اور نہ فن برائے فن میں یقین رکھنے والوں کی سی اوپری چمک دمک۔ اُن کا فن نہ جدیدیت سے عبارت ہے جس کے ٹیڑھے میڑھے اُلجھے ہوئے راستے اپنے آپ کو تلاش کرتے ہوئے اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں۔ کشمیری لال ذاکر کے ہاں کہانی اس پانی جیسی ہے جو تھوڑی دیر کے لئے دریا کے پاٹ سے الگ ہوتا ہے کہ چلو زندگی کے کھیتوں کی سیر کر آئیں۔ اس مقصد کے لئے وہ ندی کی سی شکل اختیار کرتا ہے اور پھر پندرہ بیس کلومیٹر تک زندگی کے کھیتوں کو سرسبز و شاداب کرتا، باغوں کو نئی ہریالی عطا کرتے ہوئے، جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو واپس دریا میں آ کر مل جاتا ہے، اسی لئے کشمیری لال ذاکر کی کہانی منجھے ہوئے بت تراش کے بنائے ہوئے بت کی طرح نہیں ہوتی جس کے ایک ایک انگ کو تراش کردہ بے جاں بُت کو زندگی عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کشمیری لال ذاکر کے ہاں تو ایسا لگتا ہے جیسے جیتے جاگتے انسان کہانی کے کردار بن کر آپ سے خود اپنی زندگی کی کہانی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

''جب وہ پچھلی بار یہاں آیا تھا تو یہ ایک چھوٹا سا ہل اسٹیشن تھا لیکن اب ہماچل کا نیا پردیش بن جانے سے یہ تحصیل ہیڈ کوارٹر اب ایک ضلع بن گیا تھا۔ اور ضلع بن جانے سے شہر کا سوشل اسٹیٹس بھی بدل گیا تھا۔ جیسے کسی دفتر میں کام کرنے والا معمولی کلرک کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھے اور اک دم سول سروس میں آجائے، اور کھٹ سے کہیں کا مجسٹریٹ بن جائے۔''

کشمیری لال ذاکر کی کہانی ''سویا ہوا شہر کا یہ اقتباس ہمارے عہد کا بھی عکاس ہے اور کہانی کار کے ذہنی رویے کا بھی ترجمان ہے۔ اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کشمیری لال ذاکر کے لئے شہر اور بستیاں بھی مجسم زندگی ہیں اور ان کی زندگیوں پر بھی کبھی شباب آتا ہے، اور کبھی بڑھاپا اور کبھی موت۔

کشمیری لال ذاکر اس اعتبار سے نہایت خوش قسمت تھے کہ انہیں جموں کے کالج میں پڑھتے ہوئے قدرت اللہ شہاب جیسے اُبھرتے ہوئے کہانی کار کا ساتھ نصیب ہوا۔ ان کی دیکھا دیکھی اُنہوں نے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ یوں ان کے اندر کہانی کار کا مزاج اُس وقت پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا جب یہ اپنے والد کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر کشمیر کی پہاڑی وادیوں میں گھوما کرتے تھے۔ ان پہاڑیوں کے لامتناہی سلسلے کو دیکھ کر ان کے ذہن میں خیالات کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوتا تو یہ تصور ہی تصور میں اپنے لئے نئی دنیا بسا لیا کرتے تھے اور قدرت اللہ شہاب کے ساتھ نے ان کی ذات کو جلا بخشی تو ان کی کہانیاں 'ہمایوں' میں چھپنا شروع ہو گئیں۔ 'ہمایوں' کے مدیر کرنل بشیر احمد نے جب انہیں لکھا کہ آپ کی یہ کہانی پہلی کہانی نہیں لگتی تو اس سے کشمیری لال ذاکر کا حوصلہ دُگنا ہو گیا۔

بس وہ دن اور آج کا دن، پانچ دہائیوں سے بھی زائد عرصہ گزر گیا اور کشمیری لال ذاکر کہانیاں لکھتے لکھتے سفر کے لپیٹے میں پہنچ گئے۔ بال پک گئے، چہرے پر جھریوں کا جال بچھ گیا۔ لیکن کشمیری لال ذاکر متواتر لکھ رہے ہیں، اُن کا قلم آج بھی جوان ہے، اپنے جوان قلم کے لئے سیاہی وہ زندگی کے اہم واقعات سے نہیں غیر اہم واقعات سے حاصل کرتے ہیں۔ زندگی کے نہایت معمولی واقعات کو فن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا کشمیری لال ذاکر کا حصہ ہے۔ اور انہیں اس فن پر عبور حاصل ہے۔ اسی فنکارانہ عبور کے باعث اس کا شمار ملک کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ (فن اور شخصیت، ذاکر نمبر ممبئی ۱۹۹۴ء)

رشید حسن خاں

خادمِ اُردو......ذاکر

کشمیری لال ذاکر صاحب ہریانہ اردو اکیڈمی کے سکریٹری ہیں۔ یہ سرکاری عہدہ ہے، لیکن اردو زباں کے فروغ کے سلسلے میں ان کا رویّہ ٹھپّا لگے ہوئے روایتی سرکاری اور افسرانہ رویّوں سے خاصا مختلف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کے زمانے میں ہریانہ اُردو اکیڈمی میں تعطّل کا زمانہ کم سے کم آیا ہے اور ریاست ہریانہ میں اردو زبان کی تعلیم اور ادب کے فروغ کا کام نسبتاً بہتر طور پر ہوا ہے۔

ہریانہ میں میوات کا علاقہ ایسا ہے جہاں اُردو پڑھنے والوں کی یا یوں کہیئے کہ اُردو والوں کی قابل ذکر تعداد ہے۔ ریاست کے باقی حصوں میں اردو دوست تو ہیں، اردو بولنے والے بھی ہیں اور پُرانی نسل کے اردو جاننے والے بھی ہیں مگر اردو پڑھنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میوات کے علاقے میں آج اگر اردو کی تعلیم کا تھوڑا بہت انتظام ہے، تو بعض دوسرے اسباب کے علاوہ، اس میں ہریانہ اُردو اکیڈمی اور اکیڈمی کے واسطے سے ذاکر صاحب کا بھی حصہ ہے۔ اردو دوستی کا جذبہ اُن کے دل میں ہے اور زبان و ادب کے فروغ کے لئے غیر سرکاری امداد سے کام کرنے کا جواں کا ڈھنگ ہے، اُس نے بہت مدد کی ہے۔

پچھلے پندرہ بیس برسوں میں یہ واقعہ ہے کہ اُردو اکیڈمیوں سے ہم اردو والوں کو جتنے فائدے پہنچے ہیں اُردو زبان کو اتنا فائدہ نہیں پہنچ پایا۔ زباں کے معاملے میں ادب کا پلّہ بھاری رہا ہے، جب کہ اُردو کی بقا اور اس کے حقیقی فروغ کا تعلق ابتدائی اور ثانوی سطحوں پر اُردو زباں کی تعلیم سے ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ زباں کو فائدہ پہونچا ہی نہیں، کہہ بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کے لئے دونوں آنکھوں بند کر لینا ہوں گی۔ لیکن تناسب پر اگر نظر رکھی جائے تو پھر یہ ماننا ہوگا کہ اوسط کے لحاظ سے ہم لوگ یعنی ادیب و شاعر فائدے میں رہے ہیں۔ ہریانہ اُردو اکیڈمی بھی ہر سال انعامات دیتی ہے، ادیبوں اور شاعروں کو بھی نوازتی ہے، ہریانہ کا ''قومی حالی ایوارڈ'' ہندوستان کی ہر اکیڈمی کے اعلیٰ انعام سے زیادہ رقم کا ہے، لیکن اس ریاست میں اردو پڑھنے والوں کا جو چھوٹا سا علاقہ ہے، وہاں اردو زباں کی تعلیم اور فروغ کے لئے بھی ٹھوس کام ہو رہا ہے اور اس میں ذاکر صاحب کا حصّہ بہت زیادہ ہے۔

بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب نرے سرکاری افسر نہیں، ان کی پہلی حیثیت اُردو کے ادیب کی ہے۔ فکشن ان کا موضوع ہے۔ فکشن کے موضوعات سے ایک عام قاری کی سی دلچسپی مجھے ہے، لیکن یہ میرا میدان نہیں۔ یعنی ناول، افسانے یا ڈرامے کے سلسلے میں کسی ادیب کی نگارشات کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کر سکتا، اس لئے اس پہلو پر کچھ لکھنا میرے لئے مناسب نہیں، بلکہ یوں کہیے کہ جائز نہیں ہوگا۔ یوں اس سے قطع نظر کرتا ہوں، مگر یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہریانہ اُردو اکیڈمی کے سکریٹری کی حیثیت سے وہ جس قدر دلچسپی کے ساتھ اُردو زبان کی تعلیم کے لئے اور اردو ادب کے فروغ کے لئے کام کرتے ہیں، اس میں اصل حصہ ان کے ادیب ہونے کا ہے جس کی نسبت سے اُردو زبان اور اردو سے گہرا تعلق خاطر ہے۔ کسی زبان کے ایک سچے ادیب کو اس زبان کی بقا اور اس کے فروغ سے جو لگاؤ ہو سکتا ہے، وہ لگاؤ محض ایک سرکاری افسر کو نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ہمہ وقت ضابطوں کا قیدی اور دفتری رسوم و قیود کا سچا وفادار رہے گا۔

ذاکر صاحب کی ایک قابلِ ذکر خوبی یہ ہے کہ ہریانہ اسٹیٹ میں اوپری سرکاری سطح پر اُردو کے خلاف وہ جذبہ میں نے نہیں پایا جو دوسرے مقامات پر نہایت درجہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس میں بہت کچھ حصہ ہے ذاکر صاحب کے طریقۂ کار کا۔ انہوں نے ایسی فضا بنالی ہے اور اعلیٰ حکومتی حلقوں سے تعلق رکھنے والوں سے ذاتی اور سرکاری سطح پر ایسے روابط پیدا کر لئے ہیں کہ اردو کے سلسلے میں اپنی باتیں آسانی کے ساتھ منوا لیتے ہیں۔ انہوں نے اس کا خیال رکھا ہے کہ اُردو زبان کی تعلیم کے لئے اور اردو ادب کے فروغ کے لئے جو بھی کام کیا جائے، اس کو اس طرح عمل میں لایا جائے کہ اس کا ردِعمل پیدا نہ ہو سکے۔

(مرد شخصیت کے کشمیری لال ذاکر مرسے اقتباس)

زینت اللہ جاوید

کشمیری لال ذاکر کا تخلیقی رویہ

فرانسیسی ادب و ڈرامہ نگار لا رو یر ایک جگہ لکھتا ہے "انسان کے لئے اہم ہیں۔ پیدا ہونا، زندہ ہونا، اور مرنا۔ جب وہ پیدا ہوتا ہے تو اس کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ جب وہ مرتا ہے تو اُسے تکلیف ہوتی ہے، جب وہ زندہ ہوتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔" ایک کہانی کار انسانی زندگی کے اس درمیانی ٹکڑے کو اہمیت دیتا ہے۔ انساں جب زندہ ہوتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے لیکن ایک کہانی کار کو نہ صرف اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ایک انساں کی زندگی کیسے گزرتی ہے بلکہ اُس کی نظر اس بات پر بھی ہوتی ہے کہ وہ انسان اپنی زندگی کیسے گزارتا ہے؟ زندگی گزرنے اور گزارنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن ان کا نقطۂ اتصال اور اُن کی باہمی آویزش ہی دراصل کہانی یا افسانہ کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ اس نقطۂ آغاز سے دنیائے اُردو میں سفر کرنے والے وہ ادیب بھی ہیں جنھوں نے پریم چند کے بنائے ہوئے راستوں کو اپنایا ہے۔ دوسرے وہ بھی ہیں جنھوں نے یورپی ادب سے متاثر ہو کر افسانہ کی تکنیک میں مختلف تجربات کئے ہیں۔ کشمیری لال ذاکر کا تعلق اوّل الذکر گروہ سے ہے جن کی تحریروں میں اپنی زمین اور اپنی دھرتی سے آپ کا اٹوٹ رشتہ نظر آتا ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ اجنبی وادیوں کی سیر نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنے ہی وطن کی کھلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کا اُس نسل سے تعلق ہے جو کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور قرۃ العین حیدر کے بعد آئی۔ اِن ممتاز ادیبوں کے بعد نئی نسل کے کسی افسانہ نگار کا اپنے وجود کو منوا لینا سہل نہ تھا لیکن کشمیری لال ذاکر نے اپنے تیشۂ تخلیق سے اپنا ایک منفرد جادہ تراش ہی لیا۔ ایک حساس، باشعور اور ذہین تخلیق کار ہونے کے ناطے وہ اپنی تخلیقات کے لئے مواد بھیڑ میں کھو کر بھی تلاش کر لیتے ہیں اور تنہائی کا زہر پی کر بھی، کبھی سچائی کی آنچ میں سسک کر موئے قلم کو جنبش دیتے ہیں تو کبھی ناانصافی اور جھوٹ کی آگ میں جل کر نوکِ قلم سے تلوار کا کام لیتے ہیں، کبھی سکون کی چاندنی میں شانتی پا کر قلم میں جمالیاتی کیفیت پیدا کرتے ہیں تو کبھی کرب کی کڑی دھوپ میں جھلس کر قلم کو زندگی کی حرارت بخشتے ہیں۔ غرض ان کی تحریروں میں گلاب کی پنکھڑیاں ہیں تو ببول کے کانٹے بھی، کسی معصوم لہجہ کا چاند ہے تو کرخت

بول کا نشتر بھی، پیار کی کرن ہے تو نفرت کی چنگاری بھی، دوستوں اور عزیزوں کی شفقت ہے تو ان کی بے مروتی بھی ہمدردیوں کا گہرا درد ہے تو لمحوں کی طمانیت بھی۔ ان کی زندگی کا سفر ہر راستہ اور ہر منزل سے تجسس نگاہوں کے ساتھ گزرا ہے اور اُن کے دامن نے جہاں کہیں سے بھی اپنی کہانیوں اور ناولوں کے مواد قابل اعتنا سمجھا سمیٹ لیا ہے۔ کشمیری لال ذاکر کی زندگی اسی کھوج اور اسی جستجو کی متاع بے بہا ہے۔ جسے انہوں نے احساس و شعور کی روشن کرنوں سے دھو کر تخلیقی سطح پر بے نقاب کیا ہے۔

ذاکر چاہتے ہیں کہ سمبندھ کی روپ ریکھا بنتی رہے، آپ کے تعلق کی بنیاد پڑتی رہے، وہ اپنے افسانوں میں غیر واضح اور انجانے رشتوں کو بار بار اُجاگر کرتے ہیں، ایک ایسے تعلق کو جس کی تشریح نہیں کی جا سکتی، ایک ایسے سمبندھ کو جس کی تفصیل نہیں دی جا سکتی، جو گہرے انسانی جذبہ پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک ایسا جذبہ جو انسانوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت ایک دوسرے کو قریب لے آتا ہے۔ افسانہ ''ڈاک گھر کی شمع اوی'' ایک اچھا افسانہ ہے۔ موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے بھی ایک اچھوتا اور دلکش، جس میں رشتوں کے بننے اور سنورنے کی خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ہلکا سا علامتی اسلوب افسانہ میں جان ڈال دیتا ہے۔

ناول ''لمحہ لمحہ بکھرتی زندگی'' میں ایک مسلم لڑکی سلمٰی ایک ہندو برہمن لڑکے ٹونی کو اپنا بھائی بناتی ہے تو ناول کی ہیروئن ارچنا بھی ایک مسلمان لڑکے سلمٰی کے منگیتر ارشد کو اپنا بھائی کہتی ہے اور یہ رشتے نہ صرف تادمِ آخر برقرار رہتے ہیں بلکہ سلمٰی کی موت کے بعد بھی اس کی ماں سے بدستور قائم رہتے ہیں۔

اور پھر ناول 'کرماں والی' ہے جس میں ایک طرف کرماں والی کا بھائی کریم اور بھاوج وکیلاں ہے۔ جس نے رقابت کی آگ میں کرماں والی کی گود سے اس کے بیٹے خوشیا کو چھین کر ہندوستان میں کہیں زندگی کے راستوں میں پھینک دیا ہے تو دوسری طرف اکبر خان اور نوری ہیں جنھوں نے پاکستان میں ہجرت کے بعد کرماں والی کو اپنی بیٹی اور اس کے خاوند فیضے کو اپنا داماد بنا لیا ہے اور پھر رام سرن ہے جس نے کرماں والی کی مدد کی اس کے بیٹے خوشیا کو سہارا دیا، اسے اس کا گھر واپس کر دیا جو اس کے پاس امانت تھا۔ اسے اس کی زمینیں دلوا دیں اور پھر سردار نتھا سنگھ گرنتھی ہے اس کی بیوی جمیت کور ہے جنہوں نے لاوارث مسلمان بچے خوشیا کو اپنا بیٹا بنا لیا، اس کے سر پہ ہاتھ رکھا، اس کی پرورش کی، اس کی شادی کروائی اور اس کا گھر آباد کیا۔ انسانی رشتوں کے پُل کیسے بن جاتے ہیں؟ جہاں اپنے بھی دھوکہ دے جائیں وہاں غیر اپنے کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب کہیں نہیں مل سکتا، ممکن ہے خدا کی خدائی اور کائنات کا وجود انہیں روابط پر ہو ـــــ دراصل کشمیری لال ذاکر اپنی تخلیقی کاوشوں سے ایسے ہی مضبوط پلوں

کی تعمیر میں ممہک ہیں وہ انسانی رشتوں کے ایسے چھوٹے چھوٹے پُل تعمیر کرتے ہیں جن کے نیچے سے انسانی جذبات و احساسات کا صاف وشفاف اور گہرا پانی بہتا رہے اور جو انسانی برادری کی کھیتیوں کو سینچتا اور دھرتی کے باسیوں کی زندگیوں کو سیراب کرتا رہے۔ اسی ٹھنڈے اور صاف پانی میں ''چھوٹی چھوٹی حشیاں ،ٹیاروں کی ہنسی ، دلہنوں کی چوڑیوں کے چھناکے ، پیار کرنے والی کی تقدیریں زندگی بخش پھوار کی طرح دور دور تک بکھر جاتی ہیں جیسے اَن گنت ستارے دھرتی پر بکھر جائیں۔'' (کرماں والی)۔ ذاکر کی تحریریں صاف وشفاف پانی کے بہی وہ آئینے ہیں جن میں قاری اپنے ہم حصوں کے چہرے دیکھ سکتے ہیں، اں میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے عکس تلاش کر سکتے ہیں جو اُن کسی اور گاؤں کسی اور آنگن میں چمک رہے ہیں دور کہیں بہت دور۔

کشمیری لال ذاکر کے یہاں لمحوں کا احساس شدید ہے، اں کے افسانوں میں کہیں نہ کہیں وہ لمحہ ضرور آتا ہے جو واقعہ کو ایک یا موڑ دیتا ہے اور ذاکر اسے اپی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانہ 'اُداس شام کے آخری لمحے' میں زخم کریدنے اور زخم سے نکلے ہوئے خون سے زندگی کے غیر متوازن خاکے سانے بیر اُداس شام کے آخری لمحے میں یادِ ماضی کی راکھ کرید کر چند چنگاریوں کو ہوا دینے کا عمل ہے۔ ایک 'یاد' ایک ارچنا جس کی قربت کے لمس اب جدائی میں فنکار کے دل ودماغ کو جلا کر راکھ کر رہے ہیں۔ اس کی منظورِ نظر ایک ایسے تاجر کی شریکِ حیات بن گئی ہے جس میں احساسِ جمال نام کی کوئی شے نہیں ہے بلکہ اس کے دل ودماغ پر کاروبار کا بوجھ ہے اور اس بوجھ تلے اَرچنا کی خواہشات وآرزوئیں دم توڑ رہی ہیں۔ کہاں تو اس کا خواب تھا شادی کے فوراً بعد اس کا شوہر اس کے ساتھ بھاگ کر پہاڑ کی چوٹیوں پر جائے گا اور ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ نیچے خندق میں کود جائے گا کیونکہ یہی اس کا کلائمیکس ہے لیکن ارچنا کی زندگی میں وہ محبت بھرا کلائمیکس نہ آسکا۔

کشمیری لال ذاکر کے افسانوں کے بیشتر کردار نسوانی ہوتے ہیں جن کی ذہنی اُلجھنیں گرہ در گرہ ہو کر افسانہ نگار کو عقدہ کشائی کے لئے مجبور کرتی ہیں لیکن فنکار کسی مسئلہ کا حل ہاتھوں میں لے کر ظاہر نہیں کرتا بلکہ وہ ان کی اس طرح مصوری کرتا ہے کہ اں کے خدوخال بھی بگڑنے نہ پائیں اور افسانوی رنگوں کی آمیزش سے ان میں ایک تخلیقی نکھار بھی پیدا ہو۔

افسانہ 'دھوپ ایک چادر'، اپورں، اوِیناش اور مس رتنا کی تثلیث پر محیط ہے۔ اپورن کی بیوی اسے چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے، اوِیناش بن ماں کا بچہ ہے جو ایک اسکول میں پڑھتا ہے، اس کی ٹیچر مس رتنا ہے۔ رتنا ایک بے ماں کے بچے اوِیناش کے لئے اپنے آپ میں ایک انجانی کشش محسوس کرتی ہے کیوں کہ اس

نے اوینا ش کے گلے میں ایک لاکٹ دیکھا ہے جس میں ایک تصویر ایسی ہے جو اس کی ہم شکل ہے، اب اس کے دل و دماغ پر وہی تصویر چھائی ہوئی ہے، ایک رات وہ محسوس کرتی ہے جیسے اوینا ش ساری رات اس کے پائینتی بیٹھا ہے اور اس کے لاکٹ کی تصویر لاکٹ سے نکل کر بستر پر رتنا کی جگہ لیٹ گئی ہے، بستر پر جو عورت سو رہی تھی وہ رتنا خود نہیں تھی اوینا ش کی ممی تھی۔ 'اپورن'، اوینا ش۔فل فلیمنٹ کا ایک طویل پروسس جو رتنا کے بغیر ادھورا تھا، ایک غیر شادی شدہ عورت کا ایک شادی شدہ مرد کی زندگی میں داخلہ کا امکان ایک بچے کے توسط سے کتنا عجیب پروسس' اس کے برعکس 'زخم اور خوشبو' میں ایک ایسی عورت اُبھر کر سامنے آتی ہے جو شادی شدہ ہو کر بھی ایک غیر مرد میں دلچسپی لیتی ہے لیکن انسان کی شرافت اور ایمانداری بھی کسی کے لئے کتنی مہلک اور جاں لیوا ثابت ہو سکتی ہے اس کا احساس اسے اُس وقت ہوتا ہے جب وہ غیر مرد شرافت اور اخلاق کا مارا اسے اتنی بھی خوشی نہیں دیتا کہ کبھی محبت سے اس کے شانوں پر ہاتھ ہی رکھ دے۔ نتیجہ ایک عورت کا ذہنی انتشار اور ایک کربِ مسلسل۔ غرض کہ ارچنا (اُداس شام کے آخری لمحے)، رتنا (دھوپ ایک چادر)، چترا (زخم اور خوشبو)، چمپا (ڈاک گھر کی شہزادی)، پرکاشو (کلائمیکس)، معصومہ (افسانہ معصومہ) کتنے ہی ایسے کردار ہیں جو صنفِ نازک سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر نسوانی سیرت اپنی مخصوص دلکشی رکھتی ہے۔ کشمیری لال ذاکر نے ان کرداروں کی روحوں کو بڑی بصیرت کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے نسوانی روح کا خفیف سے خفیف ارتعاش ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہتا اور پھر نسوانی کردار اپنی علاحدہ انفرادیت بھی رکھتے ہیں، ہر تصویر کے نقش و نگار الگ ہیں۔ ایسے کردار بھی ہیں جن کے جسم ایک الاؤ کی مانند جل رہے ہیں، سلگ رہے ہیں اور یہ کردار اس میں سے نکلے ہوئے دھوئیں سے اپنی لال سرخ آنکھوں کو سینک رہے ہیں اور یہ کردار بھی ہیں جو اپنے حسن کی آنچ سے اپنی تقدیر جلا ڈالتے ہیں، کبھی عورت کشمیری لال ذاکر کی تحریروں میں ایک ٹھہرے ہوئے تالاب کی مانند ہے جس میں ایک بڑا سا پتھر کوئی آ کر پھینک دیتا ہے اور سارے کا سارا پانی لرز اُٹھتا ہے۔ ہلکی ہلکی موجیں اُٹھتی ہیں اور تالاب کی سطح پر جمی ہوئی سبز کائی کی تہیں جگہ جگہ سے پھٹ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کہانی کو کسی نسوانی کردار کی زبانی بیان کرتا ہے۔ ایک ایسے کردار کی زبانی جو گزرے ہوئے وقت میں غوطہ زن ہو کر حال کی تلخیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کے افسانوں میں کھوئے ہوئے لمحات کی جستجو ہے اور چونکہ انسان کا وجود اُس کے حافظہ کا مرہونِ منت ہوتا ہے، اس لئے ذاکر کرداروں کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے حافظہ کو کھنگال کر گزشتہ واقعات کو ایک لڑی میں پرو دیتے ہیں لیکن یہی حافظہ، یہی یادِ ماضی کرداروں کے لئے

عذاب جاں بن جاتے ہیں، اس لئے کہ ان کی زندگیوں کا انجام المیاتی تاثرات پر ہوتا ہے۔ کشمیری لال ذاکر کے شہ پاروں میں جن یادوں کی تصویر کشی ہوتی ہے ممکن ہے ان کا تعلق ان کی ذاتی سوانح سے بھی رہا ہو لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان تحریرات کے سینوں میں آدم و حوا کے دلوں کی دھڑکنیں بھی محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ذاکر کے افسانوں میں ایک ایسی فضا ہے جو حسن و عشق سے شرابور ہے اور اس کا ادراک و شعور اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے آپ کو، اپنی زندگی کو ان لمحوں میں سمیٹ لیں جو اب باقی نہیں رہے اس لئے کہ خود کرداروں کے یہاں یہی ذہنی عمل ہے اور یہی عمل پلاٹ کے ارتقا میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کے پاؤں زندگی کی ارضیت پر جمے ہوئے ہیں۔ وہ اپنا عالم علاحدہ تخلیق نہیں کرتے اسی لئے یہ پراسرار نہیں ہوتا بلکہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے جو مادری اور طبعی ماحول سے عبارت ہے، اس لئے ان کے کرداروں کی مجروح تمنائیں اور آرزوئیں تکمیل کو نہیں پہنچتیں۔ ایک تخلیق کار اگر چاہے تو اپنی خیالی دنیا میں اپنی مرضی کے مطابق کرداروں کو جس طرح چاہے تخلیق کر سکتا ہے۔ ذاکر کے یہاں طرزِ فکر بہتے ہوئے پانی کی طرح اپنا راستہ خود بناتی ہے اس لئے ماحول کا تجزیہ بھی کہانی اور پلاٹ کے ساتھ ساتھ قاری کے سامنے آتا رہتا ہے۔ طرزِ فکر کے ساتھ اسلوب بیان میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ملتی، تحت شعوری استعاروں کے پیچ و خم کے بجائے ایسی عام تشبیہات ملتی ہیں جن سے قارئین کے ذہن و ادراک بھی فی الفور اپنا راستہ پیدا کر لیتے ہیں اور ابہام و تفہیم کا مسئلہ پیدا نہیں ہونے پاتا۔

کشمیری لال ذاکر کی کہانیوں کے موضوعات انسانی مصائب پر مشتمل ہوتے ہیں۔ زخم خوردہ اور مجروح مسکراہٹ کے پیچھے ہونٹوں کی قاشوں کے اندر کہیں کسی زخم کے رستے ہوئے لہو سے وہ اپنے افسانوں میں رنگ بھرتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر انسانی روابط کی نقش گری نیز ٹوٹنے اور بچھڑنے کا درد اُن کی تحریروں کا بنیادی رنگ ہے۔ ایک دوسرے کے پاس رہنے والے لوگ بھی ایک دوسرے کو کہاں ملتے ہیں۔ فاصلہ کی دوریاں جتنی کم ہو گئیں ہیں ذہنی فاصلے اتنے ہی زیادہ ہو گئے ہیں۔ ذاکر نے اُنہیں فاصلوں کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے لیکن ناول 'کرماں والی' میں وہ ان فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر درخت کو جڑوں سے کاٹ کر کسی اور زمین میں لگانے کی کوشش کی جائے تو اس کا پنپنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جڑیں تو کہیں اور سڑ رہی ہوں اور درخت کہیں اور لگایا جا رہا ہو، اس صورت میں درخت کو اپنی بقا کے لئے جس اذیت ناک کرب سے گزرنا پڑتا ہے 'کرماں والی' اسی اذیت ناک کرب کی آئینہ دار ہے۔ اس ناول کا موضوع 'تقسیم' ہے۔ اس موضوع پر بہت سی کہانیاں اور ناول لکھے جا چکے ہیں۔ کشمیری لال

ذاکر نے بھی اس ناول سے قبل اس موضوع پر کچھ کہانیاں لکھیں تھیں جن میں تقسیم کے بعض ایسے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا جو بہت اہم اور بنیادی تھے۔ اس موضوع میں وہ محرومی اور کسک ہے جس کا احساس ۱۹۴۷ء کے بعد کی نسل کو شدت کے ساتھ رہا ہے۔ تقسیم وطن بطور خاص مسلمانوں کے لئے ایک اہم مسئلہ بن کر اُبھرا اس لئے کہ اُن کے والدین ہندوستان میں رہ گئے تو بیٹے پاکستان میں ہجرت کر گئے۔ بہن بھائیوں کے لئے ہندوپاک کی سرحدیں ایک آہنی دیوار بن کر درمیان میں کھڑی ہوگئی جس نے محرومی اور جدائی کا احساس دلایا۔ ’کرماں والی‘ اس نسل کی جو ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے ہجرت کرگئی تھی ایک نمائندہ ہے۔ ایک ماں اپنا وطن چھوڑنے کے لئے مجبور ہوگئی اور اس کا معصوم اور بے گناہ بچہ ہندوستان میں رہ گیا۔ کشمیری لال ذاکر نے اس کردار کے ایک مار اُجڑنے اور پھر دوبارہ بسنے کے جان لیوا عمل کو پیش کیا ہے، جس میں ایک بدنصیب ماں اپنے لختِ جگر کو نہ بھلا سکی اور عمر کا ایک لمبا سفر زندگی کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے طے کیا۔ بیٹے سے ملنے کی تمنا حسرت میں بدل گئی۔ ’کرماں والی‘ اسی تلاش، اسی سفر اور جستجو کی علامت ہے۔

برصغیر کو مذہب کی بنا پر جب تقسیم کردیا گیا اور مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوگئے تو کرماں والی بھی اپنے شوہر کے ساتھ وطن کو خیر باد کہنے کے لئے مجبور ہوگئی لیکن اسے ہندوستان اپنے وطن عزیز سے اس قدر محبت تھی کہ ہجرت سے قبل اس نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اپنے وطن اور اپنے کھیت کی آخری مینڈھ سے ایک مٹھی بھر مٹی لے کر اپنے دوپٹے کی چھور میں باندھ لی جیسے وہ اپنی تقدیر کو بھی اپنے ساتھ لے جارہی ہو۔ اس کا خیال تھا تھوڑے دنوں بعد پھر وہ اپنے وطن واپس آجائے گی، لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ ’’ایک بار گھر چھوڑ دو تو پھر گھر ہمیں چھوڑ دیتا ہے۔‘‘

جب کرماں والی اپنے شوہر فیضا کے ساتھ پاکستان پہنچتی ہے اور کمپارٹمنٹ سے نکل کر پلیٹ فارم پر آتی ہے تو وہ اپنے دوپٹے کے کونے کو چھو کر دیکھتی ہے جس میں اس کے گاؤں کی مٹھی بھر مٹی بندھی ہوئی تھی۔ کرماں والی نے اس مٹی کو اپنے آنکھوں سے لگایا اور پھر ایک بار ماتھے سے چھو کر اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اس کے کھیت کی مٹی تھی اور دوسرے ہاتھ میں سبز رنگ کے کپڑے میں لپٹا قرآن شریف تھا۔ ہندوستان سے ہجرت کے بعد کرماں والی اور فیضا کو ایک کیمپ میں ٹھہرایا گیا جہاں انہوں نے ایک اذیت ناک زندگی گزاردی۔ لیکن جب کبھی کوئی لیڈر یا افسر کیمپ میں آتا اور کوئی تکلیف پوچھتا تو جواب میں کرماں والی خدا کا شکر ہی ادا کرتی لیکن بیشتر اس کا وقت خاموشی میں گزر جاتا۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں لیکن اس کی خاموشی میں ہزاروں داستانیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ جب تک اس کے دوپٹے کے چھور میں اس کے وطن کی مٹی بندھی رہی اس کی زبان بھی بند رہی۔ اس کی

روح تو ابھی بھی اپنے گاؤں، اپنے وطن میں تھی، اپنے کھیتوں میں کھڑی فصلوں پر منڈلا رہی تھی۔ کیمپ میں پڑا اس کا جسم کس کام کا تھا۔ اس کی روح ہندوستان میں تھی جہاں اس کا بیٹا خوشیا تھا، اس کی توتلی باتیں تھیں اور اس کی معصوم ہنسی اور اس کے پاس آنسو تھے۔ کرماں والی کا تو صرف جسم پاکستان میں تھا جہاں اس کا شوہر فیصا تھا جو اپنی بیوی کو اپنی جان سے بھی عزیز رکھتا تھا۔

کرماں والی اس حسرت میں مری جا رہی تھی کہ اب اس کا بیٹا اُسے کبھی نہیں ملے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر وہ خواب میں دیکھتی کہ اس کا بیٹا اس سے کہہ رہا ہے "مجھے تم سوتے ہوئے چھوڑ کر چلی آئی تھی نا اب میں تمہیں کبھی نہیں ملوں گا۔ تم مجھے بغیر دیکھے ہی مر جاؤ گی۔" اور کرماں والی ماتا کی باہیں پھیلائے اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگانے کے لئے بے چین ہو کر چیخ چیخ اُٹھتی۔

جس روز فیصے کا انتقال ہوا اور اُسے قبر کے سپرد کیا گیا اس کی تازہ قبر پر مٹھیاں بھر بھر کے مٹی ڈالی گئیں۔ کرماں والی برسوں سے سنبھالی ہوئی ہندوستاں میں چھوڑے ہوئے اپنے گاؤں کی مٹی کو بھی دوپٹے کی چھور سے کھول کر قبر کی مٹی میں شامل کر دیتی ہے۔ اپنے دوپٹے میں باندھ کر رکھی ہوئی تقدیر کو وہ فیصے کی قبر کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور اس طرح فیصے کی موت کے ساتھ ہی ہندوستان کی زمین سے کرماں والی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہندوستان کی مٹی پاکستاں کی مٹی میں مل جاتی ہے اور اسے کچھ دیر کے لئے خیال آتا ہے کہ اب ہندوستاں میں اُس کا کوئی نہیں ہے اس کا ہندوستاں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پاکستاں میں کیمپ کے اندر حسن نوری اور اکبر نے اُسے دلاسا دیا تھا، اُسے اپنی بیٹی بنایا تھا، دھیرے دھیرے دل کے کونوں سے اُن کی یادیں بھی نکل جاتی ہیں۔

زندگی حالات میں کسی سورج کا طلوع ممکن نہ تھا لیکن جس طرح کالی سیاہ رات میں گھنگھور گھٹاؤں کے اندر سے کبھی کبھی ایک ستارہ ٹمٹمانے لگتا ہے، روشنی کی ایک لکیر پھوٹنے لگتی ہے۔ اسی طرح کرماں والی کو بھی زندگی کی تاریک رات میں ایک تارہ نظر آتا ہے، روشنی کی ایک لکیر پھوٹتی دکھائی دیتی ہے، دل کے اندھیروں میں کوئی چراغ لے کر گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو اُمید بندھ جاتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے سے ایک بار ضرور ملے گی۔ واقعات کی کڑیاں دھیرے دھیرے ملتی رہتی ہیں اور پھر ایک دن اسے اپنے بیٹے کی جانب سے ایک خط موصول ہوتا ہے، اس کی شادی ہو چکی ہے، اس کا بھی ایک بیٹا ہے۔ کرماں والی خط سن کر خوشیا کے خط کو چھاتی سے لگائے بہت دیر تک روتی ہے۔ دل پر جمنے والی درد کی برف ٹوٹ جاتی ہے، بیٹے سے قربت کا احساس اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے، خوشیا آخر اُسے مل ہی گیا۔ وہ اپنے بیٹے سے ملنے ہندوستان جاتی ہے۔ بیٹے، بہو اور پوتے کو دیکھتی ہے، خوش ہوتی ہے، اس کی زندگی کی آخری تمنا

چراغ سحری کے گل ہونے سے پہلے پوری ہوگئی۔ جسم و جان کا قرض ادا ہوگیا، اُسے اس کا خوشیا مل گیا جس کی تلاش میں وہ فقیرن بنی تھی۔ تین ماہ ہندوستان میں گزارنے کے بعد وہ پاکستان جانے کی تیاری میں لگ جاتی ہے، بیٹے اور بہو کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اُن کے پاس تادمِ آخر ٹھہرنے کے لئے راضی نہیں ہوتی اس لیے کہ اب وہ پاکستان کی شہری تھی اور پھر پاکستان میں اُس کے شوہر فیضے کی قبر بھی تھی جس پر ہر جمعرات کو اُسے چراغ جلانا تھا، وہاں اس کی لڑکی شاداں تھی اور شاداں کا لڑکا نورا تھا اور اس طرح وہ یہ دُعا دیتے ہوئے پاکستان چلی جاتی ہے کہ "سب کو اپنے اپنے گھروں کی برکتیں نصیب ہوں۔" ایک دُکھی، غم نصیب اور اپنے قافلہ سے بچھڑی ہوئی ایک مجبور عورت کے دل سے نکلی ہوئی دُعا جو سب کے لئے کی گئی تھی نسلِ آدم کے ہر فرد کے لیے تھی چاہے وہ دھرتی کے کسی بھی گوشہ میں بستا ہو اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اپنے خدا سے اس کی برکتیں حاصل کرنے کے لئے وہ سجدہ میں گر پڑتی ہے، اُس سے دُعا مانگتی ہے اپنے لئے، اپنے بچوں کے لئے، اپنے خانداں کے لئے، بنی نوعِ انسان کے لئے، ایک سُکھ بھرا مستقبل اور ایک روشن صبح جس کے ماتھے پر انسانیت کی عظمت کا تاج ہو۔ دراصل یہ دُعا کرماں والی ہی کی زبان سے نکلی ہوئی دُعا نہ تھی بلکہ ایک فنکار، ایک کہانی کار، ایک تخلیق کار کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دُعا تھی جو اُس کے ہاتھوں کی انگلیوں سے روشنی بن کر پھوٹ رہی تھی۔ کشمیری لال ذاکر کے نوکِ قلم سے نکلی ہوئی یہ دُعا اُن کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

شمع افروز زیدی

عہد ساز شخصیت ـــ کشمیری لال ذاکر

یہ عہد جس میں ہم سانس لے رہے ہیں منافقت اور سنگدلی کا ایک ایسا حصار ہے جس میں ہر باشعور انساں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر چہ انساں اس حصار سے باہر نکلنے کے لئے چھٹپٹا تا ہے اور اس جدو جہد میں وہ اپنے جسم کے ساتھ اپنی روح کو بھی زخمی کر لیتا ہے لیکن جدید دور کا یہ بھی بڑا المیہ ہے کہ ہم اس دور میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ چہار اطراف بے یقینی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ لیکن جب یہی کیفیت کسی فنکار پر گزرتی ہے تو اس کا تمام تر عکس اس کی تحریروں میں در آتا یقینی ہے یہاں تک کہ فنکار کی یہ کیفیت اس کے تخلیقی عمل میں جزو کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

یہاں بات ہو رہی ہے کہ جناب کشمیری لال ذاکر کی جو علم وادب کی دنیا میں کسی تفصیلی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کا شمار اردو فکشن میں اہل کمال کے اس زمرے میں کیا جاتا ہے جنھیں کسی سے خراجِ تحسین وصول کرنے کی ضرورت نہیں۔ تقریباً ۶۵ برسوں سے ان کا تعلق اپنی جولانیاں بکھیر رہا ہے اور قاری کے ذہن کے کسی گوشے میں عمر کے ۸۵ برس گزرنے کا احساس نہیں کراتا مسلسل مصروف عمل رہنا ان کی فطرت اور مختلف تنظیموں واداروں سے منسلک رہنا ان کا شعار ہے۔

ذاکر صاحب کی پہچان کئی حوالوں سے ہوتی ہے۔ اگر وہ ایک جانب بہترین کہانی کار ہیں تو دوسری جانب باشعور ڈرامہ نویس بھی۔ شاعری وہ کرتے ہیں سفرنامے وہ لکھتے ہیں خاکے اڑانے میں وہ ماہر اور عنواں ایسے شاعرانہ رکھتے ہیں کہ ذہن عنوان کے ارد گرد حسین تانے بانے بننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ''اپنی ہواؤں کی خوشبو'' میں انھوں نے ہم عصر ادیبوں کے خاکے بڑی خوبصورتی سے پیش کئے ہیں۔

میں ذاکر صاحب کو اس وقت سے جانتی ہوں جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ میرے بچپن میں بیسویں صدی میری والدہ کا پسندیدہ رسالہ تھا شعور پکڑنے کے ساتھ میں بھی اس جانب ملتفت ہوتی گئی یہاں تک کہ ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات اسی رسالے میں شائع ہوئی ان کی کہانی ''ایک چھوٹا سا غم'' کے ذریعہ ہوئی ان کی تحریریں پڑھ پڑھ کر بڑی ہوئی تو حسن اتفاق کہ میری شادی مدیر بیسویں صدی ضیاء الرحمٰن نیر سے ہوگئی تو دفتر میں ذاکر صاحب سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وہ جب بھی دہلی پہونچتے تو

ملاقات کا شرف بخشنے کبھی خود تشریف لے آتے کبھی بذریعہ فون ہم دونوں کو ہریانہ بھون میں مدعو کر لیتے اس طرح انہیں مزید قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ گھنٹوں کبھی ادبی کبھی کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔

دراصل کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ملاقات میں ہمارے دل میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن سے آپ برسوں ملتے رہیں اجنبیت کی دیوار درمیان میں حائل رہتی ہے لیکن ذاکر صاحب ایسے باوضع اور مخلص انسان ہیں جو اپنے خوردوں سے کچھ اس طرح شفقت سے پیش آتے ہیں کہ بزرگ اور خورد کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اپنے پروگراموں میں نہایت خلوص سے مدعو کرتے ہیں پرانی قدریں اور وضعداری گویا ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ ان کے خلاق ذہن نے اردو ادب کو ۱۰۰ سے زائد کتابوں کی شکل میں جو کچھ دیا ہے وہ ایک مستقل اور قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۲۶۔۲۷ ناول لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن ذاکر صاحب کے مزاج میں مہم جوئی بھی شامل ہے اس لئے دشوار ترین کام چٹکیوں میں کر لیتے ہیں۔ اتنا کچھ لکھنے کے باوجود ان کے قلم کو کسی دم قرار نہیں اور خوبی یہ کہ ان کی تحریروں میں ورائٹی ہے کبھی بھی خود کو دوہراتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔

ذاکر صاحب علم وادب اور فکر وفن کے ایک ایسے دریا کی مانند ہیں جو اپنی روایتی شان سے رواں دواں ہے۔ ان کے اندر دور بینی کا جو وصف ہے وہ خال خال قلمکاروں کو ہی نصیب ہے۔ وہ اشخاص، نظریات، عقائد اور حسیات پر جب غائر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی نگاہیں محدب شیشے کی مانند دور تک سب کچھ دیکھ لیتی ہیں۔ واقعات کی دلکشی، ماحول کی جاذبیت۔ جذبات کی اثر آفرینی نے حال ہی میں شائع ان کے ناول "درد بے زبان" کو ایسی زبان عطا کر دی ہے کہ اسے ہم ذاکر صاحب کا شاہکار قرار دے سکتے ہیں۔ ۴۰۶ صفحات پر محیط اس ناول کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس قوی تر ہو جاتا ہے کہ ہم ایک بڑے ناول کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس میں مصنف نے کمال یہ کیا ہے کہ بدھ مت کے ماضی وحال کی اس تمام معلومات کو اس میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے خیال میں آنے والی نسلوں اور مستقبل کے مورخوں کے لئے سودمند ہو سکتی ہے۔ اس ناول کا مطالعہ قاری کو فکر کی دعوت دینے کے ساتھ ہی اس کی جستجو میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ اس میں کرداروں کی زبان، جذبات کی عکاسی، رہن سہن، وقت، ثقافت وتاریخ جغرافیائی حالات اور سب سے بڑھ کر گوتم بدھ اور بدھ مت کے پیران کے اقدار اور رویوں کے بارے میں تفصیل سے تمام معلومات فراہم کر دی ہے۔ انھوں نے متعدد منتشر واقعات کی جس مہارت سے شیرازہ بندی کی ہے یہ ذاکر کا ہی حصہ ہے۔ یہ ناول پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ بدھ مت کے تعلق سے

ایک ایک جزئیات پر اس کی گہری نظر ہے۔ مصنف نے بودھ گیا اور سکم کے جغرافیائی حالات کا ذکر بھی بہت واضح انداز میں کیا ہے۔ وہ انسانی رشتوں کی معنویت اور زندگی کے اسرار ورموز کا گہرائی سے مطالعہ کر کے تجزیہ کرنا بھی نہیں بھولے ہیں۔ جاکھو کا ہنومان مندر، جولاکھی کا مندر، مہاراجہ چوگیال مہاراجہ تاشی نامکیال کے لڑکے پالڈں تھانڈوپ۔ نامکیال کی شادی کا ذکر ناول کے کرداروں تالش، ڈوما، سونم اور احیت کا سہارا لے کر اس طرح کیا ہے کہ قاری کے سامنے اس وقت کے تمام حالات مجسم ہو اُٹھتے ہیں۔ اس لئے کہ ذاکر صاحب نے سفر کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔ دور دراز کے سفر کئے کئی لائبریریاں کھنگالیں یہاں تک کہ سان فرانسسکو کی پبلک لائبریری بھی پہونچے۔ تکسلا کا سفر بھی کیا وہاں کے میوزیم کی سیر کی۔ سکم میں Reseach institute of Tibetalogy میں جا کر ریسرچ ورک کیا۔ باریک بینی سے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا جب پوری طرح مطمئن ہو گئے تو برسوں کی محنت شاقہ کے بعد اپنی ریسرچ کی کہانی ''درد بے زباں'' کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ اس میں واقعات کا تسلسل مصنف نے کچھ اس انداز میں قلمبند کیا ہے کہ یہ ناول حوالے کے طور پر بھی اہم قرار پاتا ہے مثلاً۔

''سکم میں سیاسی چیتنا ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی آئی اس سے پہلے تو سکم پر حکومت چوگیال ہی کی تھی جو برٹش پولیٹیکل آفیسرز کی مدد سے عوام پر پوری طرح حاوی تھا۔ چوگیال مہاراجہ کے علاوہ مذہبی طور پر بھی طاقتور تھا۔ مذہب اور بادشاہی دونوں نے مل کر سکم کے عام شہری کو اپنے ادھیکاروں سے محروم کر رکھا تھا۔۔۔ ۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو تینوں پارٹیوں کو آپس میں ملا کر سکم اسٹیٹ کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے بعد ایک ڈیپوٹیشن نے مہاراجہ تاشی نامکیال کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔'' صفحہ ۵۱

''فروری ۱۹۴۹ء میں اسٹیٹ کانگریس نے ''نو رینٹ'' ''نو ٹیکس'' کی تحریک شروع کر دی۔۔۔ حکومت کے خلاف عوام کی یہ پہلی ریوولٹ تھی۔'' صفحہ ۵۲

''پہلی مئی ۱۹۴۹ء کو بغاوت کا جذبہ پھر ٹوٹ پڑا۔۔۔

مارچ سکم کونسل میں عوام کے نمائندوں کو چنے جانے کے لئے الیکشن کا اعلان کیا۔ سکم کی ہسٹری میں الیکشن کا یہ پہلا تجربہ تھا۔''

''مئی ۱۹۶۰ء میں سبھی سیاسی پارٹیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سب مل کر ایک سیاسی پارٹی بنائیں گے اور اپنی پارٹیاں توڑ دیں گے۔ چنانچہ سکم سوتنتر دل کے قاضی لہنڈوپ ڈورجی، سکم پارٹی کے سونم نیرنگ سکم پرجا سمیلن کے ڈی۔ جی۔ تیواری سکم اسٹیٹ کانگریس کے سی۔ڈی رائے نے سنگٹم کے مقام پر ایک جوائنٹ کنونشن کی بنیاد رکھی'' صفحہ ۵۶

ایسی نہ جانے کتنی مثالیں ہیں جو اس ناول سے پیش کی جا سکتی ہیں جو قاری کی معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ناول لکھنا بڑا جوکھم کا کام ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

ایک اچھا ناول تفریحی سے زیادہ تہذیبی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ غیر معمولی طوالت اس کے حسن کو مجروح کرتی ہے کسی بھی ناول میں آخری سطر تک قاری کی دلچسپی برقرار رکھنا آسان نہیں لیکن ذاکر صاحب نے ایسا کر دکھایا ہے۔ ان کا بچپن کشمیر کے مرغزاروں، وہاں کی حسین وادیوں، باغوں اور جھیلوں کے درمیان گزرا ہے۔ اوائل عمر کی ذہن میں محفوظ تمام تر حسن کی عکاسی ان کی تحریروں میں بھی گندھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مناظر کی تصویر کشی بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ ''درد بے زبان'' میں بھی سکم کی حسین وادیوں، اس کی ترنم ریز فضاؤں، کل کل بہتی تستہ ندی کی گمبھیر اور دھیمی دھیمی موسیقی جیسی لہروں کا ذکر مصنف نے کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ قاری خود کو اس ماحول میں رہتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اجیت جب دارلنگ میں سن رایز کا منظر دیکھنے کے لئے کنچن چنگا کی پہاڑیوں پر جاتا ہے اس منظر کی تصویر کشی ملاحظہ فرمایئے۔

> ''اندھیرا دھیرے چھٹتا جا رہا تھا۔ سب لوگوں کی نگاہیں سامنے کے پہاڑیوں پر جمی تھیں جو دھیرے دھیرے اندھیروں کی تہوں سے باہر نکل رہے تھے آسمان بالکل صاف تھا۔ بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا پھر اچانک پہاڑیوں کے پیچھے جیسے آگ لگ گئی تھی، سرخ روشنی کا ایک سمندر پھیلتا جا رہا تھا پہاڑیوں کی چوٹیوں پر فضا ایک دم خاموش تھی۔۔۔'' صفحہ ۳۰۴

ذاکر صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ حسین نظاروں کا ذکر یونہی نہیں کرتے بلکہ ذکر کے ساتھ فکر کے نئے نئے سوتے بھی پھوٹتے محسوس ہوتے ہیں۔ حیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اس لئے یہ شعور ان کی تحریروں میں بھی موجزن ہے۔ مثلاً جب وہ کہتے ہیں۔

''لوگ جانے شروع ہو گئے تھے لیکن اجیت اپنی جگہ پر ہی بے حس و حرکت کھڑا تھا اس کے صرف ہونٹ لرز رہے تھے۔ اسے لگا شاید نروان کا یہی وہ لمحہ جس کا سامنا مہاتما بدھ نے گیا مندر کے پیچھے اُگے درکش کے نیچے بیٹھے کیا تھا اور پھر مکت ہو گیا تھا۔ کیا وہ بھی مکت ہو رہا تھا؟

کیا اسے بھی نروان پراپت ہو رہا تھا؟

کیا اس کی زندگی میں بھی آخری موڑ آ گیا تھا۔ صفحہ ۳۰۴

مذکورہ ناول ماہنامہ بیسویں صدی میں قسط وار تقریباً تین برس تک شائع ہوا۔اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی مہینے قسط شائع نہیں ہوتی تھی تو قارئین کے خطوط اور فون آنا شروع ہوجاتے تھے یہ میں اتنے وثوق سے اس لئے کہ رہی ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے جھیلا ہے۔میں سمجھتی ہوں کہ ذاکر صاحب کا مقصد قاری کو صرف کہانی سنانا نہیں ہوتا بلکہ اس کو انوالو کرنا بھی ہوتا ہے۔وہ قاری کو زیریں سطح سے بلند کرکے اس کی سوچ کو اپنی فکری سطح سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنے میں حد درجہ کامیاب ہیں۔چونکہ ذاکر صاحب کو اردو کے ساتھ انگریزی زباں پر بھی عبور حاصل ہے اور وہ غائر نظر سے انگریزی ناولوں کا مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں اس لئے اردو میں ناول لکھتے ہوئے وہ اسے سجانے سنوارنے میں تمام تر راکتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔دراصل ناول کی تخلیق ادھوری شخصیتوں کے بس کا روگ نہیں زندگی کے صحیح معنوں میں عکاسی وہی کرسکتا ہے جس نے زندگی کا مشاہدہ بہت نزدیک اور باریک بینی سے کیا ہو۔اور ذاکر صاحب کو یہ وصف حاصل ہے۔وہ بلا مقصد قلم نہیں اٹھاتے جب کوئی موضوع انھیں مجبور کرتا ہے درد حد سے سوا ہو جاتا ہے تو وہ قلم پکڑ لیتے ہیں پھر انھیں ہوش نہیں رہتا لکھتے چلے جاتے ہیں۔ثبوت کے طور پر ان کا تازہ ترین ناول ''سمندر اب خاموش ہے'' پیش کیا جاسکتا ہے۔یہ ناول سونامی کے ڈھائے ہوئے قہر پر تحریر کیا گیا ہے۔۲۶ر دسمبر کی صبح طوفانی لہروں نے صرف ہندوستاں ہی نہیں جنوبی ایشیا کو بھی اپنی پیٹ میں لے لیا تھا اور تباہی مچائی جواب تک سب سے بڑی قدرتی آفات میں سے ایک ثابت ہوئی لیکن اس قہر کے تعلق سے اتنی جلد ۱۴۴ صفحات کا ایسا مکمل ناول پیش کردینا کچھ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ اس ناول کا موضوع اہم، پلاٹ کسا ہوا اور مربوط ہے۔بیانیہ میں زور آفرینی ہے مختصر مکالمے شدت انگیز تاثر کے ساتھ ایک ایک سطر پڑھنے پر مجبور کردیتے ہیں۔میں نے یہ ناول شروع کرنے کے بعد رات کے دو بجے ختم کیا تو میں سمجھتی ہوں کہ اگر کوئی تحریر قاری کو اس طرح باندھے رکھنے میں کامیاب ہے تو یہ اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔اس المیہ ناول میں بھی ذاکر صاحب زندگی سے حسن کس قدر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔اس میں اگر ایک جانب فانی زندگی کا نقشہ بڑے ہی درد انگیز پیرائے میں بیان کیا ہے تو انسانی زندگی کے حسین ترین لمحوں کو بھی بڑی خوبصورتی سے قید کرلیا ہے۔ناول کا اختتام آخری چند سطروں میں طربیہ بنا کر پیش کرنا مصنف کا کمال ہے۔

ناول کی کہانی شکیل حمید کی ربانی بیان کی گئی ہے۔ایک طرح سے شکیل حمید اس میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ضمنی طور پر دیگر کردار بھی ہیں جس میں اس کے ماں باپ بہن بہنوئی اور اس کے بچوں کا بھی ذکر بھی ہے پھر رضوانہ سے شادی کا بیان ہے۔درمیان میں شکیل حمید کی دفتری ساتھی مریم کا کردار بھی

اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ لفظ" بہ تقریب" کے زیر عنوان مصنف نے سونامی لفظ کی ہسٹری اور سونامی قہر کی تاریخ بیان کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

> "ہندوستان میں سونامی کا قہر کوئی نئی بات نہیں ہے اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ بحر ہند میں اٹھارہویں صدی سے لے کر دسمبر ۲۰۰۴ء تک سونامی کئی بار آفت ڈھا چکا ہے۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ بحر ہند میں پہلا سونامی طوفان ۱۷۶۲ء میں برپا ہوا تھا اس کے بعد ۱۸۱۹ء، ۱۸۸۳ء، ۱۹۰۳ء، ۱۹۰۷ء، ۱۹۲۶ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۴۵ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۹۴ء، میں سونامی نے قہر برسایا تھا اس کا آخری حملہ ۲۶ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو ہوا جو سب سے زیادہ خطرناک اور انتہائی خوفناک تھا اور جس میں جتنا جانی اور مالی نقصان ہوا اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔"

دکھ سکھ، مسرت ومصیبت انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ حادثات وسانحات بھی انسانی زندگی میں وقت بے وقت رونما ہوتے رہتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی میں مصیبتوں، پریشانیوں اور صدموں کو وقت کے ساتھ ساتھ بھولتا چلا جاتا ہے کہ بھولنا اس کی سرشت میں شامل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی ایک دم بوجھل بن جاتی اور انسان کو جینا مشکل ہو جاتا لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے انتہائی تکلیف دہ حالات میں بھی زندگی کے پرمسرت اور حسین لمحوں کو فراموش نہیں کیا ہے پیش ہیں اس ناول کے کچھ اقتباس جو ناول کو سمجھنے میں تقویت بخشتے ہیں۔

> "سامنے میری تینوں بہنوں کے ساتھ رضوانہ کھڑی تھی مجھے تینوں بہنیں تو صرف تصویر کے فریم کا فرض نبھا رہی تھیں، رضوانہ تو فریم کے اندر تھی میں لمحہ بھر کے لئے سناٹے میں رہ گیا۔ یا اللہ اتنا بے پناہ حسن۔ مجھے لگا میرے دل پر ہاتھ رکھا وہ واقعی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
>
> اس کے جاگنے اور سونے کے درمیان کا جو وقفہ ہے شاید یہ وہی وقفہ ہے جس نے خیام اور کالی داس، غالب اور ٹیگور کو اپنی عظیم تخلیقات کو رچنے کی پریرنا دی تھی۔ رضوانہ کے سونے کی اس کیفیت نے مجھے اچانک ایک معمولی سافٹ ویر انجینئر سے ایک دانشور اور ایک فلاسفر بنا دیا۔"

> "میں سمندری کو جی بھر دیکھنے کے بعد ساحل سے پلٹ آیا تھا اور ذرا دوری سے ان

سب زائرین کو دیکھ رہا تھا جو مزار کے ارد گرد کھڑے تھے۔ خانداں کے دوسرے لوگوں کے درمیاں رضوانہ سر جھکائے کھڑی تھی اور وہاں بھیڑ میں سب سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی میں نے سوچا ایک بار مزار کی طرف جاؤں اور کسی چراغ کے دھوئیں کی تھوڑی سی کالک اس کے گال پر لگا دوں۔۔۔"

''ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک سمندر کی ساکن سطح پر پہاڑ جیسی خوفناک کئی فٹ اونچی لہر ساحل کی طرف بجلی کی سی رفتار سے بڑھی پیشتر اس کے میں چلا کر جعفر اور رضوانہ کو پکارتا، طوفاں کا وہ سارا پہاڑ پیر کے مزار پر ٹوٹ پڑا اور پل بھر میں تمام بھیڑ اور اس کے ساتھ پیر کے مزار کو اپنی چپیٹ میں لے کر لوٹنے لگا۔۔۔ میرے خانداں میں میری دو بہنیں خوفناک لہروں سے بچیں۔۔۔ طوفان کی اس لہر نے مجھے ایک دم گونگا اور اپاہج کر دیا۔ میرے پاؤں ایک ہی جگہ پر ریت میں دھنس گئے اور میری زباں پر فالج گر گیا۔ میں نے خوف سے کانپتے ہوئے دیکھا۔ جعفر سب کو ٹاٹا سوموکی طرف دھکیل رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔۔۔ شکیل، بھاگو قیامت کا قہر ابھی باقی ہے۔"

ناول میں کئی مقامات ایسے بھی آئے ہیں کہ قاری بیحد جذباتی ہو جاتا ہے آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں لیکن اگلے ہی پل مصنف اپنے قاری کو سنبھال لیتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس قہر نے انساں سے مال اسباب زندگی کی ہر قیمتی شے اور خوشی چھین لی تھی۔ شکیل حمید کا سب کچھ اس طوفان کی نذر ہو چکا تھا اس کی بہنیں حسینہ اور شکیلہ اپنے اپنے شوہر اور بچے گنوا چکی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ زندگی پھر معمول پر آ گئی۔ زندگی میں پھر وہی رعنائیاں اپنا رنگ دکھانے لگیں حسینہ جعفر کے ساتھ سیٹ ہو چکی تھی۔ شکیلہ نے نور شاہ نامی نوجواں سے شادی کر لی تھی اور شکیل حمید بس اتنا بڑا سانحہ جھیلنے کے بعد آہستہ آہستہ زندگی کی جانب لوٹنے لگا تھا۔ مریم نے اسے بر وقت سنبھال لیا تھا اور پانچ دسمبر ۲۰۰۵ء کو مریم اور شکیل حمید رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ناول کا اختتامیہ اس کی زباں سے ملاحظہ ہو۔

''میں نے مریم کے کندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا ہے اور مریم میرا ہاتھ تھامے، مجھے چرچ کے خاموش، پُرسکوں اور پاک وصاف ماحول سے باہر لے آئی ہے۔ اب میرے سامنے نکھرا ہوا نیلا آسمان ہے اور اس کے ایک حصے میں سورج اپنی آب وتاب سے چمک رہا ہے۔

مجھے لگ رہا ہے کہ میرے اندر بپھرتا ہوا تیز و تند طوفان اب دھیرے دھیرے شانت ہونے لگا ہے۔"

میں اپنی بات ان سطور پر ختم کرتی ہوں کہ مجھے ذاکر صاحب کی شخصیت میں ہمیشہ ایک باوقار ادیب اور باعظمت انسان کے نقوش نظر آئے۔ انھوں نے اپنا آپ تسلیم کروانے کے لئے کبھی ذاتی کوشش نہیں کی۔ خاموشی سے اپنے تخلیقی عمل میں مصروف رہے اور تا حال ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اغلب نہیں کہ وہ عنقریب پھر کوئی ایسا شاہکار ہمارے سامنے پیش کر کے حیرت میں ڈال دیں۔ اردو حلقوں کے لئے یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ حکومتِ ہند نے ۲۴ رجنوری ۲۰۰۶ء کو ذاکر صاحب کی ادبی خدمات کے لئے پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ اس سے اس حقیقت کو طاقت ملتی ہے جہاں ذاکر صاحب کی تخلیقات نقطۂ عروج پر نظر آتی ہیں۔ دراصل وہ اب ایسے مقام پر ہیں جہاں سے راستہ مزید بلندی کی جانب جاتا ہے۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے تا کہ وہ اس طرح اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں۔ آمین ثم آمین۔

شمس الرحمن فاروقی

’’تجھے ہم ولی سمجھتے‘‘ — چند خیالات

اردو میں، اور اردو ہی کیا، تمام ہندوستانی زبانوں میں ایسے افسانے اور منظومات کم ہیں جن میں مرد کے بالمقابل عورت کی سماجی اور نفسیاتی صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہو، یعنی ایسی تحریریں جن میں ہمارے مرد حاوی معاشرے میں عورت کی حیثیت کا جائزہ لیا گیا ہو اور آج کے زمانے میں، جب تانیثیت (Feminism) کا رواج بڑھ رہا ہے اور عورت بحیثیت صنف، یعنی عورت کی زندگی کے ان پہلوؤں کا مطالعہ بھی بڑھ رہا ہے جنھیں انگریزی میں Gender Issues کہا جاتا ہے، تانیثی تحریریں صرف عورتیں ہی لکھ رہی ہیں۔ ایسی تحریروں میں اکثر و بیشتر یہ بات نمایاں کی جاتی ہے کہ عورت کے اوقات اس معاشرے میں بہت تلخ ہیں۔ مسائل کا تجزیہ اور گتھیوں کا حل کم نظر آتا ہے۔ جدید زمانے میں بیدی شاید واحد مرد مصنف ہیں جنھوں نے عورتوں کی مظلومیت کو اپنے افکار کا موضوع بنایا اور ایسے کئی افسانے لکھے جن میں ان کی فنی چابک دستی، زبان کی تخلیقی قوت اور دل کی دردمندی بیک وقت نمایاں ہیں۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان افسانوں کے ذریعہ بیدی ہمیں عورت کے بارے میں کسی فلسفیانہ یا وجودی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ عورتیں یہ سارے دکھ کیوں اٹھائیں، یا کیوں اٹھاتی ہیں، اس کے بارے میں وہ بس اتنا ہی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ یہ تو حقائقِ حیات میں سے ایک حقیقت ہے۔

آج اردو ادب کی دنیا میں جو عورتیں تانیثی خیالات رکھتی ہیں انھیں بیدی کے افسانوں سے شاید اطمنان نہ ہوتا ہوگا۔ بیدی صاحب کی بے مثال خوبصورت نثر ان کے ان افسانوں کو تباہی سے بچاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جن میں مرد کے بالمقابل عورت کی نفسیات یا حقیقت یا مرتبے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ لیکن بیدی صاحب کے افسانے شاید کچھ زیادہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یا شاید کچھ کم کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے باوجود بیدی صاحب کا افسانہ غالب کی زبان میں ؏

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

کہنا تو دور رہا، خود بیدی صاحب اسی قاعدہ آسمان کی توفیق نہیں تو تصدیق کرتے ہوئے ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات شاید عورتیں ہی محسوس کرسکتی ہیں۔ تانیثی تنقید کا پہلا اور سب سے بنیادی

اصول یہ ہے کہ عورتیں ہی عورتوں کو سمجھ سکتی ہیں۔ لہٰذا عورتوں کے بارے میں مردوں کی تحریریں ہمیشہ مشکوک ٹھہریں گی اور تانیثی تنقید کا دوسرا اصول یہ ہے کہ عورتیں اور مردوں کے پڑھنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ عورتیں اپنے بارے میں، اور دنیا کے بارے میں، ایسی بہت سی باتیں محسوس کر لیتی یا دیکھ لیتی ہیں جو مردوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں اور اوجھل ہی رہتی ہیں۔

ایسی صورت میں راجندر سنگھ بیدی ہو یا کشمیری لال ذاکر، عورتوں پر قلم اٹھائیں گے تو ان کے سامنے ایک حد تک خسارے میں رہیں گے، کیوں کہ عورتیں کہیں گی، اور یہ کہنے میں شاید حق بجانب ہوں گی کہ ع

خضر کیا جانیں بھلا اگلے زمانے والے

آپ ایک تو مرد لوگ، اور دوسرے اگلے زمانے کے لوگ، آپ ہماری باتیں کیا سمجھیں گے، آپ لوگ اپنے جیسوں کے بارے میں لکھئے اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ لیکن ذرا ٹھہر کر سوچیں تو یہی نکتہ ہے جہاں تانیثی تنقید کو ذرا اپنا دل ٹٹولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا کشمیری لال ذاکر کے یہ افسانے مردوں کے بارے میں نہیں ہیں؟ اگر نہیں ہے تو پھر اس عنوان کا کیا مطلب ہے ''تجھے ہم ولی سمجھتے''؟ غالب نے اپنی (اپنے خیال میں) ایک بنیادی کمزوری کا ذکر کیا تھا کہ میاں اگر تم شرابی کبابی نہ ہوتے تو دنیا تمھیں ولی سمجھتی۔ تو کیا کشمیری لال ذاکر یہی کہتے ہوئے نظر نہیں آرہے ہیں کہ صحیح، ہم مرد ہیں، اور ہر روز کر رہے ہیں، جو ہماری برتری کو مشکوک کر دیتا ہے؟ یعنی ایک طرح سے دیکھئے تو یہ افسانے مردوں کے حق میں قرار داد جرم ہیں کہ ان کے اخلاقی اصولوں میں اتنی بھی گنجائش نہیں کہ دنیا کی آدھی آبادی کے بارے میں محبت بھرا، یا محبت بھرا نہ سہی، برابری کا رویہ اختیار کر سکیں۔

میں نے لڑکپن میں بہت سے افسانے پڑھے تھے جو معمولی درجے کے سہی، لیکن جن میں مردوں، اور خاص کر شوہروں کے مظالم کا بہت ذکر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو بندھوا مزدور یا ظالم زمیندار کی رعایا سے بھی کمتر سمجھتے تھے۔ وہ سب افسانے مردوں ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ گویا حساب برابر ہوا، میں دل میں سوچتا۔ یعنی اگر مرد لوگ عورتوں پر ظلم کر رہے ہیں تو عورت ذات بھی کچھ کم نہیں۔ لیکن یہ تو افسانہ نگاری نہ ہوئی، قصے کے روپ میں اپنے اپنے ذاتی تعصبات کا اظہار ہوا۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ ان افسانوں میں مرد ظالم تھے، عورتوں کو وعدہ خلاف یا بے وفا دکھایا جاتا تھا۔ گویا عورتیں ظالم نہیں، بے وفا ہیں، اور مرد بے وفا نہیں، ظالم ہیں۔

افسانوں کی یہ تقسیم مجھے کچھ اچھی نہ لگتی تھی اور بیدی صاحب کے ''مظلوم عورت'' والے افسانوں میں تو عورت ہو، بیوی ہو یا کچھ اور عموماً کسی ظالم یا بے ضمیر مرد کا شکار ہی نظر آتی تھی، خود اسے کبھی کوئی

احتجاج کرتے نہ دکھایا جاتا تھا۔ کشمیری لال ذاکر کے اِن افسانوں کا موضوع بیدی صاحب سے در اصل مختلف ہے، کیونکہ بیدی کے افسانے اب پچاس ساٹھ برس پرانے ہو گئے ہیں اور مرد سماج نے عورتوں پر ظلم کرنے کے کچھ اور طریقے بھی دریافت یا ایجاد کر لئے ہیں۔ ذاکر صاحب کے زیرِ نظر افسانوں کا تعلق انھیں نئے طریقوں سے ہے۔ انھیں مجموعی طور پر ''گھریلو تشدد'' (Domestic Violence) کہا جا سکتا ہے لیکن ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' کے افسانوں میں بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ یہاں ''گھر'' استحصال کا میداں ہے لیکن عورت یہاں سر اٹھا کر گھر اور خاوند کو چھوڑ بھی سکتی ہے۔

''دوسرا مرد'' غیر معمولی افسانہ ہے۔ متکلم ایک عورت ہے جو اپنی مرضی سے شادی کرتی ہے۔ پھر محنت مشقت کر کے اپنی تعلیم پوری کر کے نوکری حاصل کرتی ہے تا کہ گھر کی کفالت میں شوہر کا ہاتھ بٹا سکے۔ لیکن چند ہی برسوں میں محبت کی شادی کی حست ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور متکلم اور اس کے شوہر کے درمیاں مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کا کوئی حل ظاہر نہیں ہے۔ لیکن ایک بچے کی پیدائش کے چند دن بعد وہ گھر چھوڑ دیتی ہے

''میرے ماتھے کا زخم تو بھر گیا لیکن زخم کی جگہ ایک جلتی ہوئی گرم مہر میری جلد کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔ میں جب بھی آئینہ دیکھتی میرے ماتھے پر چپکی ہوئی مہر جلنے لگتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ تپش کی ایک جھلس دینے والی رو میرے تمام جسم میں پھیلنے لگی ہے۔

بلرام ابھی دس ہی دن کا تھا کہ میں نے پرم پال کا گھر چھوڑ دیا۔

تنہائی کے بیس سال گزرتے ہیں، بلرام جواں ہو کر اپنی مرضی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماں اسے ارادے سے باز رکھنا چاہتی ہے، ہونے والی بہو کے بظاہر استقلال مزاج اور سچے وعدوں کے آگے اس کا عزم ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اس کی شادی کی رضامندی تو دے دیتی ہے لیکن اس کے دل میں دعائیں اور خوف امڈ رہے ہیں۔''

اس طرح دیکھئے تو ''دوسرا مرد'' صرف گھریلو تشدد یا میاں بیوی کے بگڑتے ہوئے باہمی رشتے کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ افسانہ ہمیں اپنی نئی دنیا اور نئے ماحول کے بارے میں متنبہ کرتا ہوا نظر آتا ہے جہاں آدرشوں کا خوں ہو چکا ہے۔ ''ڈریم لینڈ'' بھی بظاہر کچھ نا کام سی نابرابری کی شادی کی داستان ہے۔ لیکن دراصل یہ اس طرح کی مفاہمت کی داستان ہے جو ہم اب زندگی میں کئی کئی بار کرتے ہیں۔ افسانے کے مرکزی کردار کی ڈریم لینڈ کوئی خوشگوار، بھرا پرا گھر نہیں جس میں چاہنے والا شوہر اور پیارے پیارے بچے ہوں، بلکہ ایک خوبصورت پہاڑی مقام ہے جس کا منظر ایک خوبصورت بنگلے کی خواب گاہ سے نظر آتا

ہے۔ یہ ڈریم لینڈ اس نے اپنی آرزوؤں کا خون کرکے حاصل کیا ہے۔ وہ اس میں خوش ہے یا نہیں، اس کے بارے میں افسانہ نگار کوئی واضح اطلاع ہمیں نہیں دیتا۔

کشمیری لال ذاکر کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ افسانے کو بظاہر ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح قاری کو اپنی رائے قائم کرنے اور اپنے نتائج خود نکالنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ذاکر کے افسانے ہمیں سوچنے کی ترغیب دیتے ہیں، ہماری طرف سے سوچتے نہیں۔ ''ڈبل شفٹ'' کی عورت اب چالیس سے اوپر ہے'' اور میں تین بیٹوں کی ماں ہوں۔'' وہ آگے کہتی ہے ''میری زندگی کا دائرہ بہت محدود ہے میں نے کبھی بہت سنجیدگی سے نہیں سوچا ہے اپنی زندگی کے بارے میں۔ نہ ہی میں نے کبھی زیادہ بات کی ہے جو لوگ کم بولتے ہیں لوگ ان پر اعتبار نہیں کرتے، انھیں گھنے سمجھتے ہیں۔''

پھر ایسی بظاہر بے رنگ، کم گو، اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں بلکہ صرف ہائی اسکول پاس عورت میں کیا خاص بات ہے جس کے باعث وہ اس افسانے کی متکلم بھی ہے اور اس پر چھائی بھی ہوئی ہے؟ وہ کہتی ہے ''میں جب بھی کسی معاملے پر بات کرتی، ہمارا جھگڑا شروع ہو جاتا۔'' اور یہ جھگڑا عموماً اس طرح ختم ہوتا کہ شوہر، جو شراب کے نشے میں کم و بیش دُھت ہے، بیوی پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ اب بچے بھی اس بات کو جان گئے ہیں لیکن بڑا بیٹا جس سے کچھ توقع ہو سکتی تھی، اپنے کسی معاملے میں ماں کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتا۔ لیکن وہ اپنے رومانس کو پھلنے پھولنے کے لئے رقم بھی ماں ہی سے مانگتا ہے۔ ماں جو ڈبل شفٹ میں کام کرتی ہے اور جوں توں کرکے گھر چلاتی اور مکان کی قسط بھی ادا کرتی ہے، بالآخر بیٹے کا تقاضا پورا کرتی ہے یعنی اسے پانچ سو روپے دے دیتی ہے، حالانکہ اسے بیٹے کے لچھن کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔ افسانہ ختم ہوتے ہوتے ہم بیٹے کی آنکھ میں ماں کے لئے تشکر کے آنسو دیکھتے ہیں اور ہمیں شوہر کی آواز بیڈ روم سے آتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ ''آج چائے نہیں ملے گی کیا؟

ظاہر ہے کہ افسانہ یہاں ختم نہیں ہوا اور ہو بھی گیا۔ کشمیری لال ذاکر کوئی حل بتانے یا کسی رائے زنی سے گریز کرتے ہیں اور ہمیں سوچتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔

چند مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ اپنے بڑی معنویت لئے ہوئے ہے۔ ہم لوگ، جو کشمیری لال ذاکر کو اپنے لڑکپن سے پڑھ رہے ہیں، یہی دعا کر سکتے ہیں کہ خدا اُن کے قلم کو یوں ہی رواں رکھے۔

علی احمد فاطمی

سچ اور موکش کو تلاش کرتی کہانیاں

مطالعہ مشاہدہ کی روشنی میں یہ بات پختہ ہوئی کہ مشکل کہانی لکھنا جتنا آساں ہے کہانی لکھنا اتنا ہی مشکل۔

کشمیری لال ذاکر ایک آسان کہانی کار ہیں اور آسان کہانی لکھنا مشکل کہانی لکھنے کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں اور دلیلیں ہیں لیکن فی الحال اتنا ہی عرض کروں گا کہ یہ دارومدار اس پر بھی ہے کہ فنکار کے ذہن میں فکر وفن کے معیار کیا ہیں اور مقصدِ ادب کیا ہے اور اسی سے جڑتا ہے سوال کہ آپ کا مقصدِ حیات کیا ہے۔ یہ چیزیں واضح ہوں تو اپنے آپ واضح ہوجاتا ہے کہ آپ کا کلام اور پیغام کیا ہے اور اس کا خطاب کس سے ہے اور کیوں ہے۔ اس کا جواب آپ کو پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعہ سوزِ وطن میں ملے گا۔ پریم چند لکھتے ہیں

> ''ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم ونثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت''۔

ملاحظہ کیجئے، اس طویل جملہ میں تین بار لفظ قوم آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند کا خطاب چند مخصوص قارئین وناقدین سے نہ تھا بلکہ پوری قوم سے تھا۔ ایک لفظ اور آیا ہے ''صفائی'' یعنی ایسی صفائی جیسے آئینہ میں صورت۔ اس سے مراد تکنیک اور اسلوب سے ہے۔ یہ کام بھی آسان نہیں اور پریم چند نے یہ مشکل کام بھی آسان کر دکھایا اور وہ کہانیاں جو دادی، نانی بچوں کو سلانے کے لئے کہتی سنتی تھیں پریم چند نے قوم کو جگانے کے لئے لکھیں اور بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے۔ ذہن اور مشن بڑا ہو تو چھوٹی چھوٹی باتیں اور کہاوتیں بھی بڑی ہوجایا کرتی ہیں۔

پریم چند نے تو یہ سب بڑے پیمانے پر کیا اور سوچے سمجھے مقصد اور ایک منصوبہ کے تحت کیا اور

پوری زندگی اس بڑے کام کے لئے وقف کر دی۔ اسی لئے پریم چند کا اپنا ایک دبستان قائم ہوا اور اس کی تاریخی گونج دور دور تک پہنچی۔ دیکھا جائے تو پوری ترقی پسند تحریک بالعموم اور ترقی پسند افسانہ نگار اسی دبستانِ فکر و فن کے افراد تھے۔ اپیندر ناتھ اشک بھی، بلونت سنگھ بھی، بیدی اور قاسمی بھی، یہ سب اور آگے تک گئے اور زندگی کی پرتوں اور جہتوں اور پیچیدگیوں کا اور زدیک سے، گہرائی سے حقیقت اور معروضیت کے ساتھ سمجھا اور پیش کیا اور نہ صرف خود بڑے ہوئے بلکہ کہانی کی صنف کو بھی بڑا کر دیا۔ کشمیری لال ذاکر اسی کارواں کے ایک ہونہار، لائق اور کمیٹیڈ قسم کے افسانہ نگار اور فنکار ہیں اور اب تو اس قدیم اور تاریخ ساز قافلہ کے غالباً آخری ستون۔

زیرِ نظر کتاب ''اس صدی کا آخری گہن'' میں بطور تعارف ان کے بارے میں مرقوم ہے

> ''کشمیری لال ذاکر کا تعلق ترقی پسند مصنفین کے اس قافلے سے ہے جس کے میر کارواں پریم چند تھے۔ ۱۹۴۳ء میں آپ اپنی پہلی کہانی ''الگ الگ راستے'' کے ساتھ ادیبوں کی صف میں شامل ہوئے''۔

کشمیری لال ذاکر نے دنیائے ادب اور دنیائے افسانہ میں تقریباً پینسٹھ سال گذارے ہیں۔ اس درمیان انہوں نے درجنوں ناول اور متعدد افسانوی مجموعے اردو دنیا کو دیئے ہیں اور شاید اس وقت اردو دنیا کے بزرگ ترین فنکار اور قلمکار ہیں اور آج بھی متحرک اور رواں دواں، ایسا فنکار جس نے ایک زندگی جی ہے، سرد و گرم دیکھے ہیں۔ حادثات اور تجربات سے گذرا ہو وہ اپنی کہانیوں میں زندگی سے کس طرح الگ ہو سکتا ہے۔ ان کہانیوں کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں

> ''میں نے ان کہانیوں میں ان لمحوں کی عکاسی کرنے کی سعی کی ہے جن لمحوں میں میرے کرداروں نے زندگی کو پہچاننے اور انسانی قدروں اور انسانی رشتوں کو مضبوط کرنے کی معمولی معمولی کوششیں کی ہیں۔ ہماری یہ چھوٹی چھوٹی کوششیں ہی زندگی کو جینے کے قابل بناتی ہیں اور ہم میں یہ اعتماد پیدا کرتی ہیں کہ زندگی خوبصورت ہے اور ہمیں اسے زیادہ دلکش اور زیادہ سندر بنائے رکھنے کا جتن بھی کرنا چاہئے''۔

ان جملوں میں کئی بار زندگی اور انسانیت کے الفاظ آئے ہیں اور سب سے بڑی بات ہے اس دونوں کو زیادہ دلکش بنانے کا جذبہ و نظریہ۔ اس سے علم و ادب کا رجائی اور معروضی نظریہ جنم لیتا ہے اور غم بھی نشاط غم میں بدل جاتا ہے اور اچانک خوبصورت و گلابی رنگ کے کرداروں کے مقابلے ہوری، دھنیا، گھیسو،

مادھو جیسے رمنی اور کھر درے کردار اردو فکشن کے خوبصورت اور معیاری کردار بن جاتے ہیں کیونکہ صداقت اور حقیقت کی اپنی جمالیات ہوا کرتی ہے۔اسی جمالیات کے ارد گرد نظر آتی ہیں کشمیری لال ذاکر کی کہانیاں جنہیں ذرا ارد یک سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اس مجموعہ کی پہلی کہانی ہے ''چھٹا ادھیائے''۔ یہ سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کے احساسات اور ملک کے سیاسی حالات کی کہانی کم، رپورٹنگ زیادہ ہے۔ راجیو نے کئی موتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔والد فیروز گاندھی، نانا جواہر لال نہرو، بھائی سنجے گاندھی، والدہ اندرا گاندھی اور پانچواں اُدھیائے یا حادثہ خود راجیو گاندھی تھے۔ پانچویں ادھیائے کو گیتا میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔اسی ادھیائے میں بھگوان کرشن نے ارجن سے کہا تھا کہ ان کو عمل سے منہ نہیں موڑنا چاہئے۔نشکام ہو کر بنا پھل کی تمنا کئے ہوئے کیونکہ عمل ہی زندگی کی بنیاد ہے۔کرم ہی جیون کا شیر شک ہے۔مرتیو تو انت ہے جیون کا— لیکن کہانی کا عنواں ہے ''چھٹا ادھیائے'' جس پر کہانی ان جملوں کے ساتھ ختم ہوتی ہے

> ''کتھا کا چھٹا ادھیائے جس میں ہندوستاں کے اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی بات کہی جانے والی تھی، اس ان کہی کو اب کون پورا کرے گا''۔

ان سوالات اور بعض اور معنی خیز جملوں کے ذریعہ کہانی کو دائرۂ فکر و فلسفہ میں لانے کی عمدہ کوشش ضرور ہے تاہم کہانی رپورٹنگ تکنیک میں ہونے کی وجہ سے راستے بدل دیتی ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ کہانی کا دائرہ ملکی سیاست کے کمال و زوال کو خوبصورتی سے احاطہ کرتا ہے اور اسے زندگی کے درشن کے قریب کرتا ہوا فنا و بقا کے قریب کر دیتا ہے۔

''پھولاں پتھیرن'' اس مجموعہ کی عمدہ کہانی ہے جو شروع تو ہوتی ہے راج موہن کی موت سے لیکن پہنچتی ہے اینٹوں کے بھٹے کی زندگی تک کیونکہ راج موہن کا اینٹوں کے بھٹے کا کاروبار تھا۔کہانی کی ابتداء میں بھٹہ اور بھٹے کے مزدوروں کے جو حالات اور نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ دلآویز ہے اور ایک زندگی کا پتہ دیتے ہیں جس سے کہانی میں ثقافت اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ ذرا ان کی زندگی کے یہ معاملات اور معمولات دیکھئے

> ''مزدوروں کو ہر اماوس اور پورن ماشی کے دن ان کے حساب کے مطابق مزدوری کا بھگتان ہوتا ہے۔ یہی دو دن مزدوروں کے جشن کے ہوتے ہیں۔ رات بھر گاتے ہیں، دارو پیتے ہیں اور چار دن کے بعد دکاندار سے اُدھار پر آٹا، دال، چاول خریدنا

شروع کردیتے ہیں''۔

یہ ہے مزدوروں کی زندگی کا ایک رُخ۔ دوسرا رُخ یہ ہے

''بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی کا ڈھانچہ دوسرے مزدوروں کے لائف پیٹرن سے مختلف نظر آیا۔ ان مزدوروں کو کام دلانے کے لئے ایک تیسرا شخص ہوتا ہے جو نمبردار کہلاتا ہے۔ وہ بھٹے کے مالک سے مزدور سپلائی کرنے کا ایگریمنٹ کرتا ہے۔ وہ دونوں پارٹیوں سے کمیشن لیتا ہے۔ مالک سے بھی اور مزدور سے بھی۔ یہ روایت اتنی پرانی ہے کہ بعض بھٹوں پر تو بندھوا مزدوروں کی پرتھا چل پڑی ہے۔ نمبردار اور بھٹے کے مالکوں نے آپس میں ایک گہری سازش کے تحت مزدور اور اس کے خانداں کو ایک طرح سے اپنا غلام بنالیا ہے''۔

ذاکر صاحب نے بڑے قریب سے ان مزدوروں کی زندگی کو محسوس کیا ہے اور اس کے استحصالی نظام کو دردانگیز انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ دردانگیزی محض جذباتیت سے مملو نہیں ہے کہ اس میں ایک نوع کی زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کا مفکرانہ اور فنکارانہ اشاریہ بھی ہے کہ عمدہ کہانی صرف کہنے سننے کی بات نہیں ہوتی بلکہ اس آسان سے عمل میں زندگی کا عمل اور ردِ عمل پوشیدہ رہتا ہے اس کا اعلامیہ راج موہن کا وہ کردار ہے جو اس غلیظ بستی میں نسبتاً پاک صاف ہے۔ مزدوروں کا ہمدرد ہے۔ شاید اسی لئے اس کی موت ہو جاتی ہے کہ وہ اس نظام تجارت میں موروں نہیں ہو پاتا۔ لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک نسوانی کردار کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔ یہ کردار ہے پھولاں پتھیرن کا جو کہانی کا عنوان بھی ہے۔ راستھالی عورت ہے، صحت مند ہے اور شرابی شوہر کی بیوی لیکن بانجھ بھی ہے۔ تعارف کا یہ جملہ دیکھئے

''پھولاں جو بانجھ بھی ہے اور شاید اسی لئے تیز مزاج بھی تھی۔ ایک بھٹے پر زیادہ نہ ٹکتی تھی۔ اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا''۔

اسی خراب نظام، غربت، ٹوٹتی بکھرتی معیشت، نمبردار اور ٹھیکے دار کے مظالم انساں کو کس قدر کٹھور اور سنگدل بنا دیتے ہیں اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن پھولاں ایک عورت ہے اور بانجھ بھی۔ اپنی تمام تر مشکلات کے باوجود راج موہن کے حسنِ سلوک سے اس کے اندر کی چھپی ہوئی عورت ممتا کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے اور یہی عورت کا عورت پن یا ممتا اس کہانی کا مرکزی خیال ہے کہ راج موہن کی موت کی خبر پا کر وہ چیختی ہوئی شمشان کی طرف بھاگتی ہے۔ یہاں پر مصنف نے چند جملے کچھ اس طرح رقم کئے ہیں

''ایک عورت اپنے خاوند کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے بیٹے کی لاش کے ساتھ چتا میں کود کر جلنے والی تھی۔ یہ ایک اور غلط پرتھا قائم ہونے والی تھی۔ ہندوستانی عورت کا مقدر کیا صرف جلنا ہی ہے؟ چاہے وہ بیوی ہو، چاہے ماں ! ایسا نہیں ہونا چاہئے''۔

کہانی میں بالخصوص خاتمہ پر ہلکی سی ڈرامائیت ضرور آ گئی ہے۔ تاہم بھٹے کی زندگی، مزدوروں اور عورتوں کے حالات، وہاں کا استحصالی نظام، اپنی تمام تر مکروہات کے باوجود رشتوں کا احساس بیداری اس کہانی کا پیغام ہے جو محبت اور زندگی کا پیغام دیتی ہے۔ مصنف نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنے بیانیہ میں روانی پیدا کرتے ہوئے اپنی بات موثر ڈھنگ سے کہی ہے اور کہانی اپنے اثرات مرتب کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ کہانی میں چونکا دینے والے واقعات نہ بھی ہوں، متاثر کرنے والے کردار بھی نہ ہوں، لیکن اگر وہ زندگی کا کوئی ایسا رُخ پیش کر رہی ہے جس نے عرفان اور ایقان کی نئی شکل بنتی یا بگڑتی ہے تو کہانی اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

کچھ کہانیاں ایسی ہیں جو عوانات کے تحت بظاہر الگ الگ سی لگتی ہیں، جیسے ''چہروں پر لکھا اتہاس''، ''ایک کامیاب مرد''، ''دوسرا مرد''، ''ایک سویا ہوا شہر''، ''گڑی''، ''ڈریم لینڈ'' وغیرہ۔ لیکن یہ سب کی سب سماجی کہانیاں ہیں۔ ان کے سارے کردار، واقعات، معاشرہ اور معاشرتی زندگی کے پیچ وخم سے پیدا ہوتے ہیں۔ ''دوسرا مرد'' میں گھریلو زندگی، عام سا عشق اور پھر عام سے مسائل جو بڑے میکانکی ڈھنگ سے تیزی سے آگے بڑھتے ہیں، لیکن روزمرہ کی زندگی اور اس کے عام سے کردار جب اپنے ذاتی اور حقیقی مسائل سے جھوجھتے ہیں تو ایک عام قاری کو اپنی زندگی کے عکس نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ ان کی پیش کش میں اس قدر سادگی، تاثیر اور معنویت رہتی ہے اور دبا دبا سا پیغام بھی کہ اس کی قربت اور اپنائیت ہی ان کہانیوں کا وصف ہے۔ ایک منزل ایسی آتی ہے کہ قاری اور کہانی ہی ہوتی ہے، مصنف غائب ہو جاتا ہے اور مصنف کی گمشدگی کہانی کی کامیابی ہوتی ہے۔ فرانس کے ناول نگار آندرے ژید کا کہنا ہے کہ کتاب ایک شراکت کا نام ہے۔ اس کی قدر و قیمت جتنی بڑھتی جائے گی اتنا ہی مصنف کا عمل دخل کم ہوتا جائے گا۔ ان کہانیوں کا ایک بہت بڑا وصف انسانی رشتے ہیں جو مختلف راویوں سے زیر غور اور کبھی کبھی زیر بحث رہتے ہیں۔ مرد اور عورت کے حوالے سے یہ معنی خیز جملے ملاحظہ کیجئے

''مرد عورت کا وشواس خریدتا ہے۔ ایک چھوٹی سی گھٹن بھری چار دیواری کے بدلے میں اور ایک دن اُسی چار دیواری کی زہر بھری سڑاند میں وہ دم توڑ دیتی ہے ہرار

عورتوں کے ساتھ مرد عورت کو ایندھن بناتا ہے۔ عورت مرد کی بنائی ہوئی بھٹی میں عمر بھر تل تل جلتی رہتی ہے''۔

اسی طرح ''یاترا سے لوٹی پوتر لڑکی'' کہانی میں یہی خیالات فلسفہ کا روپ لے لیتے ہیں۔ اچھی بات یہی ہے کہ کہانی، کہانی ہی رہتی ہے۔ اس میں سچ کی تلاش ہے

''سچ کیوں نہیں بولتے؟''

''سچ بولنے والوں کا حشر بہت برا ہوتا ہے''۔

''تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟''

''کرائسٹ کی، بدھ کی، گاندھی کی''۔

''مگر انہوں نے سچ بولا ہی کب تھا''۔

''اور کیا کیا تھا انہوں نے؟''

''وہ تو صرف سچ کی تلاش کرتے رہے تھے''۔

''اگر سچ کی تلاش کرنے والوں کا یہ حشر ہو سکتا ہے تو سچ بولنے والوں کا کیا حشر ہوگا؟''

''وہ موکش پراپت کر لیتے ہیں''۔

''یہ موکش کیا ہے؟''

''تم جیسے پاپی جیو یہ راز نہیں جان سکتے''۔

جتنے اچھے اور بنیادی سوالات، اتنی ہی اچھی پیشکش۔ ایک اور کہانی ''ایک کامیاب مرد'' میں کامیابی کا مطلب سمجھتا ہوا یہ کردار

''مہاجن صاحب — آپ کے خیال میں زندگی میں کامیابی ہمیں کیسے ملتی ہے؟''

''محنت سے''۔

''اور؟''

''ستاروں کی مدد سے''۔

''اور؟''

''اور بیوی کی مہربانی سے''۔

''وہ کیسے؟''

'اگر بیوی گھریلو ہے اور اس کی کچھ تمنائیں ہیں تو وہ اپنے خاوند کو ہر لحہ انسپائر کرتی رہتی ہے۔ اس کا حوصلہ نہیں ٹوٹنے دیتی۔ اس سے رات دن کی فرمائشیں کر کے اسے پریشان نہیں کرتی۔ وہ اپنے خاوند کے مسائل جانتی ہے اور ان کا حل تلاش کرنے میں اُس کی مدد کرتی ہے''۔

''کیسے؟''

''پیار سے، ہمدردی سے، سیکس سے۔ سیکس آدمی کی بہت بڑی کمزوری ہے اور ایک سمجھدار عورت مرد کی اسی کمزوری کو طاقت میں بدل دیتی ہے''۔

زندگی کی کامیابی، انسانی رشتے، مسائل کا حل، انسپائریشن اور سیکس سبھی کچھ آ گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی کتنی شاخیں ہیں، پھل تک پہنچنے کے لئے اسے کیا کیا کرنا پڑتا ہے، لیکن جڑ میں ہے محبت اور محنت۔ اسی سے حرکت و حرارت ہے۔ ان کہانیوں میں یہ پیغام بدرجہ اتم موجود ہے۔ ''ایک کامیاب مرد'' جو عنوان کے تحت تو مرد سے تعلق رکھتی ہے لیکن کہانی کی ابتدا ہوتی ہے عورتوں کے مزاج اور قسموں سے۔ شوہر بیوی یا مرد اور عورت کے رشتے۔ درمیاں میں گھر اور سماج اور پوری زندگی۔ ''ایک سویا ہوا شہر''، ''گڈی''، ''ڈریم لینڈ'' وغیرہ میں بھی اگرچہ ان کا ماحول مختلف سا نظر آتا ہے لیکن تان ٹوٹتی ہے انسانی رشتوں اور زندگی کے پیچ و خم پر۔ کچھ کہانیاں ایسی ضرور ہیں جیسے ''آتم کتھا''، ''چھٹا اُدھیائے''، ''ہم سب گواہ ہیں'' وغیرہ جو کہانیاں کم رپورٹ یا رپورتاژ کے زمرے میں آتی ہیں لیکن زیادہ تر کہانیاں انسانی رشتوں، جدوجہد، حالات کے جبر و قہر کے ارد گرد گھومتی ہیں جن کے بطن سے زندگی کا نظریہ، فلسفہ، جینے کے مختلف انداز جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ ان سب تکرار، گفتار اور کردار میں ایک روشنی کی چمک، امید و نشاط کی کیفیت اور زندگی کو سمجھنے ہی نہیں بلکہ اس پر قابو پانے کی للک صاف نظر آتی ہے۔ وہ اس لئے کہ کشمیری لال ذاکر صرف کہانی کار نہیں ہیں بلکہ ایک ترقی پسند دانشور بھی ہیں۔ تحریک کے تئیں بھی اور زندگی کے تئیں بھی ایک صالح نظریہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں

''میں نے ان کہانیوں میں ان لمحوں کی عکاسی کی ہے جن لمحوں میں میرے کرداروں نے زندگی کو پہچاننے اور انسانی قدروں اور انسانی رشتوں کو مضبوط کرنے کی معمولی سی کوششیں کی ہیں۔ ہماری یہ چھوٹی چھوٹی کوششیں ہی زندگی کو جینے کے قابل بناتی ہیں اور ہم میں یہ اعتماد پیدا کرتی ہیں کہ زندگی خوبصورت ہے اور ہمیں اسے زیادہ دلکش

اور سندر بنانے کا جتن کرنا چاہئے''۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ فنکار اس نوع کے خیالات اور کہانی کے پیغامات میں بعد اور تضاد ہوتا ہے۔ کہانی کار کچھ کہتا ہے اور کہانیاں کچھ اور۔ لیکن ذاکر صاحب کی کہانیوں اور خیالات میں ہرگز تضاد نہیں ہے۔ جو باتیں درج بالا تحریروں میں کہی ہیں وہ ان کی تقریباً تمام کہانیوں میں ٹکڑوں ٹکڑوں میں رچی بسی ہیں جس سے کہانی صرف کہانی نہیں رہتی بلکہ جا بجا کہیں مزہ، کہیں نظریہ اور کہیں فلسفہ بن جاتی ہے۔ لارنس نے کہا تھا کہ فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن نہیں کہلایا جا سکتا۔

یہ کہانیاں لارنس کے معیار پر اُترتی ہیں یا نہیں، کہہ نہیں سکتا کیونکہ ان میں کہیں کہیں ارماں زیادہ ہے اور فکشن بھی زیادہ لیکن اس کو ہم کسی طرح کا عیب نہیں کہہ سکتے کیونکہ زندگی فیکٹ اور فکشن کے درمیاں سے ہو کر گذرتی ہے۔ ایک اچھے فنکار میں یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ کہاں فیکٹ فکشن میں بن کر زیادہ مزہ دے گا اور کہاں فکشن ایسا مزہ دے کہ فیکٹ معلوم ہونے لگے۔ یہ خصوصیت ذاکر صاحب کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔

کہانی کا فن اور تکنیک، ترقی اور عروج کے نام پر آج جہاں پہنچ گئی ہے ہو سکتا ہے اس کے پیش نظر یہ کہانیاں روایتی اور پرانی سی لگیں لیکن ان کہانیوں میں جس طرح زندگی کے مسائل، رشتوں کے پیچ وخم اور معاشرتی افکار و اقدار موجزن ہیں وہ ہرگز پرانے نہیں ہیں اور زندگی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ بس دراصل شکلیں بدل جاتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں ہی عرض کیا کہ سہل ممتنع میں جو شعر اپنی گہری معنویت کی وجہ سے زبان زدِ خاص و عام ہوتا ہے مشکل شعر وہ مقبولیت اور دوامیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح آسان، عام فہم، سادہ اور پُر تاثر کہانیاں دل و دماغ میں جو جگہ بناتی ہیں وہ مشکل کہانیاں نہیں بنا پاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند آج بھی زندہ ہیں اور ہر طبقہ میں مقبول۔ ان کا دبستان بھی زندہ ہے۔ کشمیری لال ذاکر اسی دبستان کے فنکار اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی یہ کہانیاں بھی زندہ رہیں گی کیونکہ یہ زندہ رہنے والی کہانیاں ہیں اور کشمیری لال ذاکر بھی زندہ رہنے والے فنکار ہیں۔

غلام نبی خیال

دبستانِ کشمیر کا گلِ صد رنگ — کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا نام یوں تو میں نے جوانی کے دنوں میں ہی سنا تھا اور میرے ذہن میں اس اُردو کہانی کار کی تصویر کے جو نقوش ثبت ہوئے تھے اُن کا حسین ترین پہلو یہ تھا کہ میں اُن کے بارے میں یہ رائے رکھتا تھا کہ وہ ایک کشمیر زاد کشمیری بولنے والا ادیب ہوگا۔ اس حسین تصور کا نصف صحیح ثابت ہوا۔

ذاکر صاحب تو جموں کشمیر کے پہاڑی ضلع پونچھ[1] میں پیدا ہوئے لیکن وہ کشمیری زباں سے نابلد ہی ہیں۔ اس کے باوجود جب میں نے اُن کی چند مطبوعات کا بغور مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر کی محبت اُن کے رَگ و پے میں رواں خون کی طرح سرایت کر چکی ہے اور کشمیر تو اُن کی یادوں کی بارات بن چکا ہے۔

ذاکر صاحب سے چند سال قبل سری نگر میں ایک ادبی سیمینار میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس ستر سالہ شخص کو زندگی کی حدت و حرارت سے مالا مال اور اُن کی ہر ادا کو بھرا شباب قوت سے سرشار پایا۔

کشمیری لال ذاکر ہم عصر اُردو دنیا کے افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام کے مالک ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُن کے کتنے مجموعے تا حال شائع ہو چکے ہیں لیکن میں نے اُن کے تخلیق کردہ ادب کا جو بھی پہلو پرکھنے کی کوشش کی وہاں وہاں اُس میں مصنف کی انسانی زندگی کے ساتھ شفقت اور انسانی قدروں کا احترام و احتشام نظر آیا۔ یہ اُس فنکار کا فکری نظریہ ہے جس کے نحیف و نزار جسم کے اندر ایک ایسا دل موجود ہے جو چھوٹے چھوٹے صدمے کی ٹھوکر کھا کر موم کی طرح پگھل جائے۔

کشمیری لال ذاکر نے نہ صرف اپنے نام کی مناسبت سے بھی کشمیر کو اپنی کہانیوں کا نہ صرف مرکزی موضوع بنایا ہے بلکہ اس جنتِ ارضی کی مدح سرائی میں مدھر اور رسیلے گیت بھی گائے ہیں۔

ذاکر صاحب نے اپنی جوانی میں وہ دیکھا جہاں دریائے جہلم کی لہروں پر رات کو بھی شکارے چھوٹی چھوٹی قطاروں میں مقامی شب بیداروں اور بیرونی سیاحوں کو سری نگر شہر کی سیر کراتے تھے اور ان شکاروں میں ٹمٹماتے ہوئے مٹی کے چراغ اس دریا کو ایک طلسمی چراغاں سے منور کرتے تھے۔ ان چراغوں

---

[1] پیدائش ضلع پونچھ میں نہیں ضلع گجرات پنجاب میں ہوئی۔

میں آج بھی ذاکر صاحب کی بے چین رُوح اُس منزل کی طرف رہنمائی کرتی نظر آرہی ہے جہاں حدِنظر سے آگے اور کوئی حدنظر میں نہیں آتی۔

اُن خوبصورت دنوں کی یاد ذاکر صاحب نے ان الفاظ میں تازہ کردی ہے

''(سری نگر کشمیر میں) یہ میری زندگی کا وہ زمانہ ہے جب میں نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں نامعلوم محبت کی ہلکی ہلکی گرمی محسوس کی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں سری پرتاپ ہائی اسکول کی بڑی پُر وقار عمارت میں تعلیم حاصل کررہا تھا اور اسکول کے بعد گھر لوٹنے سے پہلے کچھ وقت ریذیڈنسی روڈ سے ملحقہ خوبصورت پھولوں سے آراستہ پرتاپ پارک میں گزارتا تھا اور ہر روز دیر سے گھر پہنچتا تھا۔ پرتاپ پارک سے میری بڑی ہی پیاری وابستگیاں آج تک زندہ ہیں اور کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی روپ میں میری تحریروں میں جلوہ ریز ہوتی رہتی ہیں۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ سری نگر چھوڑنے سے تیس دن پہلے میں اُن تمام جگہوں میں گھومتا رہا جنھوں نے مجھے بیحد متاثر کیا تھا۔ شالیمار اور نشاط باغ، چشمۂ شاہی، ڈل جھیل، شنکر آچاریہ کا مندر، نسیم باغ، شیر گڑھی کے محلات، ٹٹو مالو کا وسیع میدان جس میں ٹکٹکی پر چڑھا کر سیاسی ورکروں کو کوڑے لگائے جاتے تھے۔ اپنے اسکول کے بہت پرانے اور گھنی چھاؤں والے چناروں میں دن بھر گرتے بے شمار پتوں کو اکٹھا کرتا رہا اور اُنہیں سنبھال کے گھر لے آیا۔ جس پر مجھے والدہ کی جھڑکیاں بھی ملیں اور اُنہوں نے بہت سے پتوں کو وزیر پھمن کی عمارت کی دوسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔ میں اُن پتوں کو ہوا میں اُڑتے ہوئے بے بسی سے دیکھتا رہا اور روتا رہا۔''

حالات بدلتے گئے۔ ذاکر صاحب کشمیر چھوڑ کر چلے گئے اور بالآخر انہیں ہندوستان کی وسیع و عریض ادبی دنیا نے اپنی گود میں جگہ دی۔ اس طرح وہ اس کارواں کے اُن تھک راہی بن گئے جس کے قافلہ سالاروں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک اور راجندر سنگھ بیدی شامل تھے۔ ذاکر صاحب نے ان سبھی ہم عصروں سے متاثر ہوئے بغیر اپنا ایک جداگانہ اسلوب اور تجربات کے اظہار کا مخصوص انداز بیاں اپنے لئے تخلیق کیا۔ احمد ندیم قاسمی ذاکر صاحب کی ان بے پناہ صلاحیتوں کے بارے میں لکھتے ہیں

''کشمیری لال ذاکر اُردو افسانہ نگاری کے موثر ترین دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُس سنہری دَور کو کرشن چندر، منٹو اور بیدی کی تخلیقات سے جو روشنی اور توانائی حاصل ہوئی اُس کی گواہ اُردو ادب کی تاریخ ہے۔ اُس خاص دور میں کسی دوسرے افسانہ نگار کا افسانے کے ذہین قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لینا مشکل تھا۔ مگر کشمیری لال ذاکر نے یہ مشکل اپنے تخلیقی جوہر کی مدد سے آساں بنالی۔ اس نے متوسط اور زیریں طبقات سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو حد درجہ سچائی اور حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے۔ اور اُن کی نفسیات کا مطالعہ کمالِ گہرائی سے کیا ہے۔ پھر کشمیری لال ذاکر کا اسلوبِ اظہار دلآویز ی، اُس کی زبان صاف اور سلیس اور اُس کا انداز بیاں ایسا رواں ہے جیسے افسانہ پڑھنے والے کے ساتھ اُس کی دوستانہ گفتگو ہو رہی ہے۔ اور یہ کسی افسانہ نگار کا معمولی کارنامہ نہیں ہے۔''

ذاکر صاحب کے ساتھ میرے تعلقات ایک پُر شفقت دوستی میں اس طرح تبدیل ہوئے کہ وہ مجھے ہریانہ اُردو اکادمی کے سیمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کی دعوت بار بار دیتے رہے۔ اُس دوران مجھے یہ دیکھ کر کسی حد تک حیرانی ہوئی کہ ۸۰ سال کی عمر کی دہلیز پر کھڑا یہ مردِ بزرگ ایک نوجوان کی طرح اپنے کام کو اپنی پوری جسمانی اور ذہنی طاقت کے سہارے سرانجام دے رہا ہے۔ یہ قوتِ ارادی میں نے بہت کم بزرگوں میں دیکھی ہے۔

اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''برف، دھوپ، چنار'' تو مکمل طور پر کشمیری کینواس پر رنگ بکھیرے ہوئے ہے۔ کشمیر کی برف اور چنار کے عظیم الشان درختوں کی طرح یہاں کی دھوپ بھی انسان کے انگ انگ کو پُر اسرار طریقے پر ڈھلتی جوانیوں اور کہنہ سالی کو شبابِ تازہ کا فیضاں عطا کرتی ہے۔

ذاکر صاحب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ کشمیر سے سالہا سال دور رہنے کے باوجود بھی جب وہ کشمیر کے پس منظر میں کوئی کہانی لکھتے ہیں تو اُس میں تاریخی اور حقیقی لحاظ سے ناموں اور مقامات کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ کرتار سنگھ دگل اور ملک راج آنند کی طرح اُنہوں نے کبھی ایک ایسے خیالی کشمیر کو تخلیق نہیں کیا جس کا حقیقت سے دور کا بھی رشتہ نہیں۔ دُگل کا ''اور دِیا بجھ گیا''، آنند کا ''شہید'' اور سلیم خان گمی کی ''کشمیر ادب اور ثقافت'' اس مبالغہ آرائی کی چند مثالیں ہیں۔

سرزمینِ کشمیر میں رونما ہونے والی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں اور تغیرات نے ذاکر صاحب کے

قلم کی توجہ بار بار اپنی طرف مرکوز کر لی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے وہ ایک جذباتی انداز میں کہتے ہیں

> ''دریائے جہلم، اُس کی ست رفتار لہریں اور لہروں پر تیرتے شکارے اور ہاؤس بوٹ آج بھی میرے تحت الشعور میں دن رات ہچکولے کھاتے رہتے ہیں اور میں اُن کی دلنواز خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔ خوبصورتی اور حسن سے میرا لگاؤ لڑکپن سے شروع ہو گیا تھا۔ جو آج بھی اُسی شدت سے قائم ہے مجھے آج بھی پرسکون پانیوں، میٹھی میٹھی خنک دھوپ اور اونچے اونچے پہاڑوں پر آرام سے سوئی برف کی دوشیزاؤں سے محبت ہے۔ اور اُن کی پرچھائیاں میری کہانیوں میں اور میرے ناولوں میں جگہ جگہ عکس ریز ہوتی رہتی ہیں۔''

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کشمیری سماج کے گوناگوں پہلوؤں اور رسوم و رواج کا گہرا مشاہدہ کرنے کا شوق ذاکر صاحب کے لئے ایک محبوب شغل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ کشمیر صدیوں سے فرقہ وارانہ میل ملاپ اور مذہبی رواداری کا ایک حسین گہوارہ رہا ہے اور یہاں کے معاشرتی نظام میں ہر کشمیری اس رنگا رنگ تہذیبی اور ثقافتی وراثت کا امین ہے۔ ان امانت داروں میں ذاکر صاحب بھی شامل ہیں جنھوں نے کشمیر کے اقلیتی پنڈت فرقے کی شادی کی بھی ایک دل نشیں انداز میں منظر کشی کی ہے۔ یہ اُن کے ناول ''لمحوں میں بکھری زندگی'' سے ایک اقتباس ہے۔

> ''کشمیری پنڈتوں کی شادیوں کی کئی بہت ہی پیاری رسمیں میں نے دیکھیں جن کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا لیکن ان سے بھی پیارے وہ کشمیری لوک گیت تھے جو لڑکیاں رات بھر دف بجا کر گاتی رہی تھیں۔ (اسے کشمیری میں ونج ناری کہتے ہیں) گوری گوری دودھ سی چٹی لڑکیاں، جن کے گالوں پر میدہ اور سندور گھلا تھا۔ جن کے جسم بیدِ مجنوں کی طرح لچک دار اور جن کی آنکھیں ڈل کے پانی کی طرح گہری اور جن کے بال کیلاش پربت پر منڈلاتی ہوئی گھٹاؤں کی طرح پیچ دار اور سیاہ تھے۔ جب وہ گاتی تھیں تو ایسا لگتا تھا کہ راجہ اندر کے دربار کی اپسرائیں گا رہی تھیں۔ سورگ تو خیر کسی نے نہیں دیکھا لیکن اُس کی جو کلپنا کی جاسکتی ہے وہ میرے سامنے موجود تھی۔
>
> سلوچنا کی ایک سہیلی نے جب گیت کے یہ بول اُچھالے تو ساری فضا مہک اُٹھی۔

مانج آسس سرے تھا جی

تاوں راجی لس

(میں مانج میں گل ریحان کی طرح مہک رہی تھی کہ دہکتی آگ نے مجھے بھون کر رکھ دیا)

مجھے گیت کے معنی نہیں آتے تھے لیکن لگتا تھا جیسے اس لڑکی کی خوبصورت مترنم آواز نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ کتنی پر سوز اور درد بھری آواز تھی اُس لڑکی کی۔ جب میں نے اپنے پاس بیٹھی ایک اور لڑکی سے اس گیت کے معنی پوچھے تو اُس نے بتایا کہ یہ پیار کرنے والی ایک لڑکی کے جذبات تھے جو جدائی کے جھلس دینے والے لمحات میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ باغ کی ایک نازک کلی تھی جسے شدید تمازت نے مرجھا ڈالا تھا۔"

کشمیری لال ذاکر کا وطن مالوف کشمیر جب بھی حالات کے تھپیڑوں کی زد میں آکر اپنی پُر سکون اور پُر امن زندگی کے رنگ وروپ سے محروم ہو جاتا تھا تو ذاکر صاحب اپنی اُس والہانہ عقیدت اور ہمدردی کا اظہار پھر ایک کشمیری قوم پرست کی طرح اس طرح کرتے ہیں گویا اُن کے دل پر کسی نے پے در پے ضربیں لگائی ہوں۔ وہ کہتے ہیں

"آپ میری کشمیر کی کہانیاں پڑھیں گے تو تقسیم کے بعد سے اب تک ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ زینہ بہ زینہ آپ تک پہنچے گی اور آپ جان جائیں گے کہ ریاست کے عوام کن کن مشکل مرحلوں سے گزر کر یہاں پہنچے ہیں۔ لیکن یہ بھی اُن کی منزل نہیں ہے۔ کشمیری عوام کی آخری منزل ابھی دور ہے لیکن وہ مایوس نہیں۔ کشمیر کا رہنے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا کہ یہی اُس کی وراثت ہے جس کی وہ کئی صدیوں سے حفاظت کئے جا رہا ہے۔"

کشمیر کی سدا بہار خوشیوں، دل شکن صدموں اور صدیوں پر پھیلی ہوئی کامرانیوں اور ناکامیوں کی ایک طوفانی داستاں کو اُردو ادب میں کشمیری لال ذاکر کے سوا اُردو ادب کے کسی ہم عصر ناول نگار یا افسانہ نویس نے اُن سے زیادہ شدتِ احساس اور بہتری کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے۔

جب اُنہوں نے ازراہِ کرم اپنے افسانوی مجموعہ "برف، دھوپ، چنار" کے لئے مجھ سے پیش لفظ

لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے اُن کے فن کی قدر دانی کے طور پر ایک مختصر سے نذرانہ کی شکل میں یہ الفاظ قلم بند کیے جنہیں یہاں پر بارِ دگر درج کرنے کے ساتھ ساتھ میں اپنی اس تحریر کو اختتام تک لاتا ہوں۔

"کشمیری لال ذاکر دبستانِ اُردو میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، وہ گزشتہ نصف صدی سے اردو رباں اور ادب کے گیسو سنوارتے رہے ہیں اور اُس پُر جمال اور پُر کمال فنی سلسلے کو انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور فنکارانہ نزاکتوں سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔"

ذاکر صاحب کا سرزمین کشمیر سے ایک خاص تعلق رہا ہے جو کہیں کہیں پر عشق کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے کشمیر کی ارضی جنت کو گونا گوں رنگ اور اس میں رہنے والے نجیب، چرب دست اور تر دماغ لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ اپنے افسانوی ادب میں پیش کیا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

کشمیر پر اُن کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ اُن کے فنی سفر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ان کے افسانوں میں بھی افسانہ نگار کا وہ دل زور زور سے دھڑک رہا ہے جو کشمیر کے برف پوش کوہساروں، روپہلی آبشاروں، دلنواز نظاروں اور عطر بیز مرغزاروں کے جادوئی ماحول میں عشق کی حدت وحرارت سے بار بار پگھلا اور کئی بار موم ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔

خدا کرے کہ اُن کا یہ دل اَب کبھی نہ ٹوٹے اور زیرِ نظر مجموعہ اُن کے بہت بڑے نام کو اور بھی بلند و بالا کرنے کا باعث بن جائے۔"

☆☆☆

—فرزانہ نسیم

کشمیری لال ذاکر—ایک ہمہ جہت شخصیت

برصغیر ہندو پاک کی ادبی دنیا میں کشمیری لال ذاکر کا فن اور شخصیت کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ کرشن چندر بیدی اور منٹو کی قطار کے افسانہ نگاروں کے بعد جو قابل احترام نام آتا ہے وہ کشمیری لال ذاکر ہے۔

آپ ایک ماہر صحافی، ایک بلند پایہ مقالہ نویس، ایک شاعر، ایک افسانہ نگار اور ایک باعظمت ناول نگار ہیں۔

ذاکر صاحب کا تخلیقی کینوس بہت وسیع ہے۔ سیاسی، اقتصادی، اخلاقی امور اور معاشی قومی مسائل کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہوگا جس پر انھوں نے نہ لکھا ہو۔

آپ کے افسانوں اور ناولوں کی پہلی خصوصیت زباں اور انداز بیان ہے، آپ اپنے تجربات، مشاہدات کو اتنی خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری دیر تک اس کے زیر اثر رہتا ہے۔ وہ اپنی کہانی کو طلسماتی گورکھ دھندا بالکل نہیں بناتے۔ وادات قلبی ہو یا جمالیاتی نہایت سلیس پیرائے میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی کہانی کو اصلاحات کی بیساکھیاں لگا کر جبراً آگے نہیں بڑھاتے بلکہ ندی کی روانی کی طرح وہ خود آگے بڑھتی ہے، گنگناتی ہے، ترنگ میں آتی ہے۔ ٹھہر جاتی ہے۔ کہانی کی یہی ادا پڑھنے والوں کو بھا جاتی ہے۔ کہانی کہنے کا یہ مخصوص انداز ذاکر صاحب کو خوب آتا ہے، اس کی کہانیوں کے کردار بھی اپنی زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہیں، جن کا تعلق سماج اونچے اور نچلے طبقات سے ہے اس کے ساتھ ہی آپ کی تحریریں طبقے کی زباں کا بہت اہم حصہ ہیں۔ چنانچہ علاقائی زباں کا بھی برجستہ دخل ہے۔ جس نے آپ کی تصانیف کو حقیقی بنا دیا ہے۔ جیسے پنجابی، انگریزی، ہندی، ہریانوی اور ڈوگری کا استعمال ہر تصنیف کے وقار کے مطابق کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج Electronic Media کے دور میں بھی لوگ ذاکر صاحب کی کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ اور ختم کرنے کے بعد ہی ہاتھ سے الگ کرتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ کتابیں انسان کی بہترین دوست ہوتی ہیں۔ اور کتابوں کا مصنف کتنا انساں دوست ہے۔ اس کی مثال کشمیری لال ذاکر کی شخصیت ہے بقول سردار جعفری -

"کشمیری لال ذاکر صفِ اول کے ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ وہ قلم کے سپاہی بھی ہیں اور مزدور بھی انھوں نے اپنی ساری زندگی اردو زبان وادب کے لئے وقف کر دی ہے۔ اور اردو ادب کی تاریخ کبھی کشمیری لال ذاکر کے ذکر سے خالی رہ کر مکمل نہیں ہو سکتی۔"

ذاکر صاحب کی جو شہرت، بڑائی اور عظمت ملی وہ کسی اتفاق کسی سہارے کسی وسیلہ کسی سازش اور کسی پروپیگنڈہ کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی ذاتی محنت اور اعلیٰ لیاقت اور قابلیت کا ثمر ہے۔

ذاکر صاحب ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کے فن اور شخصیت کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کر لیا جاتا ہے، آپ کی تقریباً ۱۰۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ نے ناول اور افسانوں کے علاوہ سفرنامے، خاکے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ حیدرآباد۔ کشمیر اور چنڈی گڑھ University میں ذاکر صاحب پر کئی PHD مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ پدم شری کے علاوہ متعدد مرتبہ مختلف ملکی وغیر ملکی علمی وادبی تنظیموں نے اعزازات سے نوازا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط نہیں کہ کشمیری لال ذاکر "ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک ادارے" کا نام ہے۔

مجھے فخر ہے کہ ایسی شخصیت کے ماتحت ہریانہ اردو اکادمی میں، میں لائبریرین کی پوسٹ پر کام کر رہی ہوں۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جس سے بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے لہجے کی مٹھاس اور مدھم گفتگو کا اتار چڑھاؤ اور ہر بات میں ایک شیریں متانت اور منطقی توازن ایسا ہوتا ہے کہ بات کرنے والا پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ انگریزی کی ایک کہاوت ہے "سادہ رہنا اور سوچنا" اور اسی کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں ذاکر صاحب۔ سچ میں ذاکر صاحب ایک بااخلاق اور شریف النفس انسان ہیں۔ نہایت سنجیدہ اور متین، تبسم زیر لب کے قائل ہیں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ قہقہے لگا کر ہنستے ہوں۔ بلند منصب اور ادبی شہرت کے باوجود اں کے مزاج میں عاجزی وانکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، تکبر خود نمائی اور بڑائی بالکل نہیں ہے۔ ان کی تحریروں میں بھی یہی خوبی پائی جاتی ہے۔

ذاکر صاحب پچھلے چالیس سال سے ایڈلٹ ایجوکیشن سے بھی جڑے ہیں۔ اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔

Adult Education کے سلسلے میں آپ کو UNESCO کی فیلوشپ بھی ملی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے کئی ملکوں کا دورہ بھی کیا جہاں ادبی تقریبات میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آپ کا ناول "کرماں والی" کو نیشنل اسکول آف ڈرامہ نئی دہلی نے آڈوپٹ کر کے ڈرامہ کی شکل میں ۱۹۹۰ء میں ایک سو سے زائد بار پیش کیا جا چکا ہے، سری نگر اور جالندھر کے دوردرشن مراکز نے اسی

ناول کو پنجابی لباس ڈھال کر ''میرا رانجھا، میرا جوگی'' کے نام سے ایک کامیاب سیریل کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس ناول میں انسانیت کی ان اعلیٰ قدروں کو ابھارنے کی کامیاب کوشش ہے جن کا استحصال سیاست کے گھناؤنے کردار کرتے ہیں اور نفرت اور فرقہ پرستی کا زہر افراد اور سماج میں پھیلاتے ہیں۔

ناول ''کرماں والی'' جہاں ہمارے گنگا جمنی تمدن کا عکاس ہے وہاں سچائی کا ایک ایسا کرب بھی ہے جسے وہ حساس مائیں ہی زیادہ محسوس کرسکتی ہیں۔ جن کے بیٹے سرحدوں کی مجبوریوں کے سبب ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے الفاظ میں

''یہ ناول ذاکر نے قلم میں روشنائی بھر کر نہیں بلکہ انسانیت کے آنسوؤں سے روشنائی کا کام لے کر لکھا ہے۔''

ذاکر صاحب کے یہاں جو بات سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے اس کے اچھوتے موضوعات کی تلاش، اور یہ تلاش وہ اسی سماج سے ابھارتے اور اٹھاتے ہیں جس کے ہم سب بھی ایک جزو ہیں۔

کشمیر ہمارے ملک کا جنت نشاں خطہ ہے لیکن پڑوسی ملک کی رشک آمیز نظر کشمیر کی پرامن فضاؤں کو خراب کردینے کے درپے رہتی ہے۔ کشمیری عوام کے سکون کو شر پسندی نے کس طرح منتشر کر کے رکھ دیا۔ ان ہی حالات سے متاثر ہو کر کشمیری لال ذاکر نے ناول لکھے ''جب کشمیر جل رہا تھا'' اور ''لمحوں میں بکھری زندگی'' ان ناولوں میں انھوں نے کشمیر کی تاریخ اور سماجی زندگی سے صرف متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ انسانیت کے حوالے سے رشتوں کی آفاق گیری کو ابھارا ہے۔

ذاکر صاحب کا ایک اور اچھوتا ناول ہے ''بلیک باکس'' جو اس بڑے فضائی حادثے کے زیرعنوان لکھا گیا جس کو شاید کبھی نہ بھلایا جاسکے، کنشک کا حادثہ، جس میں بہت سے لائق ہندوستانیوں کی جانیں تلف ہوگئی تھیں۔

''ڈوبتے سورج کی کتھا'' یہ ناول روح کو جھنجھوڑ دیتا ہے، اس ناول کا سفر دیہات سے شروع ہو کر شہر پر ختم ہوجاتا ہے، تقسیم ہند میں ایک گاؤں سے اجڑے ہوئے لوگ ایک نئے شہر میں آباد ہوتے ہیں یا پناہ لیتے ہیں۔ اس پس منظر میں نئی اور پرانی نسلوں کی وہ کشمکش ہے جو جدید تمدن میں روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے اور اس کی وجہ سے قدیم تہذیب کی اچھی قدریں بھی تباہ ہورہی ہیں۔ اس میں انہوں نے آج کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے خاندانوں میں بوڑھوں کا مسئلہ اٹھایا ہے اور اس کے حل کے لئے جو بوڑھوں

کے آشرم کی تجویزیں مغرب کے ساتھ ساتھ اب مشرق میں بھی پیش کی جارہی ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔

یہی تعلیم ذاکر صاحب کے دو اور افسانے 'اب یہی میرا گھر ہے' اور ''دوسرا موسم' میں بھی نظر آتی ہے۔ کہ کس طرح آپسی رشتے بوجھ بن گئے ہیں جو آج کے دور کی ایک تلخ حقیقت ہے، وقت نے کس طرح دوستی کو دشمنی میں بدل دیا ہے۔ ماں باپ اپنی اولاد پر بوجھ بن گئے ہیں، Old Age کی اپنی چھوٹی ضرورتوں اور احساسات کو سمٹ کر بڑے موثر انداز سے پیش کیا ہے۔

ابھی چند برس پہلے ہی تمام دنیا نے سونامی لہروں کا بھیانک روپ دیکھا تھا۔ جب انڈونیشیا سے لے کر سری لنکا اور جنوبی ہندوستان کے علاقے ان لہروں کی زد میں تھے۔ اور بہت سے جزیرے یہ لہریں اپنے شکاری دانتوں اور پنجوں سے جھپٹ کر نگل گئی تھیں۔ سونامی کی اس پوری سینٹی مینٹل فضا کو ذاکر صاحب نے اپنے ناول ''سمندر اب خاموش ہے'' میں بڑے موثر پیرائے میں سمیٹا ہے۔

عورت ایک پہیلی ہے اسے سمجھنا محال ہے اور اس کی نفسیاتی پرتیں کھولنا ٹیڑھی لکیر۔ شاید ہی کسی نے کبھی عورت کو جاننے کا دعویٰ کیا ہو۔ ذاکر صاحب کے ہاں عورت کی تہ در تہ نفسیات کو سمجھنے کی کاوش ملتی ہے۔ ذاکر صاحب کے یہاں عورت کے مختلف روپ ہیں جس میں محبوبہ کو زیادہ اہمیت دی ہے اپنے ناول ''اب مجھے سونے دو'' میں عورت کے کردار کے ذریعے مرد کی بگڑی ہوئی صورت حال کو پیش کیا ہے۔ عورت کے جھوٹ، فریب، بیگانگی اور ضمیر جذباتیت کے پیچھے بھی صرف مرد ہے، جو صرف حقوق اور توقعات کو سمجھتا ہے، اور فرائض سے غفلت برتتا ہے۔ جو اپنے لئے سب کچھ روا سمجھتا ہے اور عورت کو محض ایک مقبوضہ شے بلکہ ملکیت مانتا ہے۔

بعض وقت زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جس سے انسان میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس امر کی عکاسی 'اب مجھے سونے دو'' میں ملتی ہے اس ناول میں عورت کو کہانی کا مرکز بنا کر اس کے جذبات اور نفسیات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں انسان سائنس کی ترقی اور مادہ پرستی کی وجہ سے بالکل مشینی انداز میں کام کرنے لگا ہے۔ عیش و عشرت کا سامان فراہم کرنا زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ گھر اور افرادِ خانہ پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔ اسی عدم توجہ کے باعث گھر کے دوسرے افراد مختلف نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

''اب مجھے سونے دو'' میں عورت کو جنسی خواہشات اور نفسیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ 'دیپتی' اخلاقی زوال کا شکار ہے جبکہ 'وشال' میں اخلاقی قدریں ابھی موجود ہیں۔

ذاکر صاحب کی ایک کہانی جو میں نے شاید بیس سال پہلے پڑھی تھی بہت خوبصورت کہانی ہے

''ڈری ہوئی لڑکی'' افسانے کا موضوع نفسیاتی ہے جس کی ماں تقسیم ملک کے وقت پیش آنے والے انسانیت سوز مظالم، درندگی اور بربریت کا شکار ہوتی ہے۔ ڈر، خوف، دہشت اس کے دل و دماغ میں گھر کر گئی ہے جبکہ شادی کے بعد وہ ایک نارمل زندگی گزارتی ہے مگر جب وہ ایک لڑکی کو جنم دیتی ہے تو اس کے احساسات پھر جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے۔ ''اسے کہیں چھپا دو نہیں تو غنڈے اٹھا کر لے جائیں گے اور اس کا ریپ کر دیں گے۔ بقول رتن سنگھ'' کہانی کو پڑھتے پڑھتے دل میں خیال جاگتا ہے کہ کشمیری لال ذاکر ''منٹو کی'' کھول دو'' کی آگے کی کہانی کہہ رہے ہیں''

اس موضوع پر بے شمار افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے اس موضوع کو جس فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے وہ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا کھلا ثبوت ہے یہ کہانی آج بھی پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ المناک واقعہ ابھی پیش آیا ہے۔

یہاں ذاکر صاحب کی کس کس کہانی اور کون کون سے ناول کا ذکر کروں۔

اس کی باتیں کیا کرتے ہو
وہ لفظوں کا بانی ہے
اس کے کتنے لہجے ہیں
اور ہر لہجہ لافانی ہے

دیکھا جائے تو ذاکر صاحب کی تمام کہانیاں سچے کھرے اور حساس لوگوں کا المیہ ہیں جو معاشرے کی معصومیت و خوبصورتی کو بدنما بنانے والوں کے خلاف ہیں اور اس امید پر زندہ ہیں کہ شاید وہ وقت آجائے جب یہ معاشرہ جنم لے جس میں انساں کا تقدس عزت و عظمت مجروح نہ ہو۔

کشمیری لال ذاکر بلاشبہ ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا لفظ لفظ حقیقتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں کے کردار ہماری اپنی زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہیں جو زندگی کو تمام تر سچائیوں، حقیقتوں اور اس کی بدصورتیوں سمیت بیان کرتے ہیں۔ کہانی پر ذاکر صاحب کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ قاری کو جکڑ لیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کہانی کار پہلے اپنے آپ کو لکھتا ہے پھر دوسروں کو اور پھر سارے سماج کو موضوع بنا لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے نکل کر جب سماج کے دکھوں میں خود تحلیل ہو کرتا ہے تو پھر مسئلہ صرف اس کی ذات کا نہیں بلکہ سماج کا ہو جاتا ہے۔ اس کا احساس کا دائرہ ایک نقطے سے پھیلتا پھیلتا اتنا وسیع ہو جاتا ہے جس میں ایک سماج تو کیا پوری دنیا سما جاتی ہے۔

کشمیری لال ذاکر کی تصانیف کی تعداد اور اعزازات ان کے عہدے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ ان کے فن نے ان کی شخصیت کو گہرائی بخشی ہے۔ یا ان کی شخصیت نے ان کے فن کو بہتر کیا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اعزازات ان کی تلاش میں ہیں۔ ان اعزازات نے انھیں مغرور نہیں بنایا بلکہ ان کے اندر ایک ایسی قوت پیدا کر دی ہے۔ جس نے ان کی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کیا ہے۔

ذاکر صاحب ان لوگوں میں سے نہیں جن کا قد انعامات و اعزازات کے طفیل بڑھتا ہے بلکہ وہ ان گنے چنے باصلاحیت لوگوں میں سے ہیں جن سے اعزازات کی وقعت میں اضافہ ہوتا ہے

آخر میں صرف یہی کہتی ہوں کہ ایسے لوگ، ایسے ادیب جن کے قلم اور دل و دماغ میں انسانیت اور محبت رچی ہوتی ہے روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اپنی بات کو ذاکر صاحب کے ہی شعر پر ختم کرتی ہوں۔

میں واقعات کو اتنا تراش دیتا ہوں
فسانے ہوتے نہیں ہیں فسانے لگتے ہیں

☆☆☆

قمر رئیس

کشمیری لال ذاکر کی کہانیوں کا پیغام

اب سے نصف صدی پہلے جب کالج کا طالب علم تھا تو رسائل میں جن ادیبوں کی کہانیاں دلچسپ اور انہماک سے پڑھتا تھا ان میں کرشن چندر کے بعد عصمت چغتائی اور کشمیری لال ذاکر کے نام سب سے نمایاں تھے۔ اس وقت ذاکر صاحب کی عمر چالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ اتنا یاد ہے کہ ان کی کہانیوں میں عمل کی دلکشی اور روانی کے ساتھ انسانی دردمندی کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اور آج جب وہ نوّے سال کی عمر کو پہنچ رہے ہیں ان کے قلم اور تخلیقی سوچ کی رفتار میں فرق نہیں آیا ہے فکشن کے میدان میں شاید آج وہ سب سے بزرگ اور سب سے قدآور ادیب ہیں۔ برصغیر ہندو پاکستان میں ان کے ناول اور کہانیاں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اتنی طویل عمر پا کر بھی وہ ذہنی اور تخلیقی انحطاط سے کوسوں دور ہیں۔ ان کے قلم میں رور ہے۔ گردوپیش کے مسائل پر وہ مسلسل غور کرتے رہتے ہیں اور عملی زندگی میں بھی فعال ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چند ماہ بعد جب وہ زندگی کے نوّے سال پورے کریں تو جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے، ہم ان کی بسیط خدمات کے شایان شان تہنیتی جلسے کریں اور انہیں گلہائے عقیدت پیش کریں۔

دراصل ان کی تخلیقی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ایک مضمون تو کیا کتاب میں بھی ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ پھر یہ کہ وہ ایک سوچنے والے ادیب ہیں، ان کے ناول ہوں یا کہانیاں، اپنے عہد کے اور انسانی مقدر کے مسائل سے ہم کلام رہتی ہیں۔ ان کی ہر تخلیق میں سماجی فکر کا کوئی روشن پہلو ضرور چمک اٹھتا ہے جو قاری کو حظ و مسرت کے علاوہ انسانی رشتوں کے حوالے سے بصیرت بھی بخشتا ہے۔

ذاکر صاحب کی ایسی کئی کہانیاں یاد آ رہی ہیں جن میں انہوں نے ملک کی تقسیم، المناک فسادات اور ہجرت کے ہولناک تجربات کو موضوع بنایا ہے، یہ بڑا نازک موضوع رہا ہے۔ سیاست اور نفرت کے ہاتھوں لاکھوں بے گناہ انسانوں کی ہلاکت، بے گھری اور بربادی کا موضوع۔ ایسا بھی ہوا کہ اس موضوع پر لکھتے ہوئے کچھ ادیبوں کے قلم عصبیت اور جانبداری سے آلودہ ہو گئے۔ لیکن کرشن چندر احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور کشمیری لال ذاکر ایسے تخلیق کار تھے جن کی تربیت ترقی پسند فکر و شعور

کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے ان اندوہناک حادثوں کو تاریخ کے وسیع تناظر اور انسان د
کے شفاف آئینہ میں دیکھا اور ایک مثبت رجائی زاویہ نظر سے انسانی بربریت کے المناک مناظر کی ۃ
کشی کی۔ کشمیری لال ذاکر کی کم وبیش تمام تحریروں میں انسان کی نیک سرشت او۔ انسانی دردمندی پ
اعتماد جھلکتا ہے۔ ان کی افسانوی تحریوں میں حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری کا ایک خاص تصور ملتا۔
وہ جانتے ہیں کہ زندگی میں دھند لکے ہی نہیں اندھیرے بھی ہیں اور تاریخ کے بعض ادوار تو ایسے ہوتے
جب روشنی اور انسانی رشتوں کے تقدس پر سے آدمی کا اعتماد اٹھنے لگتا ہے۔ مایوسی کا کابوس اس کے وجہ
مسلط ہونے لگتا ہے۔ ذاکر صاحب بھی ایسے اندوہناک درد سے گزرے ہیں۔ شاید کچھ عرصہ دکھو
مایوسیوں نے ان کے اعصاب کو جھنجھوڑا ہو۔ لیکن پھر ان کی عقلیت دوستی اور بنی نوع انساں سے جبلی ہم
نے انہیں انسان پروری کے وسیع مسلک سے جوڑ دیا، اپنے ایک افسانوی مجموعہ کی تمہید میں لکھتے ہیں

> ''انسان اس لئے زندہ ہے کہ وہ مسیحوں کا پیغام سنتا ہے۔ وہ اس لئے بھی زندہ ہے کہ مسیحوں کے حوالے سے سنا ہوا پیغام ان سب تک پہنچائے جنہیں روشنی مسیحوں اور خوبصورت شاموں کا انتظار ہے اور جنہیں اس بات کا یقین ہے کہ خواب دیکھنا ہماری میراث ہے اور خوابوں میں بڑی قوت ہے''۔

یہ زندہ اور متحرک رجائی لہجہ محض الفاظ کا کرشمہ نہیں۔ ذاکر صاحب جانتے ہیں کہ کرۂ ارض
بہاریں اور اس کا فروغ مایوسی کا نہیں امیدوں اور حوصلوں کا رہین منت ہے۔ اور یہی امید پروری ان
متعدد ناولوں اور کہانیوں میں بھی توانائی اور فنی دلکشی کے اچھوتے اوصاف وعناصر پیدا کرتی ہے۔

ان کی حقیقت نگاری میں امیدیں اور خواب اس اعتماد کے مظہر بن جاتے ہیں جو وہ انساں کی تو
تعمیر پر رکھتے ہیں۔ وہ حقیقت نگاری کے اس مسلک کو نہیں مانتے ہیں جس میں حیات انسانی کے تار
گوشوں اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ادیب کے منفی وژن کا نتیجہ ہوتا ہے
ادھوری سچائی کو پیش کرتا ہے۔ اس نوع کی واقعہ نگاری قاری کو مایوسی اور پست ہمتی کی سمت لے جاتی
جبکہ خوابوں اور امیدوں کی کرنیں دھندلکوں میں بھی انسان کے روشن مستقبل پر انسان کے عقیدہ کو استح
بخشتی ہیں۔

یہ ایک وسیع موضوع ہے اور ذاکر صاحب کے ان گنت افسانوں میں ان کی رجائی فکر کے
پہلوؤں کی نشاں دہی کی جاسکتی ہے۔ لیکن میں یہاں صرف ہندو پاکستان کے رشتوں کے حوالے سے

کی چند کہانیوں کا ذکر کروں گا۔ مثلاً اس کی ایک طویل کہانی ہے' سمدری ہواؤں کا موسم' یہ کشمیر کی درخشاں تاریخ کے ایک نہایت المناک دور کی کہانی ہے۔ کشمیر جہاں صدیوں کے ہندو مسلمان ایک خطہ ایک مشترکہ تہذیب اور ایک زبان کے گھنے ٹھنڈے سایے امن عافیت اور یگانگت کی فضا میں زندگی بسر کررہے تھے۔ کہ اچانک سیاست اور مذہبی کٹرپن کے ہاتھوں امن وعافیت کی اس پرسکون وادی میں نفرت کی آگ سلگ اٹھتی ہے۔ اصل میں اننت ناگ میں رہنے والے پشکر ناتھ کول اور جان محمد بھٹ کے دو کنبوں کی مثالی دوستی سے اس کہانی کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ یہ اُس وقت کی کہانی ہے جب بقول مصنف یہ حسین وادی دھوئیں بارود اور شعلوں کا آتش رار بن گئی تھی۔ اس آتش رار میں صدیوں کی رفاقت محبت اور دوستی بھی معرض حطر میں پڑگئی تھی۔ لیکن کچھ خانداں ایسے ضرور تھے جنھوں نے صدمے اٹھائے لیکن باہمی اعتماد اور دوستی کے مقدس انسانی رشتے پر آنچ نہ آنے دی۔ اں میں سے ایک کنبہ اپنے آبائی وطن سے ترک وطن کرکے پاکستاں چلا جاتا ہے اور دوسرا اپنے آباواجداد کے گھر میں ہمیشہ کے لئے تالا لگا کر جموں ہجرت کرجاتا ہے۔ مذہب کی تعریق کے باوجود یہ جدائی ایک عذاب تھی۔ کہانی کی راوی پشکر ناتھ کی شریک حیات شاردا ہے جو اپنی فہم وفکر اور عقلی سوجھ بوجھ سے ہر طوفاں کا مقابلہ کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جبری ہجرت کے بعد

> ''اگرچہ وادی کے ہمارے سبھی رشتے ٹوٹ گئے تھے لیکن ایک رشتہ ابھی بھی قائم تھا۔ وادی کی پرانی اور عظیم روایات کا رشتہ جو اتنی صوبوں سے انسانی قدروں کی حفاظت کرتا آرہا تھا۔ اسی رشتہ کی روشنی سے جو مشعل روشن کرکے انکل جاں محمد بھٹ اپنے ساتھ کراچی لے گئے تھے اس کی روشنی ابھی تک ہمارے دلوں میں زندہ تھی۔ وہ اپنے خطوں میں لگاتار اس رشتے کی عظمت کو دہراتے رہتے تھے''۔

تقریباً ساٹھ صفحات پر مشتمل یہ کہانی شاردا کی زبانی ایسی سادگی اور فطری روانی سے بیان ہوتی ہے کہ انسانی رشتوں کے تقدس پر قاری کا ایمان تارہ ہوجاتا ہے۔

ذاکر صاحب کی معتدد کہانیاں حقیقی واقعات کی افسانوی توسیع ہیں واقعات جو اکثر اخباروں کی ریست س کر عام لوگوں کو حافظہ سے تحلیل ہوجاتے ہیں لیکں ذاکر صاحب کی تخلیقی حس انھیں کہانی کا روپ دے دیتی ہے۔

ایسی ہی ایک کہانی ہے 'صدائے سرحد' جس میں ہمدوستانی اپنے حقیقی بھائی اور اس کے کنبہ سے

ملنے کے لئے اپنے جوان بیٹے کے ساتھ پاکستان جاتا ہے وہاں اس کا بیٹا مقبول اپنی ممزاد بہن طاہرہ سے رشتۂ مناکحت میں بندھ جاتا ہے برسوں کی جدائی کے بعد دو خاندانوں کا یہ ملن اور یہ رشتہ اہل خاندان کے دل خوشیوں سے معمور کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ہندوستانی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کا حملہ دونوں ملکوں کے تعلقات میں ایسی تلخی پیدا کر دیتا ہے کہ قربت اور نکاح کا یہ رشتہ ٹوٹنے کی کگار پر آ جاتا ہے لیکن ذاکر صاحب کا انسانی رشتوں کی حرمت پر اعتقاد کہانی کو موڑ دیتا ہے اور آخر حالات سدھرنے پر طاہرہ خود شاں پنجاب ٹرین سے ہندوستان کے لئے روانہ ہو جاتی ہے اور وہاں اس کا شریکِ سفر مقبول کھلے آغوش کی گرمی سے اسے اپناتا ہے۔

اس سیدھی کہانی میں پاکیزہ انسانی جذبات کی ایک وسیع دنیا آباد نظر آتی ہے۔

ایک دوسری کہانی 'گڈی' میں محبت اور یگانگت کے اسی رشتہ کی گاتھا سائی گئی ہے۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ کہانی ہے جس میں پنجاب کا دیہی ماحول اپنی پوری توانائی سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ایک نوجواں شراب کے مدہوشی میں گاؤں سے متصل پاکستان سرحد پار کر کے گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسکے گھر میں والدین کے علاوہ بیوی اور ایک بچی گڈی اس کا انتظار کر کے مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ برسوں تک بے گناہی کی سزا کاٹتا ہے اور پھر ایک دن قیدیوں کے تبادلہ میں اسے بھی وطن کی زمیں دیکھنے کی خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔ آخر میں وہ ملتان کی جیل میں قید رہا۔ وہاں جیل کے افسر حاجی عبدالرزاق اس پر بہت مہرباں تھا وہ بھی حاجی کی پانچ سالہ بیٹی گڈی سے بے حد پیار کرنے لگا تھا۔ اس مقدس جذباتی رشتہ کو مصنف نے بڑی نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ سارا قصہ ایک اخباری رپورٹر کی زبانی بیان ہوا ہے جو قیدیوں کے تبادلہ کے سلسلہ میں سرحد پر موجود تھا۔ ذاکر صاحب نے ایسی تمام کہانیوں میں انسانی فطرت مثبت پہلوؤں کو اجاگر کر کے اعلیٰ انسانی اقدار کو مستحکم کرنے کی سعی کی ہے۔

ملک کی تقسیم کے ہولناک واقعات سے جڑی ذاکر صاحب کی ان گنت کہانیوں میں نفرت، تعصب اور تشدد سے کہیں زیادہ انسانی محبت، ہمدردی اور امن خواہی کے جذبات میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک موثر کہانی، ایک حسرت زدہ اکیلا آدمی ہے۔ یہ اکیلا آدمی امیر چند اپنے گاؤں رامن کی حسینہ رحمتاں سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ اور جب وہ ریفیوجی ٹرین میں بیٹھ کر ہندوستان آیا تو رحمتاں کی جدائی کے غم نے اسے زندہ لاش بنا دیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ جینے کی خاطر محنت کرتا ہے۔ گھربار بناتا ہے لیکن ہر پل تنہائی کا عذاب اسے گھیرے رہتا ہے۔ ایک جرنلسٹ امیر چند سے اس کے ماضی اور اس کی زندگی کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ مصنف لکھتا ہے

''امیر چند دہلی جنکشن کے پلیٹ فارم پر اکیلا تھا آنکھیں بند کیے۔ ہندوستان اور پاکستان کے حدوں کے اندر داخل ہو کر بہت آگے نکل گیا۔ ڈیرہ غازی خاں کے دور دراز کے ایک گاؤں رامس میں جہاں اسکے کھیتوں میں باجرے کی بھرپور فصل کے درمیاں رحمتاں اس کا انتظار کر رہی تھی۔''

پوری کہانی انسانی دردمندی اور عشق کی سرمدی لہروں کی کہانی ہے اور یہ مقدس لہریں اتنی قوی ہیں کہ نفرت اور تشدد کے آتشیں جھونکوں کے اڑا لے جاتی ہیں۔ یہ کہانیاں بلاشبہ انسانی رشتوں اور انسانی دردمندی کی عظمت پر ہمارے اعتقاد کو مستحکم کرتی ہیں۔ ہمیں ان کے تقدس کا احساس دلاتی ہیں اور آج تشدد اور تنگ نظری کے حس الناک ماحول میں ہم جی رہے ہیں اس میں سماج کی صالح اقدار کو زندہ رکھنے کا منصب بھی اہم منصب ہے۔

نریندر لوتھر

انسانیت کی بقا کا ضامن — ذاکر

کئی بار کوئی پرانا دوست بہت عرصے کے بعد ملتا ہے تو پیچھے سے آ کر چپکے سے دونوں ہاتھ ہماری آنکھوں پر رکھ دیتا ہے اور ہمیں پوچھنا پڑتا ہے کہ وہ کون ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ فون پر کوئی آواز بڑی بے تکلفی سے ہمیں مخاطب کرتی ہے۔ ''ارے پہچانا؟ اچھا بتاؤ میں کون ہوں؟''

اگر کشمیری لال ذاکر کی کوئی کہانی بھی مجھ سے ایسی ہی چھیڑ خانی کرے تو میں فوراً بتا سکوں گا کہ تم ذاکر کی کہانی ہو۔

کیا میرے لیے اتنا کہنا کافی نہیں کہ ذاکر میرا پسندیدہ ادیب ہے؟ تخلیقی ادیبوں کو اکثر بہت مشکل آن پڑتی ہے۔ جب ان تنقید نگاروں کی صف میں کھڑا کر کے انہیں کسی فنکار کے فن کے بارے میں رائے دینے کو کہا جاتا ہے۔ تخلیق اور تنقید دو مختلف بلکہ متضاد صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ یہ سراسر زیادتی ہے کہ ایک تخلیقی ادیب کو اس کام کے لئے کھینچ کر دوسرے کوچے میں لایا جائے۔

آج مجھے بھی ایسی ہی مشکل آن پڑی ہے میں بانگِ دُہل کہتا ہوں کہ ذاکر مجھے بے حد پسند ہے۔ میں اس کے فن اور شخصیت دونوں کا احترام کرتا ہوں لیکن روایت ہے کہ اپنی پسند کے لئے جواز دیا جائے۔ جب شہزادہ سلیم نے انارکلی سے پوچھا تھا کہ کبوتر کیسے اڑ گیا تو اس نے دوسرا کبوتر اُڑا کر جواب دیا۔ ''ایسے'' اگر وہ تفصیل بتانا شروع کرتی اور اپنے قصور کے لئے معافی مانگ لیتی تو سلیم کو اس کی ادا پر پیار نہ آتا اور ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ ادب کے سلیم تشریح مانگتے ہیں، کب، کیوں، کیسے؟

کمیٹی کے ارکان۔ آپ مجھ سے میری رائے مانگ رہے ہیں یا میری پسند کے لئے مجھ پر مقدمہ چلا رہے ہیں؟ میں وکیل استغاثہ کی جرح کا جواب دینے کی حتی الوسع کوشش کروں گا۔

ذاکر کو میں نے اس وقت پڑھنا شروع کیا تھا جب میں نے جوانی میں قدم رکھا ہی تھا۔ پہلی بار پڑھنے پر ہی ایک گہرا اور دیرپا تاثر محسوس کیا، وہ آج بھی قائم ہے۔ چند نام ایسے ہوتے ہیں جو دل و دماغ کے نہاں خانوں میں محفوظ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اردو افسانہ اور ناول نگاروں میں ذاکر کا نام بھی میرے لئے ویسا ہی ہے۔ وہ میرے لاشعور کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

جی ہاں۔ میں نے اس کی تقریباً سبھی کہانیاں پڑھی ہیں۔ کچھ ناول بھی۔ ابھی حال ہی میں ایک سرمایۂ پاکستان بھی نظر سے گزرا۔ اپنی یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے اس کا ناول 'کرماوالی' ابھی پھر پڑھا۔ اس کے تعلق سے میرے ساتھ دھوکا نہیں ہوا۔ اب بھی میری رائے وہی ہے جو میں نے عرصہ ہوا قائم کی تھی۔ اس کی انساں دوستی، گرم جوشی، رجائیت پسندی ہمیں ایک نیا حوصلہ دیتی ہیں۔ اس کا انداز بیاں دل کو موہ لیتا ہے۔

ذاکر اس پیڑھی کے قد آور فنکاروں میں سے ہیں جو اب انے گنے رہ گئے ہیں۔ میں اسے راجندر سنگھ بیدی کے پلے کا افسانہ نگار مانتا ہوں۔ ان دونوں میں کئی مماثلتیں ہیں۔ دونوں پنجاب کے نچلے درمیانی طبقے کی بڑی پراثر نیابت اور ترجمانی کرتے ہیں۔ دونوں کی زبان میں پنجاب کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ہے۔ اس کے معاشرے کی جھلکیاں ہیں۔ وہاں کے مخلوط اور زخم خوردہ کلچر کی عکاسی ہے۔ دونوں پر تقسیم ہند کے سانحے کا اثر ہے۔ ذاکر کے ہاں یہ اثر گہرا ہے، کیوں کہ وہ ایک زیادہ معصوم انسان ہے۔ اسے پڑھتے وقت کبھی کبھی جوگندر پال کا امیج بھی ابھرتا ہے۔ دونوں میں زخم خوردہ لیکن لافانی معصومیت ہے۔ ایک کے ہاں بوکھلائی ہوئی معصومیت کی وجہ مذہبوں اور فرقوں کا بے معنی تصادم ہے۔ دوسرے میں نسلوں اور رنگوں کا ٹکراؤ۔ اس کی معصومیت شخصی بھی ہے اور آفاقی بھی۔

نثر کو چھوڑ کر نظم کی طرف آئیں تو ذاکر کے ساتھ شوکمار بٹالوی کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے گیتوں میں جو انسانی قدروں اور رشتوں کا شدید احساس ملتا ہے، جو تنہائی کا کرب ہے وہ ذاکر کی نثر میں موجود ہے۔

انسانی رشتے بنیادی طور پر ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پھر بھی ہر خطے کی اپنی خصوصیت ہوتی ہے۔ ذاکر کے کردار خالص پنجابی کیرکٹر ہیں جہاں وہ اس سرزمین کی روایتوں کے علم بردار ہیں وہاں وہ نمایاں طور منفرد بھی ہیں۔ ان کے رشتوں میں آپسی معاملات میں خلوص اور سالمیت ہے۔ ان کی زندگی کے ایسے پنجاب کے لوک گیتوں یا گربانی کے شبدوں میں اپنی جڑیں پاتے ہیں۔

ککا کیوں لمیاں۔ دھیاں کیوں جمیاں

اس گیت میں بیٹیوں اور عموماً عورتوں کی زندگی کی بے چارگی کا کرب سمو کر رکھ دیا گیا ہے۔ جب بیٹی مائکے آ کر ماں کے سامنے اپنے دُکھڑے روتی ہے۔ جب ساس اور بہو کی آنا کانی کا ذکر ہوتا ہے۔ جب خاوند اور بیوی کے جھگڑے اور ملاپ کی بات ہوتی ہے تو وہ کہانی افسانہ نہیں، آپ بیتی بن جاتی ہے۔

ذاکر کے افسانوں میں جو خلوص اور خیٹ پنجابیت ملتی ہے وہ بیدی کے سوا کسی اور میں نہیں ملتی۔ مجھے اس کا احساس اس لئے زیادہ ہے کہ میں بہت برسوں سے پنجاب سے باہر رہا ہوں اور میں جب بھی ذاکر کی کوئی کہانی پڑھتا ہوں تو مجھے بقولِ ذاکر پنجاب کی دھوپ، چاندنی، پانی، ہوا، گلیاں، کھیت، کنوئیں، دوستیاں، محبتیں، رشتے سب سے بڑی شدت سے یاد آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ حب الوطنی کا جذبہ اپنے گاؤں، ریاست اور چھوٹے چھوٹے ملکوں کے لئے پیدا ہوتا تھا، ہم اسے کھینچ تان کر ایک برصغیر کی حدود تک پھیلا دیتے ہیں۔ وطن کی کئی تعریفیں ہیں۔ ہماری بیشتر زبانوں میں دیش کی اصطلاح ملک کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے اور صوبوں کے لئے بھی۔ (سارے دیشاں وچوں ہویش پنجاب نی سیو" (تیلگو دیشم)"

جی ہاں۔ حضور انور، ذاکر کی کہانیاں پڑھتے وقت میرے اندر پنجاب کے تئیں حب الوطنی کا جذبہ مڈ آتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ جرم قابل دست اندازی نہیں اور میں اپنا بیان ختم کرنے تک گرفتار نہیں کیا جاؤں گا۔

شرت چندر اور بکم چندر کے افسانوں اور ناولوں میں بھی ٹریجڈی کی وہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ میں ذاکر کی کہانیوں کو پڑھتے وقت اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتا تھا'' (جواں مرد رویا نہیں کرتے)'' لیکن اب میں پرواہ نہیں کرتا۔ اب مجھے حکیم ارسطو کی سینکشن مل گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آرٹ کا مقصد یہی کیتھارسیس ہے، ان آنسوؤں سے ہی ہمارا اندر اور باہر دونوں دھل کر صاف ہو جاتے ہیں۔ ان آنسوؤں کے بہہ جانے کے بعد ایک بشاشت کا احساس ہوتا ہے۔ دنیا ذرا بہتر دکھائی دیتی ہے۔ جیسے بارش کے بعد بجارہ ہلز یا عینک پہننے کے بعد اپنے گھر کے در و دیوار۔

ذاکر مجھے اس لئے بھی پسند ہے کہ اسے پڑھنے کے لئے مجھے ڈکشنری کی مدد نہیں لینی پڑتی۔ اس کے ہاں زبان کی سلاست اور بیاں کی سادگی کے ساتھ وہ فہم و فراست ملتی ہے جو عموماً کہاوتوں اور ضرب المثالوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے بیشتر فقرے اور جملے آن کی آن میں محاوروں کا روپ دھارن کر لیتے ہیں۔ جیسے چھوٹے چھوٹے نالے، ندیاں، آبشاریں دیکھتے ہی دیکھتے ایک دریا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کہاوتیں ہمارے معاشرے کے مجموعی تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہوتے ہیں جو ہماری زندگی میں مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ ذرا ان کہاوتوں پر غور کیجئے

☆ عورت تو اولاد سے آباد ہوتی ہے، گھر کی دیواروں اور چھتوں سے نہیں۔
☆ خدا تمام برکتیں کبھی کسی کی جھولی میں نہیں ڈالتا۔ کچھ نہ کچھ اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔
☆ ہمارے گناہ اور ہماری نیتیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔

☆ ایک بار گھر چھوڑ دو تو پھر گھر ہمیں چھوڑ دیتا ہے۔
☆ اب تو خدا ہی اپنی مخلوق سے ڈر رہا ہے۔
☆ اجڑے ہوئے لوگ ہی اجڑے ہوئے لوگوں کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔
☆ انسان اپنے اندر کی آگ سے ہی جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔
☆ انسان کو بسنے کے لئے کتنی بار اجڑنا پڑتا ہے۔ آبادیاں اپنے ساتھ کتنی ویرانیاں لاتی ہیں۔
☆ گہری نیند میں سونے والوں کو تو سبھی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔
(جو سووت ہے وہ کھووت ہے، جو جاگت ہے سو پاوت ہے۔)
☆ فقیر اور دریا کسی ایک جگہ نہیں رکتے۔ فقیر کہیں ڈیرہ ڈال لے تو جانو حرص اور خودغرضی نے اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہے۔
☆ درد اور سفر شاید ایک ہی تجربے کے دو نام ہیں۔ درد اپنے آپ میں ایک طویل اور دشوار سفر ہے، اور سفر بذاتِ خود ایک درد۔
☆ ایک بار پھر جھوٹ مرا تھا کہ موت اس کے تقدیر میں ہے۔

یہ اور ایسے کئی اور قول کہاوتوں اور محاوروں کی کتابوں سے اخذ نہیں کیے گئے۔ یہ ذاکر کی اختراعیں ہیں۔ وہ لفظوں کا کاریگر ہے۔ اس نے اپنے پچھواڑے میں ایک چھوٹا سا ذاتی کارخانہ لگا رکھا ہے۔ ایسی کہاوتیں، ایسے محاورے وہاں خود تراشتا ہے اور پھر اپنے تجربے اور مشاہدے کی خراد سے انہیں بناتا اور سنواتا ہے۔

تجربہ اور مشاہدہ اور شدت احساس کی اور مثالیں دیکھئے

☆ مینہ ایسے رسا جیسے آسمان سے سمندر پھٹ پڑا ہو۔
☆ اس کے سائے میں وہ ٹھنڈک تھی جو کسی جواں عورت کے نہائے ہوئے جسم میں ہوتی ہے۔
☆ وہ نسل جو ایک پوری فصل کی طرح تقسیم کے بعد پروان چڑھی تھی۔

اور پھر کتنی تیکھی چوٹ ہے ان الفاظ میں

☆ ان شہیدوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جنہیں مرتے دم تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیوں شہید کیے گئے تھے۔!

ذاکر کے دماغ میں بیک وقت بچوں کی معصومیت اور پختہ کار سائنس دانوں کا تجسس ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔
''سمندر کبھی سوکھ جائے تو کیسا منظر ہوگا؟''

ایسے ہی سوالوں سے آرٹ اپجتا ہے۔ ایسے ہی سوالوں سے انسان زمین سے چاند پر پہنچتا ہے۔
ہر فن کار کے دماغ میں ایسے ہی سوال اٹھتے ہیں۔

ابن آدم کے مقدر کا پر شکوہ کارواں تاریخ کی شاہراہ پر اپنی شان بے نیازی سے گامزن ہے۔ اس کی بے حس، بے رحم منطق کے آگے انفرادی، انسانی زندگی کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ شاندار جلوس اپنی متعین منزل کی طرف کامرانی سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جگن ناتھ کے اس رتھ کی یاترا کے آگے جم غفیر ہے۔ اس میں سے بہت سے اس رتھ کے پہیوں کے نیچے کچلے جائیں گے۔ اس کی سمت اور رفتار طے شدہ ہے۔ ایک سیلاب ہے جو ایک عظیم منصوبہ کی تکمیل میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں پاتا۔ وہ عظیم انسانی سمجھ سے بالاتر اور باہر ہے۔ اس کے سامنے کوئی انسانی تدبیر کارگر نہیں۔ کرمو، خوشیا، فیضا، کیدار، رتنا، پرکاشو، یہ سب کردار ایک دیوہیکل بے حس مشین کے پرزے ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنی بساط اور توفیق کے مطابق خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جلد ہی تاریخ کے ریلے میں بہہ جاتے ہیں۔

ہر فن کار ایک طرح سے خالق کا، قدرت کا حریف ہوتا ہے۔ وہ ایک مبہم نظام میں ایک افسانہ نگار اور ناولسٹ ہے۔ آپ نے مجبور کیا تو میں نے اپنی پسند کی تائید میں کچھ کہنے کی جسارت کی لیکن مقصد میرا صرف اتنا ہی تھا کہ میں ذاکر کے حق میں ہزاروں ووٹ ڈال سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لئے میں نے آپ کا اتنا وقت لیا لیکن یہ حکم آپ کا ہی تھا۔

اب کیا مجھے اجازت ہے کہ اس کٹہرے سے نکل کر اپنے مسکن کی طرف چلا جاؤں۔

شکریہ

☆☆☆

محمد مستمر

''تجھے ہم ولی سمجھتے'' کا نفسیاتی جائزہ

کشمیری لال ذاکر کا نام آتے ہی ذہن بیسویں صدی کے وسیع کینوس کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ ذاکر صاحب بیسویں صدی کے ادب کے ان معماروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے فکشن نگاری میں اپنے جوہر دکھائے اور اپنی قابلیت صلاحیت، انفرادیت اور فنی جودتوں کا لوہا منوایا ہے۔ تقریباً پون صدی پر پھیلا ہوا ان کا تخلیقی کینوس ایک امتیاز کا حامل ہے۔ وہ پچھلے ۶۵ برسوں سے برابر لکھ رہے ہیں۔ ان کے لکھنے کا یہ کارِ خیر ہنوز تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے ان کا قلم ابھی جوان ہے اور روانی میں کسی طرح کا کوئی انسداد دیدنہیں پڑتا ہے۔ جس طرح فکشن کے میدان میں کرشن چندر، منٹو، بیدی، عینی آپا احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور وغیرہ کا پایہ مسلم و مستحکم ہے ذاکر صاحب بھی اس سے محروم اور مستثنیٰ نہیں ہیں وہ ایک بڑے فنکار کی ساتھ فعال شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ لگ بھگ ایک سو تصانیف کا یہ خالق افقِ ادب پر ہنوز اپنی آب و تاب برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ان کی تخلیقات میں صرف ناول ہی نہیں بلکہ انہوں نے قریب قریب فکشن کے ہر اصناف پر اپنی فنی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' یہ ان کا افسانوی مجموعہ ہے جو بارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اگر چہ اس مجموعہ کی سنِ اشاعت ۲۰۰۷ء ہے مگر اس میں وہ افسانے ہیں جو اب سے ایک دہائی پہلے قارئین کی نظروں سے گزر چکے ہیں۔ یہاں پر میرا مقصد اس افسانوی مجموعہ میں شامل کہانیوں کا نفسیاتی جائزہ لینا ہے۔

ذاکر صاحب کا جو سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے وہ یہ کہ وہ میسکو لائن جینڈر ہونے کے باوجود فیمی نائن جینڈر کی کشمکش، نفسیاتی شعور، سماجی و گھریلو مسائل اور تفکرات و خیالات کے پیچ وخم کو بڑی چابکدستی اور فنکارانہ ہوش مندی سے صفحہ قرطاس پر پیش کرتے ہیں جس میں ان کے اپنے تجربات و مشاہدات فطری رجحان اور غیر معمولی ذہانت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایک مرد کے لئے عورت کے مسائل اور اس کے نفسیاتی پیچ وخم کو پیش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک جوئے شیر لانے جیسا ہی امر ہے مگر اس میدان میں ذاکر صاحب ہمیں ایک کامیاب ہی نہیں بلکہ پختہ فنکار نظر آتے ہیں اور ان کی یہ پختہ فنکاری اور غیر معمولی پکڑ ان کی کہانیوں میں جلوہ گر ہے جو ان کے مستند ہونے کی دلیل ہے۔

"تجھے ہم ولی سمجھتے" یہ غالب کے شعر کا ٹکڑا ہے۔ ذاکر صاحب نے مذکورہ افسانوی مجموعہ کا جو نام تجویز کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس تسمیہ میں بھی انہوں نے ایک نفسیاتی الجھاؤ اور پیچ و غم والی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ "تجھے ہم ولی سمجھتے" میں جو تجسس قائم ہے وہ عورت اور مرد کے گوناگوں لاشعور تحت شعور اور شعور اور اسی کے ساتھ نرگسیت، آبائی الجھاؤ، جنسیات، خواہشات، ارتقائے شہوانیت، جنسی ہیجانات خواب خرامی اور اعصابی بیماریوں جیسے امور کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ یہاں صرف ذاکر صاحب نے اس ایک جملے میں "تجھے ہم ولی سمجھتے" میں ایمائی انداز میں دو رُخی بات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جملہ عورت کے تئیں مرد کی طرف سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور مرد کے تئیں عورت سے خیالات کی غماری کرتا ہے۔ نیز ذاکر صاحب کا یہ دوہرا رویہ اور رجحان نفسیات کی تہہ در تہہ سے تعلق رکھتا ہے۔

"ڈبل شفٹ" یہ ایک ایسی متوسط عورت کی کہانی ہے جو اپنے خاوند، اولاد اور اپنی معاشی حالات سے دوچار ہے۔ اس عورت کا نام بھاگونتی ہے۔ بھاگونتی کا شوہر منشیات کا شکار ہے جو ہر بات میں اپنی اَنا کو فوقیت دیتا ہے اور آگے رکھتا ہے۔ اسے اپنے خانداں، بچوں اور بیوی سے کسی طرح کا کوئی لینا دینا نہیں ہے لیکن ڈبل شفٹ سے محصول آمدنی جو بھاگونتی ہر مہینے لاتی ہے، اس آمدنی کو ہر طریقے سے ہتھیانے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ دوسری طرف اس کے تین بیٹے شرت، آشیش اور روی ہیں۔ شرت سب سے بڑا ہے جو انجینئرنگ کر رہا ہے۔ بھاگونتی گفتگو کے لحاظ سے بھی اعتدال پسند ہے۔ وہ اپنی خاوند کی تلخ اور بیہودہ باتوں کو بھی برداشت کر جاتی ہے اور موقع محل کے مناسب نظر انداز کر دیتی ہے۔ وہ ہر بات میں نفسیات سے کام لیتی ہے۔ وہ ایک متحمل خاتون ہی نہیں بلکہ نفسیاتی شعور بھی رکھتی ہے۔ وہ اپنے نفسیاتی شعور اور اپنی دور اندیشی سے اپنے بیٹے شرت کو راہِ راست پر لانے میں حتی الامکاں کامیاب نظر آتی ہے۔ کشمیری لال ذاکر نے اس کہانی میں ماں اور بیٹے کے مابین ہونے والی گفتگو کو ایسی نفسیاتی کشمکش کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس کا تعلق بھاگونتی کے تجرباتِ زیست سے بھی ہے اور شرت (جو ایک مرد ہے اور اب بالغ ہو چکا ہے) میں پیدا ہونے والی مختلف جنسیات سے بھی ہے۔ شرت جو وندنا نام کی ایک لڑکی سے پیار کرتا ہے، اُسے لو لیٹر لکھتا ہے جو اس کی پینٹ کی جیب میں رہ جاتا ہے اور بھاگونتی کپڑے دھوتے وقت وہ خط نکال لیتی ہے۔ ماں بیٹے کی اس گفتگو کو ذاکر صاحب نے کس نفسیاتی شعور سے پیش کیا ہے

"کپڑے کیوں خراب کر رہے ہو بیٹے؟"

اپنی پینٹ تلاش کر رہا ہوں اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔

"دو پتلونیں تو باہر تار پر ڈال دی ہیں"۔

میری بات سن کر وہ فوراً صحن کی طرف لپکا اور تار پر ٹنگی بلیو شیڈ کی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ پتلون میں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ میں غسل خانے سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ بے چارے کا برا حال تھا۔

''ڈیم اٹ!'' وہ چیخا۔

''تم مجھ سے پوچھے بغیر کیوں کپڑے الماری سے نکالتی ہو ممی''۔

''اس لئے کہ تم صاف کپڑے پہن سکو''۔

''آئی ڈونٹ لائک اٹ''۔ وہ بولا

''مجھے زیادہ انگریزی نہیں آتی لیکن تمہاری باتیں مجھے بھی پسند نہیں''۔

میں نے غصہ میں آ کر آہستہ سے کہا۔

''ممی!'' وہ چیخا۔

''میں نے سنبھال کر رکھ لیا ہے تمہارا کو لیٹر''۔

شرت میرا جواب سن کر ایک دم بجھ گیا۔ اس کا چہرہ پسینے سے نچڑنے لگا تھا۔

اس نے نظریں جھکا لیں۔

''یہ لڑکی کون ہے؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''میری کلاس فیلو''۔ اس نے بڑی ایمانداری سے جواب دیا۔

''کیا کرتا ہے اس کا فادر؟''

''انجینئر ہے''۔

''اور تمہارا باپ؟''

''ہیڈ کلرک''۔

''کہاں؟''

''اسی کے آفس میں''۔

''فرق سمجھتے ہو؟''

''لیکن　''۔

شرت اپنی ماں سے بے حد پیار کرتا ہے اور ہر بات اپنی ماں سے شیئر کرتا ہے۔ بھاگونتی بھی شرت سے بے حد محبت کرتی ہے۔ یہاں ہمیں ماں اور بیٹے کے بیچ ایک آبائی الجھاؤ واضح طور سے نظر آتا ہے۔

ذیل کے اقتباس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں جو بھاگونتی کا شوہر اپنے لڑکوں کے تئیں تاثرات ظاہر کرتا ہے۔

''تمہارے بیٹوں کو تو صرف تمہاری اجارت چاہئے۔ میری کیا پرواہ کرتے ہیں وہ''
''آپ کتنی پرواہ کرتے ہیں ان کی؟ کبھی سوچا بھی ہے آپ نے اپنے بیٹوں کے بارے میں؟''
''وہ آنچل تو تمہارا پکڑے رکھتے ہیں ہر وقت''۔

ڈبل شفٹ میں جہاں ایک اور ہمیں یہ نفسیاتی پیچ وخم دکھائی دیتے ہیں، جنسیات کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔ ذاکر صاحب کے یہاں یہی جنسیات کا عنصر ہمیں بیدی، منٹو اور عصمت کی طرح ہی نظر آتا ہے۔ اس جنسیات کا تعلق بھی ہمارے نفسیاتی لاشعور سے ہے جو کبھی ریادہ ابھرتا ہے اور کبھی دب جاتا ہے۔ نیز جنسیات کی یہ برانگیختگی حارجی امور کی نشاندہی کرتی ہے

''تو آپریشن ہی کرالو، مجھے ہی کیوں روکتی ہو؟''
''آپ کروالو نا آپریشن''۔
''میں تو نہیں کراؤں گا''۔
''کیوں؟''
''میری مرضی''۔
''تو میں اپنے پنڈے کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی''۔
''یہ بھی کر دیکھنا''۔

جہاں اس مذکورہ اقتباس میں جسیات کا جذبہ ابھرتا ہے وہیں بھاگونتی کے شوہر کے حملوں میں پھر منشیات کی بو نظر آتی ہے اور یہ نرگسیت بھاگونتی کے شوہر میں ایک جگہ نہیں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ کبھی یہ نرگسی کیفیت کمینگی کی حد تک تجاور کر جاتی ہے اور افسانے کا اختتام اسی کمینگی اور بے شرمی پر ہو جاتا ہے۔ راجندر ناتھ عرف انجینئر ملہوترہ کے ''ڈریم لینڈ''، ہمالہ کی آغوش میں بسی آبادی میں ایک بنگلے کا نام ''ڈریم لینڈ'' ہے لیکن اس ڈریم لینڈ کا تعلق خواب اور قبلِ شعور سے ہے۔ ملہوترہ پہاڑی علاقے میں گھومنے کی غرض سے جاتا ہے جہاں اس کی رہنمائی اس کا دوست کرپال کرتا ہے۔ کرپال ملہوترہ کے دفتر کے عملے کا ہی ایک فرد ہے۔ ہمالہ کی آغوش میں بسی اس آبادی کی جو منظر نگاری اور جزیات نگاری کی ہے اس میں رومانس کی ایسی فضا پیدا کی ہے کہ جنسی ہیجانات میں ہلکی ہلکی سسکیوں کے ساتھ مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا

ہے۔ یہاں ملہوترہ کی ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوتی ہے جو اپنے فوجی شوہر کے ساتھ تنِ تنہا رہتی ہے اور تب تو وہ اور بھی تنہا رہ جاتی ہے جب اس کا اوھیڑ عمر شوہر شہر میں کسی کام سے باہر چلا جاتا ہے۔ اس وقت بھی وہ تنِ تنہا رہ جاتی تھی جب ملہوترہ ٹہلتے اور گھومتے ہوئے اس کے بنگلے میں پہنچے۔ کرپال کی ان لوگوں سے کچھ دید، شنید تھی۔ اس کہانی کا تعلق اصل میں ملہوترہ اور لڑکی کے قبل شعور اور ارتقائے شہوانیت سے ہے۔ یہ جسی ہیجاں اب سے کئی برس پہلے دب کر رہ گیا تھا۔ ڈریم لینڈ نامی بنگلے میں رہنے والی لڑکی کا نام رکمنی دیوی ہے۔ رکمنی کی کئی شادیاں ہوئیں تھیں مگر وہ کہیں بھی سیراب نہ ہوسکی اور پیاسا ساون، پیاسا ہی رہا۔ اب مسز کرنل کے نام سے جانی جاتی ہے۔ زندگی کے کئی نشیب وفراز کے باوجود بھی آنکھوں میں حسرت، دل میں تمنا اور ضرورت باقی ہے۔ مسز کرنل جس نے ملہوترہ سے کئی برس پہلے ٹیوشن پڑھا تھا اور دوریاں نزدیکیوں میں بدل گئی تھیں، لیکن ان نزدیکیوں اور لمحوں پر وقت کے دھندلے نقوش چھا گئے تھے۔ دونوں کے ذہنوں میں سے ایک دوسرے کے حسین چہرے اتر چکے تھے۔ مگر جب ملہوترہ، مسز کرنل کے بنگلے پر پہنچا ہے اور ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو دونوں شعور میں لوٹ آتے ہیں اور بے ساختہ، پرتپاک اور گرم جوشی سے اس طرح بغلگیر ہوجاتے ہیں

> ''او ماسٹر جی!'' اور اس نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔
>
> ''کتنا زمانہ گزر گیا۔ ہم دونوں کتنے بدل گئے ہیں۔ ماحول اور حالات کتنے تبدیل ہو گئے ہیں''۔ میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو ایک دم زیادہ نیلی اور زیادہ گہری ہوگئی تھیں اور جن میں ایک عجیب طرح کی چمک ابھر آئی تھی۔ اس کے بازو کی گرفت بھی مضبوط ہوگئی تھی۔

ذاکر صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس کہانی میں مرکزی کردار ملہوترہ اور مسز کرنل کے ذریعہ کہانی میں جگہ جگہ ایسے جملے ادا کروائے ہیں کہ جہاں جسی ہیجانات میں اضافہ ہوتا ہے وہیں رومانس بھی اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ قوت نفسی اور خواہشات کا حولا وا دونوں کے اندر موجود ہے وہ یہ انکشاف کرتا ہے کہ بیوی اور شوہر کے درمیان عمر کی خلیج ایک وبال پیدا کرسکتی ہے۔ کہانی کار نے ایسے برانگیختہ لفظ استعمال کیے ہیں جن سے شہوانیت اور جنسیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مسز کرنل کی آنکھوں کا زیادہ نیلا اور گہرا ہونا بازو کی گرفت اور مضبوط ہونا، ملہوترہ کی پسند کو اس کی پسند ہونا، ملہوترہ کے بالوں میں شفقت سے ہاتھ پھیرنا، علاوہ ازیں دوسرے وہ افعال وحرکات اور اشارے کنائے جو ملہوترہ اور مسز کرنل کے مابین پیش آتے ہیں نفسیاتی پیچ وخم کی نمائندگی کرتے ہیں اسی کے ساتھ گفتگو کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیجئے

''بیس برسوں کے بعد آنے والا مہمان نہیں ہوتا''۔
''تو کیا ہوتا ہے وہ؟''
''وہ ایک خدائی نعمت ہوتی ہے، ایک فرشتہ ہوتا ہے، ایک خدا ہوتا ہے''۔
''سروج!'' میں جیسے چیخ اٹھا تھا۔
''تم بیس برس بعد بھی اتنی ہی جذباتی ہو''۔
''برا لگا تمہیں؟''
''کہہ نہیں سکتا''۔

باتوں کے بیچ بیچ میں ملہوترہ ماضی کے اوراق پلٹنے لگتا ہے۔ وہ ماضی کے اوراق، جن پر رومانس اور جنسیات کی تحریریں ثبت تھیں، آج پھر اس ملاقات میں اس نے وہی تپاک اور جوش پایا تھا جو بیس برس پہلے تھا گویا وقت کے انقلاب کا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ مسز کرنل کے گھر سے رخصت ہو جاتا ہے مگر اس کی آنکھوں میں وہی کشش، مدہوشی، نشہ اور پیاس دیکھتا ہے

''اور میں نے دیکھا، اس کی گہری نیلی آنکھوں میں جانے کتنے ہی ڈریم لینڈز کے جلتے ہوئے کھنڈروں کا دھواں سلگ اٹھا تھا''

اور انہی مذکورہ بالا جملوں کے ساتھ کہانی اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

''دوسرا مرد'' اس کہانی کا مرکزی کردار جگتار ہے۔ جگتار ایک ایسی عورت ہے جو بنیادی طور پر گھریلو، سماجی، معاشرتی کشمکش اور نفسیاتی تشدد کی شکار ہے۔ یہ عورت اور مرد کے باہمی پیار کے رشتہ کی وہ کہانی ہے کہ جو مرد ''پیار'' جیسے پاکیزہ اور مقدس لفظ اور رشتہ کا واسطہ دے کر عورت ذات سے جو واقعی قدرت نے بھولی، معصوم اور دل سے سوچنے والی بنائی ہے اور جذبات کی رَو میں بہہ جاتی ہے، کھلواڑ کرتا ہے۔ پیار جیسے پاکیزہ رشتہ کو ناپاک پلید اور زہر آلودہ بنا دیتا ہے جب کہ یہ حلاوت کا سرچشمہ ہے۔ جگتار کی زندگی میں بھی ایک ایسا ہی مرد آتا ہے اور وہ ہے پرم پال۔ جگتار کی کہانی بڑی دلدوز، اندوہ وغم سے پر اور غریبی ولاچاری کی کہانی ہے، جو ایک لفظ پیار کے کارن وہ اپنا سب کچھ پرم پال کو سمرپت کر دیتی ہے اور اس کے بدلے میں پرم پال اسے دیتا ہے دنیا کے غم، تکلیفیں، دُکھ اور درد۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ ان مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے پرم پال کا گھر چھوڑ دیتی ہے اور ایک ایسی جگہ اپنے بیٹے کو لے جاتی ہے جہاں اس کا منحوس باپ اور مرد کا اُس پر سایہ بھی نہ پڑ پائے۔ نیز آج جب اس کا بیٹا بلرام جوان ہو چکا ہے یہ اس کی زندگی میں آنے والا دوسرا مرد ہے۔ ایک مرد شوہر کے روپ میں اور دوسرا بیٹے کے روپ میں۔

حقیقت میں اس افسانے میں ذاکر صاحب نے ایک عورت کی دوہری زندگی کو اس نفسیاتی شعور سے پیش کیا ہے جس میں قاری عورت کے تیئں کہیں بھی بے وفائی کی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ ذاکر صاحب نے سماج کی دکھتی رگ پر کاری ضرب لگائی ہے۔ مرد، جو ہر جگہ، ہر موڑ پر عورت کو قصوروار ٹھہراتا ہے ذاکر صاحب نے نہ کہ من گھڑت بلکہ حقیقی سماج کی عکاسی کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر معاملے میں عورت ہی دوشی نہیں ہوتی ہے۔

کہانی میں کہانی کار نے زندگی کے دو رُخوں کی نمائندگی کی ہے۔ پہلا رُخ جگتار کی زندگی کا وہ ہے جب وہ ایک لفظ 'پیار' کے ہاتھوں پرم پال کی جیون سنگنی ہو جاتی ہے اور اس کا گرہست جیون کا آغاز ہوتا ہو۔

جگتار کے گرہست جیوں کو پیش کرنے میں مصنف نے فنکارانہ مہارت، تجربات، مشاہدات اور ژرف نگاہی سے کام لیا ہے اور نفسیاتی، معاشی، گھریلو اور سماجی مسائل نیز ساس نندوں کے مابین چکی کے پاٹ کی طرح شوہر کا رویہ، آپسی رنجشیں، چھوٹی چھوٹی بات پر بڑے بڑے محاذ وغیرہ کارگزاریوں اور کرتوتوں کو ذاکر صاحب نے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ جگتار جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے، گھریلو پریشانیوں کے باعث نفسیاتی کھینچا تانی اور رسہ کشی میں وہ ٹرسیت کی شکار بھی نظر آتی ہے، وہ اَنا سے کام لیتی ہے۔ اس کی خودداری اس کی عزت ہے۔ لیکن یہ اَنا فوق الانا کا روپ دھارن نہیں کرتی بلکہ وہ اعتدال پسند نظر آتی ہے۔ اگر وہ اعتدال پسند نہ ہوتی تو ہرگز وہ اپنے بیٹے بلرام کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں کامیاب نہ ہوتی۔

جگتار مردوں کے خلاف زہر بھی نہیں اُگلتی بلکہ وہ ایسے مرد کا تصور کرتی ہے جو اپنی عزت کرانے کے ساتھ عورت کی بھی عزت کرنا جانتا ہو اور اسے محض پیروں کی جوتی نہ سمجھ کر یا غلام نہ بنا کر رکھتا ہو بلکہ اس کو وہ درجہ دے جس کا سبھی مذاہب نے اپنے یہاں بکھان کیا ہے۔ عورت پر صرف مرد کا ہی حق نہیں بلکہ عورت کا بھی مرد پر اتنا ہی حق ہے جتنا مرد کا عورت پر اور اسی فلسفہ کے تحت وہ اپنے بیٹے بلرام کی تعلیم و تربیت کرتی ہے اور یہی اس کہانی کا دوسرا رُخ ہے۔ اور جب بلرام رچنا نام کی لڑکی کو اپنے گھر اپنی ماں سے ملوانے لاتا ہے اور جو نفسیاتی اور اصلاحی گفتگو ماں بیٹے کے مابین ہوتی ہے یہی اس کہانی کا نچوڑ ہے اور افسانہ نگار کا مقصد بھی۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے

"کیا تم رچنا کو بھی ایسی ہی بھٹی میں جلانا چاہتے ہو؟" میں نے بڑے تیکھے لہجے میں بلرام سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں ماں، ہرگز نہیں''۔ وہ زور سے چیخا اور پھر صوفے سے اُٹھ کر میرے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

''تم وعدہ کرو کہ رنجنا کو غلام نہیں بناؤ گے۔ اس کی آزادی پر پہرے نہیں بٹھاؤ گے؟''

''میں تمہاری قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں''۔ اس نے مجھے زور سے جھنجھوڑ دیا۔

اسی لمحہ رچنا میرے پاؤں پر گر پڑی۔

''اتنا کڑا امتحان نہ لو اپنے بیٹے کا ماں جی''۔ اس کے گرم گرم آنسو میرے ٹھنڈے پاؤں کو بھگو رہے تھے۔

''تم میرے سامنے ہو''۔ اس افسانے میں روپا اور ترپاٹھی کو مرکزی کردار میں پیش کیا ہے۔ یہ روپا اور ترپاٹھی کے اٹوٹ بندھن اور ازدواجی زندگی کی کہانی ہے۔ افسانے میں افسانہ نگار نے عورت اور مرد دونوں کو اس نفسیاتی طور سے پیش کیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا برابر خیال رکھتے ہیں۔ روپا اگر ایک وفا شعار عورت ہے تو ترپاٹھی کو بھی بیوی کے روپ میں روپا کے حقوق کا اتنا ہی خیال ہے۔ کہانی میں تجسس تب پیدا ہوتا ہے جب روپا کی ایک سہیلی رچنا کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے اسی بیچ روپا اور ترپاٹھی نے ٹور کے لئے پروگرام بنایا تھا۔ بہر کیف روپا تو اپنی سہیلی کی موت کے باعث نہیں جا پائی مگر ترپاٹھی اپنے دفتر کی طرف سے انٹر اسٹیٹ میٹنگ کے لئے اندور روانہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے مانڈو کے تواریخی مقامات دیکھنے کے لئے جاتا ہے۔ کہانی کار نے مانڈو کے حوالے سے لمبی چوڑی روایت کا جو بیان کیا ہے اس سے کہانی میں پیوندکاری کا اثر نمایاں ہو گیا ہے۔ جیسے ہی ترپاٹھی واپس آتا ہے تو روپا کے ذریعہ اس کو پتہ چلتا ہے کہ رچنا کا شوہر دوسری شادی کر رہا ہے۔ اس بیچ روپا اور ترپاٹھی میں جو نفسیاتی محبت کی گفتگو ہوتی ہے وہی کہانی کے عنوان ''تم میرے سامنے ہو'' کے مطابق کھری اترتی ہے اور کہانی کار کے مقصد کا انکشاف ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے

''اگر میں مر گئی تو تم بھی شادی کر لو گے؟''

''ہر مرد ایسا ہی کرتا ہے''۔

''میں صرف تمہاری بات کر رہی ہوں۔ ترپاٹھی صرف تمہاری''۔ روپا نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا تھا۔ آنسو بھری آنکھوں کا اور کانپتے لہجے میں اس نے دوبارہ سوال کیا۔۔۔

''تم بھی یہی کرو گے؟''

''نہیں میں ایسا نہیں کر سکوں گا''۔

یہ سن کر روپا نے اپنی برسات بھری آنکھوں میں دھندلایا چہرہ تر پاٹھی کے کندھے پر رکھ دیا اور اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ اس نے اپنے کانپتے باروؤں سے روپا کی برسات میں بھیگے چہرے کو اپنے کندھے سے اُٹھایا۔ اپنے کوٹ کی آستین سے اسے پونچھا اور پھر دیر تک اپنے ہاتھوں کے کٹوروں میں روپا کی چھلکی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

''اب یہی میرا گھر ہے'' میں ذاکر صاحب نے آج کے خود غرض، مطلب پرست سماج اور معاشرے کا نفسیاتی نقشہ کھینچا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح انسانوں کے خوں سفید ہو گئے ہیں۔ کہانی مختصر ہے مگر قاری کے دل کو چھوتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کو پڑھ کر استعجاب بھی ہوتا ہے، افسوس بھی، دُکھ بھی اور واقعہ کو پڑھ کر انگشت بدنداں والی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ پرسنی جو ایک ضعیفہ خاتون ہے جس کے تین شادی شدہ بیٹے ہیں۔ ماں کی اچھی بھلی باتوں سے تنگ آ کر اسے شمشان میں بے سہارا، بے یار و مددگار چھوڑ آتے ہیں۔ ایک طرف اولاد کی سب سے گھٹیا حرکت قاری کے سامنے آتی ہے تو دوسری طرف ممتا کا خوں ہوتا ہے۔ یہ انسان کے نفسیات کا وہ حصہ ہے جہاں نرگسیت کے دوران مراجعت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس میں انساں کو وہ چیزیں بری لگتی ہیں جن سے ان کی رغبت ختم ہو گئی ہو۔ ذاکر صاحب نے پرسنی کے بہوؤں کے برتاؤ اور رویہ کو بڑے نفسیاتی طور سے پیش کیا ہے۔ مندرجہ ذیل جملوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار عورتوں کی زبان اور نفسیات سے بخوبی واقف ہے۔

''بڑھیا میں یہ ہمت''۔ بڑی بہو بولی۔

''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے''۔

دوسری بہو نے کہا۔

''بڑھیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے، ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مار رہی ہے''۔

تیسری بہو نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔

''بس اس کا انجام جو ہونا چاہئے تھا وہی ہوا اور آخر کار تینوں بیٹے اس کو شمشان گھاٹ چھوڑ آتے ہیں اور وہیں اس کی موت ہو جاتی ہے۔ ذاکر صاحب نے حالاتِ حاضرہ کی سچی تصویر کھینچی ہے جو کافی دیر تک قاری پر اپنا اثر چھوڑے رہتی ہے۔ گاؤں کے پنچ اسے اپنے گھر لے جانے کے لئے بھی کہتے ہیں مگر اس کا اپنا گھر ہی اپنا نہیں رہا اس پر وہ یوں ردِ عمل ظاہر کرتی ہے —

''اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب شمشان ہی میرا گھر ہے۔ میں یہیں رہوں گی اور

تنگی مروں گی"۔

"ایک کامیاب مرد" یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک ناکامیاب عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ کہانی کار کا اپنا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ذاکر صاحب نے کہانی میں ناکامیاب عورتوں کی ایک فہرست بھی پیش کی ہے اور ان کی اس فہرست میں ایک ہے محبت میں ناکام عورت۔ نیز اس افسانہ میں محبت میں ناکام عرت کی ہی داستان کو نفسیات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ رانو کی ناکام محبت کی ایک کہانی ہے جو اپنے ہی محلے کے برج موہن نام کے ایک غیر برادری کے لڑکے سے پیار کرتی ہے۔ مگر برادری دونوں کے بیچ میں دیوار بن جاتی ہے۔ البتہ رانو شادی کے بعد بھی اپنے پہلے پیار کو بھلا نہیں پاتی ہے اور اپنے ہونے والے لڑکے کا نام برج موہن ہی رکھتی ہے۔ رانو ایک کھاتے پیتے امیر گھرانے کی لڑکی ہے۔ پربھو دیال مہاجن جو اس کا شوہر ہے، اس کو زندگی میں ہمیشہ آگے بڑھنے کی تلقین اور حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس کی انا کو مرنے نہیں دیتی ہے۔ وہ نفسیاتی طور سے اپنے شوہر کا سماجی اور معاشی اسٹیٹس مضبوط دیکھنا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں وہ زندگی میں ہمیشہ کامیاب نظر آتا ہے۔

لیکن جو افسانہ کی تھیم اور مرکزیت ہے، وہ ہے رانو اور پربھو دیال کی ازدواجی زندگی کے مابین پیدا ہونے والے نفسیاتی پیچ و خم کا سلسلہ۔ یہ نفسیاتی پیچ و خم تب اور مزید شدت اختیار کر لیتے ہیں جب ان کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور ہر معاملے میں رانو اپنی ٹانگ اڑانی شروع کر دیتی ہے۔ ویسے تو رانو کے مزاج اور سرشت میں یہ بات ہم شروع سے ہی دیکھتے ہیں کہ وہ ہر معاملے میں اپنی بات کو فوقیت دیتی ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ دونوں کے بیچ کچھ تلخیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں مگر اس معاملے میں پربھو دیال ہوشیار ہی نہیں بلکہ معاملے کی نزاکت کو بھی سمجھنے والا ہے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں زہر گھولنا نہیں چاہتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے ساتھ بڑی باتوں کو بھی نظر انداز کر جاتا ہے جب کہ رانو اپنے بچوں کے معاملے میں نام سنسکرن سے لے کر بڑے ہونے اور یہاں تک کہ رشتوں کے معاملوں میں بھی اپنی ہٹ دھرمی دکھاتی ہے۔ وہ ہمیں ایک نرگسی عورت دکھائی دیتی ہے مگر اس کی اس نرگسیت میں افراط کا عنصر اس قدر تحلیل ہو جاتا ہے کہ اس باعث اس کا شوہر بھی ذہنی طور پر پریشان ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے اندر ضبط اور برداشت کرنے کا مادہ اس قدر ہے کہ قاری کو اس کے متحمل ہونے پر داد دینی پڑتی ہے۔ رانو کی بچکانہ اور احمقانہ حرکتوں کے باعث ان کی لڑکی چیتنا کا رشتہ بھی اُدھر میں لٹک جاتا ہے۔

"ایک عورت ایک ساڑھی" میں ایک بے نام کردار متکلم کی حیثیت سے ہے جس کے ذریعہ کہانی

آگے بڑھتی ہے۔ گویا کہ وہ قاری کو افسانہ کے مرکزی کردار مس تلواڑ کی زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی ہے۔ ذاکر صاحب کی اور کہانیوں کی طرح اس کہانی میں بھی عورت مرد کے استحصال کی شکار ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کی کہانیوں کا کمزور پہلو بھی یہی ہے اور خاص پہلو بھی کہ اس کے یہاں اُنا اور فوق الانا کو مرکزی حیثیت حاصل رہتی ہے۔ کبھی یہ ''انا'' افراط کی حد تک چلی جاتی ہے اور کبھی اس میں اعتدال کا وصف بھی دَر آتا ہے۔ اس افسانہ میں بھی مس تلواڑ اس انا کی شکار ہے اور جب یہ انا، فوق الانا اور یہاں تک کہ افراط کی حد تک پہنچ جاتی ہے تو یہ ازدواجی زندگی کے لئے نہایت ہی مضر ثابت ہوتی ہے۔ یہی بات ہمیں اس کہانی میں مس تلواڑ کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ یہ بات تو سہی ہے اور صدفی صد سچ ہے کہ عورت ہمیشہ سے ہی استحصال کا شکار ہوتی آئی ہے۔ مرد، حوا س کا ناخدا ہوتا ہے، اس پر بغیر کسی بنا پر جب ظلم کرتا ہے تو عورت کی اُنا جاگ جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ انسان میں انا کا عنصر ہمیشہ زندہ رہنا چاہئے مگر جب اس میں افراط کا عنصر تحلیل ہو جاتا ہے تو تعمیر کی بجائے تخریب کا جنم ہوتا ہے۔ مس تلواڑ کی کہانی بھی ایسے ہی نشیب و فراز کے نفسیاتی مرحلوں سے گزرتی ہوئی اختتام پذیر ہوتی ہے اور وہ ملک عدم کو لبیک کہہ دیتی ہے۔

ذاکر صاحب کا جو سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ جزئیات نگاری میں نفسیات سے کام لیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی وہ نفسیات کے وصف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ اس کہانی میں بھی ہمیں یہ وصف جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ مس تلواڑ کی جب اچانک موت کی خبر سواری کے توسل سے متکلم کو معلوم ہوتی ہے اور وہیں کھڑی کھڑی متکلم تلواڑ کی زندگی کے پس منظر میں کھو جاتی ہے۔ یہ ضمیر اور ذہن کے بیچ قبل الشعور سے متعلق ایک نفسیاتی سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہیں سے متکلم کی حیثیت سے مس تلواڑ کی زندگی کے اوراق پلٹنے شروع کرتی ہے اور قاری مس تلواڑ کی زندگی کے بارے میں آگاہی حاصل کرتا ہے جس میں وہ اپنے پتی کے ذریعہ استحصال کی جاتی ہے اور تنگ آکر وہ علیحدگی اختیار کر لیتی اور آخر کار تنِ تنہا اس دُنیا سے چل بستی ہے۔ یہاں کہانی کار نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کی زندگی کا کل سرمایہ اس کی ایک ساڑھی ہی ہوتی ہے اور مس تلواڑ بھی اپنی ساری زندگی کی دولت اسی دنیا میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

> ''ایک ہندوستانی عورت کی کل کائنات ایک سادہ سی سفید ساڑھی ہے جو اس کے جنم سے لے کر موت تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایک سفید ساڑھی　　اس کی حیات کا کل اثاثہ ہے''۔

''گلنار'' اور ''کتاب کور'' بھی ذاکر صاحب کے پچھلے افسانہ ''ڈریم لینڈ'' کی طرح ہی ہیں۔ ''گلنار'' اور ''کتاب کور'' میں بھی افسانہ نگار نے عورت کی اس نفسیات کو پیش کیا ہے جس میں عورت جنسیات کے معاملے میں اپنے شوہر سے محرومی کی شکار رہتی ہے۔ یا تو ان کے مرد کسی دوسری عورت میں دلچسپی لیتے ہیں یا پھر وہ عورت کے قابل نہیں ہوتے۔ ''گلنار'' بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں گلنار کی ماں مسز ملہوترہ کے نسوانی حقوق کا خون کیا گیا ہے۔ گلنار چھ سال کی ایک معصوم بچی ہے۔ گلنار اور مسز ملہوترہ سے مصنف کی ملاقات ہوائی سفر کے دوران سری نگر سے جموں جاتے ہوئے ہوتی ہے۔ باتوں ہی باتوں میں کہانی کار کو پتہ چلتا ہے کہ وہ تو ان کے شناسائی راکیش ملہوترہ کی بیوی ہے۔ ہوائی سفر کے دوران بچی کے توسل سے کہانی کار اور مسز ملہوترہ میں جو گفتگو ہوتی ہے اس میں ایک رومانس کی فضا کے ساتھ ساتھ مسز ملہوترہ کی آتشِ نہاں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مصنف باتوں ہی باتوں میں راکیش ملہوترہ کے کردار اور چال چلن پر حرف زنی اس انداز سے کرتا ہے کہ مسز ملہوترہ کا کوئی ردعمل نہیں ہوتا ہے اور وہ ہاں میں ہاں ملاتی ہے۔ اقتباس دیکھئے —

''کیا نام ہے آپ کے ہسبینڈ کا؟''

''راکیش ملہوترہ''۔

''آئی تھنک آئی نو ہم۔ وہ لمبا خوبصورت جوان ہے نا؟''

''جی''۔

''پہلے اے آئی آر میں تھا؟''

''جی''۔

''لڑکیاں اس کے آگے پیچھے پھرتی تھیں؟''

وہ خاتون خاموش رہی۔

''اب کیا عالم ہے؟''

''اب بھی ویسا ہی ہے۔ اسی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہوں''۔

اوپر کے اقتباس سے ہمیں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مسز ملہوترہ کے سینہ میں کتنا درد، پیڑا اور پیاس باقی ہے۔ جموں آنے پر وہ کہانی کار کو اپنے گھر لے جاتی ہے اور جب گھر پہنچنے پر اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کا پتی کسی مہمان استری کو چھوڑنے پہلگام گیا ہے تو یہ اس کے دردِ نہاں اور آتشِ نہاں میں اور مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ راکیش ملہوترہ کے گھر پر کہانی کار کے بیچ ہونے والی گفتگو میں بھی مسز ملہوترہ میں جنسیاتی مدو

جز رصاف دکھائی دیتا ہے۔

''کتاب کور'' بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔ کتاب کور اس افسانہ کا مرکزی کردار ہے جس کا شوہر ایک ریٹائرڈ کپتان ہے جو قوتِ باہ اور عقل دونوں سے خارج ہے۔ کتاب کور واقعی ایک کوری کتاب ہے جس کے اوراق پر کسی طرح کے کوئی نشان موجود نہیں ہیں۔ اسے زندگی میں کبھی نفسیاتی خواہشات کی آسودگی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی جھیل میں کوئی پانی آ کر نہیں گرا۔ وہ ایک خشک جھیل کی مانند ہے۔ کپتان صرف قوتِ باہ میں ہی کمزور نہیں ہے بلکہ ایک شکی اور سنکی قسم کا انسان بھی ہے۔ وہ نفسیاتی اعتبار سے اعصابی خلل کا شکار ہے۔ کتاب کور سے شادی کیے ہوئے اسے دو سال ہو گئے ہیں مگر کتاب کور نے ان دو سالوں کے بیچ ایک دو مرتبہ ہی کپتان کے بنگلے سے باہر قدم رکھا ہے۔ اچانک ان کے یہاں ایک نیا کرائے دار غیر شادی شدہ راکیش نام کا نوجوان آتا ہے جس کے ساتھ ماں اور بہن رہتی ہیں۔ ہر تین مہینے کے بعد وہ مکان بدل دیتا ہے۔ یہ بھی ایک خبطی قسم کا انسان ہے جو مستقل مزاج کا مالک نہیں ہے۔ فنکار نے اس افسانے میں ''کتاب'' کو جگہ جگہ تمثیل کے طور پر پیش کیا ہے کیونکہ راکیش بھی کتابوں کے پڑھنے کا بے حد شوقین ہے۔ کہانی کار نے ''کتاب'' کے حوالے سے کتاب کور اور راکیش کی شرارتوں، باتوں، نوک جھونک اور اس میں آمیزش ہونے والی نفسیاتی خواہشات اور جنسی تہیجات کے نشیب و فراز کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے بس میں کہانی کار کا اسلوب ہی پنہاں نہیں ہے بلکہ حسین و لطیف گفتگو اور مقصدیت بھی پوشیدہ ہے۔ کہانی کار کہانی میں ایسے ایسے جملے کہہ جاتا ہے جن کا تعلق براہِ راست جنسی آسودگی سے ہے اور کتاب کور کی زندگی میں ان کا فقدان ہے۔

راکیش جب سے کپتان کے بنگلے میں آیا ہے اس کی زندگی میں گویا رونق آ گئی ہے۔ نہ جانے کس طرح کپتان نے اسے راکیش کے کمرے میں آنے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ راکیش کی ماں اور بہن مالتی سے دھیرے دھیرے اس کے ربط و ضبط قائم ہو جاتے ہیں۔ مگر اس ربط و ضبط میں مقصد تو راکیش کو پانے کا ہے۔ کتاب کور جو راکیش کو دیکھ کر سر پر آنچل رکھ لیتی تھی، مگر چند ملاقاتوں سے ہی کتاب کور کی یہ جھجک ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ راکیش کے سامنے اپنا ڈھلکا ہوا آنچل سنبھالنے کی کوشش نہ کرتی۔ مندرجہ ذیل اقتباسات کو آپ پڑھیے اور دیکھیے کہ کتاب کور کی ادھوری زندگی کا مقصد اور نفسیاتی علت تامہ کس قدر سربستہ ہے اور وہ اپنی علتِ جنسی کا معالج راکیش میں تلاش کرتی ہے۔

''نمستے''۔ وہ راکیش کی طرف مڑی اور مسکرائی۔

''بہت دنوں میں درشن ہوئے آپ کے؟''

"آپ کو بیماری، کتابوں سے اور دفتر کی فائلوں سے فرصت ملے تو کسی دوسری طرف دھیان دیں"۔

"اچھا تو یہی پوچھ رہی تھیں آپ میرے نوکر سے"۔

"جی"۔

"پہلے دن تو آپ نے خبر تک نہ لی کہ آپ کے کرائے دار کیسے ہیں"۔

"کرائے دار آپ میرے نہیں کپتان صاحب کے ہیں"۔

"ایک ہی بات ہے"۔

"ایک نہیں ہے"۔(۱)

"دھیرے دھیرے راکیش کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ چٹان حواب تک برسات میں اُگی ہوئی گھاس پر پڑی اُسے کچل رہی تھی، کسی نے ایک طرف دھکیل دی تھی۔ کونپلوں کا رنگ بدلنے لگا تھا اور ان میں توانائی آنے لگی تھی"۔(۲)

"کتاب کور کی زندگی میں کہیں کوئی رنگ، کوئی اتھل پتھل، کوئی چمک دمک، کچھ بھی نہ تھا۔ ایک سپاٹ اور سیدھا راستہ تھا جس میں کہیں کوئی موڑ نہ تھا اور راکیش کے آجانے سے اس کے جیون میں ایک رنگ آ گیا تھا"۔(۳)

"دوسرا موسم" یہ ذاکر صاحب کی پہلی کہانی "اب یہی میرا گھر ہے" سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس افسانے میں بھی ایک ضعیف خاتون کو، جس کا نام لیلا دیوی ہے، اولڈ پیپلز ہوم کے گیٹ کے آگے چھوڑ جاتے ہیں۔ "اب یہی میرا گھر ہے" افسانے میں بھی ایک ضعیفہ کو اس کے بیٹے اپنے بہوؤں کے کہنے پر اسے شمشان گھاٹ چھوڑ آتے ہیں جہاں وہ خوف و دہشت اور موسم کی تاب نہ لا کر مر جاتی ہے۔ لیکن کہانی کار نے اس افسانے میں خود غرض اور بے رحم لوگوں کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں ہمدرد، محسن اور بے لوث قسم کے انسان بھی رہتے ہیں۔ یہاں کہانی کا مقصد عبرت حاصل کرانا ہے اور انسانی رشتے کو بروئے کار لانا ہے۔ کہانی میں سماج کے دو نفسیاتی رُخوں کی غمازی کی گئی ہے۔ ایک رُخ وہ کہ ہم اپنے نفس کی خاطر انسانی قدروں اور رشتوں کو بھی بھول جاتے ہیں اور دوسرا رُخ یہ کہ ۲۱ ویں صدی کے اس گہما گہمی اور بھاگ دوڑ کے عالم میں وہ لوگ بھی ابھی زندہ ہیں جو انسانی قدروں کو پامال ہونے سے بچانے میں لگے ہوئے ہیں اور شاید اس بنا پر کہ کہیں لوگوں کا اس دنیا سے یقین ہی نہ اُٹھ جائے۔ چنانچہ کہانی کا کردار، جو نسوانی کردار متکلم کی حیثیت سے ہے، جب ٹی وی اسکرین پر اس مظلوم ضعیفہ کو

دیکھتی ہے تو وہ دوردرشن والوں سے رابطہ کر کے اُسے اپنے گھر لے آتی ہے کیونکہ نسوانی کردار کی ماں اسے بچپن میں چھوڑ کر مرگئی تھی اور افسانے کا یہ آخری اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں اس ضعیفہ کے تئیں اس نسوانی کردار کا خلوص، ہمدردی اور بے کراں پیار نہاں ہے —

''شریمتی رکمی دیوی، میری پہلی ماں، جو مجھے تیس سال پہلے اچانک چھوڑ گئی تھی، میری زندگی کے ہرے بھرے باغ کا پہلا خوش گوار موسم تھا اور شریمتی لیلا دیوی، جسے میں نے تیس سال کے بعد، اچانک آج ہی دوسری ماں کے روپ میں قبول کیا ہے، میری زندگی کے خزاں بھرے باغ کا دوسرا موسم ہے''۔

''ایک ڈری ہوئی لڑکی''، یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کی ماں راجو تقسیم وطن کے دوران فسادات کی زد میں آجاتی ہے اور ہمیت قسم کے لوگ اس کے ساتھ ریپ کرتے رہتے ہیں۔ راجو کا باپ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی پر ہونے والے مظالم کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا رہتا ہے۔ جہاں اس کی غیرت اور حس بالکل بھی بیدار نہیں ہوتی ہے اور وہ راجو کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہاں سے ذہنی طور پر راجو کے وجود اور نسوانی فطرت پر بے حد برا اثر پڑتا ہے لیکن دھیرج چاؤلہ نام کا ایک دلیر نوجوان اسے دل سے اپنا لیتا ہے۔ چنانچہ وہ ماضی کو بھول جاتی ہے۔ لیکن اس کے قبل شعور میں ہمیت اور حیوانیت قسم کے لوگوں کا ایک امٹ نقش ثبت ہو چکا تھا جو کبھی بھی عود آسکتا تھا اور ہوا بھی وہی۔ کچھ دن کے بعد اس نے ایک بچی کو جنم دیا۔ بچی کی ولادت کے دوران وہ فوراً بے ہوش ہوگئی تھی لیکن جب اسے ہوش آیا تو اس کا قبل شعور پھر بیدار ہوگیا۔ یہ اقتباس دیکھئے —

''اس نے اپنے پہلو میں پڑے گوشت کے لوتھڑے کو دیکھا تو ایک دم چیخی —

''اسے کہیں چھپادو۔

نہیں تو غنڈے اُٹھا کر لے جائیں گے اور اس کا ریپ کریں گے''۔

ڈاکٹر اور اسپتال کے اسٹاف اور دھیرج سبھی حیران تھے۔ راجو دوبارہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو بچی کو اس سے الگ کر دیا گیا تھا۔

راجو دوبارہ دھیرج کو وہ پیار نہ دے سکی جو وہ پچھلے ایک برس سے اُسے دیتی آئی تھی''۔

راجو کی یہی لڑکی کہانی کار کے دفتر میں مختصر نویس ہے جو ایک دن کہانی کار سے ایک افسر ہونے کے ناتے اپنے دفتر کے لڑکوں کی شکایت کرتی ہے کہ وہ مجھ سے ریپ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس افسانے میں افسانہ نگار نے آج کے سماج، دور اور معاشرے میں ہونے والی بیہودہ نفسیاتی حرکتوں پر روشنی ڈالی

ہے لیکن یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا حل افسانہ نگار کے پاس بھی موجود نہیں۔ اور وہ اسی کشمکش میں ہے کہ اس گتھی کا کیا حل تلاش کیا جائے نیز خود کہانی کار کے الفاظ میں ـــــ

''اور میں لیمپ پوسٹ کے ساتھ کھڑا اس سے یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اس شکایت پر کیا ایکشن لینا چاہئے''۔

اور انہی لفظوں کے ساتھ افسانہ کا اختتام ہو جاتا ہے۔

''پرواز کے زخم'' اس کہانی میں بھی دوسری کہانیوں کی طرح افسانہ نگار متکلم کردار کی حیثیت سے ہے۔ دوسرا کردار نیناں کا ہے اور تیسرا مرکزی کردار شاردا کا ہے۔ شاردا کہانی کار کی دوشیزہ اور نیناں کی ایک اچھی دوست ہے۔ جب کہ نیناں متکلم کی ہم ادارہ بھی رہ چکی ہے۔ چنانچہ وہ نینا کو کالج ٹائم سے جانتا ہے۔ نیناں سے افسانہ نگار کی اکثر ملاقاتیں شاردار کے توسل سے ہوتی ہیں۔ نیناں کا باپ ایک وکیل ہے جو قدامت پسند اصولوں کا خیر خواہ ہے۔ نیناں کے باپ کی یہ قدامت پسندی، اصول پرستی، اس کی زندگی میں زہر گھول دیتی ہے۔ اس کی ہنسی خوشی اور کھلی فضا میں پرواز کرنے پر وہ روک لگا دیتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد پرواز نہیں کر سکتی ہے۔ وہ وکیل صاحب کی حویلی میں مقید ہے جسے کہانی کار کے مطابق، اس نے اصطبل بنا رکھا ہے۔ کسی طرح کی کوئی رونق نہیں، چہل پہل نہیں، ایک اجاڑ قسم کا ماحول ہے، جو داخل ہوتے ہوئے ڈسنے کو آتا ہے۔ اس کا ایک بیٹا یعنی نیناں کا بھائی ہے، جو اپنے باپ سے تنگ آ کر الہ آباد جا کر مقیم ہو جاتا ہے۔ کاش نیناں بھی اپنے بھائی کی طرح پرواز کر کے کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتی۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی وہ پرواز نہیں لگا سکتی۔ اسے سماج، خاندان اور لوک لاج کا بھی خیال ہے اور یہیں سے ہی شروع ہوتا ہے اس کے نفسیاتی پیچ و خم کا لامتناہی سلسلہ۔ ایسا سلسلہ جس میں آبائی الجھاؤ بھی موجود ہے اور نفسیاتی شکار ہونے کے باعث بہت سی اعصابی اور وضعی بیماریوں کی شکار بھی ہے۔ نیز پرواز کے زخم وہ جھیلتی رہتی ہے جو اپنے خیالوں اور تصورات و تفکرات کی کائنات میں ہی محبوس ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں کہانی کار کا یہی مقصد ہے کہ ہمیں اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت اور ان کی سوسائٹی کے متعلق میانہ روی سے کام لینا چاہئے۔ ہمیں اتنا سخت بھی نہیں بننا چاہئے کہ وہ بچے ذہنی اور جسمانی اعتبار سے نفسیات کی رد میں آ جائیں۔ نیناں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ اس نے کتابوں کا سہارا لینا شروع کیا اور یہ کتابی مطالعہ جنوں کی حد تک بڑھ گیا نیز وہ ناول اور کہانیاں بھی لکھنے لگی۔ گو وہ اس قدر نرگسیت کی شکار ہوتی گئی کہ ایک دن پھر اسی جنونیت میں اس نے اپنی تمام کتابیں جلا ڈالیں۔ یہ واقعہ شادی کے بعد ہوا کیونکہ شادی کے معاملے میں بھی اس کے باپ نے اس سے کسی طرح کی کوئی صلاح اور مشورہ نہیں لیا اور ایک بے جان گڑیا

کی طرح اسے رخصت کر دیا تھا۔ اس کا بھائی دلیپ سنگھ جو نیناں سے بہت پیار کرتا تھا اور ایک وہی اس کا ہم مزاج اور دُکھوں کو بانٹنے والا تھا، وہ بھی نیناں کی شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس باعث وہ ذہنی اور جسمانی طور پر مزید نفسیات کی شکار ہو گئی تھی کیونکہ شادی کے وقت کوئی اس کی ڈھارس بندھانے والا نہیں تھا ۔الغرض یہ ایک ایسی کہانی ہے جو زندگی بھر پروار کے زخم سہتی رہتی ہے۔

اس کہانی میں ذاکر صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ محاورات، تمثیلات اور تشبیہات کے ذریعہ وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے، جو کہانی اور تھیم کا تقاضا ہے۔ یہ وصف اور فنی تخصیص صرف ذاکر صاحب کی اسی کہانی میں دکھائی نہیں دیتی بلکہ وہ اپنی تمام تر کہانیوں میں ایسی ہی نادر تشبیہات واستعارات اور اشارے کنائے استعمال کرتے ہیں، جس کے موجب اس کے فن میں گیرائی، گہرائی اور داخلیت کا عنصر تحلیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ جو بات قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں، اپنے مختص الفاظ اور استناطی عمل، انداز بیاں اور اسلوب نگارش سے پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ کرداروں اور مرکزی خیال کے تئیں ان کی جاذب نظر قاری کے لئے بھی جاذبِ نظر ثابت ہوتی ہے اور ان کی اس جاذبیت میں ان کی جانکاہی و جاں فشانی پیوست رہتی ہے اور اس پیوستگی میں ان کے تجربات و مشاہدات، خیالات و تفکرات اور نظریات شامل ہوتے ہیں جو قاری کو سماجی، گھریلو، معاشی، ازدواجی حالات اور نفسیاتی تشدد سے واقف کراتے ہیں۔ نیز ''تجھے ہم وہی سمجھتے'' بھی انہیں فنی اوصاف کا آئینہ دار ثابت ہوتا ہے جس میں ذاکر صاحب کی بوقلمونیاں اور تنوعات، موضوع، تھیم، کردار ساری، فنی جودت اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے بکھری پڑی ہیں جن کو یکجا کرنا اتنا سہل کام نہیں ہے۔ تاہم میری یہ ادنیٰ سی کاوش ضرور ان کی شخصیت اور فن کو اُجاگر کرے گی۔

کشمیری لال ذاکر صاحب بجا طور پر فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ جن لوگوں نے اُردو کو یہ مقام دلانے میں مدد دی ہے اُن میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ وہ تخلیقی فنکار ہیں۔ شعر، افسانہ اور ناول میں ان کا نام ہمارے صفِ اول کے لکھنے والوں میں لیا جاتا ہے۔۔ ان کی پانچ چھ درجن کتابیں شائع ہو کر ناقدین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مختلف اداروں نے انعامات اور ایوارڈ دے کر اُن کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

۔۔مالک رام

— آزاد گلاٹی

کشمیری لال ذاکر — بحیثیت خاکہ نگار

افسانہ، ناول اور شاعری کے علاوہ کشمیری لال ذاکر کی تخلیقی جولانیوں کی ایک اہم سمت خاکہ نگاری
ی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکوں کی کتاب ''اپنی ہواؤں کی خوشبو'' میں بقول خود ان کے ''شخصی
عالیے'' ہیں اور ''یہ نقش ان نازک خیال لوگوں کی شخصیتوں کے پرتو ہیں جن سے ادب کے ستارے روشنی
تے ہیں۔'' شخصی خاکہ نگاری تو کھیل ہی شخصی تاثرات کی جادوگری کا ہے۔ یہ دراصل غزل کی طرح ریزہ
اری میں میناکاری کا فن ہے اور دریا کو کوزے میں بند کردینے کا بھی۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کی
وایت کچھ خاص پرانی تو نہیں ہے لیکن ایسا بھی تو نہیں ہے کہ اردو میں اچھے خاکوں کا فقدان ہو۔ فرحت
للہ بیگ، چراغ حسن حسرت، رشید احمد صدیقی، شورش کاشمیری، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، صالحہ
اہد حسین، جگن ناتھ آزاد، محمد طفیل، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، عوض سعید وغیرہ نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے اس
ن کو مرحلہ بہ مرحلہ عروج پر پہنچادیا ہے۔ ذاکر صاحب کا نام بھی اس فہرست میں ایک قابلِ احترام مقام کا
ق دار ہے۔

خاکہ نگاری کی کوئی واضح یا جامع تعریف لکھنا تو شاید ممکن نہیں کیوں کہ بیشتر اصناف ادب کی طرح
بھی کوئی جامد صنف نہیں ہے جس کی حدود مقرر کی جاسکیں۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خاکہ نگاری شخصیت
کے ظاہر و باطن کی چند انفرادی خصوصیات کے تاثرات کا ایک ایسا لفظی اسکیچ ہے جس میں اس کے زندہ اور
متحرک ہونے کا احساس در آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی شخصیت کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر زندہ
کرنے کے لیے جہاں شخصیت میں کسی اہم جوہر کا ہونا لازمی ہے وہاں خاکہ نگار کے قلم اور اس کی بصیرت
ں بھی ایسی توانائی اور تابانی کا ہونا ضروری ہے جس سے وہ کم سے کم الفاظ میں اسے گویائی دے سکے۔
قول مشفق خواجہ ''شخصی خاکہ نگاری کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو ایسی آنکھ
چاہئے جو کسی شخص کے ظاہر و باطن کا مشاہدہ کرسکے۔ پھر وہ بصیرت چاہئے جو ان عوامل کا تعین کرسکے
جو کسی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تیسری چیز حقیقت بیانی ہے۔ یعنی موضوع کو اس طرح
پیش کیا جائے جیسا وہ ہے، نہ کہ لکھنے والا اپنی منشا کے مطابق اس کے خد و خال سنوارے یا بگاڑے۔ چوتھی

اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ خاکہ نگار کو لکھنے کا فن آتا ہو، وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہو۔ ''اپنی ہواؤں کی خوشبو'' اس بات کا ثبوت ہے کہ ذاکر صاحب ان میں سے بیشتر شرائط ہمہ وقت پوری کرتے ہیں۔

جب نیک چند کے خاکے میں سدھا یہ کہتی ہے کہ ''آپ پتھروں میں روحیں بلاتے ہیں، ذاکر صاحب لفظوں میں بلاتے ہیں'' تو وہ جہاں فن کاروں کی مابعد الطبیعاتی صلاحیتوں کا اعتراف کرتی ہے وہاں ایک لحاظ سے آدھے سچ کا بھی اظہار کرتی ہے کیوں کہ یہ دونوں فن کار اپنے خام مواد میں نہ صرف روحیں ملاتے یا ڈالتے ہیں بلکہ اپنے ہاتھ اور قلم کی صفائی سے اس کے جسم کے خدوخال بھی تراشتے ہیں اور اس کی سیرت کے جوہر بھی کچھ اس ڈھنگ سے ابھارتے ہیں کہ وہ واقعی مجسم اور متحرک نظر آتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے ہاں یہ عمل عام طور پر ایک پنسل اسکیچ کی طرح ہوتا ہے وہ یہاں ہلکی گہری لکیریں ایسے فنکارانہ انداز سے لگاتے چلے جاتے ہیں کہ کردار کی شخصیت اپنے ظاہری حدوخال اور باطنی خصائل کے تمام تاثر سے ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ویسے بھی خاکہ نگاری کا فن فوٹوگرافی کا نہیں بلکہ مصوّری کا فن ہے۔ جس طرح ایک مصوّر کردار کے شخصی تاثر کو ابھارنے کے لیے، اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ کے تحت شخصیت کے عوامل کی ترجیحات و تشریحات میں انتخاب کے عمل سے گزرتا ہے، عین اس طرح خاکہ نگار کو بھی کردار کی شخصیت کے ایسے نمایاں اور نمائندہ خطوں اور قوسوں کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جن کے ذریعے کم سے کم الفاظ میں وہ شخصیت کے زیادہ سے زیادہ ابعاد کو اجاگر کر سکے۔ اس طرح سے اپنی بصارت سے کہیں زیادہ اپنی بصیرت کو بروئے کار لانا ہوتا ہے۔ یہاں خاکہ نگاری سوانح نگاری کے فن سے گریز کی نکالتی ہے۔

ذاکر صاحب کو قدرت سے بڑی تیز قوتِ مشاہدہ ودیعت ہوئی ہے اور ان کے ہاں وہ بصیرت بھی ہے جو کردار کی ان خصوصیات کا انتخاب کر سکتی ہے جو اس کے خدوخال اُبھارنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ذاکر صاحب شخصیات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بسا اوقات چند ہی لفظوں میں ان کی صورت و سیرت کے نقوش نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بلونت سنگھ کے بارے میں ان کے یہ تاثرات و بیانات دیکھئے

''ایک دم تھری ناٹ تھری تھا وہ ان دنوں'' ''بلونت سنگھ تو شکل صورت میں بھی تھانیدار لگتا تھا، ڈیل ڈول سے بھی اور زبان کے لہجے سے بھی'' ''اس کے دستخط دیکھ کر ایسے لگتا تھا کہ چوتھے یا پانچویں درجے کے کسی طالب علم کے دستخط ہیں۔'' ''وہ جہاں بھی رہا اپنے ساتھ پنجاب کی آب و ہوا لیے

پھر۔''اس سلسلے کی چند اور مثالیں بھی ملاحظہ کیجیے

- ''میں سن رہا تھا اور فراق صاحب بول رہے تھے۔لگ رہا تھا جیسے علم و ادب کے آبشار کے پاس کھڑا تھا اور ہلکی فرحت انگیز پھوار پڑ رہی تھی۔''
- ''ان کے اپنے مزاج میں کہیں جھوٹ نہیں، نہ لباس میں نہ شخصیت میں۔''
- ''صاف گوئی اور ایمانداری اور خلوص اور دردمندی کا احساس یوگ جوائے کی شخصیت کے اندر اپنی تکمیل کر رہے تھے۔''
- ''قتیل کی شاعری اور اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی گرماہٹ کی کیفیت ہے۔ایسی گرماہٹ جو دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں آتش دان میں لکڑیاں سلگانے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگوں کو محسوس ہوتی ہے۔''

ذاکر صاحب کی قوت مشاہدہ کی کرامات جہاں کرداروں کی ظاہری صورت نکھارنے میں نظر آتی ہے وہاں ان کی بصیرت ان کرداروں کی سیرت کے ایسے عناصر پر ٹک جاتی ہے جو ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کی بنیاد ہوتے ہیں۔ذاکر صاحب کہتے ہیں ''میں نزدیک کی چیزوں کو کم اور دور کی چیزوں کو زیادہ دیکھنے کا عادی ہوں۔'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دور نزدیک، ماضی حال، ظاہر و باطن، سبھی پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس طرح انھیں اپنے کرداروں سے قربت کا جو احساس ہوتا ہے وہ ان کے خاکوں میں سوز و گداز پیدا کر دیتا ہے جس سے ان کی شخصیت کے کئی مخفی پہلو بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ایسی بصیرت خاکہ نگار کے لیے ایک ایسا عطیہ ہے جو اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

چونکہ خاکہ نگار اپنے کرداروں سے قربت اور ذہنی وابستگی رکھتا ہے، اس لیے جہاں اسے کرداروں کو سمجھنے سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے وہاں یہی آسانی اس کے لیے ایک دشواری بھی بن جاتی ہے۔ حقیقت بیانی کا پل صراط طے کرنے کے لیے جس معروضی اور غیر ذاتی انداز نگارش کی ضرورت ہے وہ ایسے عالم میں خاکہ نگار کے لیے ایک امتحان بن جاتا ہے۔ذاکر صاحب اس پل صراط کو بڑی خوبی سے پار کر لیتے ہیں۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں وہ تنقیدی شعور بھی ہے جو شخصیت اور دونوں کو ایک Detached طریقے سے دیکھنے میں مدد کرتا ہے۔جب وہ جاں نثار اختر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''وہ اپنے نظریات اور ملازمت کے تقاضوں کے آپسی تضاد سے سمجھوتہ نہ کر سکا۔'' تو وہ جہاں اختر کی زندگی سے گہری وابستگی اور واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں وہاں اسکی شخصیت کے اس پہلو کو بھی پیش کرتے ہیں جس کی تصدیق اختر کی ساری زندگی سے ہوتی ہے۔کبھی کبھی وہ اس معروضی فاصلہ کو برقرار رکھنے کے

لیے شخصیت کے کسی اہم پہلو کو یا کسی واقعہ یا بات کو Generalise بھی کر لیتے ہیں۔ مثلاً ''یوگ جوائے حس کے ذہن میں آج سے تیس برس پہلے کی تصویریں ہی تصویریں بکھری پڑی تھیں اور وہ ہر لحہ جنھیں سمیٹنے میں مصروف رہتا تھا۔ آج اپنی ہر تصویر میں بکھرا پڑا ہے۔ اس کی ہر تصویر انسانیت کے مستقبل کی تصویر ہے۔'' اردو تب بھی تیسرے درجے کے مسافروں کی زبان تھی　اور لطف یہ تھا کہ تیسرے درجے کی زبان کے شاعروں کو دوسرے اور پہلے درجے کے لوگ زیادہ شوق سے سنتے تھے اور زیادہ خوش سے داد دیتے تھے'' تو وہ ساحر لدھیانوی کے بارے میں لکھتے وقت ہندوستان میں اردو کی حالت بھی بیاں کرتے ہیں، جس سے سب کچھ ذاتی سطح سے بلند ہو کر غیر ذاتی سطح پر آ جاتا ہے۔

جہاں تک خاکہ نگاری کی اس شرط کا سوال ہے کہ خاکہ نگار کو لکھنے کا فن آتا ہو تو ذاکر صاحب کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس فن میں طاق ہیں۔ وہ کفایتِ لفظی سے بھی کام لینا جانتے ہیں اور خوبصورت، دل میں اتر جانے والے جملوں سے بھی جو کسی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو قاری کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔ 'اپنی ہواؤں کی خوشبو' سے یہ چند مثالیں دیکھیے

- ''وہ جہاں ہوتا ہے بس وہیں نہیں ہوتا۔ جہاں وہ نہیں ہوتا، وہیں موجود ہوتا ہے۔''
- ''پہلے وہ تصویروں میں بولا کرتا تھا اب اس کی تصویریں بولتی ہیں۔ بولا تو خیر وہ جب بھی کہا کرتا تھا۔ اس کی خاموشی، گہری گہری، غم آلود آنکھیں ہی بولا کرتی تھیں، اس کی تصویروں میں۔''
- ''اب وہ تصویریں تلاش نہیں کرتا، تصویریں اسے تلاش کرتی ہیں اسے بکھیرتی ہیں، اسے انوائٹ کرتی ہیں۔''
- ''درد کی صرف گواہی دی جا سکتی ہے، اسے بھوگا نہیں جا سکتا۔''
- ''خدا کو متاثر کرنے کے لیے عالمگیر مذہب کی ضرورت ہے۔''
- ''ادب ہماری شخصیت کے تیز کونوں کو گولائیاں دیتا ہے اور ہم دوسروں کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کے انگوں کو چھیلتے نہیں۔''
- ''ہر نام کے ساتھ اپنا ایک ماحول ہوتا ہے۔''

ایسے جملوں کے معنوی تہہ داری اور Suggestiveness سے ذاکر صاحب ایک اچھے قلمکار کی طرح کام لینا جانتے ہیں۔

چونکہ ذاکر صاحب بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ وہ خاکوں میں بھی کہیں کہیں افسانوی حربوں سے دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن کئی بار اس کی اسی حوبی کا ان کے خاکوں کی خامی بن جانے کا شائبہ پیدا

ہونے لگتا ہے۔ ان کے خاکوں میں جہاں مختصر افسانے کی سی کیفیت ہوتی ہے وہاں کہیں کہیں جزویاتی طوالت اور Digressions بھی ملتے ہیں۔ لیکن وہ ایک ماہر فن کار کی طرح اس عیب کو یوں ہنر بنا لیتے ہیں کہ وہ اسے اپنے عہد کی ادبی، ثقافتی اور معاشرتی فضا خلق کرنے کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے خاکوں کے کرداروں کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو ایک ایسے تناظر میں منکشف کرتے ہیں جس سے ان کا شخصی تاثر ذہن پر مزید گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے اور اگر کہیں ان کی اپنی ذات ان کے کرداروں کی شخصیت پر حاوی ہونے لگتی ہے تو وہ اس تناظر میں اس تاثر کو Dilute کر دیتے ہیں اور اس طرح اپنے خاکوں میں ایک ایسا توازن برقرار رکھنے میں اکثر و بیشتر کامیاب رہتے ہیں جو اچھے خاکہ نگار کی ایک اہم صلاحیت ہے۔ اور ذاکر صاحب یقیناً ایک بہت اچھے خاکہ نگار ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کا نام ہمارے ادب میں ایک معتبر نام ہے۔ شاعر کی حیثیت سے بھی اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی۔ خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی اور نقاد کی حیثیت سے بھی۔ ادب کی اس قدر اصناف پر لکھنا اور اس طرح نام پیدا کرنا کہ مستند تخلیقی فن کار اور مستند نقاد اُن کے کمالِ فن اور کمالِ نقد و نظر کا اعتراف کریں، ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ بڑی بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مَیں ذاکر صاحب کی شاعری اور فکشن کا ایک زمانے سے قائل تھا اور ہوں لیکن ابھی جب مَیں دہلی سے اُدھر چیکوسلواکیہ روانہ ہو رہا تھا تو ڈاکٹر خلیق انجم کی میز پر ذاکر صاحب کی نئی تصنیف دیکھی۔ خاکوں پر مشتمل۔ مَیں نے وہاں بیٹھے بیٹھے اس پر محض ایک نظر ہی نہیں ڈالی بلکہ اس کے کئی ابواب اول سے آخر تک پڑھ لیے۔ اس کتاب کا نام ہے ''اپنی ہواؤں کی خوشبو''۔

خاکہ نگاری میں بالعموم ادبی تنقید کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن مذکورہ خاکوں میں ذاکر صاحب نے فن کاروں کی شخصیت پرستی پر روشنی ڈالتے ہوئے جس طرح اپنی تنقیدی نثر کا جادو جگایا ہے، ہر اہلِ قلم کے بس کی بات نہیں۔ احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، محمد طفیل اور ساحر لدھیانوی پر لکھے ہوئے خاکے تو بے ساختہ دل میں اُتر جاتے ہیں۔

۔جگن ناتھ آزاد

کشمیری لال ذاکر

زیرِ لب سے گھر آنگن تک

جاں نثار اختر

میں جاں نثار اختر سے پہلی بار ملنے سے پہلے ہی اُس سے کئی بار مل چکا تھا۔

اور یہ ملاقاتیں اختر کی مرحوم شریکِ حیات صفیہ اختر کی وساطت سے ہوئی تھیں۔ اس کے خطوط پڑھ کر جو وہ جاں نثار اختر کو لکھتی رہی تھیں اور جنھیں بعد میں اختر نے 'زیرِ لب' کے عنوان سے کتاب کی شکل میں چھپوایا تھا۔ ایک عورت کسی مرد کو اس حد تک بھی پیار کر سکتی ہے۔ اس کا مجھے یقین نہیں تھا، عورت تو پیار کر سکتی ہے لیکن صرف اس مرد سے جو اُس کا محبوب ہے۔ محبوب جب خاوند بن جائے تو پیار صرف ایک فارمیلیٹی بن کر رہ جاتا ہے اور صرف جمع تفریق کے کام آتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی پریشانیاں مختلف مدوں پر اخراجات کی تفصیلیں اور نون، تیل، لکڑی کا حساب کتاب۔ اس میں پیار کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔ آپسی جھک جھک کے بعد کہیں رات کو بند کواڑوں کے اندر 'جب دونوں اکیلے ہوتے ہیں تو پیار تو خیر نہیں' البتہ سیکس کی لذت ضرور باقی رہ جاتی ہے۔ اور اس طرح ازدواجی رشتے میں بندھ کر ایک دوسرے سے پیار کرنے والے دو انسان زندگی کی تلخیوں، رنجشوں اور بکھیڑوں کا جوا گلے میں ڈالے کولہو کے بیل کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔

جب میں نے صفیہ اختر کے خطوط کو پڑھا تو مجھے کئی بار یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ اس میں خود اختر نے اپنی طرف سے اضافے کر کے خطوں کو چھپوایا ہو اور دراصل میں جس بے پناہ محبت اور پرستاری کی تصویر جو ان خطوط سے ملتی ہے وہ تصویر اتنی شوخ اور دلکش نہ ہو۔ اس دوران میں نے ان دوستوں سے بھی ان خطوط کا ذکر کیا جو جاں نثار اختر اور صفیہ کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ ان سب کی یہی رائے تھی کہ صفیہ نے واقعی اختر کو والہانہ طور پر چاہا تھا اور وہ عمر بھر واقعی برہا کی آگ میں جلتی رہی تھی اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو مر مر کر پالا تھا۔ اس کے بعد میں نے "زیرِ لب" کے خطوط کو جب بھی پڑھا، مجھے یہی لگا کہ میں جاں نثار اختر سے ایک نئی ملاقات کر رہا تھا اور اس ملاقات میں صفیہ ایک انٹرپریٹر کے فرائض سرانجام

و یسے ہی تھی۔ جب اختر سے پہلی بار ملا تو اس کی شکل و صورت کی جو تفاصیل ان خطوط میں دیکھ چکا تھا، سو فی صدی وہی تھیں۔ وہی لمبے روکھے بال، وہی ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، وہی میلا سا کرتا اور وہی سوئی سوئی خواب آلود آنکھیں، سچ مانیے مجھے صفیہ پر بڑا ترس آیا۔ کیا وہ عمر بھر اسی آدمی پر مرتی رہی تھی جو فلم اسٹار نمی سے کرائے کی رقم لے کر جب بمبئی سے لکھنؤ پہنچا تھا تو صفیہ قبر میں اُتاری جا چکی تھی۔ صفیہ زندگی بھر جس کی پرستار رہی وہی آخری لمحوں میں بھی اس کے پاس نہ پہنچ سکا تھا۔ میں اختر کو اس کے لیے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ ہجر کی آگ اندر ہی اندر دہکتی رہتی تھی اور صفیہ کی ہڈیاں پگھلاتی رہی تھی اور انہی پگھلی ہوئی ہڈیوں کی سوور راکھ سے جاں نثار اختر نے وہ نظم کہی تھی جس کا عنوان 'خاکِ دل' تھا۔ یہ نظم واقعی بڑی تاثیر انگیز ہے۔ نظم طویل ہے اس کے صرف تین بند پیش کر رہا ہوں۔

لکھنو! میرے وطن، میرے چمن زار وطن!
تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جانِ بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کیے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی اَدا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کیے جاتا ہوں

اے مری روحِ چمن! خاکِ لحد سے تیری
آج بھی مجھ کو تیرے پیار کی لو آتی ہے
زخم سینے کے مہکتے ہیں، تری خوشبو میں
وہ مہک ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے

مجھ سے کیا بات بنائے گی زمانہ کی جفا
موت خود آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے

چوم کر آج تری خاکِ لحد کے ذرّے
اَن گنت پھول محبت کے چڑھاتا جاؤں
جانے اس سمت کبھی میرا گزر ہو کہ نہ ہو
آخری بار گلے تجھ کو لگاتا جاؤں

لکھو! میرے وطن، میرے چمن زار وطن!
دیکھ اس خاک کو آنکھوں میں بسا کر رکھنا
اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھنا
لکھو! میرے وطن، میرے چمن زار وطن!

اور اس کے ساتھ ہی صفیہ کا اختر کے نام آخری خط بھی درج کر رہا ہوں جو اُس نے ۲۹ دسمبر ۱۹۵۲ء کو لکھا تھا

عزیز اختر میری جان!
نظم ملی (یہ کس نظم کی طرف اشارہ ہے اس کا مجھے اندازہ نہیں)
تمہارا بہت پیار اتحہ!
سچ مانو میرے آنسو ہی تو چھلک پڑے۔ آج میں کتنی مغرور ہوں اور نازاں۔ مجھے تمہاری محبت، ملائمت، دوستی، شفقت، خلوص اور اعتماد سب کچھ تو حاصل ہو رہا ہے۔ آج مجھے محسوس ہوا کہ میں نے تمہاری شاعری کو بھی جیت لیا ہے۔ اب مجھے اور کیا چاہیے۔
اختر آؤ تم مجھے مرنے نہ دو۔ میں مرنا نہیں چاہتی البتہ میں تھک بہت گئی ہوں۔ ساتھی! آؤ میں تمہارے زانو پر سر رکھ کر ایک طویل نیند لے لوں۔ پھر تمہارا ساتھ دینے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوں گی۔

میرے بے شمار پیار تم پر نچھاور ہیں
تمہاری اپنی

صفو

۱۹۵۹ء میں دہلی میں ایشیں رائٹرز کانفرنس ہوئی۔ اس میں جاں نثار اختر بھی موجود تھا۔ اس کانفرنس میں جن دوستوں سے میں پہلی بار مل رہا تھا ان میں جاں نثار اختر بھی تھا۔ مجھے صدمہ ہوا جب میں نے اس کے ساتھ کھڑی ایک دبلی پتلی لڑکی دیکھی جس کا تعارف اس نے ''خدیجہ میری بیوی'' کہہ کر کرایا۔ کیا یہ وہی شخص تھا جس نے ''خاکِ دل'' نظم کہی تھی؟ کیا اختر اتنی جلدی صفیہ کو بھول گیا؟ کیا اس کے زخم

اتنی جلدی بھر گئے تھے؟

میرے ذہن کی کیفیت ایک دم ایسی ہوگئی کہ میں زیادہ دیر اختر کے قریب کھڑا نہ رہ سکا۔ یہ بھی سنا کہ یہ اختر کی لومیرج تھی۔ مجھے اختر کی یہ حرکت جانے کیوں بری لگی۔ شاید میں دقیانوسی تھا اور اس سچویشن سے سمجھوتہ نہ کرسکا تھا۔ اس کے بعد کئی برسوں تک اختر سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ آنکھ جھپکنے میں دس سال گزر گئے۔

اور پھر اختر سے میری ملاقات چنڈی گڑھ میں ہوئی جہاں سکھ دیو پرشاد، ممبئی کے پنالال مہیشوری اور میں نے اور کچھ اور دوستوں نے کچھ ادب نواز حضرات کے تعاون سے جشن غالب کا تین روزہ پروگرام مرتب کیا تھا۔ آخری دن مشاعرہ تھا۔ پہلا دن فلمی ہستیوں کے اجتماع کے لیے رکھا گیا تھا۔ دوسرے دن قوالیاں ہوئی تھیں۔ اس قسم کا مشاعرہ چنڈی گڑھ میں پھر کبھی نہیں ہوا۔ مشاعرہ میں ترقی پسند شاعروں کا سارا قافلہ موجود تھا۔ اس میں جاں نثار اختر بھی شامل تھا اور اس کے ساتھ اُس کی دوسری بیوی خدیجہ بھی ممبئی سے آئی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں جس دُبلی پتلی لڑکی سے میرا تعارف ہوا تھا اب وہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ دیکھ چکی تھی اور خاصی میچور لگنے لگی تھی۔ اختر کی شکل وصورت اور عادتیں ویسی ہی تھیں۔ رتّی بھر فرق نہ تھا۔ مجھے لگا جاں نثار اختر کا ماؤنٹ آف وینس بہت اسٹرانگ تھا ورنہ اس جیسی ناہموار زندگی رکھنے والے مرد میں عورتوں کے لیے اتنی زیادہ کشش کیوں ہوتی؟

اختر نے مشاعرے میں اپنے سوئے ہوئے انداز میں ایک نظم سنائی تھی۔ نظم کا عنوان مجھے یاد نہیں۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اسے بہت داد ملی تھی۔ نظم کے بعد اس نے ایک غزل کے کچھ اشعار بھی سنائے تھے۔ دو شعر تو مجھے بہت ہی پیارے لگے

آراستہ بدن پہ ہیں زخموں کے پیرہن
شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں
ایسے میں زلفِ یار نہ ہم سے گریز کر
ہم آج تیرے پاس پریشاں سے آئے ہیں

لیکن اختر سے میری حقیقی پہلی ملاقات ممبئی میں سنیل دت کے گھر پر ہوئی۔ میں اُسی کے ہاں رکا ہوا تھا۔ جاں نثار اختر مجھے سنیل صاحب کے گھر سے باندرہ میں اپنے تین کمروں والے فلیٹ میں لے آیا۔ جہاں اس کی دو معصوم پیاری سی بچیاں بھی تھیں اور خدیجہ بھابھی بھی تھیں۔

اس کی خدیجہ کو قریب سے دیکھا تو وہ سو فی صدی ہندوستانی عورت لگی جو سوتی ساڑھیاں پہنتی تھی اور گلے میں مالا ڈالے رکھتی تھی۔ اختر اور خدیجہ نے میری جی بھر کر تواضع کی اور خدیجہ نے مجھے میری کہانیوں کے تراشے دکھائے جو اُس نے ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہونے والے ادبی رسائل سے کاٹ کر فائل میں محفوظ کر لیے تھے۔ اسے میری کچھ کہانیاں تو بہت پسند تھیں۔ انہی دنوں جاں نثار اختر رباعیوں کا ایک مجموعہ ترتیب دے رہا تھا جس کا عنوان اُس نے ''گھر آنگن'' رکھا تھا۔ ان رباعیوں میں اس نے ان لمحوں کو قید کرنے کی کوشش کی تھی جو اُس نے شادی کے بعد خدیجہ کے ساتھ گزارے تھے۔ اختر نے جب مجھے اپنی کچھ رباعیاں سنائیں تو خدیجہ کونے میں ایک اسٹول پر بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے نیچی نظریں کیے چھالیا کترتی رہی اور لجاتی رہی۔ جیسے میں ایک اجنبی تھا اور جھروکوں سے چوری چھپے ان لمحوں کی خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا جن میں ایک ہندوستانی بیوی دن بھر کے تھکے ماندے شوہر کی زندگی کو اپنے پیار کی پھوار سے سینچ رہی تھی۔ کچھ رباعیاں تو بیحد خوبصورت تھیں

یہ تیرا سبھاؤ، یہ سلیقہ، یہ سروپ
لہجے کی یہ چھاؤں، گرم جذبوں کی یہ دھوپ
سیتا بھی شکنتلا بھی رادھا بھی تو ہی
یُگ یُگ سے بدلتی چلی آئی ہے تو روپ

ہر صبح کو غنچے میں بدل جاتی ہے
ہر شام کو شمع بن کے جل جاتی ہے
اور رات کو جب بند ہوں کمرے کے کواڑ
چھنکتی ہوئی چاندنی میں ڈھل جاتی ہے

نظروں سے مری خود کو بچا لے کیسے
کھلتے ہوئے سینے کو چھپا لے کیسے
آٹے میں سنے ہوئے ہیں دونوں ہی ہاتھ
آنچل جو سنبھالے تو سنبھالے کیسے

وہ جان کے بھی مجھ کو ستاتے ہیں کبھی
نکلوں جو نہا کے تو ڈراتے ہیں کبھی
آئینے کے سامنے نہ بدلنا کپڑے
آئینے میں عکس رہ بھی جاتے ہیں کبھی

آتی ہے جھجک ہی اس کے آگے جاتے
وہ دیکھتے ہیں کبھی تو ایسے
گھبرا کے میں بانہوں میں سمٹ جاتی ہوں
لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں پہنے جیسے

''گھر آنگن'' پبلشر کو بھیجے جانے کی بات تھی۔ اختر نے اس کا دیباچہ لکھنے کے لیے کرشن چندر سے کہہ رکھا تھا۔ ابھی اُس نے لکھا نہیں تھا۔ خدیجہ بھابھی نے مجھے کہا کہ میں دیباچہ لکھوں ''گھر آنگن'' کا۔ میں نے حامی بھر لی۔ اختر نے اپنے چھپے ہوئے مجموعوں کی بھی ایک ایک کاپی دی۔ 'سلاسل' تارِ گریباں، مدرستاں، جاوداں، جب میں چنڈی گڑھ لوٹا تو ذہن میں ''گھر آنگن'' کی رُباعیاں گونج رہی تھیں۔ میں نے دفتری مصروفیتوں سے فرار پاتے ہی دیباچہ لکھ ڈالا اور اختر کو بھیج دیا۔

جب تک کرشن چندر نے بھی دیباچہ لکھ ڈالا تھا۔ دونوں دیباچوں کو تولا گیا۔ خدیجہ کو میرا والا دیباچہ پسند تھا اور اختر کو کرشن چندر کا۔ لیکن پبلشر کو کرشن چندر کا دیباچہ چاہیے تھا۔ چنانچہ میرا دیباچہ کٹ گیا۔ اختر نے اسے ایک بہت ہی معیاری پرچے میں شائع کروایا اور اس بات کا بھی دھیان رکھا کہ وہ ''گھر آنگن'' کی اشاعت سے پہلے ہی چھپ جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کرشن چندر کا دیباچہ میرے دیباچے سے بہتر تھا۔ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے اختر کو بہت قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ صرف ایک ہی تو قریبی اور تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے برعکس کرشن چندر نے اس کے ساتھ عمر کا ایک حصہ گزارا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس کے مشاہدات اور اختر کی ذاتی زندگی اور فنی ارتقا کے بارے میں پیش کیے خیالات زیادہ قابلِ اعتبار تھے۔

بمبئی میں جو تیں چار شامیں ہم دونوں نے ایک ساتھ گزاریں ان میں اختر نے مجھے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بڑی اہم معلومات بہم پہنچائیں جن کا مجھے علم نہیں تھا لیکن جن کے بارے میں کرشن، جعفری، مجروح، ساحر اور اس کے دوسرے ترقی پسند دوست بخوبی واقف ہیں۔

جاں نثار اختر ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں پیدا ہوا، جہاں اُس کے والد مضطر خیر آبادی بطور سیشن جج تعینات تھے۔ مضطر خیر آبادی خود ایک بہت اچھے شاعر تھے۔ اس طرح اختر کو ادبی ذوق اور شاعری ورثے میں ملی تھی۔ گوالیار سے میٹرک کرنے کے بعد اختر نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہیں اس کے ادبی ذوق کو نمو ملی اور اس کی شہرت بطور شاعر علی گڑھ سے باہر بھی جا پہنچی۔ جب وہ بی اے کا طالب علم تھا تو اس نے ایک ایسی نظم کہی جس نے اسے ایک دم مشہور کر دیا۔ نظم کا عنوان تھا "گرلز کالج کی لاری۔" اس سلسلے میں اختر نے بتایا کہ علی گڑھ یونیورسٹی ہال میں ۱۹۵۳ء میں ایک مشاعرہ ہوا اور اس میں اسے یہ نظم پڑھنے کو کہا گیا۔ جب اس نے نظم پڑھنا شروع کی تو ایک لیڈی پروفیسر نے نظم کے خلاف احتجاج کیا اور بطور پروٹسٹ مشاعرہ سے اُٹھ کر چلی گئیں۔ لیکن اختر کی یہ نظم بیحد مقبول ہوئی۔

جاں نثار اختر نے علی گڑھ یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کیا اور ۱۹۱۴ء میں وکٹوریہ کالج گوالیار میں بطور لیکچرار تعینات ہو گیا۔ لیکن یہ ماحول بڑا پھیکا، بے جان اور بورنگ تھا۔ گوالیار میں اس کا دل نہ لگا اور ۱۹۴۷ء میں حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبۂ فارسی کا صدر بن کر آ گیا۔ یہ ماحول اسے پسند تھا۔ اسی دوران وہ ترقی پسند مصنفین کا صدر بھی منتخب ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا کیوں کہ وہ اپنے نظریات اور ملازمت کے تقاضوں کے آپسی تضاد سے سمجھوتہ نہ کر سکا تھا۔ صفیہ نے اس کے اس فیصلے کو سراہتے ہوئے اسے لکھا تھا

> "تم نے استعفیٰ دے دیا۔ اچھا کیا۔ ایک طویل ذہنی کشمکش کا خاتمہ یوں ہی ممکن تھا۔ میری طبیعت کی کمزوری سمجھو یا کچھ بھی، میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ ہاں تم نے اپنے عزم کا ثبوت دیا اور سچ جانو میں تمہاری فوقیت کے احساس سے سر جھکانے کو تیار ہوں۔"

اختر اس کے بعد روزی روٹی کے چکر میں بمبئی چلا آیا۔ جہاں وہ کئی برسوں تک در بدر پھرتا رہا اور وہ اس وقت بھی مالی طور پر بیحد پریشان تھا جب صفیہ بستر مرگ پر تھی اور اسے فوراً لکھنؤ پہنچنے کے لیے تار ملا تھا۔ وہ نمی سے جو اس وقت فلم "ڈنکا" کی پروڈیوسر تھیں، پچاس روپے لے کر لکھنؤ پہنچا تھا لیکن اس وقت جب اس کی پرستار صفیہ سپردِ خاک ہو چکی تھی۔ جاں نثار اختر کے بارے میں مجھے واقعی اتنی ڈھیر ساری تفصیلات معلوم نہ تھیں۔ جوں جوں ہم قریب ہوتے گئے مجھے اختر سے ایک گہری وابستگی ہو گئی۔ اس کی عمر کے آخری پانچ سالوں میں اختر کا اور میرا رشتہ اتنا مضبوط ہو گیا کہ جب بھی کوئی ممبئی سے چنڈی گڑھ آتا

خدیجہ بھابھی میرے بچوں کے لیے تحفے بھیجتیں اور اختر کو پنجاب یا چنڈی گڑھ سے جو بھی چاہیے ہوتا بنا کسی ہچکچاہٹ کے لکھ دیتا۔ اس کا بڑا لڑکا سلیمان جو یہاں پی جی آئی میں ڈاکٹر تھا کسی ہندو لڑکی کو دل دے بیٹھا اور اس نے اسٹر کاسٹ میرج کر لی۔ سچویشن خاصی بگڑ گئی۔ اختر اور خدیجہ بہت پریشان تھے۔ اچانک اختر کا ٹیلیفون آیا، وہ بیحد گھبرایا ہوا تھا۔ سلیمان کو فوری مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے اختر سے کہا کہ وہ بالکل مطمئن ہو جائے، میں سب سنبھال لوں گا۔ میں نے سلیمان کی ہر طرح سے مدد کی اور جب تک وہ چنڈی گڑھ میں رہا میں ہی ایک طرح سے اس کا گارجین بنا رہا تھا۔

ایک بار پنجاب یونیورسٹی کے مشاعرہ میں شرکت کے لیے جب اختر چنڈی گڑھ آیا تو منتظمین مشاعرہ کے اصرار کے باوجود وہ میرے ہی گھر ٹھہرا اور وہ بھی میری غیر حاضری میں۔ میں خود ان دنوں چنڈی گڑھ سے باہر تھا۔ بمبئی لوٹ کر اس نے ایک بڑا ہی خلوص بھرا خط لکھا کہ میری غیر حاضری کے باوجود اسے میرے گھر میں ہر طرح کی سہولت ملی اور میری ماں نے اس کی بہت دیکھ بھال کی۔ یہ تھی اختر اور میرے تعلقات کی منزل۔ اس میں کتنا خلوص اور اپنا پن تھا، اس کا اندازہ اس کے ہر خط سے ہوتا جو وہ مجھے کبھی کبھار لکھتا تھا۔

عمر کے آخری دَور میں جاں نثار اختر کی شاعری نے ایک نیا موڑ لیا۔ اس نے نظم کا میداں چھوڑ کر غزل میں نئے نئے تجربے کیے۔ اُدھر اسے ''خاکِ دل'' پر سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ ملا، ادھر وہ غزل کو نیا لہجہ، نیا روپ، نیا آہنگ دینے میں لگا رہا۔ جب وہ نرگس بھابھی کے ساتھ روس کا دورہ کر کے واپس آیا تو وہ بیحد خوش تھا۔ خدیجہ نے اپنے فلیٹ کی شکل و صورت بدل ڈالی تھی۔ اختر نے ٹیلی ویژن لینے کا بھی پروگرام بنا لیا تھا اور خاصا مطمئن نظر آتا تھا۔ انہی دنوں صابر دت نے اپنے میگزین ''فن اور شخصیت'' کا ''جاں نثار اختر'' نمبر نکالنے کا بھی پروگرام بنا ڈالا۔ اختر کے دوست اس کی شخصیت اور شاعری پر مضمون لکھ رہے تھے اور وہ خود اپنی پیاری پیاری غزلوں کے مصرعے تراش رہا تھا اور فلموں کے گیت لکھ رہا تھا۔ نوشاد سے اس کی اکثر گفتگو رہتی تھیں۔

آخری چند برسوں میں اس کی شاعری میں جو ایک نئی حلاوت ''پارس'' اور نئی کسک آئی تھی وہ اس بات کی غماز تھیں کہ جاں نثار اختر بحیثیت شاعر اچانک ہی بہت سی منزلیں طے کر گیا تھا۔ اس کا ثبوت اس کا آخری مجموعۂ کلام ''پچھلے پہر'' ہے جو واقعی اس کی زندگی کا پچھلا پہر ثابت ہوا۔ ''پچھلے پہر'' کی غزلوں کی کچھ شعر سنیے۔ اور کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی دیکھئے

ہمیں تو اتنا پتا ہے کہ جب تلک ہم ہیں
رواج چاک گریباں نہیں بدلنے کا

زندگی یہ تو نہیں تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو
کچھ نہ کچھ ہم نے ترا قرض اُتارا ہی نہ ہو

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لیے ہیں
کچھ شعر فقط اُن کو سنانے کے لیے ہیں

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی
ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لیے ہے

اور کیا اس سے زیادہ کوئی نرمی برتوں
دل کے زخموں کو چھوا ہے ترے گالوں کی طرح

کس کی دہلیز پہ لے جاکے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

مٹ گیا پر تری بانہوں نے سمیٹا نہ مجھے
شہر در شہر میں گلیوں میں بکھرتا ہی رہا

زخموں کے چاند، لبوں کے گلاب مانگے ہے
بدن کی پیاس، بدن کی شراب مانگے ہے

اور پھر ایک شام جاں نثار اختر اپنی غزل کے ایک شعر کا خمار اپنی خوابناک آنکھوں میں لیے، اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں خدیجہ اور اپنے بچوں سے منھ موڑ کر چپ چاپ اس وادی کی طرف چلا گیا جہاں آج سے بہت برس پہلے اس کی پرستار صفیہ لڑکھڑاتے قدموں سے اکیلی نکل گئی تھی۔

ہماری قدر کرو اے سخن کے متوالو
غزل کے کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے

کشمیری لال ذاکر

میں ایک جزیرہ نہیں ہوں

خواجہ احمد عباس

یہ اُس کی موت سے کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے

میں کسی سرکاری کام سے بمبئی گیا تھا۔ وحید انور اِن دنوں خواجہ احمد عباس کے پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا اور کہانیوں کی ایک انتھالوجی ترتیب دے رہا تھا۔ مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور اسے انتھالوجی کے سلسلے میں میرے تعاون کی ضرورت تھی۔ وحید انور سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے عباس کے گھر فیلو مینا لاج ہی میں اگلی صبح گیارہ بجے مل لے۔ ان دنوں صابر دت کا ''فن اور شخصیت'' کا 'عباس نمبر' چھاپنے کا منصوبہ تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ عباس کے گھر چلے اور وہاں اُس سے عباس نمبر کی بھی بات ہو جائے۔

چنانچہ اگلے روز میں اور صابر دت گیارہ بجے عباس کے گھر پہنچ گئے۔ اُس سے ملاقات کا یہی وقت طے ہوا تھا۔

عباس بڑی محبت سے ملا، لیکن اتنے دنوں کے بعد اُسے دیکھ کر مجھے دھکا لگا۔ اُس سے تو ٹھیک طرح سے کھڑا بھی نہ ہوا جاتا تھا۔ چھڑی کے سہارے سے ہی قدم اُٹھا سکتا تھا، بیچارہ۔ بلکہ وحید انور ہی نے اُسے سہارا دیا۔ میں وہیں اُس کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا۔ صابر اُس سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ لیکن میرا ذہن کئی برس پہلے کی ایک ملاقات کو دہرانے میں مصروف ہو گیا۔

پرگتی میداں دہلی میں نیشنل بک فیئر تھا۔ آتھر گلڈ آف انڈیا نے (جس کا میں بھی ممبر تھا) مذاکرہ رکھا تھا۔ ''آتھر اینڈ پبلشرز'' عنوان سے۔ اب مجھے یاد نہیں۔ لیکن مسئلہ مصنفین اور پبلشرز ہی کا تھا۔ کئی زبانوں کے نئے پرانے بہت سے ادیب جمع تھے۔ عباس کو ایک پینل ڈسکشن میں بولنا تھا۔

میں جب پہنچا تو مذاکرہ تو شروع نہیں ہوا تھا لیکن بہت سے ادیب ہال میں جمع ہو چکے تھے۔ عباس سامنے کھڑا تھا۔ ایک دم چاق و چوبند۔ بڑا بانکا لگ رہا تھا۔ دو ایک ادیب اس سے گفتگو کر رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر اونچی آواز میں بولا۔ ''پرنس آف چنڈی گڑھ ہیز کم۔''
بہت سے لوگوں کو اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔ عباس نے آگے بڑھ کر مجھے اپنی باہوں میں لیا اور ساتھ کھڑے دوستوں سے مخاطب ہوا۔

''یہ ہے کشمیری لال ذاکر۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ چندی گڑھ میں اس کا کیا اسٹیٹس ہے تو ایک بار چنڈی گڑھ ضرور جایئے۔''

میں اپنے آپ میں بڑا ایمبر یسڈ فیل کر رہا تھا۔

ییل ڈکش میں بولتے ہوئے اس نے ایک بڑا پر معنی جملہ کہا جس سے لکھنے والوں اور پبلشر کے آپسی رشتے کی صحیح ترجمانی ہو جاتی ہے۔ عباس نے انگریزی میں کہا۔

''آتھر اور پبلشر کا آپسی رشتہ میاں بیوی کا رشتہ ہے۔''

Author Conceived & The Publishers Delivers

بہت زور سے قہقہے گونجے تھے۔

مجھے فیلو میالاج میں بیٹھے لگ رہا تھا کہ نک دیئر کے ایک ہال میں گونجے ہوئے قہقہے اس وقت عباس کے گھر میں گونج رہے تھے، جنہیں صرف میں ہی سن رہا تھا، کیوں کہ جو لوگ عباس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے ان میں کسی کو بھی ان کا آپسی ربط معلوم نہیں تھا۔

اور پھر عباس نے وحید انور سے کہا۔

''الماری میں سے 'انقلاب' کی ایک جلد نکال کر ذاکر صاحب کو پیش کرو۔ اسے خریدتا تو کوئی ہے نہیں۔''

جتنی دیر وحید انور کو کتاب نکالنے میں لگی اتنی دیر میں عباس نے 'انقلاب' کی بڑی دلچسپ کہانی سنائی۔ اُس نے کہا۔

'انقلاب' کا روسی زبان میں نوے ہزار کا ایڈیشن شائع ہوا۔ کئی برس کے بعد اسے انگریزی پبلشروں نے انگریزی میں چھاپا۔ اس کے بعد ہندی میں شائع ہوا۔ لیکن اُردو میں چھاپنے کے لئے کوئی پبلشر سامنے نہیں آیا۔ آخر مجھے خود ہی چھاپنا پڑا۔ اس کے اجرا کا انتظام میں نے اپنے گھر پر ہی کیا۔ اس موقع پر کافی لوگوں کو بلایا، انہیں بڑھیا کھانا بھی کھلایا اور سب کو 'انقلاب' کی ایک ایک جلد بھی پیش کی۔ لیکن دوستوں کی بے نیازی دیکھئے، تبصرہ کرنا تو در کنار کسی نے چار سطروں میں اپنی رائے بھی نہ دی۔''

یہ کہتے ہوئے عباس کے چہرے پر ملال کا جذبہ اُبھر آیا تھا۔

جب عباس نے ناول کی ایک جلد مجھے پیش کی تو صابر دت نے فوراً تصویر بھی لے لی۔ وہ فوٹو گرافر بھی ساتھ لایا تھا۔ جب وہ ''فن اور شخصیت'' کا 'عباس نمبر' چھاپے گا تو اُسے عباس کی تصویروں کی بھی تو ضرورت ہوگی۔ میں عباس اور صابر تو تخت پر بیٹھے تھے۔ اور وحید انور سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ 'انقلاب' کے بارے میں عباس نے خود لکھا ہے

''انقلاب'' جیسا ناول لکھنے کے لیے (جس کا پس منظر ملک کی سیاست بلکہ 'انقلاب' ہے) فرصت چاہیے جو مجھے نہیں تھی۔ فارغ البالی چاہیے جو مجھے حاصل نہیں تھی۔ ایک 'چھا خاصا اسٹاف چاہیے۔ ریسرچ کرنے کے لیے جو میرے پاس نہیں تھا۔ پبلشر سے بہت معقول ایڈوانس چاہیے جو مجھے ہندوستان میں نہیں مل سکتا تھا، پھر بھی میں نے اگست ۱۹۴۷ء کو یہ ناول لکھنا شروع کیا۔ ہڑتالوں اور اسٹرائکوں کے زمانے میں بھی میں نے اپنے ہیرو کے بچپن کے باب لکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۹ء تک یعنی تین برس میں صرف تیرہ باب لکھ پایا، وہ بھی انگریزی میں۔ پھر ایک مہینے کی چھٹی لے کر میں اپنی مرحومہ بیوی سمیت راس کماری گیا۔ پورا صندوق بھر کر کتابوں، اخباروں اور تراشوں کا ساتھ لے گیا اور وہاں ایک کمرے میں جس کی کھڑکیوں میں سے تین طرف سمندر نظر آتا تھا، رات دن ایک ایک کر کے یہ ناول مکمل کیا۔''

پھر صابر دت عباس سے ''عباس نمبر'' کے سلسلے میں تفصیل سے بات کرتا رہا اور میں وحید انور سے الگ کہانیوں کی انتھالوجی کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔

وحید انور کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی دو بیویاں تھیں، ایک ممبئی میں اور ایک حیدر آباد میں۔ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہیں تھا اس لیے معاشی طور پر اس کی حالت بہت اچھی نہیں تھی۔ وہ کہانیوں کی ایک انتھالوجی پہلے چھاپ چکا تھا اور اس میں اُس نے نقصان اُٹھایا تھا۔ میں نے وحید انور سے کہا

''ارے بھائی، تم اُردو کی انتھالوجی چھاپ کر دو بیویوں کو اقتصادی طور پر خوش کرنا چاہتے ہو۔ اُردو ادیب تو ایک بیوی کو بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ کوئی چھوٹی دکان کر لو یار کہانیوں کی انتھالوجی کا چکر چھوڑو۔''

میرا آخری جملہ شاید عباس نے سن لیا تھا۔

''یہ تمہاری بات نہیں سنے گا۔ یہ دُھن کا بڑا پکا ہے۔''

''آپ سے زیادہ دھن کا پکا کون ہوگا عباس صاحب۔ راج کپور کے لیے بڑی کامیاب فلمیں لکھتے ہو۔ اور جو تھوڑا بہت پیسہ فلموں سے ملتا ہے اسے اپنی فلمیں بنانے پر خرچ کرتے ہو اور نقصان پر نقصان اُٹھاتے ہو۔''

''یہ بات تو ٹھیک ہے۔''

''آپ نے بھی کسی کی بات مانی ہے جو وحید انور مانے گا۔''

''نہیں مانے گا۔''

''آپ کو فلم 'بابی' کے بارے میں ایک لطیفہ سناؤں۔''

''سناؤ۔''

''بابی' واقعی باکس آفس ہٹ تھی۔ چنڈی گڑھ کے دو سنیما گھروں میں چل رہی تھی اور کسی شو کی ٹکٹیں آسانی سے نہیں ملتی تھیں۔ میں نے خود ڈپٹی کمشنر سے کہہ کر ٹکٹ منگوائے تھے۔ میرے آئی اے ایس دوست کا لڑکا جس کی عمر مشکل سے سات برس کی ہوگی 'بوبی' کو بیس سے بھی زیادہ بار دیکھ چکا تھا۔ اس پر تو 'بوبی' کا پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔ اسے ہر شخص اور ہر چیز میں 'بوبی' نظر آتی تھی۔ اپنی ماں میں بھی باپ میں بھی، بہن میں بھی، گھر کے ملازم میں بھی۔ جتنی تصویریں کمروں میں ٹنگی تھیں اُسے سب میں 'بوبی' نظر آتی تھی۔ اس کے گھر والے بیحد پریشاں تھے۔ پڑوس کی کسی خاتون نے اسے رائے دی کہ پاس کے گاؤں میں ایک پہنچا ہوا مہاتما ہے۔ اُس نے اس طرح کے کئی کیس ٹھیک کیے تھے۔ اسے گھر بلوا لو، وہ بچے کو ٹھیک کر دے گا۔ لڑکے کا باپ ہماری طرح کا آدمی تھا، اسے اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں تھا لیکن بیوی کے بار بار کہنے پر اس نے مہاتما کو بلوایا اور اس کی بڑی خاطر تواضع کی۔ مہاتما تھا بڑا پر بھاؤ شالی۔ اس نے بچے سے بڑی محبت سے 'بوبی' کے بارے میں بات کی اور اسے بہت سمجھایا۔ جب بات بہت طویل ہوگئی تو جانتے ہو بچے نے مہاتما سے کیا کہا؟

''نہیں۔''

''اس نے کہا، مہاتما جی مجھے تو آپ میں بھی 'بوبی' نظر آرہی ہے۔ یہ سارا سنسار ہی 'بوبی' ہے۔''

یہ کہہ کر بچہ 'بوبی'، 'بوبی' پکارتا ہوا کمرے سے باہر دوڑ گیا۔

لان میں 'بوبی'، 'بوبی' کا نام گونج رہا تھا۔

آواز کمرے میں بھی آرہی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' صابر نے پوچھا

''مہاتما جی اپنی چمکتی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چلے گئے۔ اور میرا آئی اے ایس دوست اُسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ڈرائیور سے کہہ رہا تھا— مہاتما جی کو واپس چھوڑ آؤ۔''

ہم لوگ دیر تک ہنستے رہے۔

عباس نے ہامبے ٹاکیز کے لیے پہلی فلم ''سنسار'' ۱۹۴۱ء میں لکھی۔ ''اچانک'' اس کی آخری پکچر تھی جس کی کہانی اس نے رو پم پکچرز کے لیے ۱۹۷۳ء میں لکھی، لیکن وہ دوسروں کے لیے کہانیاں لکھ کر مطمئن نہیں تھا کیوں کہ جو پیغام وہ عوام تک پہنچانا چاہتا تھا، وہ فلموں کے ذریعہ ان تک نہیں پہنچتا تھا۔ اس کا احساس تو اسے دس گیارہ فلمیں لکھنے کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ اس لیے ۱۹۵۱ء میں ''نیا سنسار پروڈکشن کے نام سے اپنا فلمساز ادارہ بنایا اور اس کے تحت بارہ فلمیں بنائیں۔ 'انہونی'، 'منا'، 'چار دل چار راہیں'، 'ہمارا گھر'، 'بمبئی رات کی بانہوں میں'، 'دو بوند پانی'، 'نکسلائیٹ'، 'راہی'، 'شہر اور سپنا'، 'آسمان محل'، 'سات ہندوستانی'، اور 'فاصلہ'۔ اس کی آخری فلم 'ایک آدمی' تھی جو اپنے انتقال سے پہلے شدید بیماری کے دوران اس نے بنائی۔ وہ فلم شاید ریلیز نہیں ہوئی۔ ان میں سے کچھ فلموں کو نیشنل اور انٹرنیشنل ایوارڈ تو ملے لیکن مجموعی طور پر عباس کے لیے اپنی فلمیں بنانا گھاٹے کا سودا ثابت ہوا۔ اس کے سامنے 'نیا سنسار' کے تحت فلمیں بنانے کا ایک مقصد تھا۔ عباس نے اپنے اس مقصد کا اظہار اس طرح کیا ہے

> ''مجھے کچھ کہنا ہے' اور اسی کو میں کبھی مضمون لکھ کر، کبھی کتاب لکھ کر، کبھی فلم بنا کر، کبھی ڈرامہ لکھ کر کہتا ہوں اور بار بار کہتا رہتا ہوں۔ کیا فائدہ ہوتا ہے؟ ایک چھوٹا طبقہ نوجوانوں کا جو مجھے اور میری تخلیقات کو پسند کرتا ہے اور میری تصانیف کو پڑھ کر اور میری فلم دیکھ کر سوشلزم، انسان پرستی، عالمی امن کی طرف ہو جاتا ہے۔ یہ چند لوگ میری کاوشوں کا صلہ ہیں اور اگر ان کی تعداد بڑھتی گئی تو میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھوں گا۔''

خواجہ احمد عباس سے میری دوستی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔

وہ تھی ان کے چچا زاد خواجہ غلام السیدین صاحب کی شخصیت۔ سچ تو یہ ہے کہ عباس خود اپنے بھائی کی شخصیت سے متاثر تھا۔ اور اس کا ایک خواب یہ بھی تھا کہ وہ کبھی غلام السیدین جیسا بنے گا۔

سیدین صاحب سے میری پہلی ملاقات اُس زمانے میں ہوئی تھی جب وہ ریاست جموں کشمیر میں ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ میں نے اُن دنوں پرنس آف ویلز کالج سے گریجویشن کی تھی اور ''بزمِ ادب'' جموں

سے وابستہ تھا اور ہفتہ وار 'چاند' اور 'ریسیز' کے لیے رپورٹنگ بھی کرتا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب نواب مرزا جعفر علی خاں آثر ریاست کے وزیر ترقیات تھے۔ سیّدین صاحب کے اور آثر صاحب کے بڑے گہرے مراسم تھے اور ہم نے ان دونوں حضرات کی اپنے فورم کے لیے سرپرستی حاصل کی تھی۔ سیّدین صاحب کی عالمانہ تقریریں سننے کے سہرے مواقع مجھے جبھی ملے۔ اندازِ بیاں، بیاں کی خوبصورتی اور معلومات کا ایک خزانہ اور پھر اُن کی من موہ لینے والی مسکراہٹ، ان کی شخصیت نے مجھے بیحد متاثر کیا اور مجھے ان کی قربت نصیب ہوئی۔ یہ قربت برسوں تک قائم رہی، جب وہ مرکزی سرکار میں بطور سکریٹری ایجوکیشن تعینات ہوئے تو اُن سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں اور ان ہی کے گھر کبھی کبھی عباس سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ عباس سے میری دوستی کا آغاز سیّدین صاحب کی وجہ سے ہی ہوا تھا اور وہ میرے اور عباس کے درمیاں ایک بہت مضبوط کڑی بنے رہے۔ سیّدین صاحب تو اب ہمارے درمیاں نہیں لیکن ان کی دونوں بیٹیاں ذکیہ ظہیر اور سیدہ سیّدین مجھے اپنا بھائی سمجھتی ہیں، انہوں نے مجھے سیّدین ٹرسٹ کا سکریٹری بھی بنا رکھا ہے۔ جس کے تحت ہم کوئی نہ کوئی ادبی، سماجی اور تعلیمی پروگرام بھی کرتے رہتے ہیں۔ جب تک صالحہ عابد حسین حیات تھیں ان سے بھی میری ملاقاتیں رہیں بلکہ اُن سے ہم نے ہریانہ اُردو اکادمی کے لیے ایک کتاب ''بزم دانشوراں'' بھی مرتب کرائی۔

بمبئی کی جس ملاقات کا میں نے ذکر کیا ہے وہ عباس سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں پھر نہیں مل سکے۔ •

جب میرا ناول 'کرماں والی' چھپا تو میں نے اس کی ایک کاپی عباس کو بھیجی تا کہ اس کی رائے جان سکوں۔ اس کی رائے جو میں نے 'کرماں والی' کے دوسرے ایڈیشن اور ہندی اور پنجابی کے ایڈیشنوں میں چھاپی، اس بات کی مظہر ہے کہ عباس زندگی بھر انساں دوستی، عالمی امن اور بھائی چارے کی تلقین کرتا رہا۔ چاہے وہ ذریعہ کہانی کا تھا۔ ناول کا تھا یا فلم کا۔ 'کرماں والی' پر عباس کی رائے میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ ملاحظہ کریں

''مرحوم کرشن چندر کی طرح کشمیری لال ذاکر بھی جذباتی طور پر انسانیت کے پجاری ہیں۔ انہیں بھی انسانیت کی عظمت پر اٹوٹ بھروسہ ہے۔ یہ بھروسہ اور یقین ان کے ناول کے ہر صفحے سے جھلکتا ہے۔ مشرقی پنجاب کے دیہات میں جو کلچر تھا وہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں بھی کی روایات سے مل کر بنا تھا۔ یہ کلچر سب کا سانجھا تھا۔ دیہات کے کھلیانوں میں پروان چڑھتا ہوا کلچر۔ یہ مشترکہ کلچر صرف ملنا سکھاتا تھا۔ بچھڑنا اور الگ ہونا نہیں۔ آپس میں پیار سکھاتا تھا۔ نفرت اور ہنسنا نہیں۔ یہ ملا جلا کلچر تقسیم

ملک کے بعد ختم ہو گیا ہے۔

کاش اس ناول کو علی گڑھ اور مراد آباد کے ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے ہندو اور مسلمان پڑھیں اور اس سے کچھ سیکھیں۔

''کرماں والی'' کی کہانی تمام انسانیت کی کہانی ہے۔اُمید اور آشا کی کہانی ہے۔ جونئی بھی ہے اور پرانی بھی۔ بہت پرانی۔ کشمیری لال ذاکر نے یہ ناول قلم میں روشنائی بھر کر نہیں بلکہ انسانیت کے آنسوؤں سے روشنائی کا کام لے کر لکھا ہے۔''

مجھے افسوس ہے کہ اُردو ادب میں عباس کے دوستوں، اس کے پڑھنے والوں، اس کے نقادوں نے اسے وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ حقدار تھا۔ عباس کی موت کے دوسرے ہی دن اس کے دوستوں کا حلقہ سکڑنے لگا اور اب تو لگتا ہے، کوئی اسے یاد بھی نہیں کرتا۔ وہ زندگی بھر ہر کسی کے کام آتا رہا، لیکن موت کے بعد سب اس کے احسان بھول گئے۔ لگتا ہے کہ دھیرے دھیرے لوگ اس کے یومِ وفات کو بھی بھول جائیں گے۔

ہریانہ اکادمی نے اپنے فرض کو پہچانا اور عباس کی پہلی برسی پر پانی پت میں ایک بہت بڑا سیمینار کیا جس میں سارے ہندوستان سے آئے اسکالروں نے شرکت کی اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لیے اپنے مقالے پیش کیے۔ ان تمام مقالات کو راج نرائن راز نے ایڈٹ کیا ہے اور اکادمی نے انہیں ''خواجہ احمد عباس — افکار، گفتار اور کردار'' کے عنوان سے چھاپ کر اسکالرز کے لیے عباس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھی گئی تحریروں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے۔

مجھے یہی اطمینان ہے کہ ہم نے پانی پت کے اس عظیم سپوت اور مولانا الطاف حسین حالؔی کے پڑپوتے کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کر کے سرخ روئی حاصل کر لی۔

عباس نے اپنے بارے میں کیا کہا تھا۔ وہ بھی ملاحظہ کر لیجئے

> ''میری ہستی سے دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ کوئی لیلیٰ مجنوں جیسا لازوال عشق نہیں ہوا، کوئی لافانی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آرٹ کا کوئی شاہکار تخلیق نہیں ہوا اور کوئی نیا برِاعظم دریافت نہیں ہوا۔''

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عباس کبھی اپنے ماحول سے کٹا ہوا ایک معمولی جزیرہ نہیں بنا۔

کشمیری لال ذاکر

چادر اتنی میلی نہیں

راجندر سنگھ بیدی

یہ سن چالیس یا اکتالیس کی بات ہے۔ میں پرنس آف ویلیز کالج جموں سے گریجویشن کر کے کچھ جرنلزم میں قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ اور کچھ کشمیر کی سیاست میں مگر اطمینان (Satisfaction) دونوں میں نہیں مل رہا تھا۔ اگر تھوڑی بہت ذہنی آسودگی مل رہی تھی تو اپنے تخلیقی کام سے جو کچھ اُلٹے سیدھے شعر کہے اور کچھ علامتی قسم کی کہانیاں لکھنے تک ہی محدود تھی لیکن میں پڑھتا بہت تھا۔ کہانیاں، ناول، شعر حتیٰ میں دوسری زبانوں میں تخلیق کیا ہوا ادب بھی شامل تھا۔ بس ان ہی دنوں میں نے راجندر سنگھ بیدی کی کہانیاں پڑھی تھیں جن میں سے بیشتر کہانیاں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ لیکن بیدی کی کہانیاں مجھے اچھی لگتی تھیں کیوں کہ ان میں ایک نیا پن تھا اور کچھ ایسی علامتیں تھیں جو مجھے پسند تھیں۔ بیدی رمزیات کا ماہر تھا اور اشاروں اور کنایوں میں بات کرتا تھا۔ ان دنوں میری تمام تر معلومات ریاست جموں کشمیر تک ہی محدود تھی۔ جموں اُس زمانے میں ایک پچھڑا ہوا شہر تھا جس میں ترقی پسندی کی صرف ایک بات یہ تھی کہ وہاں کا پرنس آف ویلز کالج دور دور تک اپنی شہرت رکھتا تھا اور وہ صرف اکلوتا ایسا کالج تھا جو کو ایجوکیشنل تھا اور جس میں طالبات بڑے بڑے افسروں کی بیٹیاں تھیں جنہیں ہر دم اپنے اسٹیٹس کا خیال رہتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے دور کی ڈیکلیمیشن کونٹیسٹس میں شرکت کی غرض سے سیالکوٹ، لاہور، علی گڑھ اور لکھنؤ کے شہروں کو دیکھ آیا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ وہ شہر کسی نہ کسی لحاظ سے میرے شہر سے مختلف ہیں۔ ایسے ہی ایک شہر لاہور میں راجندر سنگھ بیدی جنرل پوسٹ آفس میں منی آرڈر کلرک تھا۔ جس کی تنخواہ ۴۵ روپے تھی۔ وہ متوسط طبقے کے مخصوص ماحول میں اپنی زندگی گزار رہا تھا جس سے وہ خاصہ غیر مطمئن لگتا تھا۔ اور اس فرسٹریشن کے اظہار کے لیے اس نے کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں۔ ایک کہانی جو کئی دنوں تک میری سمجھ میں نہیں آئی اس کا عنوان تھا "پان شاپ"۔ کہانی کا پانوں کی دکان یا پان کھانے والوں کی عادتوں سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ کہانی میں جس سماجی ضرورت کا ذکر تھا اس کا اس طرح کا وجود میرے شہر میں نہیں

تھا۔ یہ نہیں کہ جموں میں نچلے طبقے کے لوگ اپنی چیزیں گروی رکھ کر قرض نہیں لیتے تھے اور ضرورت سے کہیں زیادہ سود نہیں دیتے تھے یا پھر رقم کی واپسی کی میعاد ختم ہوئے پر اپنی گروی رکھی ہوئی چیزوں سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتے تھے لیکن یہاں گروی رکھنے کی اس طرح کی دوکانیں نہیں تھیں جس طرح کی دوکانوں کا ذکر "پان شاپ" کہانی میں تھا۔ سچ پوچھیے تو میری طرح کئی ایسے لوگ تھے جن کی سمجھ میں بیدی کی یہ کہانی نہیں آئی تھی لیکن وہ اس کا کھل کر اظہار نہیں کرتے تھے۔ میری کمزوری یا ایمانداری یہی تھی کہ میں نے اس بات کا کھلے الفاظ میں اظہار کیا تھا لیکن میں نے بیدی کو پڑھنا نہیں چھوڑا۔ اس کی ہر کہانی کو غور سے پڑھا اور اُسے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس زمانے کی لکھی ہوئی بیدی کی کہانیوں میں مجھے سب سے اچھی کہانی "گرم کوٹ" لگی۔ یہ ایک ایماندارانہ کہانی تھی اور ایک ایسے شخص کی کہانی تھی جس کا تعلق متوسط طبقے کے نچلے حصے سے تھا۔ اور وہ شخص راجندر سنگھ بیدی خود تھا، جس نے یہ کہانی فرسٹ پرسن میں لکھ کر تھی کے کردار کو بڑا عظیم بنا ڈالا تھا اور اس میں منی آرڈروں پر مہریں لگانے والا بیدی خود موجود تھا۔ جس نے مرانجا، مرانجا کمپنی سے ایک سیکنڈ ہینڈ کوٹ خریدا تھا تا کہ وہ لاہور کی دسمبر میں پڑتی سردی سے بچ سکے۔ اس زمانے میں لاہور میں سردی پڑتی بھی بہت تھی۔ اب تو وہاں کی سیاست نے اپنی گرمی سے لاہور کا ٹمپریچر خاصہ ٹھیک کر دیا ہے۔ بیدی نے اُردو ادب کو کچھ بہت ہی اچھے افسانے دیے ہیں جن میں "بھولا"، "گرم کوٹ"، "گرہن"، "لاجونتی"، "اپنے دُکھ مجھے دے دو"، "بیل"، "جوگیا"، "کوکھ جلی"، "ٹرمینس سے پرے"، شامل ہیں لیکن میں اپنے اس مختصر مضمون میں صرف بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" کے بارے میں بات کروں گا، ان افسانوں کے بارے میں نہیں۔

"ایک چادر میلی سی" کا مرکزی خیال چادر ڈالنے کا وہ رواج ہے جس کا پنجاب میں چلن ہے۔ یہ رواج بہت پرانا ہے اور اس کی وجہیں اقتصادی اور سماجی دونوں ہیں۔ تعلیم کے فروغ کے ساتھ اب یہ رواج اتنا عام نہیں رہا۔ جب کوئی عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو اس کی شادی اس کے خاوند کے چھوٹے بھائی سے کر دی جاتی تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ قسم کی شادی نہیں ہوتی۔ نہ اس میں پھیرے ہوتے ہیں، نہ کوئی پنڈت شلوک پڑھتا ہے۔ بس ایک سفید چادر تان دی جاتی ہے۔ اس کے نیچے دونوں کو بٹھایا جاتا ہے۔ قریبی رشتہ دار مرد اور عورتیں جمع ہوتی ہیں اور دیور جو اَب تک ایک چھوٹے بھائی یا بیٹے کا رول ادا کرتا رہا تھا چند ہی لمحوں میں اپنی بھابھی کا شوہر بن جاتا ہے اور اپنے بڑے بھائی کے بچوں کا باپ۔ چادر ڈالنے کا یہ رواج اس لیے پرچلت تھا کہ گھر میں جوان بیوہ پر دوسروں کی نگاہیں نہ پڑیں اور وہ محفوظ رہے اور خاندان کے لوگ اُسے بیوہ سمجھ کر اس سے بے توجہی نہ برتیں۔ دوسری وجہ یہ سراسر اقتصادی تھی۔ زمین اور جائداد کا

بٹوارہ نہ ہو اور اس کی ملکیت کا حق تقسیم نہ ہو۔ بیدی کیونکہ پنجاب کا رہنے والا تھا، اس لیے اسے اس رسم کے بارے میں پوری واقفیت تھی۔ سوال یہ ہے کہ بیدی نے اتنے برسوں بعد کیوں اس تقسیم کو اپنی ایک تخلیق کا مرکزی خیال بنایا۔ افسانے تو اُس نے اس ناولٹ کو لکھنے سے لگ بھگ تیس سال پہلے لکھنے شروع کیے تھے، بلکہ اُن دنوں تو وہ پنجاب ہی میں رہ بھی رہا تھا۔ اس تقسیم کو اپنے ناولٹ کا موضوع اُس نے اس وقت کیوں بنایا جب وہ مستقل طور پر بمبئی میں منتقل ہو چکا تھا۔ اور پنجاب سے ایک طرح سے اپنا رشتہ توڑ چکا تھا۔ میری سمجھ میں اس کا ایک ہی کارن نظر آتا ہے وہ ہے فلمی دنیا کے تقاضے۔ فلم کے لیے واقعی یہ ایک نیا تقسیم تھا اور اس میں تفریح کے بھی کئی پہلو نکلتے تھے۔ پنجاب کے کھیت کھلیان، پنجاب کے لوک گیت اور لوک ناچ، دیہات میں رہنے والے لوگوں کی معصوم دوستیاں اور شدید قسم کی دشمنیاں۔ پھر مذہبی رسومات میں اس کی آستھا، دیوی دیوتاؤں میں اَندھ وشواس کچھ دنوں سے ماتا دیوی کی بھینٹیں گانے کا بڑا رواج ہو گیا تھا۔ فلموں میں بھی اس کا استعمال ہو سکتا ہے یا اس موضوع پر کوئی فلم بھی بنائی جا سکتی ہے۔ بیدی نے اس کے بارے میں سوچا۔ بیدی حوا اَدیب صرف اس حد تک رہ گیا تھا کہ سال بھر میں دو تین کہانیاں لکھ لیتا تھا۔ ورنہ وہ خالص فلم کا آدمی بن چکا تھا اور اس کو شطرنج کے اس کھیل میں چلی جانے والی تمام چالوں کا علم ہو گیا تھا۔

یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس موضوع کو جتنی خوبصورتی سے ٹریٹ کیا جا سکتا تھا، بیدی نے اس خوبصورتی سے ٹریٹ نہیں کیا۔ موضوع کو سستی چیز بنانے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت تھی ان سب کا استعمال اس نے کیا۔ اپنی اساطیری معلومات کو اُس نے پوری طرح استعمال کیا اور عوام کے دیوی دیوتاؤں میں اَندھ وشواس کو پوری طرح ایکسپلائٹ کیا۔ ناول کا خوبصورت آغاز دیکھئے

> ''آج شام سورج کی ٹکیہ بہت ہی لال تھی۔ آج آسمان کے کوٹے میں ایک بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے بکائن پر پڑے تکوکے کے صحن میں ٹپک رہے تھے اور ٹوٹی دیوار کے پاس جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے۔ ڈبو سھ اُٹھا اُٹھا کر رو رہا تھا۔''

اور اب ذرا اندازہ کیجیے کہ فلم کے ڈائرکٹر کے لیے فلم کے پہلے شاٹ کے طور پر یہ کتنا پیارا منظر ہے۔ بیدی کے ذہن میں فلم کا جو مکمل منظر نامہ تھا اس نے اُسے ہی پورے ناولٹ میں ڈھال دیا۔ چونکہ ہندوستانی فلموں میں غیر قدرتی باتوں کی اس لیے بھر مار کی جاتی ہے کہ اس سے لوگوں کی ذہنی تسکین ہوتی ہے۔

ناولٹ کے بڑے کردار تو تین ہی ہیں۔ رانو، تلوکا اور منگل۔ وہی پرانی مثلث ایک عورت اور دو مرد۔ باقی تو سب ثانوی کردار ہیں جو صرف کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ ناولٹ میں پنجاب کی بولیاں جابجا ٹھونسی گئی ہیں جن کی ضرورت نہیں تھی۔ مرزا صاحباں سے کچھ مصرعے لے کر انہیں بھی استعمال کیا گیا ہے جو ایک دم بے محل ہیں۔ پنجابی زبان کے الفاظ کو جان بوجھ کر جملوں میں اُلجھایا گیا ہے۔ وہ جو پنجابی زبان سے ناواقف ہیں انہیں بالکل نہیں سمجھیں گے۔ بیدی کا مقصد یہ تھا کہ پڑھنے والے یہ محسوس کرتے رہیں کہ اس کا پنجاب سے رشتہ پوری طرح قائم ہے اور وہ اپنی نجی زندگی کی طرح اپنے ناولٹ میں بھی سکھوں کے لطیفے استعمال کر سکتا ہے۔ یہ کوئی کرافٹ مین شپ کی بات نہیں۔ پڑھنے والوں کو صرف چونکانے کی بات ہے۔

اب ایک اور قدرتی ٹریٹمنٹ دیکھیے۔ چادر کی رسم ادا ہونے والی ہے، آنگن میں میلی سی چادر تنی ہے جس کے نیچے کچھ گھڑے رکھے ہیں۔ ایک طرف پرانی سی کائی ماری ٹھلیا پڑی ہے اور ان سب پر سندور پُل رہا ہے۔ رانو کو لا کر چادر کے نیچے بیٹھا دیا جاتا ہے۔ اب منگل کی تلاش ہو رہی ہے اور وہ گھر سے بھاگ گیا ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن جس انداز سے گاؤں والے اسے تلاش کرتے کرتے اس جگہ پہنچتے ہیں جہاں وہ چھپا بیٹھا ہے اور اُس پر اس طرح جھپٹتے ہیں جس طرح شکاری شکار پر جھپٹتا ہے۔ وہ نہایت ہی غیر قدرتی ہے۔ ذرا دیکھیے

"لوگ آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ منگل کوٹھڑی میں دو ہاتھوں کے بل جھکا دہشت کے عالم میں، سب کو دیکھتا ہوا سچ مچ ایک جنگلی سؤر معلوم ہو رہا تھا، وہ نہتا تھا، اور باقی سب کے سب مسلح، کہاں تو لوگوں نے شور سے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا اور کہاں وہ اب آ کر سامنے کھڑے منگل کو دیکھ کر ایکا ایکی چپ ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ گھور رہے رہے تھے۔۔۔ دیکھیں پہلا وار کوں کرتا ہے۔ شکار کس طرح لپکتا ہے

منگل کا غرغرہ کانپنے لگا اور لوگوں کے دل دھک دھک کرنے لگے، کچھ دیر کی خاموشی کے بعد منگل نے ذرا سی جنبش کی۔ لوگوں نے ایک دم خائف ہو کر خالی زمین ہی پہ لاٹھیاں برسانی اور ٹو کے چلانے شروع کر دیے　ایک شدید ڈر نے اُن میں ایسا جوش، ایسی طاقت بھر دی کہ زمین میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے۔

ایک بار وہ پھر ایکا ایکی چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شکار اور شکاری! منگل کے اپنے دوست، اپنے ساتھی، اٹھنے والے گوردا اس نے جی کڑا کیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔۔۔

''دیکھتا ہوں یار، کون سا حکا ہے۔''

گورداس کے بڑھنے کی دیر تھی کہ کیسر سنگھ، حکو ا، ہو اب، اسمٰعیل سب جھپٹ پڑے، اس کے جھپٹنے کی دیر تھی کہ یہ منگل ریوڑ میں سے نکلنے کے لیے لپکا، پھر متد اول ہر اول اور قلب سب طرف سے لوگوں نے اسے آلیا، جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ 'لاٹھی' جس کے ہاتھ میں جوتا تھا، جوتا منگل پر برسانے لگا۔ اگر وہ کچھ کرتا تو گنڈا سے سے اور ٹوکے بھی تھے

شور شرابا سن کر راہ گیر جمع ہو گئے۔ منگل کو بالوں سے پکڑ کر بیچ کھیتوں اور کھلیانوں کے گھسیٹا جا رہا تھا۔ سکھ ہونے کے ناطے سردار تارا سنگھ یا کیسر سنگھ کا فرض تھا کہ بالوں کو بے حرمتی سے بچاتے لیکن یہ کسب کرنے میں وہی پیش پیش تھے اور اس میں اہم مزہ اور انتقام لے رہے تھے۔ گھسیٹے جانے کی اذیت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے منگل کچھ دور تک اپنی مرضی سے ساتھ چل لیتا، لیکن پھر پیچھے کی طرف کھینچنے لگتا جیسے کسی اَڑیل ٹٹو کو پانی پلانے کو لے جا رہے ہوں اس کے بدن پر پھٹے ہوئے کپڑوں، لمبے لمبے کیسوں اور داڑھی میں دھر کوبے کی جھاڑیاں، کپاس کی من چھٹیاں، مکی کے ناڑے، خشک آک میں سے اُڑنے والی بڈھی مائیاں اور نہ جانے کیا کچھ گھسٹتا آ رہا تھا۔''

اس بات کو ضرور دھیان میں رکھیے کہ منگل کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ دولہا ہے اور اس کی دلہن تنی ہوئی چادر کے نیچے بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

''عجیب سا دولہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور سر پر پگڑی ندارد ہاتھ میں کند سی کرپان، سہروں کی جگہ جھاڑیاں اور کانٹے، کیسر کے چھینٹوں کی جگہ کیچ کے تودے۔

آنکھوں میں محبت کے نشے کے بجائے نفرت، ندامت اور ہزیمت کے آنسو اور گدلا پن اور عجیب سی برسات جیسے شیو جی، پاروتی کو لینے آئے ہوں گلے میں رودراکش کی مالائیں اور سانپ، منھ میں دھتورہ اور بھانگ، کمر میں لنگوٹ اور کاندھے پر مرگ چھالا اور ہاتھوں میں ترشول براتی بندر اور لنگور، شیر اور چیتے اور ہاتھی اس پہ شہنائی کے بجائے ایک عجیب طرح کی کاہش اور خواہش، وحشت اور شہوت پیدا کرنے والی کتا مکھی کی بھنبھناہٹ اور آٹے کی مشین کی کو کو کو کو۔''

اب دیکھیے ناولٹ کا آخری باب۔ اگر آپ کے سامنے ساری فلم کا منظر نامہ ہے تو سینما ہال میں بیٹھے لوگوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔ تلو کے قاتل اور اس جاترن کا بھائی جس کی دھرم شالہ کے مالک مہرباں داس اور اس کے ساتھیوں نے عصمت دری کی تھی، رانو کی سب سے بڑی لڑکی کو بیاہنے کے لیے آ رہا تھا۔ یاتریوں کا ایک جلوس دیوی ماتا کے درشنوں کے بعد کوٹلہ گاؤں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ

نوجوان سر پر لال رنگ کا ٹیکا ماندھے دیوی کی بھینٹیں گا رہا ہے اور دیوی کی عقیدت کے نشے سے چور ہو رہا ہے۔

ماتا رانی دے دربار، جوتاں جگدیاں
میا رانی دے دربار، جوتاں جگدیاں
ہے میا تُسیں ستے بھیاں گوریاں
سر لال پھلاں دیاں جوڑیاں
ماتا رانی دے دربار، جوتاں جگدیاں

پھر منظر کھلا اور سب نے دیکھا، چودھری مہریاں داس اور اس کا بھائی ’گھنشام‘ سات سال کی قید کاٹ کر آرہے تھے۔ جاتریوں کے شور اور نغمے اَن پڑتے ہوئے حال کے پس منظر میں ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی کمریں سجدوں سے دوہری اور کان توبہ اور شرم سے لال صدیوں کے خشوع اور خضوع کے بعد اب اس کے ہونٹوں پر چپ چلی آرہی تھی اور ان کی یہ چپ داستانیں کہہ رہی تھی کیا یہ ایک باکس آفس والی فلم کا صحیح کلائمکس نہیں ہے۔

لیکن یہ کسی اچھے ناول یا ناولٹ کا کلائمکس نہیں ہوسکتا۔ میرا یہ خیال ہے کہ ”ایک چادر میلی سی“ فلم اس عنواں کے ناولٹ سے کہیں زیادہ خوبصورت اور اثر انگیز ہے۔ آخری فیصلہ آپ پر!

بیدی نے اپنے مضمون ”افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل“ میں ایک جگہ لکھا ہے

”فن کسی شخص میں سوتے کی طرح نہیں پھوٹ نکلتا۔ ایسا نہیں کہ آج رات آپ سوئیں گے اور صبح فنکار ہو کر جاگیں گے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں آدمی پیدائشی طور پر فنکار ہے، لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے، البتہ کہ اس میں صلاحیتیں ہیں، جن کا ہونا بہت ضروری ہے چاہے وہ اسے جبلت میں ملیں اور زیادہ ریاضت سے ان کا اکتساب کرے۔ پہلی تو یہ کہ وہ ہر بات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کرتا ہو، جس کے لیے ایک طرف تو وہ داد و تحسین پائے اور دوسری طرف ایسے دکھ اُٹھائے جیسے کہ اس کے بدن پر سے کھال کھینچ لی گئی ہو اور اس کے کام وہ بس اس چرند کی طرح ہوں جو منہ چلانے میں خوراک کو ریت اور مٹی سے الگ کر سکے۔ پھر یہ خیال اس کے دل کے کسی کونے میں نہ آئے گا، سلیٹ یا بجلی کا زیادہ

خرچ ہو گیا، یا کاغذ کے ریم پر ریم ضائع ہو گئے۔ وہ جانتا ہو کہ قدرت کے کسی
بنیادی قانون کے تحت کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی۔ پھر وہ ڈھیٹ ایسا ہو کہ نقش ثانی
کو ہمیشہ اوّل پر فوقیت دے سکے۔ پھر اپنے فن سے پرے کی باتوں پہ کان دے
مثلاً موسیقی، اور جان پائے کہ استاد آج کیوں سُر کی تلاش میں بہت ہی دور نکل
گیا ہے۔ مصوّری کے لیے نگاہ رکھے اور سمجھے کہ اس میں خطوط کیسی رعنائی اور
توانائی سے اُبھرے ہیں۔ اگر یہ ساری صلاحیتیں اس میں ہوں تو آخر میں
ایک معمولی سی بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ جس ایڈیٹر نے اس کا افسانہ لوٹا دیا
ہے، گدھا ہے!''

جہاں تک افسانے کا تعلق ہے۔ راجندر سنگھ بیدی ایک بڑا افسانہ نگار ہے — اور اُس کے کچھ افسانے دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں لیکن وہ ناول نگار سرے سے ہی نہیں ہے۔ وہ چھوٹے کینوس پر تو نہایت ہی خوبصورتی سے رنگ بھر سکتا ہے اور شاہکار تخلیق کرسکتا ہے۔ لیکن کسی بڑے کینوس پر کام کرنے کے لیے جس کرافٹ مین شپ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بیدی میں نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے کوئی ناول نہیں لکھا۔ صرف ایک ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' لکھا اور وہ بھی اُن دنوں جب وہ ایک ادیب سے زیادہ فلم کا آدمی بن چکا تھا اور اپنی ہر تخلیق کے بارے میں اسی انداز سے سوچتا تھا۔ میرے خیال سے ''ایک چادر میلی سی'' اس نے فلم کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ہی لکھا تھا، اس ناولٹ میں عظیم کیا ایک شاہکار بننے کی بھی صلاحیت نہیں۔ دراصل رانو کی چادر اتنی میلی نہیں تھی جتنی کہ بیدی نے اسے اپنے ہاتھوں سے بے دردی کے ساتھ مسل مسل کر کر دیا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ فلم میں ہیما مالنی نے اپنی اس چادر کو اتنا میلا نہیں ہونے دیا جتنا راجندر سنگھ بیدی اسے کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

کشمیری لال ذاکر

تیسرے درجے کا مسافر

ساحر لدھیانوی

میں اپنی بات کا آغاز لگ بھگ چھتیس سال پہلے کی واردات سے کر رہا ہوں۔

اُن دنوں دل و دماغ پر ابھی تقسیم میں کھائی شدید چوٹوں کے درد کا احساس باقی تھا۔ انسانی رشتے بری طرح ٹوٹے تھے اور ان رشتوں کی تیز تیز کرچیاں سرحدوں پر بکھری پڑی تھیں۔ اور روح میں اس طرح چبھتی تھیں کہ روح لہولہان ہو جاتی تھی۔ میں بھی اُن دنوں ایک شرنارتھی تھا اور دہلی کے قریب گڑگاؤں میں شرن لے رہا تھا۔ جس میں بیحد گرد تھی اور ویرانی تھی۔ اور اس گرد کو پھانکنے اور اُس ویرانی کے خلا کو بھرنے کے لیے میری طرح ہزاروں شرنارتھی گوڑگاؤں میں بھرے تھے۔ اور اُجاڑ مکانوں کی دیواروں کو اپنی بربادیوں کے قصے سناتے تھے۔ جن شرنارتھیوں نے کیمپ میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے ہوش و حواس سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ گوڑگاؤں میں اگر مجھے کوئی چیز اچھی لگی تھی تو وہ کوئی چھ فرلانگ سیدھی سڑک تھی جو گوڑگاؤں چھاؤنی کے قصبے کو ریلوے اسٹیشن سے ملاتی تھیں۔ اور جس کے دونوں طرف نیم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے جن کی شاخیں محرابیں بنا کر سڑک کے اوپر ایک دوسرے سے گلے ملتی رہتی تھیں۔ نیم کے درخت میں نے اتنی بڑی تعداد میں پہلی بار دیکھے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ سفیدے اور چنار کے علاوہ کڑوے کڑوے چھوٹے پتوں والے نیم کے درخت بھی اتنے خوبصورت ہو سکتے ہیں۔ یہ بات بھی ایک صدی کے تیسرے حصے جتنی پرانی ہے۔ جب ایک تقسیم کے بعد ملک نے ابھی دوسری تقسیم کا منظر نہیں دیکھا تھا، اس زمانے میں ابھی ہریانہ اور ہماچل کی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک ہی پنجاب تھا، جسے مشرقی پنجاب کہتے تھے۔ چونکہ مغربی پنجاب اب پاکستان میں تھا۔ ان دنوں جب ہم لوگ لاہور میں رہنے والے اپنے دوستوں کو خط لکھتے تھے تو لاہور کے ساتھ بریکٹوں میں مغربی پنجاب بھی لکھتے تھے۔ اب تو مشرقی پنجاب سے بھی دو اور صوبے نکل آئے ہیں۔ لیکن میں اس وقت صوبوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں کی بات کر رہا ہوں جنھوں نے دہلی کے آس پاس اپنی ویرانی

کے ڈیرے ڈال دیے تھے۔اس دنوں کا گوڑ گاؤں اور اب کا گوڑ گاؤں، بس پوچھیے مت! وہ جو چھ سات فرلانگ لمبی ریلوے روڈ تھی، اب اولڈ ریلوے روڈ ہو گئی ہے۔اس کی جگہ اب ایک نیو ریلوے روڈ بن گئی ہے۔جس کے کناروں پر نئی نئی کشادہ کوٹھیاں بن گئی ہیں۔اور اولڈ ریلوے روڈ کی ایک طرف چھتیس برس پہلے کی بی کچی جھگیاں اب چھوٹے موٹے پکّے مکانوں میں بدل گئی ہیں جن اُجڑے ہوئے بے گھر لوگوں نے ان کچی جھگیوں کی بنیادیں ڈالی تھیں،ان میں سے بیشتر لوگ مر کھپ چکے تھے۔جو کوئی اکادکا آدمی اپنی مضبوط ہڈیوں کے سہارے زندہ ہے وہ ان چھوٹے موٹے مکانوں کی دیواروں کے ساتھ اپنی ٹوٹی ہوئی کھاٹ ڈال کر دن بھر کھانستا رہتا ہے اور فضا میں بیماری کے جراثیم پھیلاتا رہتا ہے۔یہ اکادکا لوگ اس زمانے کی یادگار ہیں جب وہ اپنے سروں پر اپنی بربادیوں کی گٹھریاں اُٹھائے جگہ جگہ پناہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔اور دہلی کے لوگ اُنہیں پاکستانی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔دلی کے لوگوں نے بڑی بے دلی سے قبول کیا تھا ہم لوگوں کو۔انہیں خیال تھا کہ یہ اُجڑے ہوئے لوگ جنہیں وہ طنز سے پاکستانی کہتے تھے بھیک مانگیں گے، چوریاں کریں گے، دنگے فساد کرائیں گے۔اور کبھی وقار کی زندگی نہ جی سکیں گے۔لیکن راوی اور چناب اور جہلم کے پانیوں پر پلے ہوئے یہ رانجھے اور ہیریں، اپنے ساتھ اپنی مخصوص روایات لائے تھے۔محبت کی خاطر فقیر ہو جانے کی روایات، یار کی خاطر کچے گھڑے پر دریا پار کرنے کی روایات۔ ان کے پاس بھیک مانگنے اور چوریاں کرنے کی روایات نہیں تھیں۔ چنانچہ یہ رانجھے اور یہ ہیریں اجنبی دھرتی پر رُل رُل کر جیئے۔لیکن اپنا وقار نہیں چھوڑا۔اور آج دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں کاروبار کرنے والے، کارخانے چلانے والے، بڑے بڑے فارم بنانے والے وہی اُجڑے ہوئے لوگ ہیں جنہیں دہلی والوں نے بڑی بے دلی سے قبول کیا تھا۔آپ اب بھی نکل جایئے، دلی کے ارد گرد کے دیہات میں آپ کو کہیں نہ کہیں کلف لگی پگڑی کا سفید شملہ اور لٹھے کا کھڑ کھڑاتا ہوا تہمد مل جائے گا۔اسی سید ھے اور اونچے شملہ اور کھڑ کھڑاتے تہمد کی تہوں میں تو یہ لوگ اپنا وقار، اپنی خودداری اور اپنی اَنا سمیٹ کر لائے تھے۔جو انہوں نے اس دھرتی پر بکھیری تھیں جو دھرتی اب انہیں قبول کر چکی ہے اور جس نے اپنے سینے سے لگا کر اپنا سارا اُدلار اور پیار دے ڈالا ہے۔

دلی والوں کی دھرتی پر ایک اور شرنارتھی آیا تھا اُن دنوں۔

وہ پہلے لدھیانہ سے اُجڑ کر لاہور گیا تھا اور اپنے ساتھ یہ پیشینگوئی لے کر گیا تھا کہ لاہور بھی اُجڑے گا ایک دن اور لاہور واقعی اُجڑا تھا۔اور وہ شرنارتھی جس کا نام ساحر لدھیانوی تھا، لاہور سے دھکے کھاتا پرانی دہلی کی ایک نہایت ہی گھناؤنی بستی پُل بنگش کی ایک تنگ سی گلی کے ایک ایسے مکان میں آیا تھا جو کسی

مسلم مہاجر کے پاکستان چلے جانے کے بعد پرکاش پنڈت کو اَلاٹ ہوا تھا۔ (الاٹ تو شاید ساحر کو ہی ہوا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں صحیح علم نہیں) مکاں کی ڈیوڑھی عین گلی میں کھلتی تھی اور اس کے ایک کمرے کے تہہ دار دروازے بھی گلی ہی میں کھلتے تھے۔ جب سارے دروازوں کی تہیں سمیٹ دی جاتیں تو وہ کمرہ ایک طرح سے بغیر دروازوں کے ہو جاتا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ مال گاڑی کا ایک ڈبہ تھا جس میں کسی مکان کا ساماں بھر کر دوسری جگہ بھیجا جا رہا تھا۔

پرکاش پنڈت دہلی آ گیا تھا کیونکہ اسے کسی معقول ادبی کام کی تلاش تھی۔ اس نے ''شعاعیں'' کو سنبھال لیا تھا۔ جسے شیام سندر پرویز نے جاری کیا تھا۔ اس میں اسے شاہد احمد دہلوی مدیر 'ساقی' کی بھی سرپرستی حاصل تھی۔ پرویز خود تو پبلسٹی کا بزنس کرتا تھا، لیکن اُسے کچھ کچھ ادبی ٹھرک بھی تھا۔ اس لیے اُس نے ''تھری بلک فور ان وَن'' قسم کا پرچہ نکال لیا تھا۔ جس میں ادب سے لے کر خوبصورتی بحال رکھنے کے نسخے ہوتے تھے۔ ''شعاعیں'' کی وساطت سے میں نے سلمٰی صدیقی کی کہانیاں پہلے پہل پڑھی تھیں۔ پرکاش پنڈت نے مکتبہ شاہراہ کے مالک محمد یوسف جامعی سے 'شاہراہ' کو بھی دیکھنے کا کام لے لیا تھا۔ پرکاش پنڈت ایک ذہین اور خوبصورت شخص تھا۔ اور بڑا جی سور کر کام بھی کرتا تھا۔ بعد میں اس نے ''ہند پاکٹ بکس'' میں رہ کر اُردو کے سبھی اچھے شاعروں کو ہندی جاننے والے لوگوں سے متعارف کرایا۔ یہ اس کا بہت ہی قابلِ تعریف کام ہے۔ پرکاش پنڈت ایک خوددار آدمی تھا۔ اس کا مجھے ذاتی تجربہ بھی ہے۔

میں جن دنوں کا ذکر کر رہا ہوں ان دنوں پرکاش پنڈت نے راج پال اینڈ سنز کو چھوڑ دیا تھا (اس نے ''شاہراہ'' سے الگ ہو جانے کے بعد اس ادارہ کو جوائن کر لیا تھا) ملک کی طرح اس مشہور پبلشنگ کنسرن نے بھی اپنا بٹوارہ کر لیا تھا۔ دینا ناتھ ملہوترا اپنے بھائی سے الگ ہو گیا تھا۔ اور اس نے ''ہند پاکٹ بکس'' کا ادارہ سنبھال لیا تھا۔ بعد میں اس نے نیا پبلشنگ ہاؤس 'سرسوتی وہار' کے نام سے بھی قائم کر لیا تھا۔ پرکاش پنڈت اب ''ہند پاکٹ بکس' میں آ گیا تھا اور اس نے دینا ناتھ ملہوترا کا کام سنبھال لیا تھا۔ ادھر کئی برسوں سے میری اُس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر اچانک ایک دن اُس کا ایک خط ملا۔ خط میں اس نے ایک عجیب واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ ایک شخص (جس کا نام میں جان بوجھ کر نہیں لکھ رہا ہوں) میرا نام لے کر اُس سے ملنے گیا تھا۔ ویسے یہ شخص میرا نام لے کر میرے کئی دوستوں کو ایکسپلائٹ کر چکا تھا۔ پرکاش پنڈت ان دنوں بہت پریشان تھا۔ اس کی صحت بھی ٹھیک نہیں تھی اور اسے اپنے سب سے بڑے بیٹے کی چنتا تھی جو بیکار تھا لیکن کتابوں کا کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اُس نے اپنے باپ کا حشر دیکھ لیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس کے باپ کا جو حشر تیس سال کے عرصے میں ہوا تھا اس کا وہ حشر ابھی سے ہو

جائے۔ اس آدمی نے پرکاش پنڈت کو یقین دلایا کہ وہ اس کے بیٹے کو کوروکشیتر یونیورسٹی میں کوئی معقول سروس دلا دے گا۔ پرکاش پنڈت نے اسے اچھی خاصی رقم بھی دے دی تھی اور اپنا بیٹا بھی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ آدمی لڑکے کو ادھر اُدھر گھماتا رہا اور پھر وہ اُسے آگرہ میں چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ لڑکا پریشان ہوتا ہوا آخر دہلی پہنچا اور ساری داستان اپنے باپ کو سنائی۔ پرکاش پنڈت نے اتنے برسوں کے بعد مجھے جو خط لکھا تھا اس میں یہی داستان بیاں تھی۔ اور اس آدمی کا حلیہ بھی لکھا تھا اور مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں اُس شخص کو جانتا تھا، میں نے پرکاش پنڈت کو خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا اور وہ نہایت ہی فراڈ قسم کا آدمی تھا۔ اور اس طرح کئی برسوں کی ٹوٹی ہوئی ملاقاتوں کا رشتہ ایک بار پھر جڑا اور پرکاش پنڈت اور میں دوبارہ ملنے لگے۔ ایک بار اس نے ''ہند پاکٹ بکس'' والوں کی گاڑی بھیج کر مجھے منسٹری آف ایجوکیشن سے (جہاں میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے گیا تھا) شاہدرہ بلوایا، اپنے آفس میں، میں اس سے پہلے 'ہند پاکٹ بکس' کے دفتر میں تو کیا کبھی شاہدرہ بھی نہیں گیا تھا۔ حالانکہ شاہدرہ بھی انہیں شرنارتھیوں نے بسایا تھا جو پاکستان سے اُجڑ کر آئے تھے۔ وہیں میری دینا ناتھ ملہوترا سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ملہوترا بڑا شائستہ با اخلاق اور سلجھا ہوا آدمی ہے، دراصل پرکاش پنڈت مجھے ملہوترا سے ملوانا چاہتا تھا، پہلی ہی ملاقات میں مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ دینا ناتھ ملہوترہ پرکاش پنڈت میں اٹوٹ وشواس رکھتا تھا، اور اس پر پوری طرح ڈی پینڈ کرتا تھا۔ سرسوتی وہار ابھی نیا نیا قائم ہوا تھا اور پرکاش پنڈت ہی اس کام کو بھی سنبھال رہا تھا۔ اس ادارے سے کچھ بہت اچھی کتابیں چھپی تھیں۔ میرا ناول ''لہو پکارتا ہے'' پرکاش پنڈت نے اپنی دیکھ ریکھ میں ''سرسوتی وہار'' ہی سے چھپوایا تھا۔ میں نے اس ناول کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ میرا یہ ناول ساحر کی نظم ''خون پھر خون ہے'' کے ایک ٹکڑے سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اُردو میں میرے اس ناول کا عنوان ہے ''خون پھر خون ہے''۔

ناول کے ہیرو کا نام انجم ہے۔

اور ہیروئن کا نام ساحرہ۔

شادی کی پہلی رات کو ترکمان گیٹ کی اندرونی آبادی کے ایک تنگ مکان کے اوپر والی منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں انجم اپنی دلہن سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ وہ جو بھی بات کرتا ہے اسے ساحرہ سنتی ضرور ہے۔ لیکن جواب نہیں دیتی۔ جیسے اس پر کوئی ردِ عمل ہی نہیں، انجم کی کسی بات کا۔ اور پھر نہ جانے کیسے وہ کہہ اُٹھتا ہے مجھے ساحر لدھیانوی کی ایک نظم بہت پسند ہے جو اُس نے کانگو کے شہید 'لومبا' کے قتل پر کہی تھی اور جس کی موت کے بارے میں جواہر لعل نہرو نے کہا تھا کہ ایک قتل کیا ہوا، لومبا ایک

زندہ لومبا سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ تم اس نظم کا ایک حصہ سوگی؟"

"خون پھر خون ہے" ساحرہ نے ایک دم جواب دیا تھا۔

"تو تم نے ساحر کو پڑھا ہے؟"

"مجھے ساحر بہت پسند ہے۔"

خاموشی کا وہ طلسم جو ساحرہ پر اب تک چھایا ہوا تھا ساحر کے نام سے ہی ٹوٹا تھا، اس کے محبوب شاعر کے نام سے اور پھر انجم نے نظم کا یہ ٹکڑا اپنی بوجھل دھیمی آواز میں سنایا تھا اور ساحرہ روا ٹھی تھی اور اُس نے اپنے آپ کو انجم کی آغوش میں ڈال دیا تھا۔

خوں چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اُٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے، آغاز سے انجام تلک
خوں پھر خوں ہے سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

خوں پھر خوں خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا۔

پُل بنگش کی گنجان لوکیلٹی میں مال گاڑی کے ڈبے جیسے معمولی مکان میں ساحر سے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ امی بھی اُن دنوں دہلی آگئی تھیں۔ ان دنوں کی امی اور ممبئی میں بیس برس بعد کی امی میں زمین آسماں کا فرق تھا۔ ان دنوں تو امی سارے گھر کی رونق ہوا کرتی تھیں۔ خاموش ضرورت سے زیادہ، سنجیدگی اور ڈیجیسٹ تو بہت بعد میں اُبھری تھی۔ امی کی شخصیت میں۔ مسز پرکاش پنڈت بھی بڑی تندہی سے خدمت کرتی تھی امی کی۔ اور وہ انہیں بالکل اپنی ماں کی طرح مانتی تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ساحر، مجاز اور ایک آدھ اور شاعر "آجکل" کے دفتر اولڈ سکریٹریٹ میں جوش ملیح آبادی سے ملنے چلے جاتے تھے۔ ایسے بھی موقعے آئے جب میں بھی ساتھ ہوتا تھا۔ جوش صاحب بھی تو ان دنوں پُل بنگش کے علاقے میں ہی رہتے تھے۔ ایک دومنزلہ مکاں میں جو ساحر کے مکاں

سے پہلے پڑتا تھا اور خاصا بڑا بھی تھا۔ جوش صاحب والے مکان میں ہی جہاں بعد میں جگن ناتھ آزاد اپنے والد تلوک چند محروم کے ساتھ رہنے لگا تھا اور سب سے اوپر والی منزل میں ساحر ہوشیار پوری رہنے لگا تھا۔ یُں نکلسن کی یہ لوکیلٹی کچھ برسوں تک ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا مرکز بنی رہی۔ مجاز جب بھی دلی آتا ساحر کے یہاں ہی ٹھہرتا۔ ایک بار جب میں صبح ہی صبح ساحر سے ملنے گیا تو مال گاڑی کے ڈبے نما بڑے سے کمرے میں بچھے پلنگ پر ساحر اور مجاز دونوں سوئے پڑے تھے۔ شاید رات کو کسی مشاعرے سے بہت دیر میں لوٹے تھے۔

ساحر کا دہلی میں مختصر قیام بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ میں سمجھتا ہوں اس زمانے میں ترقی پسند ادیبوں کا مرکز بمبئی نہیں تھا دہلی تھا۔ 'شاہراہ' ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا اور سبھی ترقی پسند ادیب اور شاعر اس میں لکھتے تھے۔ میرا ناول ''سیندور کی راکھ'' بھی پہلی مرتبہ 'شاہراہ' میں ہی چھپا تھا۔ ساحر سب دوستوں کی تخلیقات بڑی محبت سے اور سجا سنوار کر چھاپتا تھا اور بڑے خلوص سے اُن کی رچنائیں حاصل کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میری کہانی ''اندھیرے کی کوکھ'' اس نے سنی تو مجھے صاف بھی نہیں کرنے دی اور ''شاہراہ'' میں شائع کر دی۔ کہانی کا مرکزی خیال ایک ایسی ہندو عورت ہے جو تقسیم کے دوران اغوا کر لی جاتی ہے اور جب فوج کی مدد سے اسے برامد کر کے ہندوستان لایا جاتا ہے تو اس کے پیٹ میں پورے دنوں کا بچہ ہے۔ ساحر نے جب یہ کہانی سنی تھی تو اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ''شاہراہ'' کا وہ پرچہ جس میں میری یہ کہانی چھپی تھی مجھ سے کوئی پڑھنے کے لیے لے گیا اور اُس سے گم ہو گیا۔ (جیسے کہ اکثر ہمارے ساتھ ہوتا ہے) میرے پاس اس کہانی کی نقل بھی نہیں ہے کیونکہ ساحر نے تو اُسے رَف شکل ہی میں مجھ سے لے لیا تھا۔ میں نے صرف اپنی بات کہی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی تخلیقات اسی طرح لیا کرتا تھا اُن سے۔ ان کی کہانیاں، نظمیں، غزلیں، مضمون اسی طرح حاصل کرتا تھا۔ بڑی معصومیت سے مسکرا کر پیار سے، ایسی معصومیت اور پیار سے کہانی یا غزل کی کیا کوئی اسے جان دینے سے بھی انکار نہ کر سکتا تھا۔

اور پھر ساحر اچانک ہی دہلی سے چلا گیا ——— اس نے دہلی کیوں چھوڑ دی یہ ایک الگ داستاں ہے۔

ایک شام ساحر جب اپنی ممی کو پرکاش پنڈت اور اُس کی بیوی کے پاس چھوڑ کر بمبئی چلا گیا اور چار بنگلہ میں کرشن چندر کے پاس رہنے لگا۔ ساحر کے جانے کے بعد میں امی سے اکثر ملتا۔ اس کا مزاج پوچھتا اور بدلے میں اُس کی پیاری پیاری دُعائیں حاصل کرتا۔ بزرگوں کی دُعائیں بھی ہمارے ساتھ ایک معین مدت تک ہی رہتی ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے یہ خوبصورت پناہ گاہ بھی تو مستقل نہیں ہوتی۔ بزرگ چلے

جاتے ہیں تو اپنی پیاری پیاری پُر خلوص اور شفقت بھری دُعائیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

ساحر اور پرکاش پنڈت کی دوستی بڑی مضبوط دوستی تھی، ایسی مضبوط دوستیاں آج کے مشینی دور میں نایاب ہیں۔

کبھی کبھی تو اپنے دوستوں کے بارے میں باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اس میں کوئی لاجک نہیں ہوتا کوئی آرگومنٹ نہیں دی جا سکتی--- آج میرا اس واقعی دوستوں کے بارے میں بات کرنے کو چاہ رہا ہے۔ بھلے ہی اس میں کوئی لاجک نہ ہو۔

میرا ایک دوست سکھ دیو پرشاد ہے۔ ابھی حال ہی میں ہریانہ سرکار سے ہوم سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوا ہے۔ میں کئی سال پہلے کی بات کر رہا ہوں، جب وہ ڈپٹی کمشنر بن کر کرنال گیا تھا۔ کرنال ضلع کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں ہندوستاں کی تقدیر پلٹ دینے والی کئی لڑائیاں لڑی گئیں۔ پانی پت کی تیں لڑائیاں، تھانیسر کی لڑائی اور پھر کورو کھشیتر کا مہایدھ۔ اسی علاقے میں تو کرشن نے ارجن کو وہ اُپدیش دیا تھا جس سے گیتا کا جنم ہوا۔ جہاں کرنال کا ضلع جنگوں کے لیے مشہور ہے وہاں اس کی ادبی حیثیت بھی ہے۔ اب کورو کھشیتر کا ضلع بن جانے سے جنگوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا ہے۔ الطاف حسین حالی پانی پتی کرنال کے ضلع کے ہی تو تھے۔ پانی پت میں سرسید احمد خاں، علامہ اقبال اور علم و ادب سے تعلق رکھنے والی کئی نامور ہستیاں آ چکی ہیں۔ بوعلی قلندر بھی یہیں کے تھے، اس کا مزار بھی پانی پت میں ہی ہے۔ حالی بے چارے کی تو ایک چھوٹی سی قبر تھی، بوعلی قلندر کا تو بہت بڑا مزار ہے، یہاں سبھی فرقوں کے لوگ سجدہ گزارنے آتے ہیں۔ جب سکھ دیو پرشاد نے کرنال میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے چارج لے لیا تو وہاں میرا جانا لازمی ہو گیا۔ دس پندرہ روز میں تو وہاں جانا ہی ہو جاتا تھا، کبھی کسی دفتری کام سے اور کبھی ذاتی وزٹ کے طور پر۔ سکھ دیو پرشاد علم و ادب سے عشق کرنے والا آدمی ہے اور میرا اُس سے بہت پرانا تعلق ہے۔ ایک بار جب میں کرنال گیا تو اس نے کہا کہ وہ اس ضلع کے ادبی اور کلچرل ترقی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے اور مجھ سے پوچھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرے۔ میں نے حالی کی ادبی اہمیت کا ذکر کیا اور تجویز پیش کی کہ وہ حالی کے نام پر کوئی پارک بنوا ڈالے، کوئی لائبریری کھول دے اور سب سے پہلا کام یہ کرے کہ حالی کے پرانے مقبرے کو ٹھیک کرا دے اور اس کو ایسی شکل دلائے جو حالی کے شان کے شایاں ہو۔ اور پھر ہر سال حالی کی یاد میں پانی پت میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کرائے۔ سکھ دیو پرشاد نے میری سبھی تجویزیں مان لیں اور اس کی تکمیل کے سارے پروسیس میں مجھے ساتھ رکھا۔ پانی پت کے ماڈل ٹاؤن کے باہر والے حصے میں ایک بہت ہی پرانا اور گندہ جوہڑ تھا جو سوائے مچھروں کو پالنے اور سارے شہر میں سڑاند پھیلانے

کے کسی کام نہ آتا تھا اُس نے اُس جوہڑ کو ایک شاندار پارک میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور فوراً ہی کام شروع کرا دیا۔ اس برس حالیؔ کے جنم دن پر پہلا آل انڈیا مشاعرہ اسی نامکمل پارک کے وسیع ایریا میں منعقد کیا گیا۔ سکھ دیو پرشاد تیس سال تک کرنال کا ڈپٹی کمشنر رہا اور تینوں سال پانی پت میں کل ہند مشاعرے ہوتے رہے۔ اس خوبصورت وسیع پارک میں جس کا نام حالی پارک رکھا گیا تھا۔ حالیؔ کا مقبرہ از سر نو تعمیر ہوا اور اُس کے نام پر ایک لائبریری بھی کھل گئی۔ میں اس آخری کل ہند مشاعرے کا ذکر کر رہا ہوں جس میں شریک ہونے کے لیے ساحرؔ آیا تھا اور اُس کے ساتھ امی تھیں اور انور بھی تھی۔ ساحر کا ڈاکٹر دوست بھی اس کے ہمراہ آیا تھا۔ اس مشاعرے میں ساحرؔ کے علاوہ بمبئی سے کیفیؔ اعظمی، جاں نثار اخترؔ اور سردار جعفری بھی آئے تھے۔ کیفیؔ کی طبیعت اُن دنوں ٹھیک نہیں تھی، لیکن اُس نے بھی میرا کہا نہیں ٹالا تھا اور پانی پت کے کل ہند مشاعرے میں شرکت کرنے آیا تھا۔ صاحر دت بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اب امی خاصی بدل چکی تھیں۔ مجھے اُنہوں نے پہچانا بھی نہیں۔ ساحرؔ کے روکنے کے باوجود ہم امی کو بھی چند لمحوں کے لیے اسٹیج پر لائے تھے اور اُس کے گلے میں ہار ڈالے تھے۔ اس سے تسکین صرف ہمیں ملی تھی، ہم جو امی کے پرستاروں اور عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اس سے نہ تو ساحرؔ کو کوئی فرق پڑا تھا نہ اُس کی امی کو۔

میں نے ساحرؔ کو 'تیسرے درجے کا مسافر' اس لیے کہا ہے کہ اُن دنوں ابھی ریل والوں نے تیسرے درجے کے کمپارٹمنٹ کو دوسرے درجے کا نام نہیں دیا تھا۔ نئے نام کرن سنسکار سے بھی فرق کچھ نہیں پڑا تھا۔ ڈبے وہی تھے، پرانے اور خستہ صرف اُن پر پیا روغن کر دیا تھا ریل والوں نے۔ ہمارے سماج کا المیہ تو یہی ہے کہ پرانے گلے سڑے ڈھانچوں پر روغن کر دینے سے ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ نظام بدل گیا ہے۔ لیکن اس عمل سے نہ تو نظام ہی بدلتا ہے اور نہ عوام کی تقدیر ہی بدلتی ہے۔ جو ناآسودگیاں اور تکلیفیں تیسرے درجے میں سفر کرنے والے مسافروں کو ہوتی تھیں وہی ناآسودگیاں اور تکلیفیں اب اُنہیں دوسرے درجے کے مسافر کہہ کر دی جا رہی تھیں، لوگ بھی وہی تھے، ریل کے ڈبے بھی وہی تھے۔ اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم بھی وہی تھے۔ کوئی بھی فرق نہیں پڑا تھا، صرف ڈبوں کے باہر ''تیسری شرینی'' کی جگہ ''دوسری شرینی'' لکھ دیا گیا تھا۔ وہ بھی ہندی میں اُردو میں نہیں۔ اُردو اب بھی تیسرے درجے کے مسافروں کی ہی زبان تھی۔ اسے دوسرے درجے کی زبان نہیں بنایا گیا تھا اور لطف یہ تھا کہ تیسرے درجے کی زبان کو شاعروں کو دوسرے اور پہلے درجے کے لوگ زیادہ شوق سے سنتے تھے۔ کوی سمیلنوں میں لوگ جاتے تھے، کویتائیں بھی سنتے تھے لیکن شعر اُردو کے یاد کرتے تھے۔ ہندی کی کویتائیں نہیں۔ اُردو کے شعر خاص طور پر عورتیں اپنی کٹی پارٹیوں میں سناتی تھیں اور داد حاصل کرتی تھیں۔ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ

کیفیت اب بھی جاری ہے اور اس کا چلن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ تیسرے درجے کی زباں کے شاعروں کو دوسرے درجے کی آبادی کی سرپرستی حاصل ہے (عورتیں ہمارے ملک میں دوسرے درجے کی شہری ہی تو ہیں۔ انہیں پہلے درجے کی شہری بننے میں اتنی ہی دیر لگے گی جتنی اس انقلاب کے آنے میں لگے گی جس کے لیے جانے کتنی مدت سے کوشش ہو رہی ہے)

ساحر تیسرے درجے کی زباں کا شاعر تھا اس لیے اُس نے اپنی روایات کو نہیں توڑا، وہ زندگی بھر ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھا، وہ دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی طرح ماسکو نہیں گیا کیونکہ وہ ہوائی جہاز میں سفر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے زندگی بھر اپنی دھرتی کی بو باس کو سنوارا اور اپنی دھرتی کے عوام کے دُکھ درد کا حصہ دار بنا۔ نہ اُس نے کبھی سرمایہ داروں کے قصیدے لکھے اور نہ ہی کبھی اُن کی عیش کا حصہ دار بنا۔ نہ اس نے ادب میں ایسا کیا اور نہ فلم میں۔ اس نے کبھی عوام سے اپنا ناطہ نہیں توڑا اور اس کی شاعری اسی رشتے کو مضبوط کرنے کی ایک بہت بڑی ادبی اور عوامی کوشش ہے۔

مجھے یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔

ساحر کو لدھیانہ سے عشق تھا۔ وہ جب بھی دہلی تک آتا ایک آدھ دن کے لیے لدھیانہ ضرور جاتا کیونکہ وہاں اس کے دوست بھی تھے اور پرستار بھی۔ وہ دھرتی بھی موجود تھی جس کی فضا میں وہ جیا تھا وہ کالج بھی موجود تھا جس کی دیواریں اب بھی اس کے شعروں سے گونجتی ہیں۔ ان دنوں لدھیانہ کے ڈپٹی کمشنر سردار سیوا سنگھ تھے۔ ایک نفیس بااخلاق اور کلچرڈ شخص، انہیں بھی علم و ادب سے محبت ہے جن دنوں وہ چنڈی گڑھ یونین ٹیرٹری کے ایجوکیشن اور فائی نانس سکریٹری تھے۔ ان کی مدد ہی سے تو میں دو بار انڈو پاک مشاعرے منعقد کرا سکا تھا۔ ان مشاعروں میں رئیس امروہوی، احمد فراز، پروین شاکر، کنور مہندر سنگھ بیدی، صابر دت، خمار بارہ بنکوی، بشیر بدر، جمیلہ بانو اور دوسرے کئی شعراء شریک ہوئے اور چنڈی گڑھ کے چیف کمشنر کے بیسر جی نے انہیں نہ صرف اسٹیٹ گیسٹ بنایا بلکہ اُنہیں اعزاز بھی دیئے۔ سردار سیوا سنگھ نے ساحر کی آمد پر لدھیانہ میں ایک بہت اچھا مشاعرہ کرایا تھا۔ لوگوں نے اپنے محبوب شاعر کو جی بھر کر سنا اور جی بھر کر داد بھی دی۔ اسی محفل میں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ کلب کے پیچھے والی سڑک کا نام ''ساحر روڈ'' رکھا جائے۔ جب اسٹیج پر یہ تجویز رکھی گئی تو سردار سیوا سنگھ نے یہ اعلان کرتے ہوئے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور ساحر کے گلے میں پھولوں کا ہار بھی ڈالا۔ ساحر نے جب ڈپٹی کمشنر کا اور لدھیانہ کے دوستوں کا شکریہ ادا کیا تو کہا۔

''میں ڈپٹی کمشنر صاحب کا اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے وہ اعزاز بخشا ہے

جس کا میں واقعی مستحق ہوں۔" لوگوں نے تالیاں تو بجائیں لیکن ساحر کے لطیف اشارے کو نہ سمجھ پائے تالیوں کی گونج ختم ہوئی تو ساحر نے کہا۔

"میں اس اعزاز کا اس لیے حقدار ہوں کہ میری تمام عمر سڑکوں ہی پر گزری ہے۔" تمام ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا اور اس مترنم گونج میں تالیوں کی گونجیں بھی شامل ہو گئیں۔ ساحر نے اپنی دھرتی کے باسیوں کے سامنے یہ قبول کیا تھا کہ وہ تیسرے درجے کا آدمی تھا جس کی تمام عمر سڑکوں پر گزری تھی انہیں سڑکوں پر جن پر عوام اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے غم جھولیوں میں ڈالے گھومتے رہتے تھے۔ اور زندگی سے مایوس نہیں ہوتے۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا پانی پت کے کل ہند مشاعرے کی کیونکہ صابر دت بھی اس مشاعرے میں شریک تھا اس لیے وہ میری بات کی تصدیق کرے گا۔ اس مشاعرے میں ہریانہ سے اتنے لوگ نہیں آئے تھے جتنے کہ دہلی اور پنجاب اور چنڈی گڑھ سے آئے تھے اپنے محبوب شاعروں کو سننے کے لیے۔ لیکن جو لوگ لدھیانہ سے آئے تھے وہ صرف ساحر کے لیے آئے تھے اور بضد تھے کہ اگلے دن ساحر ان کے ساتھ لدھیانہ چلے کیونکہ وہاں روٹری کلب اور کچھ دوسری انجمنوں نے مل کر ایک مشاعرہ ارینج کیا تھا جس کی صدارت گیانی ذیل سنگھ جی کر رہے تھے جو اُن دنوں پنجاب کے چیف منسٹر تھے۔

"میں ذاکر دا مہماں آں۔ اوہدے کولوں پچھو۔" ساحر نے لدھیانہ سے آئے ہوئے دوستوں سے کہا۔ وہ لدھیانہ جانے کو تیار تھا لیکن ان لوگوں کو اجازت مجھ سے لینی چاہیے تھی کیونکہ وہ میرا مہمان تھا۔

یہ تھا ساحر کا اخلاق! یہ تھی ساحر کی دوستی کی قدریں!

اس سے اگلے روز کاروں میں نہ صرف ساحر لدھیانہ گیا بلکہ سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، صابر دت اور میں بھی گئے۔

لدھیانہ کا وہ مشاعرہ ایک الگ ہی نوعیت کا تھا۔ اس مشاعرہ میں سوائے ہم چھ شاعروں کے کسی دوسرے شاعر نے کلام نہیں پڑھا، سوائے کرشن ادیب کے جو ہمارا ہی ساتھی تھا اور ساحر کا بہت پیارا دوست۔ مشاعرہ کی نظامت بلجیت سنگھ سجاد نے کی تھی۔ اس مشاعرے کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ تھی کہ گیانی ذیل سنگھ نے بڑی ہی خوبصورت تقریر کی تھی، بڑی ہی پیاری اُردو میں۔ انہوں نے اس تقریر میں ادیبوں اور شاعروں کے لیے جو الفاظ استعمال کئے تھے، وہ سنہری الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے ہم سب شاعروں کے گلے میں بہت ہی خوبصورت ہار ڈالے اور ہمیں باری باری اپنے سینے

سے لگا کر دُعائیں دیں۔ پنجاب کو ایسا اسکالر چیف منسٹر بھی شاید ہی کبھی ملے۔

لدھیانہ سے اگلے روز ساحرؔ اور جاں نثار اختر اور صابر میرے ساتھ چنڈی گڑھ آ گئے۔ کیفی اور سردار جعفری دہلی چلے گئے۔ ساحر ماڈل ٹاؤن میں ٹھہرا اور جاں نثار اختر میرے گھر۔ ساحر چنڈی گڑھ میری خاطر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی مشاعرے میں شرکت کرنے آیا تھا، پانی پت اور لدھیانہ کے بعد کسی مشاعرے کی اب ضرورت ہی کہاں رہ گئی تھی۔

ساحر چنڈی گڑھ اس لیے آیا تھا کہ اس دن اُس کے نہایت عزیز دوست شو کمار بٹالوی کے بچے کی سالگرہ تھی۔ ساحر لدھیانہ سے میرے ساتھ ضرور آیا تھا لیکن اس نے تمام دن شو کمار بٹالوی کے گھر میں گزارا تھا۔ مجھے وہ اُس دن نہیں ملا، اگلے دن جانے سے پہلے اور جاں نثار اختر کو ساتھ لے جانے کے لیے میرے گھر آیا تھا اور پھر وہ اور اختر اور صابر تینوں دہلی چلے گئے تھے۔ آج شو کمار بٹالوی اس جہاں میں نہیں لیکن اس کی نظمیں پنجابی ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ شو بھی ساحر کی طرح تیسرے درجے کا ہی آدمی تھا۔ وہ جیا بھی تیسرے درجے کے آدمی کی طرح اور مرا بھی اُنہیں میں سے ایک ہو کر۔

اب کہاں ہے وہ دوستوں کی خاطر مرنے والا پیارا شخص' جسے اس کے والد چودھری فضل محمد نے قرآں شریف دیکھ کر عبدالحیٔ نام دیا تھا لیکن دنیا نے جسے ساحر کے نام سے یاد کیا اور آنے والی نسلیں بھی جسے اُسی نام سے یاد کریں گی۔ ساحر واقعی جادوگر تھا، الفاظ کا بھی، فن کا بھی، خلوص کا بھی، دوستی کا بھی۔

ساحر!

اگر تم چند لمحوں کے لیے دوبارہ ہمارے درمیان آ جاؤ تو دیکھو گے کہ ہم تمہیں اپنے درمیان نہ پا کر کتنے رنجیدہ ہیں۔ میرا یقین نہ ہو تو اُمرتا پریتم کی کتاب ''رسیدی ٹکٹ'' منگوا کر پڑھ لو۔ امرتا اپنی کتاب تمہیں تو بنا کسی رسید کے بھی بھیج دے گی۔ سچ مچ بہت پیاری کتاب ہے اس کی شاعری کی طرح۔

شاید تمہارے ہی لیے تمہارے دوست شو کمار بٹالوی نے یہ مصرعے کہے تھے

شکھر دوپہر سر تے، میرا ڈھل چلیا پرچھاواں
قبراں اوڈیکدیاں، جیوں پُتراں نوں ماواں

(میرے سر پر پوری دوپہر کا سورج ہے اور میرا سایہ سکڑتا جا رہا ہے، قبریں، اسی پیار سے میرا انتظار کر رہی ہیں جیسے مائیں اپنے بیٹوں کا کرتی ہیں)

کشمیری لال ذاکر

کہانیاں بولتی ہیں

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ اس کی کہانیاں بولتی ہیں۔ وہ پڑھنے والے سے گفتگو کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بظاہر ہم عصمت کی کہانی کو پڑھ رہے ہیں لیکن ہم اس کہانی کی آواز بھی سن رہے ہیں۔ لیکن وہ سرگوشی کی سی آواز نہیں اونچی آواز ہے۔ جسے صرف پڑھنے والا ایک ہی فرد نہیں سن رہا بلکہ اس کے ذریعے بہت سے دوسرے افراد بھی سن رہے ہیں اور اپنا اپنا انفرادی ردِّعمل بھی بیاں کر رہے ہیں۔ عصمت چغتائی کے اپنے دوست بھی اس کی کہانیوں کی آواز سنتے تھے اور اس کے بارے میں اپنے ردِّعمل کا بھی اظہار کرتے تھے۔ کرشن چندر نے عصمت کی کہانیوں کے مجموعے ''چوٹیں'' کے دیباچے میں اپنے ردِّعمل کا یوں اظہار کیا

''عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگے ہیں—شرمندہ ہو رہے ہیں— آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔

یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔''

پطرس بخاری کا ردِّعمل کچھ اس طرح سے ہے

''جنس کے اعتبار سے اُردو میں کم و بیش انہیں (یعنی عصمت آپا کو) بھی وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانے میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔ گویا ادب کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ ہوتے ہیں۔''

عزیز احمد نے ''ٹیڑھی لکیر'' پڑھ کر اپنے ردِّعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا

''جسم کے احتساب کا عصمت کے پاس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے احساس۔ چنانچہ رشید سے لے کر ٹیلر تک بیسیوں مرد جو اس ناول میں آتے ہیں، سب کا

انداز ہ جسمی یا ذہنی احساس سے کیا گیا ہے۔ احساس عصمت کے یہاں احتساب مرد، احتساب انسان، احتساب زندگی، احتساب کائنات کا واحد ذریعہ ہیں۔''

سلمٰی صدیقی کا ردِّعمل بھی دیکھیے

''آپا کو جن لفظوں سے نفرت ہے ان میں ایک لفظ شوہر پرست یعنی پتی ورتا استری کا بھی اضافہ کر لیجیے۔ عورتوں کی اس صنف سے عصمت چغتائی کو ایسا بیر ہے کہ محض عصمت چغتائی کی تحریر کے آسرے پر عورتوں نے آج کل پتی ورتائیت کی قید سے رسّیاں تڑا کر مرد کے شانہ بشانہ چلنا شروع کر دیا ہے۔''

شاید ''پتی ورتا'' کے لفظ سے دُشمنی ہی ایک بڑا سبب ہے کہ شاہد لطیف سے شادی کے بعد صرف کچھ ہی مدت تک عصمت نے اپنی تحریروں پر عصمت شاہد لطیف تحریر کیا۔ اس کے بعد اُس نے پھر سے عصمت چغتائی لکھنا شروع کر دیا۔ وہ عصمت شاہد لطیف نہیں بلکہ عصمت چغتائی بن کر ہی زندہ رہیں اور عصمت چغتائی بن کر ہی دنیا کی محفل سے اُٹھ کر چلی گئیں۔

لیکن سعادت حسن منٹو نے جس انداز سے عصمت کو پرکھا اور اُس کی شخصیت اور فن کے بارے میں اپنے ردِّعمل کا اظہار کیا اس بھرپور انداز سے کسی اور ادیب یا نقاد نے نہیں کیا، بات کہنے کا منٹو کا ایک اپنا اسٹائل ہے اور اسی اسٹائل میں اُس نے عصمت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے

''عصمت کا قلم اور اُس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کرے گی تو کئی مرتبہ اُس کا دماغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔ باتیں کرے گی تو لفظ ایک دوسرے پر چڑھتے چلے جائیں گے۔ شیخی بگھارنے کی خاطر اگر کبھی باورچی خانے میں چلی جائیں گی تو معاملہ بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت ہی عجلت ہے اس لیے آٹے کا پیڑا بناتے ہی سکی سنکائی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آلو ابھی چھیلے نہیں گئے لیکن اُن کا سالن اُس کے دماغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے بعض اوقات وہ باورچی خانے میں قدم رکھ کر خیال خیال میں شکم سیر ہو کر لوٹ آتی ہو گی۔ اس حد سے بڑھی ہوئی عجلت کے مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی بچی کے فراک سیتے دیکھا ہے۔

اس کا قلم لکھتے وقت املا کی غلطیاں کر جاتا ہے لیکن منّی کے فراک سیتے وقت اُس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش بھی نہیں ہوتی۔ نپے تلے ٹانکے ہوتے ہیں اور مجال کیا جو کہیں بھول ہو۔''

عصمت چغتائی سے میری ذاتی ملاقاتیں بہت کم رہی ہیں۔ زیادہ تر میں نے اسے اُس کی تحریروں سے ہی پہچانا ہے۔ عصمت سے میرا ادبی تعارف ۱۹۴۲ء میں ہوا جب میں نے ''ادبِ لطیف'' میں اُس کی کہانی ''لحاف'' پڑھی۔ اس کہانی نے عصمت کو اوور نائیٹ مشہور بھی کر دیا اور بدنام بھی۔ ان دنوں میں نے بھی کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں اور مجھ میں کشمیر کے فیوڈل ازم کے خلاف حد بہ اُبھرنے لگا تھا جس کے زیرِ اثر اونچے گھرانے کی عورتوں کو بڑی ہی گھٹی ہوئی زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ لیکن میں ''لحاف'' میں بیاں کی گئی واردات سے ایک دم نا آشنا تھا۔ ''لحاف'' اگر کسی مرد افسانہ نگار نے لکھی ہوتی تو وہ شاید پڑھنے والے کو اس طرح نہ جھنجھوڑتی۔ کہانی چونکہ ایک خاتون نے لکھی تھی اور وہ بھی ایک مخصوص اسٹائل میں اور خوبصورت الفاظ میں اس لیے اس کا زیادہ اثر تو ہونا ہی تھا لیکن اس کہانی کا مجھ پر بڑا عجیب وغریب اثر ہوا۔ میں نے کئی برسوں تک سردیوں میں لحاف استعمال کرنا چھوڑے رکھا اور کمبلوں کو ہی استعمال کرتا رہا۔

لیکن منٹو نے لحاف کے بارے میں اور اس کے حوالے سے عصمت کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ دراصل عصمت اور منٹو میں ایک بات سانجھی تھی۔ وہ دونوں ہی چونکا دینے والی کہانیاں لکھنے میں یقین رکھتے تھے۔ شاید اسی لیے دونوں میں گہری دوستی تھی۔ سماج کے ایک مخصوص طبقے کی نظروں میں وہ مجرم تھے اور اُن پر نمائش کا الزام تھا۔ اگر دو بھگت اچھے دوست بن سکتے ہیں تو دو مجرموں میں دوستی کا رشتہ گہرا ہو جانا زیادہ حسبِ فائیڈ ہے۔ بہر حال ''لحاف'' کے بارے میں منٹو کا ردِّ عمل ملاحظہ کیجیے

''ایک مہینہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا۔ 'ادبِ لطیف' میں عصمت کا 'لحاف' شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے میں نے کرشن چندر سے کہا تھا۔ ''افسانہ تو بہت اچھا ہے لیکن آخری جملہ بہت ہی غیر صنّاعانہ ہے۔ احمد ندیم کی جگہ اگر میں ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔'' چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت سے کہا آپ کا افسانہ ''لحاف'' مجھے بہت پسند آیا۔ بیاں میں الفاظ کو بقدر کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں

خصوصیت رہی ہے لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار یہ جملہ لکھ دیا کہ 'ایک انچ اُٹھے ہوئے لحاف میں میں نے کیا دیکھا کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو میں کبھی نہیں بتاؤں گی۔'

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر نا گفتنی شے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے سخت نا اُمیدی ہوئی، اس لیے کہ میں "لحاف" کے تمام تر جزئیات کے متعلق اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل عورت نکلی۔"

عصمت زندگی بھر اس کوشش میں مصروف رہی کہ ہندوستانی سماج میں عورت کے اسٹیٹس کو اونچا کیا جائے۔ عورت کی زندگی کے پہلو اُس نے اپنی ابتدائی زندگی میں دیکھے تھے، اُن کا تأثر اُس کے ذہن پر مدتوں قائم رہا۔ اور اس شدید قسم کے تاثر نے اس سے کئی بڑی خوبصورت کہانیوں کی تخلیق کرائی۔ "گیندا" جسے وہ اپنی پہلی کہانی قرار دیتی ہے اپنے آپ میں بڑی مضبوط کہانی ہے۔ یہ عصمت کی کہانیوں کا آغاز تھا۔ اس کے بعد تو اُس نے ایک قسم کی تحریک شروع کردی اور ایک کے بعد ایک کہانی لکھی اور ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ جب تک سماج میں عورت کا اسٹیٹس اونچا نہیں ہوتا ہندوستان ترقی یافتہ ملک نہیں ہوسکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے دانشوروں نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے سوچنا شروع نہیں کیا۔ سماج میں ایک ایسا طبقہ اَب بھی موجود ہے جو ستی کی رسم کو جائز سمجھتا ہے، عورت کو تو خاوند کے ساتھ جل مرنا چاہیے۔ لیکن خاوند کو پورا حق حاصل ہے کہ بیوی کے مرنے کے چار ہی دن بعد کسی اور عورت کو گھر میں ڈال دے۔

نقاد کا ادب میں کیا رول ہے اس کے بارے میں اس کی رائے ہے کہ نقاد کسی بھی طرح تخلیقی عمل میں معاون ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثر تنقید نگار تو وہ لوگ ہیں جو تخلیقی کام میں ناکامیاب رہے اور ڈاکٹریٹ کر کے کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور دوسروں کے عیب نکالنے لگے۔ کاش ہم ادیب اور شاعر نقادوں کی طرف نہ دیکھیں بلکہ ان مسائل پر غور کریں جن پر لکھنا ضروری ہے۔ تخلیقی پروسیس کوئی ریل گاڑی نہیں جس کا انہی پٹریوں پر چلنا ضروری ہے جن کو ادب کے انجینئروں نے بچھایا ہے۔ تخلیقی سفر کے لیے ہر ادیب اپنے لیے اپنا ٹرانسپورٹ ایجاد کرسکتا ہے اور اسے اپنی سہولت کے مطابق استعمال میں لاسکتا ہے۔

عصمت چغتائی کی اکثر تحریریں آٹو بائیوگرافیکل ہیں۔ جو کردار اُس کی زندگی میں آئے وہ اُن کا بڑے دھیان سے مطالعہ اور مشاہدہ کرتی رہی۔ اور ایک دن وہ کردار اُس کی کہانیوں میں آ کر ہم سے ہم کلام ہونے لگے۔ وہ اسی زبان میں ہم سے گفتگو کرنے لگے جو اُن کی اپنی زبان تھی اور جسے وہ اپنی بات چیت میں استعمال کرتے تھے۔ کہانیوں کو تو چھوڑیے عصمت کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' خود اُس کا ثبوت ہے۔ اس میں تو عصمت چغتائی خود ایک بھرپور کردار ہے۔ اس قسم کے تجربے پنجابی ادب میں امرتا پریتم نے بہت کیے ہیں اور وہ بڑے کامیاب بھی رہے ہیں۔

ایسا نظر آتا ہے کہ اپنی عمر کے آخری کچھ سالوں میں اس کی خود اعتمادی کمزور ہونے لگی تھی۔ اسے جیسے انسیکیورٹی (Insecurity) کا احساس ہونے لگا تھا ورنہ وہ لکھنا نہ چھوڑتی اور رسم الخط کے بارے میں ایک آدھ ایسا بیان نہ دیتی جو کچھ عرصہ تک متنازعہ رہا اور آخر ایک ایسی اسٹیج پر آ گئی کہ عصمت کو خود اپنا بیان تبدیل کرنا پڑا۔

اتنی دلیر، بے باک اور بڑی ادیبہ عمر کے آخری سالوں میں اچانک اتنی تھک جائے گی اور اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے گی، اس کا مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔ لیکن عصمت چغتائی نے اپنے قلم سے اُردو ادب کو جو کچھ دیا اس پر ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

دراصل عصمت کی زندگی پر اس کے گھر کے ماحول کا بڑا گہرا اثر تھا۔ بہن بھائیوں کی اتنی بڑی تعداد میں اور چھوٹی ہونے کے کارن اُس میں احساسِ کمتری اور غیر محفوظ ہونے کا احساس جاگنے لگا تھا۔ اور اسی احساس نے اُسے بے باک اور منہ پھٹ بنا دیا تھا۔ اور کوئی نہ کوئی چونکا دینے والی بات کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے دوسروں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو جائے۔ دوسروں کی اٹینشن اپنی طرف کھینچنا رفتہ رفتہ عصمت کی کمزوری بن گئی اور اُس کی شخصیت میں یہ بات رچ گئی کہ کسی نہ کسی طرح کا ہنگامہ کیا جائے اور سیدھی سپاٹ زندگی نہ جی جائے۔ یہ لائم لائٹ میں رہنے کا احساس بھی بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔ یہ انسان کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ مشاہدے کی قوت کو زیادہ شدید کر دیتا ہے۔ ضدی پن اور بے باکی کو جنم دیتا ہے اور سمجھوتے کرنے سے روکتا ہے۔ مقابلہ کی حس زیادہ مضبوط کرتا ہے۔ اور شہرت پانے کی لالسا کو ضرورت سے زیادہ بڑھاتا ہے۔ اگر ہم عصمت کی شخصیت اور اس کے فن کا اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے جائزہ لیں تو یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ عصمت نے بچپن میں پروٹیسٹ کے طور پر کیوں کئی دنوں تک برت رکھا، اس نے کیوں ''لحاف'' جیسی کہانی لکھی۔ عظیم بیگ چغتائی پر ''دوزخی'' والا مضمون کیوں لکھا۔ کچھ عرصہ اپنے نام کے آگے شاہد لطیف لکھنے کے بعد اچانک

اُسے کیوں کاٹ دیا۔ اور جب فن کے سوتے سوکھنے لگے تو اُس نے اُردو کے رسم الخط کے بارے میں کنٹروورشیل بیان دینے کیوں شروع کر دیے۔ ''حسون'' فلم میں ایکٹنگ کیوں کی اور پھر وصیت میں کیوں لکھا کہ مرنے کے بعد اس کی لاش کو دفنانے کے بجائے مذرِ آتش کیا جائے۔ یہ وصیت عصمت نے اس لیے نہیں کی تھی کہ اس کو قبر کے اندھیرے سے خوف آتا تھا بلکہ وہ گمنامی سے ڈرتی تھی اور اس لیے کہ آگ کے شعلے اسے مرنے کے بعد بھی ''لائم لائٹ'' میں رکھیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ عصمت چغتائی جنم سے موت تک اس ایمبشن سے دُکھ پاتی رہی کہ دوسروں کی نظریں ہمیشہ اُس پر جمی رہیں اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہی۔

کشمیری لال ذاکر

آخری گواہی

نرگس دت

صابر بامحبت

بہت پریشاں ہوں آج کل۔

میری وہ شفیق ماں جس نے پچھلے تیس برسوں میں ہر کڑے وقت میں میرا ساتھ دیا تھا، چل بسی تھی۔ لس تم نہیں آسکے تمہاری اپنی مجبوریاں ہیں۔ میں اپنی ماں کا آنچل نہیں چھوڑ سکا، یہ میری مجبوری تھی۔ تمہیں یاد ہے میں نے اپنے ناول ''سیندور کی راکھ'' کا انتساب ماں کو کیا تھا

''ماں کے نام جو مجھے زندہ رکھنے کے لیے دن رات مرتی ہے۔''

وہ مجھے زندہ رکھنے کے لیے تیس برسوں تک ہر روز مرتی رہی لیکن میں اسے زندہ رکھنے کے لیے ایک بار بھی نہ مر سکا۔ وہ مر کر بھی جیت گئی۔ میں زندہ رہ کر بھی ہار گیا۔ ہار اور جیت کا شاید زندگی اور موت سے کوئی زیادہ سمبندھ نہیں۔

ذہن بہت اُلجھا ہوا ہے۔ کوئی بات ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ ابھی پرسوں تمہارا تار ملا کہ تمہارا ہیڈلوم ہاؤس کی اینکسی والا آفس آگ کی نذر ہو گیا ہے۔ سوچتا ہوں رہندر سیدی کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ اُسی روز تو ہم ماں کی راکھ جمنا کے پانی میں بہا کر آئے تھے۔ اُدھر تمہارا آفس جل رہا تھا اور ادھر ہم ماں کی گرم راکھ جمنا کے پانی میں بہا رہے تھے۔ ماں جس نے پچھلے تیس برسوں میں ایک دن کے لیے بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، اب ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ اور جب وہ آخری سانس لے رہی تھی تو میرے علاوہ سب اس کے قریب تھے۔ اُس وقت وہی اُس کے پاس نہیں تھا جو اُس کی محبت کا سب سے زیادہ دم بھرتا تھا اور جس کی خاطر اُس نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر رکھا تھا، میں اپنی جگہ رات بھر تڑپتا رہا۔ اور لمحہ بھر بھی نہ سو سکا اور مجھے اپنی اس حالت کا کوئی سبب بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن بعد میں جب ساری سچویشن کو سمجھنے کے قابل ہوا تو جانا کہ دراصل تو یہ ماں تھی جو مجھ سے دور زندگی کے آخری لمحوں میں تڑپ رہی تھی۔

میں تو صرف اس کی تڑپن کی خاموش گواہی دے رہا تھا۔

اور جانے ابھی کتنی بار ایسی اور گواہیاں دوں گا۔

جانے میرے کتنے سگے، دوست اور ساتھی زندگی اور موت کی آخری کشمکش میں تڑپیں گے اور میں تماشبین جانے اس درد اور اذیت کی گواہی دیتا رہوں گا۔

اور جب میں خود ان لمحوں میں سے گزروں گا تو شاید میرا کوئی بھی گواہ نہ تھا۔

ابھی پچھلے سال بھی تو ایک گواہی دے چکا ہوں۔

تیس مئی کو تمہارا خط ملا تھا

''نرگس بھابھی ہمیں چھوڑ گئیں۔''

برنچ کینڈی اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ میں ہمت اور دلیری سے لڑتی ہوئی بھابھی، دھیرے دھیرے زندگی کے محاذ سے پیچھے ہٹ رہی تھی۔ یہ خبر بھی مجھے برابر مل رہی تھی۔ میں نے بھابھی کی ایک مختصر سی سطر اور اس کے دستخط بھی پڑھے تھے۔ ایک انگریزی اخبار کے پہلے صفحے پر اس نے سائیں بابا کو مخاطب کیا تھا

''بابا اب مجھ سے یہ عذاب نہیں سہا جاتا۔

نرگس۔''

یہ ایک سطر ایک تیز نشتر کی طرح میرے دل میں اُتر گئی تھی اور میں جانے کب تک نشتروں کی تیز دھار اپنے دل میں اُترتی ہوئی محسوس کرتا رہا۔ جو پچھلے کئی مہینوں سے نیویارک کے اسپتال میں اس کے جسم میں پیوست ہوتے رہے تھے۔ اور میرا بھائی سنیل وارڈ کے باہر بیٹھا اس تمام درد کو خاموشی سے پی رہا تھا۔ اور تڑپ رہا تھا۔ کون سی چیز تھی جو اُس نے قربان نہیں کی تھی اپنی بیوی پر۔ اپنی خدمت، اپنے جذبات، اپنے دن رات، اپنا گھر بار، نرگس کے بغیر گھر کا تصور ہی کیا تھا۔ سنیل کے ذہن پر نرگس کی پرچھائیاں، سجو، پریہ اور نمرتا کی شکل میں تو ضرور اُس کے سامنے تھیں۔ لیکن وہ چاند یہ سب جس کی پرچھائیاں تھیں دھیرے دھیرے گہنائے جا رہا تھا۔ اس دم گھونٹنے والے لمحہ بہ لمحہ گہنائے ہوئے دھندلکے میں سنیل اکیلا ہی تڑپ رہا تھا۔ اس کے درد کا کوئی حصہ دار نہیں تھا۔ اسی طرح جیسے اسپتال کے ایک وارڈ کے اندر نرگس اکیلے ہی اس تمام اذیت کو سہہ رہی تھی۔ جو اُس کی مہلک بیماری نے اُس پر مسلط کر رکھی تھی۔

درد کا شریک شاید کوئی بھی نہیں ہوتا۔

درد ہمیں اکیلے ہی سہنا پڑتا ہے۔ اپنی صلیب خود ہی اُٹھانی پڑتی ہے اور اپنے ہاتھوں میں کیل بھی

حود ہی گاڑنے ہوتے ہیں۔

درد اکیلا ہے اس کا کوئی اثر نہیں۔

درد کی صرف گواہی دی جا سکتی ہے۔ اسے بھوگا نہیں جا سکتا۔

لیکن اتنی بڑی عدالت میں ہم بے کسوں کی گواہی بھی کیا معنی رکھتی ہے؟

پھر بھی ہم گواہی دیتے ہیں۔

کہ اس سے ہمیں تسکین ملتی ہے۔

ہمیں اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔

ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ہم زندہ ہیں۔

ایک گواہی اور بھی دے چکا ہوں ابھی چند برس پہلے۔

سنیل کے کزن اشوک نے جمانگر سے ٹیلی فون کیا تھا۔ منگلا بوا کا انتقال ہو گیا تھا۔ مجھے فوراً منڈ ولی ملایا تھا کیونکہ سنیل اپنی ماں کی ڈیڈ باڈی لے کر اگلی صبح ہوائی جہاز سے دہلی پہنچ رہا تھا اور وہاں سے ڈیڈ باڈی منڈولی لا رہا تھا۔ اس کے جسم کی مٹی اس دھرتی میں ملنے والی تھی جس دھرتی نے اُسے پاکستان بننے کے بعد محبت اور ستکار سے قبول کیا تھا۔ بہت صدمہ ہوا یہ سن کر جب میں نے ماں کو یہ خبر دی تو وہ چیخ اُٹھی۔

منگلا بوا اور میری ماں سندھ بھابھی تھیں۔ دونوں میں کتنا پیار تھا، اس کے گواہ صرف میں نہیں خاندان کے سبھی افراد ہیں۔ دونوں جب کبھی ملتیں تو آدھی آدھی رات تک جاگ کر جہان بھر کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو کسی دوسرے کی نظر میں شاید بیکار تھیں۔ یادوں کی پوٹلی کھول کر تمام رات اس میں سے یادوں کے ٹوٹے ہوئے آئینوں کی مہین مہین کرچیاں نکالتی رہتیں اور اپنی انگلیوں کے پوروں کو لہولہان کرتی رہتیں۔ بیگا بانیاں (مائیکے کا گاؤں کی باتیں خرو چٹالہ (سسرال کا گاؤں) کی باتیں، منڈولی گاؤں کی باتیں۔ اپنے بھائیوں اور اُن کے بچوں کی باتیں۔ بلّے (سنیل دت) کی باتیں۔ نرگس کی باتیں اور پھر دونوں ہی نرگس کی تعریف کے پُل باندھنے لگتیں۔

ابھی پچھلے سال نرگس بچے کو ملنے سناور جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے چنڈی گڑھ رُکی اور مجھے ملنے گھر آئی۔ میرے پاؤں چھو کر جب گلے ملی تو سگھڑ بہو کی طرح سب کچھ بھول کر میری ہو گئی۔

''پرمیشوری بہن، اس نے تو ہمیں اس طرح اپنا لیا ہے کہ ایک بار بھی ایسا نہیں لگتا کہ بلّے نے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کی ہے اور وہ بھی فلموں میں کام کرنے والی لڑکی سے۔''

میں ساتھ کے کمرے میں جاگ رہا تھا اور دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ جھٹ سے بولا۔ ''آپ دونوں جھوٹ بول رہی ہیں۔'' اور یہ کہتے ہوئے اس کے کمرے میں آگیا۔ دونوں ایک ہی پلنگ پر بیٹھی اپنے میں مست تھیں۔ ''تم کیوں جاگ رہے ہو اَب تک۔'' منگلا نوانے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ رات بھر کیا کرتی رہتی ہیں۔''

''ہُن دیکھ لیا ای۔'' ماں نے پوچھا تھا۔

''ہاں، اب تو نرگس کی تعریف کے پل باندھے جا رہے ہیں اور جب سنیل نے اُس سے شادی کی تھی تب تو دونوں ان کے ساتھ ساتھ مجھے بھی کوستی تھیں۔''

''او پرانی گل ہے۔'' منگلا نوانے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں اس بات کی بھی گواہی دے سکتا ہوں کہ اگر میں نے اپنے خاندان میں کوئی ایسی دو عورتیں دیکھی ہیں۔ جن کے میں نقش اور ہنسی نے مجھے متاثر کیا تھا تو وہ میری ماں پرمیشوری دیوی اور میری نوا منگلا تھیں۔ ہائے کیا ہنسی تھی دونوں کی! ایک دم جادو ہی کر ڈالتی تھیں دوسروں پر! اور یہ بھی اتفاق تھا کہ اس پرانی نسل کے ساتھ اپنی ہنسی کا جادو جگانے کے لیے نئی پیڑھی کی ایک اور خاتون بھی اس کے گروپ میں شامل ہو گئی، جس کا نام تھا نرگس! اور جس نے اپنے لیٹر ہیڈ پر مسز نرگس سنیل دت چھپوا رکھا تھا۔ مجھے جب بھی اُس نے خط لکھا خط کے نیچے اپنے نام کے بجائے بھابھی ہی لکھا۔ سبز سیاہی میں بولڈ حروف میں لکھا ہوا ''بھابھی'' کتنا پیارا لگتا تھا۔ کس طرح جوڑ دیا تھا اُس نے اپنے آپ کو ایک ایسے خاندان کے ساتھ جو لڑاکو برہمنوں کا خاندان ہے۔ موہیال برہمنوں کا خاندان، جس خاندان کے اکثر افراد یا تو فوج میں ہیں یا پولیس میں، فن کاری اور پڑھائی لکھائی جن کے بس کی بات نہیں۔ اگر مجھے کہیں کوئی موہیال آرٹسٹ یا ریسرچ اسکالر مل جائے تو میں ایک بار تو اچنبھے میں آ جاتا ہوں، یہ جیو اپنی ڈار سے کیسے بچھڑ گیا ہے؟ کہیں پچھلے جنموں کا سنسکار رہوگا۔ شاید تم بھی (مائی ڈیئر صابر دت) اپنی ڈار سے بچھڑے ہوئے ہی ایک جیو ہو۔

اور پھر اگلی صبح سنیل اپنی ماں کی ڈیڈ باڈی کو ایک تابوت میں حفاظت سے رکھوا کر منڈولی گاؤں میں پہنچ گیا۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں بیر بہوٹیاں بنی ہوئی تھیں اور اس کے ساتھ نرگس سفید ساڑی میں ڈھکی ایک دم مضمحل اور نڈھال، چہرہ ستا ہوا، آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئیں۔ سنیل جب میرے گلے سے لپٹ کر سسکا تو نرگس بھی سسک اُٹھی اور میرے کندھے سے لگ گئی۔ مجھے لگتا ہے کہ اُس کے آنسوؤں کی نمی آج تک بھی میرے کندھے پر سلگ رہی ہے۔ بچے اور اُس کی بہنیں سوم اور اس کی بیوی پنیت سبھی غم زدہ تھے۔ اور اُن کے ساتھ ہریانہ کے ردیک کے علاقوں سے آئے ہوئے سینکڑوں لوگ تھے اور ہریانہ

سرکار کے نمائندے بھی جو ہم سب کے غم اور درد کے شریک تھے۔ اور جب منگلا لوا کی اَرتھی، اس کے گھر کی ڈیوڑھی سے نکلی تو اُس وقت سنیل اور نرگس کی حالت دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔

سنیل نے جمنا پل کے ساتھ دریا کے کنارے اپنی ماں کا چتا نائے کے لیے خود جگہ چنی تھی اور اب کئی فرلانگ لمبی سڑک پر ننگے پاؤں ماں کی ارتھی اُٹھائے خاموش اور نڈھال اس کی آخری منزل کی طرف رواں تھا۔ سینکڑوں لوگوں سے گھری ہوئی جمنا کے کنارے کی ریت پر بنی چتا کو جب سنیل نے آگ دی تو بھیڑ پر موت کی سی خاموشی طاری تھی اور سنیل کی سسکیاں اس خاموش فضا میں اُبھر رہی تھیں۔ سوم اور سبھی اور سبھی عزیز اور رشتہ دار اپنی اشک بھری آنکھوں سے منگلا لوا کو عقیدت کے پھول پیش کر رہے تھے۔

اور پھر سنیل ننگے پاؤں واپس گھر پہنچا۔ اس کے پاؤں میں دریا کنارے پر اُگی جھاڑیوں کے کانٹے ٹوٹ گئے تھے جن کی کسک تو شاید دوسرے بھی محسوس کر سکتے تھے لیکن جو کانٹا اُس کی روح میں چبھا وہ کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس ٹوٹے ہوئے کانٹے کی نوک پر نگاہ بھی صرف نرگس بھابھی کی پڑی تھی۔ کانٹا صرف سنیل کی روح ہی میں نہیں اس کی روح میں بھی تو چبھ کر ٹوٹا تھا۔ خون کے آنسو صرف سنیل ہی نے نہیں بہائے تھے نرگس بھی تو بہا رہی تھی۔ اپنے تلوؤں میں ٹوٹے ہوئے کانٹے لیے سنیل منڈولی گاؤں کے باہر اس فقیر کی قبر پر تیل چڑھانے گیا۔ جو فقیر جانے کب سے گاؤں کی حفاظت کرتا چلا آ رہا تھا، لیکن آج اُس نے تحفظ کا ہاتھ اُس کی ماں کے سر سے اُٹھا لیا تھا اور اُس کی ماں مر گئی تھی۔ اور وہ ایک دم یتیم ہو گیا تھا۔ ایک دم بے سہارا اور بے خانماں۔

میں اور ماں، منگلا لوا کے انتم سنسکار کے بعد جب منڈولی سے چنڈی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے تو وہ ایک دم خاموش تھی۔ جیسے اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ جس کے ساتھ وہ رات رات بھر جاگ کر باتیں کیا کرتی تھی وہ تو اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ میرے کئی بار کوشش کرنے کے باوجود راستے بھر ماں نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی اور ہم دونوں چنڈی گڑھ پہنچنے تک اپنے اپنے اندر سلگتے ہوئے الاؤ کی آگ میں خاموش جلتے رہے۔

مجھے ایک واقعہ کی یاد اس وقت بہت رُلا رہی ہے۔

سنیل اور نرگس کی شادی کو ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ ان دنوں سنیل دت پی ایسی روڈ کے اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا جس میں اب سوم دت رہ رہا ہے۔ سنیل کی چھوٹی بہن رانی بھی اُن دنوں وہیں تھی۔ میں بھی گیا تھا دو ایک روز کے لیے۔ رانی نے مجھے بتایا تھا کہ کچھ حصہ پہلے جب وہ اسپتال میں داخل تھی تو نرگس نے کیسے جی جان سے اُس کی خدمت کی تھی۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن سنیل اور

نرگس "مدر انڈیا" کے بعد ذہنی طور پر شادی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ شاید اتوار کا دن تھا، سنیل فارغ تھا۔ نرگس اور سنیل مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر وہ تمام جگہیں دکھاتے رہے جہاں شادی سے پہلے وہ جایا کرتے تھے۔ ہم ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔

"جب آپ کو معلوم ہوا کہ سنیل مجھ سے شادی کر رہا ہے تو آپ کو کیسا لگا تھا بھائی صاحب؟" نرگس نے سوال کیا اور اُس کی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"میں نے سوچا تھا کہ وہ غلطی کر رہا ہے۔"

میرے اس جواب پر نرگس کا چہرہ ایک دم اُتر گیا۔ اتنی عظیم عورت اور اتنی عظیم فنکارہ جس کے لیے میرے دل میں بڑی عزت تھی، ایک چھوٹی سی بات کو اتنی سنجیدگی سے لے گی، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

مجھے بہت دکھ ہوا، پیشتر اس کے میں کچھ کہتا۔ نرگس نے دوسرا سوال کیا۔

"اور اب؟" نرگس کا چہرہ ایک بہت بڑا سوال بن گیا تھا۔

"اور اَب میں سمجھتا ہوں کہ بھابھی تم نے غلطی کی ہے۔"

میرا یہ جواب سن کر نرگس کھلکھلا کر ہنسی اور اُس کی ہنسی کی بوچھار میں سنیل اور میں بہت دیر تک بھیگتے رہے۔ اور پھر سنیل نے مجھے بتایا کہ شادی کے بعد جب نرگس اُس کے گھر آ گئی تھی تو نرگس کے بھائی اُس کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتے تھے۔

"ایک دن نرگس کے بڑے بھائی نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں اپنے باپ کی اولاد ہوں تو رات کے بارہ بجے چوپاٹی پر آ جاؤں۔"

"تم نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا کرنا چاہیے تھا آپ بتایئے؟"

"تمہیں جانا چاہیے تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اور ہماری بیوی مسز نرگس دت ہمیں روکتی رہی اور اصرار کرتی رہی کہ ہم آدھی رات کو چوپاٹی پر نہ جائیں۔"

"یہ بھابھی کا فرض تھا۔"

"تو اب آپ نے اس کی طرفداری شروع کر دی۔" سنیل نے نرگس کی طرف اشارہ کیا۔

"تم تو چاہتے ہو کہ سب تمہاری طرفداری کریں، اور تمہاری ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔" یہ نرگس کا کمینٹ تھا۔

''تم چوپاٹی پر گئے کہ نہیں۔ یہ بتاؤ؟''

''گیا تھا بھائی صاحب، اپنی گن ساتھ لے کر گھنٹہ بھر چوپاٹی کی۔ ریت پر گھومتا رہا، لیکن کوئی سالا نہیں آیا مجھے للکارنے۔'

''سالے کم ہی للکارتے ہیں۔'' میرے اس کمینٹ پر سنیل زور سے ہنسا اور پھر نرگس بھی ہنسنے لگی، ہنسی اور قہقہوں کی یہ بارش بہت دیر تک ہوتی رہی۔

اُس شام مجھے واپس آنا تھا۔

چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں اپنا اٹیچی کیس ایک طرف رکھے میں کھڑا تھا اور میرے ساتھ سنیل تھا، اور سامنے رانی اور نرگس کھڑی تھیں۔ میں نے رانی کو گلے سے لگاتے ہوئے دس دس کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں دیے، ہمارے یہاں رواج تو ہے ہی کہ بڑا بھائی اپنی بہن کو اپنی توفیق کے مطابق کچھ نہ کچھ دیتا ہے جب بھی وہ اس سے ملے۔

نرگس نے جھک کر میرے پاؤں چھوئے، لیکن مجھے لگا اُس کی آنکھوں میں ایک ہلکے سے دُکھ کی پرچھائیں تیر رہی تھی۔ مجھے ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا میں نے اُسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا۔

''بھابھی تم جیسی عظیم فنکار کو دینے کے لیے مجھ سے غریب ادیب کے پاس کچھ بھی نہیں؟'' اور ساتھ ہی کانپتے ہاتھ سے دس دس کے دو نوٹ پیش کیے۔ اس نے بڑی محبت سے اُن نوٹوں کو لیتے ہوئے جواب دیا۔

''بھائی صاحب! یہ بیس روپے میرے لیے بیس لاکھ کے برابر ہیں۔ اس رشتے سے آپ کے علاوہ خاندان میں اور کون مجھے اس طرح کچھ دے گا۔''

اس کا جواب سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور پھر نرگس، سنیل، رانی سب مجھے چھوڑنے آئے۔ میں اپنی جھولی میں جو محبت اور خلوص لایا تھا، اس میں نرگس بھابھی ہر بار کچھ نہ کچھ ڈالتی رہی۔ اور میں اُسے سنبھالتا رہا۔ اب کون میری جھولی میں محبت، خلوص، پیار اور دوستی کے تحفے ڈالا کرے گا؟

نرگس بھابھی کی جگہ کون لے سکتا ہے؟

کوئی بھی تو نہیں۔

میری جھولی اب بھرے گی نہیں، خالی تو ہوتی رہے گی کہ یہی انسان کا مقدر ہے! اور اب ایک

آخری گواہی دے رہا ہوں صابر!

اور یہ گواہی سینکڑوں میل دور رہ کر دے رہا ہوں۔ اپنی آنکھیں بند کر کے۔ بند آنکھوں کے پردوں پر پرچھائیں کی طرح لرزتا ہوا ایک منظر دیکھنے کے بعد کوئی شخص کسی حادثہ میں اچانک اندھا ہو جائے اور پھر تصور کرے کسی گھٹنا کا جس کا ذکر صرف وہ سن رہا ہے اسے دیکھ نہیں رہا۔

''دردکارشتہ'' فلم کا پریمیر ہوگا۔

سنیل نے پچھلے ایک برس سے زیادہ عرصہ میں ذہنی طور پر جس درد کو بھوگا ہے اُسے وہ ایک تخلیقی کارنامے کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے، میری اطلاع کے مطابق وہ اس فلم سے ہونے والی پوری آمدنی اسپاسٹک سوسائٹی کے لیے وقف کر دے گا۔ فلم کی کہانی بھی تو اُسے نرگس بھابھی نے ہی دی تھی۔ امریکہ میں علاج کرانے کے بعد جب وہ ہندوستان آنے والی تھی تو اُس نے گفتگو کے دوران سنیل سے کہا تھا کہ وہ ہندوستان واپس آکر میڈم گاندھی سے بات کرے گی کہ ہندوستان میں جدید ترین عصری سازوساماں سے لیس ایک کینسر ہاسپٹل قائم کریں، اسے اس بات کا دُکھ تھا کہ کینسر کے ایک عام ہندوستانی مریض کو وہ تمام سہولتیں میسر نہیں آسکتی تھیں جو اُسے امریکہ میں ملی تھیں، کیونکہ ایک عام ہندوستانی اتنے زیادہ اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔

کاش نرگس اس سلسلے میں میڈم اندرا گاندھی سے بات کر سکتی!

بہت سے 'کاش' مل کر ہی تو انسانی زندگی کا المیہ بناتے ہیں۔

فلم کے پریمیئر کے موقع پر سنیل خوش بھی ہوگا، مسکرائے گا بھی، آنے والے مہمانوں کا گرمجوشی سے استقبال بھی کرے گا۔ لیکن جب اسٹیج پر کھڑے ہو کر 'دردکارشتہ' اور اُس کی کہانی کے بارے میں کچھ کہنا چاہے گا تو اُس کی زبان کٹ جائے گی صرف اس کے سلگتے ہوئے آنسو ہی بولیں گے، وہ نہیں بول پائے گا۔

اور جب زبان کٹ جاتی ہے۔

اور ہونٹ سل جاتے ہیں۔

اور زخم کھل جاتے ہیں۔

اور سلگتے ہوئے آنسو آنکھوں کی پتلیوں کو جھلس کر باہر اُبل پڑتے ہیں تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟

دل و دماغ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، ایک زلزلہ جاگ اُٹھتا ہے، اور ایک اور ارتھی اُٹھتی ہے جسے کوئی نہیں دیکھتا کیونکہ وہ دل کے نہاں خانے میں جلتی ہے اور لکڑیوں کی جگہ جذبات سلگتے ہیں اور

احساس جلتا ہے اور بھاؤنائیں جلتی ہیں اور جب گرم گرم راکھ ہوا کے کسی جھونکے کے کارن چتا کے گہرے دھوئیں سے الگ ہو کر آنکھوں کے پپوٹوں پر جم جاتی ہے اور سلگتی ہے تو تب ہی "درد کا رشتہ" مضبوط ہوتا ہے۔

سنیل کا، بنجے کا، پریہ اور نمرتا کا، رانی کا، سوم اور اُس کے بچوں کا، میرا اور تمہارا رشتہ اب مضبوط ہوگا کہ درد کے رشتے اسی طرح مضبوط ہوتے ہیں۔

اور یہ میری آخری گواہی ہے۔ خاموش اور بے زبان گواہی جو کسی عدالت میں پیش نہیں ہوگی کہ درد کی کوئی عدالت نہیں ہوتی !!

جناب کشمیری لال ذاکر ایک کہنہ مشق ادیب اور اُردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ وہ اُردو کے ایک سچے اور بے لوث خادم ہیں۔ اور آج کے دَور میں ان اعلیٰ اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا تذکرہ اب بے وقت کی راگنی سمجھا جاتا ہے۔ ہواؤں کے تیزی سے بدلتے رُخ میں اپنا چراغ جلائے رکھنا بڑی ہمت کا کام ہے جبکہ بہت سے اُردو ادیبوں نے اس زبان میں لکھنا ہی ترک کر دیا ہے۔ اور دوسرے زیادہ منفعت بخش سبزہ زاروں کی طرف چلے گئے۔ ذاکر صاحب نے نہ صرف خود لکھنا بلکہ دوسروں کو اُردو میں لکھنے کی ترغیب دی۔ ہریانہ اُردو اکادمی کے ذریعے انہوں نے ایک بار پھر جمنا تٹ کے اس علاقے میں اُردو کے پودے کی آبیاری کی۔ مَیں نے اس اکادمی کے ریڈنگ روم میں چند بزرگ پنجابی اور مقامی حضرات کو اُردو رسالوں میں منہمک دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ اب اُردو کا مطالعہ بھی اس طرح کیا جائے گا جس طرح گنتی کے چند لوگ اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر فرنچ سیکھ لیتے ہیں۔

۔۔قرۃ العین حیدر

بشر نواز

وہ جس خلوص سے نکھرا ہے، کون نکھرے گا

میں کشمیری لال ذاکر کو اس زمانہ سے جانتا ہوں جب میں نے پہلے پہل وادیِ ادب میں قدم رکھا تھا اور ہر چھپی ہوئی چیز کو ''عظیم'' سمجھتا تھا۔ وقت اور مطالعے کے ساتھ ساتھ یہ راز مجھ پر منکشف ہوا کہ پکی روشنائی سے مزین ہر تحریر عظیم تو کیا کبھی کبھی ادب کا درجہ پانے کی بھی مستحق نہیں ہوتی۔ رسائل و جرائد کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ چیزیں ''بھرتی'' کرنی ہی پڑتی ہیں۔ یہ چیزیں کچھ ایسی ہوتی ہیں جیسے دیدہ زیب اور شاندار صوفے کے متاثر کن ریگزین کے نیچے میلی کچیلی روئی اور فوم کے بے کار ٹکڑے بھر دئے جاتے ہیں کہ کوئے کھدرے بھرے بھرے معلوم ہوں۔ ہر پڑھنے والے کو یہ تجربہ ہوتا ہوگا۔ میں جب اس تجربے سے دوچار ہوا تو کئی لکھنے والوں کا یا یوں کہئے ان کا جنہیں میں بڑا یا اہم لکھنے والا سمجھتا تھا بھرم ٹوٹ گیا۔ صرف چند ہی ایسے فنکار ملے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ میرے ذہن میں یعنی اپنی شبیہ کو برقرار رکھا بلکہ اس کے حسن کے ان ڈھکے چھپے گوشوں کو بھی آشکار کیا جو میری نظر سے چھپے ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ جن فنکاروں کی قدر و قیمت بڑھتی گئی ان میں ایک نام کشمیری لال ذاکر کا بھی ہے۔ ''سینی ٹوریم'' سے ''سیندور کی راکھ'' تک ذاکر کے فن نے کتنے ہفت خواں طے کئے اس کا حساب کتاب میرے دائرہ تحریر سے باہر ہے۔ میں یہاں صرف ان کی شاعری سے بحث کروں گا۔

ہمارے ہاں یہ عجیب رویہ راہ پا گیا ہے کہ ہم کسی لکھنے والے کو صرف ایک ہی صنف سے متعلق کر دیتے ہیں مثلاً اگر کوئی شخص تنقید کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھنے لگے تو اس کے افسانے ناقابل توجہ ٹھہریں گے۔ یا کوئی لکھنے والا افسانے کے ساتھ شعر بھی کہے تو اس کی کوئی ایک حیثیت مشکوک قرار دے دی جائے گی گویا ہم فن کو شخصیت کے اظہار کے بجائے اصناف کو برتنے کے سلیقے سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو مانیں نہ مانیں لیکن اس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بہ یک وقت کسی لکھنے والے شاعری اور افسانہ نگاری کو چھوڑیئے ناول اور افسانوی تخلیق سے بھی پوری طرح انصاف نہیں کر پاتے۔

کشمیری لال ذاکر کا معاملہ یہ ہے کہ یہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے نہ صرف جانے پہچانے جاتے ہیں بلکہ ایک اہم مقام بھی رکھتے ہیں اور خوش قسمتی سے ناول نگار کی حیثیت سے بھی اپنے فن کو

منوا چکے ہیں۔ ذاکر کے نام کے ساتھ جہاں "جوہڑ"، "سگنل"، "تخلیق" اور "موت" جیسے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے وہیں "سیندور کی راکھ" بھی ذہن کے اُفق پر جگمگانے لگتی ہے۔

ذاکر کا بنیادی مسئلہ اپنے اظہار کا ہے۔ وہ اپنے تجربات کو زندگی کے واقعات اور گزرتے روز و شب کو اپنی ذات پر جھیلتے ہیں لیکن اس کا اظہار بے محابہ، راست یا اخباری رپورٹ کی طرح نہیں کرتے بلکہ اس میں اپنے تخیل کی چاشنی اور نقطۂ نظر کی روشنی شامل کر دیتے ہیں۔ زندگی کے تعلق سے اس کا شخصی رویہ اس تحریروں میں ایک زیریں لہر کی طرح کارفرما نظر آتا ہے اور اس کے لفظوں، جملوں اور شعروں کے بطون سے جھلکتا رہتا ہے۔ ذاکر کی تخیل پسندی اور دردمندی ان کے افسانوں کی بھی پہچان ہے اور شاعری کی بھی۔ وہ افسانوں میں بھی اور شاعری میں بھی اپنی ذات کی روشنی میں چلنے کے قائل ہیں اور چونکہ انکی ذات میں ایک قسم کی رومانویت قدرِ اول کی چیز ہے اس لئے ان کی تحریر بھی خواب میں ڈوبی ڈوبی لگتی ہے۔ کچھ اندھیرے کچھ اُجالے کا سا سماں، کچھ ہلکی ہلکی کسک اور کچھ نازک و شفاف آبگینوں سے پھوٹتی ہوئی رنگ برنگی روشنیاں ذاکر کے اشعار کو ایک ایسی کیفیت سے دوچار کرتی ہیں جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں احساس کی شدت نہیں تہذیب ملتی ہے۔ وہ واقعات کو من و عن پیش کرنے کے قائل نہیں انہیں اپنی شخصیت کی مناسبت سے تراش خراش کر پیش کرتے ہیں۔ یہ فنکار کے رد و قبول کا بھی مسئلہ ہے اور اس کی ترجیحات کا بھی۔

میں واقعات کو اتنا تراش دیتا ہوں
فسانے ہوتے نہیں ہیں فسانے لگتے ہیں

حقیقت کو فسانے تک پہنچانے کے عمل میں شاعر کی شخصیت بھی کارفرما ہوتی ہے اور ذہنی تربیت بھی۔

کشمیری لال ذاکر کا شعری ذوق آثر لکھنوی جیسے زبان و بیان کے ماہر کے زیر سایہ پروان چڑھا پھر انہوں نے اُردو کے کئی ایسے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا جن کے نزدیک حسن بیان شاعری کی بنیادی صفت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذاکر کے ہاں نہ زبان کا کوئی جھول نظر آتا ہے نہ بیان کا الجھاؤ۔ ان کے اشعار سہل ممتنع کی سرحدوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔

تیرا تو انتظار رہا مجھ کو رات بھر
میرا بھی انتظار ہے اب جا رہا ہوں میں

☆

پہلے آداب پرستش تو سکھادو مجھ کو
تم اگر چاہو تو پھر میرے خدا ہو جانا

☆

کسی کے ساتھ کوئی آدمی نہیں ہوتا
کسی کے ساتھ سفر میں زمانہ ہوتا ہے

زبان واظہار کی سادگی کے باوجود ذاکر کے اشعار یک سطحی یا محض اطلاعاتی نہیں ہوتے بلکہ ان میں تہہ داری اور رمزیت کی وہ کیفیت بدرجہ اتم ہوتی ہے جو اردو غزل کی پہچان ہے۔ ذاکر غزل کے مزاج داں ہیں اس لئے تلخ سے تلخ بات کرتے ہوئے بھی ان کا لہجہ نرم اور سجل رہتا ہے۔ وہ زندگی کی کھردری حقیقتوں کو فنی سطح تک لانے پر قادر ہیں۔ اس سلسلے میں الفاظ اور صوتی آہنگ ان کے سب سے بڑے ہتھیار ہیں۔ وہ بے رحم سچائیوں کے اظہار کے لئے زبان کے ساتھ بے رحمی سے پیش آنے کے قائل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ زندگی کی آلودہ حقیقتوں کو بھی فنی شفافیت عطا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس ہیئت یا زباں کے ظاہری روپ میں کوئی اجنبی تجربہ نظر نہیں آتا۔ البتہ معنوی اعتبار سے ان کے اشعار ایسے تجربوں سے دوچار کرتے ہیں جو حسی اور تخیلی سطح پر نئے بھی ہیں اور ہم عصر زندگی کے آئینہ دار بھی۔

تاریک مکانوں سے اُبھرتے ہوئے سائے
سورج کو بھی آنگن میں اترنے نہیں دیتے

☆

احباب کی خاطر تو میں سُولی پہ چڑھا ہوں
احباب ہی سولی سے اُترنے نہیں دیتے

☆

اپنے پہلو میں پڑا ڈھونڈ رہا ہوں خود کو
میرے اس کرب کو کس آنکھ سے دیکھا جائے

☆

لٹکنا ہوتا ہے خود ہی وفا کی سُولی پر
پھر اپنی لاش کو خود ہی اُٹھانا ہوتا ہے

یہ تمام اشعار آج کی زندگی کے عکاس ہیں۔ ان میں آج کے انسان کی دردناک صورت حال سے بھی واسطہ پڑتا اور اس کرب سے بھی گزرنے کا احساس ہوتا ہے جو ہر حساس ذہن کا مقدر ہے۔ بکھرتی ہوئی قدریں انسانی رشتوں کا ٹوٹنا، گاؤں کو نگلتے ہوئے شہر، اپنے باطن میں خود کو تلاش۔ غرض یہ وہ موضوعات ہیں جو آج کی زندگی کی دین ہیں اور اسی لئے آج کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ذاکر کی خصوصیت یہ ہے کہ اول تو وہ ان موضوعات میں اپنی شخصیت کو شامل کر کے ان کے خارجی پن کو داخلیت میں بدل دیتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان سے عہدہ برآ ہوتے وقت بھی وہ جذباتیت کا شکار ہو کر تو تراخ پر نہیں اُتر آتے اور تیسری اور زیادہ اہم بات یہ کہ وہ یہیں رک نہیں جاتے۔ منظر میں ایسے محو نہیں ہوتے کہ اس سے ماورالنظر ہی نہ جا سکے۔ وہ زندگی کی مثبت اقدار اور انسان کی وجودی نیکی پر یقین رکھتے ہیں اور چونکہ انسان کم از کم اب تک کائنات کا مرکزی کردار ہے اس لئے وہ نہ کائنات سے مایوس ہیں نہ انسان سے۔ انسان کی سرشت میں (ہزار برائیوں اور نفرتوں کے باوجود) محبت اصلاحی جوہر کا درجہ رکھتی ہے اس لئے ہر دردِ لاعلاج کی دوا بھی محبت قرار پاتی ہے۔ یہ محبت دو انسانوں تک محدود نہیں بلکہ اس کے دائرہ عمل میں پوری انسانیت اور آگے بڑھ کر پوری کائنات آجاتی ہے اور ایک فرد کو خود کے دُکھ درد سے بے پیار کر کے پوری انسانی برادری سے جوڑ دیتی ہے۔ ذاکر تصوف یا بھگتی کے قائل ہوں نہ ہوں لیکن ان کا رویہ، ان کی دردمندی، بے نیازی اور شر میں بھی خیر کا پہلو دیکھنے کا انداز اُنہیں سنتوں صوفیوں سے قریب کر دیتا ہے۔

پھر اس کے بعد پرندے ادھر نہیں آتے
بس ایک بار انہیں گھر بنانا ہوتا ہے

☆

حسن کا افسانہ بہت اچھا لگا انجام پر
اس کے افسانے کی ذاکر ابتداء اچھی نہ تھی

یہی رویہ ان میں اور کائنات میں فرد اور غیر فرد میں یگانگت کا رشتہ استوار کرتا ہے۔ فرد و کائنات کی دوئی مٹ جاتی ہے اور ایک ایسی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے منفی پہلو کی نفی کر کے اس کے اثباتی اور رجائی پہلو کو نمایاں کرتی ہے۔

مجھ میں جو کچھ اچھا ہے سب اس کا ہے
میں نے جو کچھ لکھا ہے سب اس کا ہے

اس کا میرا رشتہ بڑا پُرانا ہے
میں نے جو کچھ سوچا ہے سب اس کا ہے

یہ ہم آہنگی دو افراد (عاشق و معشوق) کی بھی ہے۔ بندے اور خدا کی بھی ہو سکتی ہے اور فرد و کائنات کی بھی۔ میں آخری امکاں کو ترجیح دوں گا کہ فرد و کائنات میں تمام رشتے خود بخود سمٹ آتے ہیں۔ فرد و کائنات کی یہ ہم آہنگی شاعری میں زندگی کا ایک ایقان اور جینے کی ایسی امنگ پیدا کر دیتی ہے کہ اس کے چراغوں کو آندھیوں کا خوف ہوتا ہے نہ اس کے حوصلوں کو شکست کا غم۔ ہر شکست اس کے لئے ایک نئے عزم کی بنیاد فراہم کرتی ہے اور ہر جھونکا اس کے چراغ کی لو کو اُکسانے کا سبب بنتا ہے۔

یہ اور بات کہ آگے ہوا کے رکھے ہیں
چراغ جتنے ہیں سارے جلا کے رکھے ہیں

انہیں فسانے کہو، دل کی داستانیں کہو
یہ آئینے ہیں جو کب سے سجا کے رکھے ہیں

کشمیری لال ذاکر کے اس مختصر سے شعری آئینہ خانے میں داخل ہونے والے کی صورت نہ بدلتی ہے نہ بھدی لگتی ہے بلکہ کچھ اور بھی سجائی نظر آتی ہے۔ خدو خال نہیں بدلتے لیکن دلکش دکھائی دینے لگتے ہیں اور یہی آئینہ خانے والے کا کمال ہے کہ اس نے اپنے آئینے ایسے زاویئے سے رکھے ہیں کہ ہر آئینہ حقیقت کو زیادہ دلکش اور قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔

کیا ایک تخلیقی فنکار کا یہ کردار نہیں کہ زندگی کو قابلِ قبول بنانے میں مددگار ثابت ہو؟

رفعت سروش

شیشہ بدن خواب کا شاعر

ہمارے دَور کا دستکار میرا اہم عصر کشمیری لال ذاکر اپنے تصور کی لامحدودیت سے بھی آگے ہے۔

کشمیری لال ذاکر اُردو کے اُن چند قلمکاروں میں ہیں جنھوں نے زندگی کو مجھ سے زیادہ جیا ہے۔ میں اپنی عمر کی ۸۵ویں منزل میں ہوں اور میرے ممدوح نوے کے آس پاس ہیں، انہوں نے مجھ سے کہیں زیادہ لکھا ہے۔ میرے قلم سے اب تک اٹھاون کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اُن کی تقریباً نوے کتابیں شائع ہو چکی ہیں

وہ مجھ سے زیادہ فعال ہیں۔ میں نے اب سے بائیس سال پہلے اپنی ملازمت کا بوریا سمیٹ لیا تھا۔ اور وہ اس عمر میں بھی ہریانہ اُردو اکادمی کے فعال سیکرٹری ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ صحت مند ہیں۔ میں طرح طرح کے حادثات اور بیماریوں کا شکار اور وہ ماشاءاللہ چاق و چوبند۔ مجھے کیا مجال کہ میں ان کے بارے میں کچھ لکھوں مگر حکم ہے کہ ''عالمی اُردو ادب'' کے خصوصی شمارے میں میں ان کے بارے میں کچھ لکھوں اور انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤں۔ چنانچہ یہ سعادت حاصل کر رہا ہوں ہر چند کہ۔۔۔ کشمیری لال ذاکر صاحب کے لئے شایانِ شان تو نہ ہوگی۔

''شیشہ بدن خواب'' اُن کے مجموعۂ کلام کا نام ہی نہیں بلکہ ان کی شاعری کا استعارہ ہے۔ خواب اُن کی زندگی ہیں۔ اتنے شفاف کہ شیشہ کی طرح چمکتے ہیں۔ لیکن وہ ابہام کے قائل نہیں جیسیاتی ادب تخلیق کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ اور وہ اس آلائش بھری دنیا سے ایک مفکر کی طرح دامن بچا کر اپنی آماجگاہ بناتے ہیں۔ نام نہاد حقیقت سے خواب کی طرف آتے ہیں۔۔ خواب جو افسانے بنتے ہیں اور دراصل ذاکر صاحب افسانہ نگار ہی ہیں۔ شاعری تو منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کی ہے اسی لئے درجنوں افسانوی مجموعوں اور ناولوں کے مقابلہ میں صرف دو مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا ہے۔ مگر شاعری تعداد سے نہیں معیار سے ناپی جاتی ہے۔ اور حسن شاعر کے قلم سے ایسا شعر طلوع ہو، اس کا کلام ضخیم دیوانوں پر بھاری آئے ہیں

تم اپنا گاؤں کہاں پر تلاش کرتے ہو
مرے عزیز یہاں راجدھانیاں گم ہیں

یہ ایک شعر سرنامہ بن سکتا ہے ایک ایسے ضخیم ناول کا جس میں صدیوں کا عروج و زوال ہو اور دورِ حاضر کی کرب ناکی ہو۔ انقلاباتِ وقت کی گونج ہو۔

خواب اور افسانہ یہ دونوں تو ذاکر کی شاعری کی کلید ہیں۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ ان دو الفاظ کے پیچھے کتنے جہاں آباد ہیں۔ آخر کچھ نہیں تو خواب ہیں۔ اور خواب ہیں تو ان کی تکمیل کے لئے انسان جدوجہد کرے گا۔۔۔ خواب جدوجہد حیات کا درس دیتے ہیں اور افسانہ یا افسانہ نگار زندگی کی ہر حقیقت کو لازوال اثاثہ بنانے کا ہنر جانتا ہے چنانچہ ذاکر نے اپنے اشعار میں اپنے افسانوں کے طلسمات سے بھی پردہ اُٹھایا ہے۔

اب کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں

ہمیں تو اپنا فسانہ سنانا ہوتا ہے
تمہارا ذکر تو بس اک بہانہ ہوتا ہے

☆

مرے فسانے عوام کو بھی پسند کیوں ہیں
ترے کرم کا کمال کیوں ہے میں سوچتا ہوں

☆

اب غزل پر گفتگو ہوگی تو اک نقادِ فن
میرے افسانوں کی کچھ آب و ہوا لے جائے گا

☆

پڑھ لو کچھ اس خیال سے میری کہانیاں
ان میں کہیں عوام کا بھی ذکر آئے گا

☆

میرے بدنام افسانے بہت ہیں
مگر ان کے بھی دیوانے بہت ہیں

☆

ہم تو اُس شہر کو چھوڑ آئے کبھی کے، لیکن،
میرے افسانوں کے کردار وہاں رہتے ہیں

☆

خوابوں کے کچھ نقوش بنا گرم ریت پر
یادوں کی کچھ کہانیاں بھی زیرِ آب لکھ

کشمیری لال اپنے افسانوں کے خود ہی ذاکر ہیں اور انہوں نے اشعار کی تہہ داری میں اپنی افسانہ نگاری کے اسرار و رموز کو ہر طرح آشکار کیا ہے۔ کہ اس کے افسانوں پر کام کرنے والے محققین کے لئے ان۔ دانستہ افسانوں اور افسانہ نگاری کے بارے میں اس کے اشعار کے بغیر کسی تبصرہ کے اس لئے پیش کئے ہیں کہ اہلِ نظر اپنے اپنے طور سے سمجھ سکیں کہ کشمیری لال ذاکر کی افسانہ نگاری کیا ہے۔ اس میں غمِ ذات بھی ہے، حکایت شیریں بھی ہے اور تلخیٔ دوراں بھی، خواص بھی ہیں اور عوام بھی۔ اور یہ سب کچھ ذاکر صاحب نے عمداً کیا ہے۔۔ ایک باہوش شاعر کی طرح واقعہ یہ ہے کہ کشمیری لال ذاکر کی شاعری کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے فنِ افسانہ نگاری کا احتساب کر رہے ہیں اور خود استفادی کی کیفیت سے گزر رہے ہیں ے جو انہیں اپنے رنگ کا واحد شاعر قرار دیتی ہے۔ کیونکہ ہمارے کئی اور افسانہ نگاروں بھی شاعر ہیں جیسے احمد ندیم قاسمی۔ ان کے یہاں یہ کیفیت نہیں پائی جاتی۔ اس اعتبار سے ذاکر کے یہ اشعار شیشہ بدن ہیں، ذاکر صاحب کے اشعار کی شیشہ بدنی میں ہی اثر کے خواب بھی جھلکتے ہیں اور ان خوابوں کا بھی ان کے افسانوی مزاج سے گہرا رشتہ ہے۔

میرے افسانوں کے عنوان خفا ہو جاتے
میرے کردار بہت پہلے جدا ہوجاتے
درد کے شہر میں ان کو نہ سنبھالا ہوتا
تو میرے شیشہ بدن خواب فنا ہوجاتے

درد کے پھولوں کو نہ نکھرنے دیں گے
میرے احساس کی دنیا نہ سنورنے دیں گے

میں تو مر جاؤں بکھر جاؤں، فنا ہو جاؤں
مجھ کو یہ شیشہ بدن خواب نہ مرنے دیں گے

اب آیئے شاعر ذاکر کے خوابوں کی دنیا کی سیر کریں جس میں محض خواب وخیال نہیں بلکہ دنیا کو بہتر بنانے کے خواب بھی ہیں اور انسانیت کو ارفع واعلیٰ سطح تک پہنچانے کے بھی خواب ہیں مگر کسی ''ارم'' یا تحریک کے زیر اثر نہیں بلکہ شاعری کے اصولوں کے باعث اور روحانی کرب کے حوالے سے۔ ذاکر صاحب کو سمجھنے کے لئے نام نہاد نقادوں کے طے شدہ اصولوں اور پہلے سے وضع شدہ تنقیدی پیمانوں کی ضرورت نہیں۔ شاعری اپنی تفہیم خود کراتی ہے جب وہ قاری کے دل میں اُترتی ہے۔

ذاکر صاحب کے خوابوں کی ہمہ گیری ملاحظہ ہو جس میں ان کا سائنسی شعور شامل ہے۔

ورق ورق پہ ستاروں کے خواب لکھتے ہیں
ہم اپنے دور کی پہلی کتاب لکھتے ہیں

ایک اور کیفیت جسے دیوانے کا خواب بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ دیوانگی جس پر فرزانگی قرباں

نظر کو بیچ کے بستی میں ایک دیوانہ
شکستہ خوابوں کا کاجل خرید لایا ہے

خوابوں کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔ خواب انسان کے باطن سے نکلتے ہیں اور پھیل جاتے ہیں۔ اس کے شعور کی دنیا میں۔

جانے رات کو کب دروازہ کھل جائے
تری گلی سے خواب گزرتے رہتے ہیں

خواب پسندی بھی عجب چیز ہے اور جسے خواب کی عظمت کا اندازہ ہو، وہ ہر قیمت پر خواب چاہتا

وہ بدنصیب میرے کارواں سے بچھڑا ہوا
سنہری دھوپ میں چاندی کے خواب مانگتا ہے

ہر دروازہ اس بستی کا خوشبوؤں سے مہکے گا
کوچہ کوچہ اس بستی کا خوابوں سے آباد رہے گا

ایک خوبصورت طنز ایسے لوگوں پر جو کتاب کتاب کی رٹ تو لگاتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کہ کتاب کسے کہتے ہیں

وہ شخص مجھ سے کتابوں کی بات کرتا ہے
بڑا ہی سادہ ہے خوابوں کی بات کرتا ہے

خواب دراصل روشنیٔ طبع سے عبارت ہیں۔ اس بات کو ذاکر صاحب نے بڑے شاعرانہ انداز سے کہا ہے

جہاں ہیں خواب وہاں روشنی بھی آئے گی
اگر ہے رات تو پھر رہی بھی آئے گی

اس سے پہلے میں ذاکر صاحب کے سائنسی شعور کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہ شعور جب شاعر کے ذہن میں رس بس جائے تب ہی ایسے اشعار کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ مستقبل کا خواب ہے۔ مگر شرط ہے خواب کی اہمیت پر یقین۔ یہ یقین ہی زندگی میں حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اور اسی حوصلہ مندی کے ساتھ انساں دست دعا بلند کرتا ہے

جو میرے خواب میں ہے وہ بہار دے یارب
کہ دشمنوں پہ مجھے اختیار دے یارب

ہمارے ساتھ بھی خوابوں کے قافلے تھے کبھی
بڑا طویل فسانہ ہے چھوڑیئے اس کو

اب ذرا ہمارے شاعر کی ''خواب فروشی'' بھی دیکھیے۔ یہ دراصل دنیا کو باشعور بنانے کا بہانہ ہے۔

خوابوں کے پھول توڑنا، گلیوں میں بیچنا
جتنے بھی کاروبار تھے، سب میرے پاس تھے

خواب اس وقت بھی روشنی بخشتے ہیں جب سوچنے کو کچھ نہ ہو۔ خواب اس وقت زندگی کو رنگین سا دیتے ہیں جب وہ حقیقت کے روپ میں نظر آجائیں۔ اور خواب اُس وقت زندگی کا حوصلہ بخشتے ہیں ان کیفیات سے گزر چکے ہوں اور ہمارے پاس یاد ماضی کے سوا کچھ نہ ہو یعنی خواب ہر حال کے ساتھی۔

برسوں کے بعد پھر سے انہیں پڑھ رہا ہوں دوست
تیرے خطوں میں میرے بھی خوابوں کا ذکر ہے

سلگتے خوابوں کے ذکر کے ساتھ اب خواب کا در بند ہوتا ہے۔

گلی کے بند مکانوں میں خواب جلتے ہیں
خود اپنی آگ میں کتنے گلاب جلتے ہیں
اندھیری رات کی خاموش بارگاہوں میں
چراغ بجھتے ہیں مگر شباب جلتے ہیں

مجھ کو تاریخ میں ڈھونڈیں یہ مورخ مدام
کاش میں رنگِ حنا، رسمِ وفا بن جاؤں

میں اکیلا تو بھٹکتا نہیں اِن گلیوں میں
ساتھ میرے ترے قدموں کے نشاں ہوتے ہیں

کیوں ہمیں ساتے ہو وسعت آسمانوں کی
ہم تو اپنے بال و پر آشیاں میں چھوڑ آئے

چلو ہم اُس سے کسی داستاں کا ذکر کریں
سنا ہے اُردو فسانے کا میر آیا ہے

یہ کہ بیسویں صدی کا میر کشمیری لال ذاکر ہے۔ آیئے اُن کے ایک مصرعے کے ساتھ رخصت ہوں

دوستو آؤ گلے مل کے جدا ہو جائیں
کس کو معلوم ہے کس کس کو کہاں جانا ہے

☆

ساحر ہوشیار پوری

ذاکر......افسانہ نگار یا شاعر

کشمیری لال ذاکر سے غائبانہ تعارف ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ وہ مغربی پنجاب سے ہجرت کے بعد گوڑگاؤں میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ اور وہیں سے ماہنامہ ''چندن'' کان پور کے پہلے شمارے کے لئے ان کا افسانہ ''سگنل'' موصول ہوا تھا۔ اس کے بعد چندن ہی میں ان کے دو افسانے ''تخلیق'' اور ''موت'' شائع ہوئے تھے۔ ''سگنل''، ''تخلیق''، ''موت'' ایک پُر معنی مثلث! ان تینوں کہانیوں کا پس منظر ۱۹۴۷ء کے فسادات اور افراتفری سے پیدا ہونے والے مسائل کا حامل تھا۔ ''سگنل'' میں ذاکر کا نظریہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا غماز تھا۔ اور یہی نظریہ ''تخلیق'' اور ''موت'' میں زیادہ واضح، روشن اور تابناک ہو گیا تھا۔ ''چندن'' کے مختلف شماروں میں خواجہ احمد عباس، پریم ناتھ در، بلونت سنگھ، غیاث احمد گدی، ممتاز شیریں، پریم ناتھ پردیسی، کرتار سنگھ دگل، ریوتی سرن شرما، اور تسنیم سلیم چھتاری کے افسانے اور کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، مخمور جالندھری کے انشائیے اور خاکے بھی چھپے تھے۔ ان سبھی قلم کاروں کی نگارشات کے بارے میں قارئین اور ناقدین کے توصیفی خطوط بھی موصول ہوئے تھے۔

چندن بند ہو گیا اور میں مختصری بے مقصد آوارگی کے بعد دہلی چلا آیا۔ محترم کنور مہندر سنگھ بیدی کا تبادلہ گوڑگاؤں میں بہ طور ڈپٹی کمشنر ہوا تو ہفتے میں دو تین بار اں کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل کرنا میرا معمول بن گیا۔ وہیں آفیسرز کلب میں ایک سہانی شام کو ذاکر صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ شعر و شاعری کا دور چلا تو ذاکر نے قطعے سنائے۔ سادہ زبان، لطیف جذبات اور شگفتہ انداز بیان سے آراستہ ان کے اشعار نے مجھے متاثر کیا۔ ان کے کلام میں ترقی پسند تحریک کے مروجہ رجحانات کی جھلک تک نہیں دکھائی دی۔ اس کے بعد چند رسمی ملاقاتوں میں ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے اور رسائل و جرائد میں ان کے افسانے پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ اور پھر ایک ناول ''سیندور کی راکھ'' کے مطالعے سے یہ مسرت انگیز انکشاف ہوا کہ اس کے نظریات میں یکسر تبدیلی آ چکی ہے اور وہ اشتراکیت کے رُجحانات پر مبنی ترقی پسندی کے حصار سے رہائی حاصل کر کے ادب کے ان زاویہ ہائے نگاہ کی ترجمانی اور نمائندگی کرنے لگے ہیں، جو صحت مند اور صالح ہیں اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی مثبت قدروں کو فروغ

دینے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک ایسا دور آیا کہ ذاکر صاحب سے پانی پت، جموں، مسوری، مدراس، بمبئی اور نہ جانے کہاں کہاں سینکڑوں ملاقاتیں ہوئیں اور تعلقات میں بے تکلفی پیدا ہوتی گئی۔ مشاعروں، مخصوص نشستوں، اور نجی صحبتوں میں ان سے کھل کر باتیں ہوئیں۔ اور ان کے ادبی سفر میں ذہنی ارتقا اور سماجی رویوں سے متعلق ثقافتی کاوشوں کو سمجھنے، پرکھنے اور جانچنے کے مواقع از خود فراہم ہوتے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ حقیقت شناسی کے اس جادے پر برق رفتاری سے گامزن ہیں، جو ایک فن کار کو زندگی اور انسانیت کے عروج کی سرحدوں کی جانب لے جاتا ہے۔

ذاکر کے یہاں کورانہ تقلید کا فقدان ہے۔ عصری حسیت کا وجدان اور اس کا اظہار ان کی تحریروں میں موجزن ہے۔ آج کی رواں دواں زندگی کے تقاضوں میں کسی واقعے یا حادثے سے متاثر ہو کر وہ اپنی تخلیق کا خمیر تیار کرتے ہیں۔ حقائق میں تخیل کی صناعانہ رعنائی کو سمو کر کردار ڈھالتے ہیں۔ اور پھر ان کرداروں کو خوبصورت الفاظ اور منفرد انداز نگارش سے بھر پور توانائی اور تازگی عطا کرنے کا ہنر بروئے کار لاتے ہیں۔ جہاں تک مسائل کے حل کا سوال ہے وہ استدلال اور منطق کے جھگڑے میں نہیں پڑتے۔ ناصح، مشفق اور واعظ باتدبیر کا رول ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور سادہ شگفتہ طرز تحریر سے پلاٹ کا تانا بانا تیار کر کے اسے نقطۂ عروج پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ تاکہ مسائل کا حل قاری خود تلاش کر لے۔ گزشتہ پانچ دہائیوں سے وہ افسانے، ناول، ڈرامے لکھتے آ رہے ہیں۔ اور آفاقیت کی جانب ان کا ادبی سفر آج بھی جاری ہے۔ جس کو وہ استقلال، استقامت اور انہماک سے طے کرتے جا رہے ہیں۔ ان کی تازہ تصانیف ''بنجر بادل'' ''بلیک ماکس'' اور ''میرا شہر ادھورا'' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ذاکر، بنیادی طور پر افسانہ نگار ہے یا شاعر، اس کی پہلی محبت شاعری ہے یا نثر نگاری؟ یہ رسمی سا سوال غیر ضروری ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو مبدائے فیض سے یہ صلاحیت عطا ہوتی ہے کہ ایک سے زیادہ اصناف میں اپنے افکار کا اظہار کرنے پر قادر ہوں۔ دنیا کے ہر بڑے ادب میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ذاکر کی شاعری میں افسانوی طلسم اور ان کی نثر میں شاعرانہ انداز کچھ اس طرح منعکس ہو جاتا ہے کہ ان کی شخصیت دو خانوں میں بٹی ہوئی محسوس ہی نہیں ہوتی۔ خود ان کو اس کا اعتراف بھی ہے اور عرفاں بھی۔ ان کا شعر ہے ؎

جب غزل پر گفتگو ہوگی تو اک نقادِ فن
میرے افسانوں کی کچھ آب و ہوا لے جائے گا

اپنے اس تجزیے کی تائید میں اس کی کتابوں کے چند نثری اقتباسات پیش ہیں -

''یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کا زہر بھی پیتے ہیں اور شبنم ڈھلی شراب بھی۔ جسے ہم امرت کہتے ہیں شاید وہ زندگی کے زہر اور شبنم ڈھلی شراب کا ہی مرکب ہے۔ وہ خود تو امرت نہیں پیتے زندگی بھر، لیکن امرت چھوڑتے ضرور ہیں۔''

☆

''ٹوٹے ہوئے پُل کو کیوں جوڑو۔ بہہ جائے دو پُل کے ٹکڑوں کو پانی میں۔ پُل ہی بنانا ہے تو نیا بناؤ۔ کھنڈروں کو کیوں تعمیر کرو دوبارہ ا کھنڈروں سے دنیا بھری پڑی ہے۔''

☆

''اس کے پاس تو صرف دوستی کا رشتہ تھا۔ اور یہاں تو صرف خون کے رشتے کا سکہ چل سکتا تھا۔ چاہے وہ سکہ جعلی ہو اور خون میں سراسر ملاوٹ ہو۔''

☆

''انسان خود ہی سب رشتوں کا محور ہے۔ وہ چاہے دوست ہو، خاوند ہو، بیوی ہو، محبوبہ ہو، بیٹا ہو، ماں ہو۔ جہاں اس کی اپنی انا کو ٹھیس لگتی ہے، وہ تلملا اٹھتا ہے اور دنیا بھر کے رشتوں کو بھول جاتا ہے جب بھی یہ محور ٹوٹتا ہے، زمین و آسمان اپنا وجود کھو دیتے ہیں۔''

☆

''کسان نے آنکھوں کے اوپر کھلے ہاتھوں کو پھیلا کر اور چہرے پر جمی گرد کو پونچھ کر جب دھیان سے دیکھا، تو اس کے کھیت میں ایک تیسری فصل پکی کھڑی تھی۔ یہ بالکل ایک اجنبی فصل تھی۔ اس فصل کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اس سے پہلے۔ یہ نہ خریف کی فصل تھی، نہ ربیع کی۔ یہ تو کوئی اور ہی فصل تھی۔ اس پکی ہوئی فصل کے ڈنٹھلوں پر اناج کے خوشے نہیں تھے، بلکہ انگارے دہک رہے تھے۔ جلتے ہوئے تارے چمک رہے تھے دن کے اجالے میں۔ کسان چیخ اٹھتا ہے۔ ''یہ کیا ہے، میرے بھگوان، میرے خدا، میرے واہگورو۔''

☆

محولہ بالا اقتباسات میں شاعری کی روح کارفرما ہے۔ یہی شہ پارے مصرعوں میں ڈھل جائیں تو ایک نظم، غزل، قطعہ اور رباعی کا روپ دھار لیں گے۔

سخن گوئی میں ذاکر کا طبعی رجحان ایک ایسے ذہن کی نشاندہی کرتا ہے جس کے فکر اور شعور میں۔ یک وقت آغاز، انجام اور ان دونوں سے ماوراء عہد حاضر کی لحہ لحہ بدلتی ہوئی اقدار کا عکس جلوہ ریز ہے۔ یہ عکس ذاتی کرب کا حامل ہے جو ماحول میں پھیلے ہوئے انتشار، محرومی اور بے اطمینانی کا احساس دلاتا ہے اور مستقبل میں رونما ہونے والی تباہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ان کے یہ اشعار۔

آندھیاں آئیں گی، یہ بستی اُجڑ جائے گی
اپنی یادوں کے سبھی نقش اُٹھالے جاؤ

☆

جس نے جوانوں کے ہرے کھیت جھلس ڈالے ہیں
میرے ماحول کی وہ گرم ہوا لے جاؤ

☆

تمام رات اندھیرے سے شمع لڑتی رہی
یہ مسئلہ تو اصولوں کا تھا، انا کا تھا

☆

دیئے تھے جس نے گلوں کو ہزار پیرہن
خزاں جو آئی تو خود بے لباس، وہ بھی تھا

☆

تم عدالت میں کھڑے ہو، یہ نہ بھولو ذاکر
وقت منصف ہے، بڑی سخت سزائیں دے گا

☆

انقلاب آئے تو چپ چاپ ہی آجاتا ہے
تم نے تاریخ کے اوراق کو پلٹا ہی نہیں

اں اشعار میں تحرے کا رس بھی ہے اور مشاہدے کی سچائی بھی۔ ہر شعر ایک معنوی وسعت کا پیکر ہے۔ بہ قول جگر مرادآبادی "سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے" اور بہ قول ذاکر ؎

میں واقعات کو اتنا تراش دیتا ہوں
فسانے ہوتے نہیں ہیں، فسانے لگتے ہیں

ایسے اشعار بلیغ مفہوم کے حامل اور حقیقت کا مظہر بن جاتے ہیں۔ ان اشعار کے تار و پود میں نہ جانے کتنے کردار جیتے جاگتے، چلتے پھرتے اور سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں، جو زندگی کے تلخ اور شیریں لمحوں کی لذّت سے آشنا ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان اشعار میں داستان کا لطف اور تسلسل بھی ہے اور شعری تراش خراش کا حُسن بھی۔

ذاکر کے کلام میں افسانوی تصورات و مضمرات سے ہٹ کر وہ لطیف عنصر بھی وافر ہے، جسے خالص تغزل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سادہ زباں اور سلیس انداز بیاں میں وہ اپنے احساسات و جذبات کا سلیقے سے اظہار کرنے پر دسترس رکھتے ہیں۔ وادی خیال میں اُن کی "گل گشت" جدید لب و لہجہ کے دل آویزش نقش و نگار کے جلو میں معنی آفرینی کی لائق تحسین مثال پیش کرتی ہے۔ اور اس کے رنگین و سنگین تجربوں کی شسم کا ترشح قاری کے دل و دماغ کو کیف و سرور بخشتا ہے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جس دن اس سے ملنے کی کچھ بات ہوئی
یاد اسی دن کتنے بہانے آئے ہیں

☆

میں وہ آنسو کہ سُلگتا ہی رہا پلکوں پر
کسی درپن پہ، کسی گال پہ ٹپکا ہی نہیں

☆

ہم اہل دل بس اُس کی طرف دیکھتے رہے
اُس کی ہر ایک بات میں کتنا رچاؤ تھا

☆

وہ میرا نام لکھے گا، ہوا کے جھونکوں پر
پھر اس میں درد کی کچھ تلخیاں ملادے گا

☆

ثمر کو اپنے شجر ہی سے ہے اگر شکوہ
تو پھر ثمر کو ہر اک شاخ سے جدا کردے

☆

مجھے تو اس کا ملال تھا، وہ جدا ہوا تھا
اسے بھی اس کا ملال کیوں ہے، یہ سوچتا ہوں

☆

پہلے آداب پرستش کے سکھادو مجھ کو
تم اگر چاہو، تو پھر میرے خدا ہوجانا

☆

یہ بھی ممکن ہے کوئی چھین لے آواز مری
ایسا وقت آئے تو پھر میری صدا ہوجانا

☆

عمر بھر ایک ہی لمحے کی پرستش کی ہے
جو کبھی خواب، کبھی زخم، کبھی مرہم تھا

☆

وہ چلا جائے گا رحموں کی تجارت کرکے
مدّتوں شہر میں اس شخص کا چرچا ہوگا

☆

پھر اس کے بعد پرندے ادھر نہیں آئے
بس ایک بار اُنہیں گھر بنانا ہوتا ہے

☆

سانسوں کی دولت کو اپنے ہاتھوں ہی
ڈھلتی عمر میں کھونا اچھا لگتا ہے

☆

جناب ذاکر کی شخصیت ہشت پہلو ہے۔ وہ صحافی بھی ہیں اور ایک قابل منتظم بھی۔ ثقافت اور تعلیم و تدریس کے میداں میں ان کی نمایاں طویل مدتی سرگرمیوں کو ہر طبقے میں بجا طور پر سراہا گیا ہے۔ ان کی تصانیف اُردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور پنجابی زبان میں چھپی ہیں۔

سرکاری اداروں اور عوامی تنظیموں نے ان کو اعزاز و اکرام سے نوازا ہے۔ ریاستی، قومی اور انٹرنیشنل ایوارڈ بھی ان کو پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں "غالب ایوارڈ" "نقوش لاہور ایوارڈ" اور نہرو لٹریسی ایوارڈ بھی شامل ہیں۔ اب ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں اور اس کی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے "جشن ذاکر" منایا جارہا ہے۔ اُمید ہے، کہ یہ تقریب تہنیت ہر لحاظ سے کامیاب رہے گی۔ اور ذاکر صاحب کو اس کے تخلیقی سفر میں مزید کامرانیوں سے ہمکنار ہونے میں معاون ثابت ہوگی۔

اللہ کرے زورِ قلم، حسنِ سخن اور زیادہ
یہ میری دعا بھی ہے، تمنا بھی یہی ہے

شمس تبریزی

چمکتی ریت کا شاعر

کہا گیا ہے کہ شاعری وارداتِ قلب کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ بات درست بھی لگتی ہے۔ لیکن دوسری جانب ایک خدشہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا افسانہ، کہانی، ناول یا دوسرا تخلیقی ادب قلبی واردات کا اظہار نہیں ہے؟ اس پر غور کریں تو بات ذرا تاخیر سے لیکن پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کہانی ناول یا دیگر اصناف جنہیں نثری ادب سے ماخوذ کیا جا سکتا ہے وہ انساں کے ذہنی احساس کی آئینہ دار ہوتی ہیں اس کے برعکس شاعری کا معاملہ ذہن کے ساتھ دل سے بھی ہوتا ہے ایک ایسا دل جو کبھی خوش ہوتا ہے تو کبھی دُکھ کے احساس سے بھرا ہوتا ہے اِن صورتوں میں دل کے اظہار کے ترسیلی رویّہ کو ہی وارداتِ قلبی کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا تعلق قلب سے ہے اس لئے اس میں شدت اور احساس کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر جن کا شعری سفر کم وبیش ۷۰ برسوں پر محیط ہے ایک افسانہ نگار، کہانی کار اور ایک صاحبِ طرز نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ طے کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ بہتر افسانہ نگار ہیں یا ایک عمدہ شاعر، کیوں کہ ان کی نثر پڑھئے تو کئی بار شعریت دَر آتی ہے اور اُن کی شاعری کو محسوس کرتے ہوئے کئی بار کئی کہانیوں کا گماں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ذاکر صاحب کا وہ طویل ادبی سفر اور اس سفر کے تجربات اور مشاہدات ہیں جو اپنی بھرپور تمازت اور تمامت کے ساتھ موجود ہیں۔ بالخصوص ان کی شاعری میں ان کے کردار جس طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں وہ انہیں ان کے ہمعصروں سے ممیّز و ممتاز کرتے ہیں، ان کی شاعری میں تین چیزوں 'شیشہ'، 'بدن' اور 'خواب' کو جو اہمیت ہے اس کا اظہار ان کے یہاں جگہ جگہ دیکھنے کو مل جاتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اپنے کلام کو یکجا کیا تو اس کا نام ہی ''شیشہ، بدن، خواب'' رکھ دیا۔ ذاکر صاحب کی شاعری میں یہ علامتیں نئے نئے طرح سے مختلف جگہوں پر استعمال ہوئی ہیں۔

اپنے خوش رنگ اُجالوں میں اُبھاریں گے تمہیں
اپنے احساس کی شبنم سے نکھاریں گے تمہیں

تم جب اس شہر سے دو دن میں چلے جاؤ گے
میرے یہ شیشہ بدن خواب پکاریں گے تمہیں

نیند میں چور یہ مہتاب مجھے لوٹا دو
میرے ناول کے سبھی باب مجھے لوٹا دو

درد کی آگ میں جل جل کے جو بچ جائیں گے
میرے یہ شیشہ بدن خواب مجھے لوٹا دو

حسن کے نام فقیروں کی دُعا لے جاؤ
درد کے شہر کی کچھ آب و ہوا لے جاؤ

اپنے گھر سے تمہیں مایوس نہ جانے دوں گا
میرے یہ شیشہ بدن خواب اُٹھا لے جاؤ

ذاکر صاحب بطور شاعر ایک حساس اور دردمند دل کے مالک ہیں۔ انہیں مالکِ کل پر یقین ہے اور دنیا میں موجود ہر چیز کو خدا کی ہی تسلیم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں

مجھ میں جو کچھ اچھا ہے سب اُس کا ہے
میں نے جو کچھ لکھا ہے سب اُس کا ہے
اُس کا میرا رشتہ بڑا پرانا ہے
میں نے جو کچھ سوچا ہے سب اُس کا ہے
میں نے جو کچھ کھویا ہے سب اُس کا ہے
میں نے جو کچھ پایا ہے سب اُس کا ہے

احساس کی یہ شدت اور سمرپن کی یہ بھاونا اُنہیں داخلیت کے اُس حلقے میں لے جاتی ہے جہاں کوئی بھی شاعری آفاقیت کا لبادہ اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں انسان اور خدا کے درمیاں کا فرق مٹ جاتا ہے، اپنی ہستی اُس کی ذات میں مدغم ہو جاتی ہے اور ہر جانب خدا کا ہی ظہور اور اُس کا ہی نور نظر آتا ہے۔ بقول شاعر ۔

جگ میں آکر ادھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جب صورت حال یہ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ شاعر کا یہ ذکر اصل میں ذکر خدا ہے۔ غزل کے پیرائے میں یہ کام جن شاعروں نے نہایت اطمینان اور چابکدستی کے ساتھ کیا ہے ذاکر صاحب اُن میں ایک ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

خرد والوں کو دیوانے بڑی تکلیف دیتے ہیں
کہ آبادی کو ویرانے بڑی تکلیف دیتے ہیں
ہم ایسے سادہ لوگوں کو بڑی پیچیدہ باتوں سے
حقیقت ہے کہ فرزانے بڑی تکلیف دیتے ہیں

میری خوشبو میرا غم میری دُعا لے جائے گا
سوچتا ہوں میرے گھر سے کوئی کیا لے جائے گا

کلی کلی کی نمو میں شریک دونوں ہیں
نظر کی اوس میری ہے جمال تیرا ہے

ذاکر صاحب کی غزلیں اصل میں معاشرے کا وہ درد بھی ہیں جن کا دیکھ پانا مشکل ہے۔ مشکل اس لئے کہ اس درد میں ایک چبھن کے ساتھ ساتھ ایک مٹھاس کا بھی احساس ہے جو اصل میں تو درد ہے لیکن مٹھاس اسے خراب محسوس نہیں ہونے دیتی۔ دیکھئے۔

میرے نسانوں کا وہ انتخاب مانگتا ہے
تمام عمر کا مجھ سے حساب مانگتا ہے
میں اس کی ایک ہی ضد سے بہت پریشاں ہوں
سوال کوئی نہیں ہے جواب مانگتا ہے

مجھے ہی دوست مرا عکس کیوں دکھاتا ہے
میں کچھ نہیں ہوں مجھے کس لئے جتاتا ہے

کہانی ختم بھی کر سب پہ نیند طاری ہے
فسانہ خوب ہے لیکن کسے سناتا ہے

ذاکر صاحب کی غزلیں اس قدر صاف وشفاف ہیں جیسے دودھ میں نہایا چاند۔ اشعار کو غیر ضروری لفظیات سے بوجھل نہیں بنایا گیا ہے، شاعری میں کسی شعوری کوشش کا دخل نہیں ہے جو ذہن و دل میں آیا اسے شعری قالب میں ڈھال دیا گیا۔ معصوم خیالات میں کوئی بھی پیچیدگی نہیں ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار نہایت سبک خرامی سے ایک ٹھنڈے جھونکے کی طرح ذہن کو معطر کر کے گزر جاتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر اس امر کو مسلم کرتے ہیں کہ اچھی اور سچی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی شرح کی جا سکے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی، سماجی ناہمواری، بھائی چارے کا فقدان، جذبۂ حب الوطنی کی ناپائیداری، احساسِ ناوفاداری جیسے بہت سے موضوع ہیں جو اُن کی شاعری کا مرکز بنے ہیں۔

اگر کہا جائے کہ کشمیری لال ذاکر ایک تخلیق کار کے طور پر ادب کا وہ سرمایہ ہیں جنھوں نے اُردو کے کلاسیکی ادب کو اسی رکھ رکھاؤ کے ساتھ برتا ہے جو اس کا خاصہ ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ انہوں نے خدمت انسانی کو اپنا نصب العین تصور کیا ہے۔ ایسے ادیب اور فنکار کو خراج انہیں کے اس شعر سے پیش کیا جا سکتا ہے

ذاکر تھا جس کا نام، اُسے جانتے تھے لوگ
اس کی کہانیوں میں غضب کا رچاؤ تھا

علی سردار جعفری

ہوا کی طرح صاف اور پانی کی طرح شفاف

کشمیری لال ذاکر

ہریانہ کی ریاست اپنی جگہ ایک الگ سیاسی وحدت ہے لیکن تہذیبی اعتبار سے وہ پنجاب کے دائرۂ اثر میں ہے۔آج ہندوستان اور پاکستان میں جو اُردو لکھی جا رہی ہے، اُس پر اقبال، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، حفیظ جالندھری، فیض اور ساحر وغیرہ کے بہت واضح اثرات ہیں۔ میرے عزیز دوست کشمیری لال ذاکر اسی مردم خیز علاقے کے صاحبِ قلم ہیں جو کہ گزشتہ چالیس پچاس سال سے اپنی تخلیقات کے ذریعے اُردو ادب کی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ وہ اسی (۸۰) سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور صفِ اول کے افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں۔اس کے ساتھ ادب اور زباں کے ایک مخلص اور خاموش خدمت گزار ہیں جن کی تنظیمی صلاحیتوں پر ہریانہ اُردو اکادمی اور دوسری تنظیمیں شاہد ہیں۔

ایک اور خوشی کی بات یہ ہے کہ کشمیری لال ذاکر جتنے اعلیٰ درجے کے نثر نگار ہیں اُتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں۔غزل کی بارگاہِ جمال میں ان کے اشعار کو بلند مرتبہ حاصل ہے۔اُن کی غزل بہت صاف ستھری ہے۔اس میں افکار کی پیچیدگی نہیں ہے۔بس احساس کی لطیف رو ہے جو نہایت سبک خرامی سے چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔موسمِ بہار کی ہوا کی طرح صاف اور سنگِ مرمر پر بہتے ہوئے پانی کی طرح شفاف۔

اپنی تقدیر سے کچھ دیر خفا ہو جاؤں — سوچتا ہوں کہ میں اب تجھ سے خفا ہو جاؤں
ایک لمحے میں بکھر جاؤں میں خوشبو کی طرح — جذب ہو جاؤں ہواؤں میں فنا ہو جاؤں

میکدہ ، چاند، چمن کوئی مہکتا سا بدن — ہم سے دیوانوں کے ایسے ہی ٹھکانے ہوں گے

اور اس کے اشعار میں زندگی کی دھوپ چاندنی بن گئی ہے۔

(مجموعۂ کلام ''شیشہ بدن خواب'' کے دیباچہ سے اقتباس)

قتیل شفائی

دو دھاری تلوار کا دھنی

یہ وصف بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے کہ وہ نظم اور نثر دونوں پہ برابر کی کماں رکھتے ہوں۔ اور کشمیری لال ذاکر ایسے ہی بہت کم لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے فن کی اسی دو دھاری تلوار کے جوہر دکھائے ہیں۔

میں نے چند برس پہلے انڈیا ہی کے کسی مشاعرے میں شاعروں کی فہرست دیکھی تو اُس میں کشمیری لال ذاکر کا نام دیکھ کے پہلے مجھے بھی حیرت ہوئی تھی اور میں نے بھی اپنے آپ سے سوال کیا تھا کہ یہ اپنے ذاکر صاحب بہت کامیاب اور مقبول افسانہ نگار اور ناولسٹ تو مانے جا چکے ہیں۔ اب اسی طرح شاعری میں بھی کوئی کارنامہ سرانجام دے سکیں گے یا نہیں۔ میں ذاکر صاحب کا دوست ہوں لیکن میرے اندر ایک کھوجی بھی موجود ہے جو اس بات کا سراغ لگا لینا چاہتا تھا کہ ذاکر صاحب واقعی اچھے شاعر بھی ہیں۔ سو ایسا ہی ہوا، مشاعرہ شروع ہوا تو میں جم کر اسٹیج پر بیٹھا رہا کہ کہیں میری عدم موجودگی میں ذاکر صاحب کلام سنا نہ چکیں اور میرے اندر کا کھوجی ذاکر صاحب کی سراغ رسانی سے محروم نہ ہو جائے۔ ایک شاعر آیا، دوسرا شاعر آیا پھر تیسرا، چوتھا، آٹھواں دسواں آیا۔ ذاکر صاحب کی بڑائی کے احترام میں انہیں بڑے شاعروں میں پڑھایا گیا تو میں نے اُسے منتظمین مشاعرہ کی برخورداری سمجھ کر دل ہی دل میں انہیں داد دی کہ وہ اپنے بڑوں کا احترام کرنا جانتے ہیں لیکن جب ذاکر صاحب نے غزل کا مطلع سنایا تو میں چونکا۔ ارے یہاں تو بات ہی اور ہے۔ واہ! سبحان اللہ۔ اور میں نے اُن کی پوری غزل پر داد دی اور ذاکر صاحب کی بھی عزت میری نظر میں بڑھ گئی۔

ذاکر صاحب محض اپنی سماجی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے سامعین پر اپنی شاعری انڈیلنے نہیں چلے آئے تھے۔ بلکہ بہت جانچ پرکھ کے بعد پورے انصاف سے انہوں نے سوچا ہوگا کہ وہ جس طرح اچھی نثر پیش کرنے میں حق بجانب ہیں اسی طرح وہ اپنی اچھی شاعری سے بھی اپنے سامعین کے اطمینان کا سامان کر سکیں گے۔ میں چاہوں گا آپ بھی وہ غزل پڑھیں

موسم تو ہر طور گزرتے رہتے ہیں گلشن اپنے آپ سنورتے رہتے ہیں

جب بھی کہیں پت جھڑ کا موسم آتا ہے ہم اپنے آنگن میں نکھرتے رہتے ہیں
جانے رات کو کب دروازہ کھل جائے تری گلی سے خواب گزرتے رہتے ہیں
قطرہ قطرہ رات برستی رہتی ہے ریزہ ریزہ اشک بکھرتے رہتے ہیں
صحرا صحرا سورج ڈھلتا رہتا ہے دریا دریا چاند اُبھرتے رہتے ہیں

(مجموعۂ کلام "شیشہ بدن خواب" کا اقتباس)

کیفی اعظمی

اُردو شاعری کی کہکشاں کا نیا ستارہ

اُردو کی ترقی پسند شاعری کی کہکشاں میں ایک نئے ستارے کا طلوع کشمیری لال ذاکر قدرت نے جن کو شاعر پیدا کیا تھا۔ اور ابتداً انہوں نے ایسی شاعری سے کی کہ صفِ شعراء میں اپنی جگہ بنالی، لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ اُردو نثر کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ پریم چند کی زباں میں ہمارے افسانوی ادب میں ایک قابلِ لحاظ اضافہ کیا۔ اس بیچ ہی شاعری سے اُن کی دلچسپی کم ہوتی گئی۔ مَیں اس کو اُردو کے شعری ادب کا نقصان سمجھتا ہوں۔ ذاکر صاحب کے دیرینہ ساتھی اور خوش فکر ادیب کے ایل نارنگ مبارک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ذاکر صاحب کا ایک مجموعہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ شعر و سخن میں ذاکر صاحب کی واپسی اُردو شاعری کے لیے ایک فالِ نیک ہے۔ آیئے ہم اپنے معتبر ساتھی اور شاعر کا محفلِ شعر و سخن میں استقبال کریں۔

ذاکر صاحب ہریانہ اُردو اکادمی کے سکریٹری اور بہت فعال کارکن ہیں۔ ہریانہ میں شراب بندی نافذ ہو چکی ہے ورنہ ذاکر صاحب کے اس استقبال کے موقع پر مَیں اُن کے نام کے چند گھونٹ ضرور پیتا۔ اگر چند گھونٹ پینے پر کوئی بزرگ اعتراض کرتا تو مَیں ذاکر کا ہی کا ایک شعر معذرت میں پیش کرتا۔

ذرا سی پی لی ذرا دیر کو بہک بھی گئے
قصور سارا مہکتی ہوئی فضا کا تھا

شعری مجموعے کی اشاعت پر پہلے کچھ دوستوں نے منصوبے بنائے تھے لیکن ذاکر صاحب نے اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور اس دستک کو گزرتی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا سمجھ کے دامن بچالیا۔ اسی دستک کو ذاکر صاحب نے کتنی اہمیت دی۔ یہ انہیں کے ایک شعر سے واضح ہو جائے گا، فرماتے ہیں

جیسے مَیں نرم سی دستک سمجھ کے چونک گیا
وہ ایک جھونکا گزرتی ہوئی ہوا کا تھا

فارسی کی ایک بہت مشہور کہاوت ہے کہ 'ہر کسے را بہر کارے ساختند' مجموعے کی اشاعت کے لئے ذاکر صاحب کو آمادہ کر لینا کے ایل نارنگ ساقی ایسے حوصلہ مند انساں کا کام ہے۔ اسی لئے وہ اپنی کوشش

میں کامیاب ہوئے۔ ذاکر صاحب کی نثر ہو یا نظم دونوں کا ماخذ ہمارا کلاسیکی ادب ہے۔ وہی رکھ رکھاؤ وہی رچاؤ، زباں کا وہی تخلیقی استعمال، یہ اگر اتفاق ہے تو بہت خوبصورت اتفاق ہے کہ اُن کا شعری مجموعہ اس مبارک موقع پر شائع ہو رہا ہے، جب ہمارا ملک اپنی آزادی کی گولڈن جوبلی منا رہا ہے۔ یہ دونوں مبارک کام اس لئے ممکن ہو سکے، یہ ذاکر ہی سے سُنیئے

تمام رات اندھیرے سے شمع لڑتی رہی
یہ مسئلہ تو اصولوں کا تھا، انا کا تھا

ذاکر صاحب کی کسی تخلیق پر سرسری نظر ڈالنے والا کبھی فنکار کی روح تک نہیں پہنچے گا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ اس کو صرف تعلّی نہیں سمجھنا چاہیے

ذاکر تھا جس کا نام اُسے جانتے تھے لوگ
اُس کی کہانیوں میں غضب کا رچاؤ تھا

بڑی سی بڑی بات کم سے کم لفظوں میں اور دل کو چھو لینے والے انداز میں کہہ دینا ذاکر صاحب کا فن ہے۔ ("شیشہ در خواب" کے دیباچے سے ۸؍اگست ۱۹۹۰ء)

☆

گوپی چند نارنگ

شاعر — کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کو میں ایک مدت سے جانتا ہوں۔ اُردو کا جغرافیہ اب شمال مغربی ہندوستان کے بعض علاقوں میں اتنا علاقے سے نہیں، جتنا اشخاص سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ کوئی خوش آئند بات تو نہیں لیکن ایسے اشخاص کا دم بھی غنیمت ہے کہ اِن کی تگ و تاز سے اُردو کا نام گردش میں ہے۔ (ستارے کا گردش میں ہونا الگ مسئلہ ہے) یہ حقیقت ہے اور اس میں مبالغہ نہیں کہ اگر کشمیری لال ذاکر نہ ہوتے تو آج ہریانہ میں اُردو کا نام لیوا اعلیٰ سطح پر کوئی نہ ہوتا۔ ہریانہ اُردو اکادمی اُن کے اور وہ ہریانہ اُردو اکادمی کے دم سے اُردو کا پرچم اُٹھائے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے ادباء و شعراء اس اکادمی کی دعوت پر چنڈی گڑھ اور دوسرے مقامات پر جمع ہوتے ہیں اور گورنر ہریانہ اور وزیر اعلیٰ کی مہمان نوازی سے فیض یاب ہوتے اور ہریانہ اُردو اکادمی اور کشمیری لال ذاکر کا گُن گاتے اور اُن کی ہمہ جہت خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہریانہ سے ہماچل اور پنجاب کی سرحد ادھر اُدھر لگتی ہیں چنانچہ ذاکر صاحب کے توسط اور تعلقات سے ادھر اُدھر بھی اُردو کے نام پر محفلیں جمتی ہیں۔ اور وہی جو اُردو کو تج چکے ہیں اردو نوسٹلجیا سے تحریک پا کر اُردو سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اُردو کے حُسن و کشش کا ذکرِ مُر تیانہ فرماتے ہیں۔ اُردو کی قبولیت کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

کشمیری لال ذاکر فکشن نگار تو بہت پھیلے ہوئے اور دُور دُور تک ہیں (جتنی اُن کی عمر ہے، اس سے بھی زیادہ کتابیں اُن کی اُردو، ہندی، پنجابی میں نکل چکی ہیں) لیکن وہ شاعری بھی اس دھڑلے سے کرتے ہوں گے اس کا اندازہ مجھے اُس روز ہوا جب وہ ایک فائیل میرے یہاں پہنچا گئے جو اُن کے کلام پر مشتمل تھا۔ کیا لطافت اور رچاؤ اور سلاست اور روانی اُن کے کلام میں ہے، اس کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہوا۔ روایت کا فیضان جاری و ساری ہے۔۔ جس شخص نے ساری عمر دشتِ ادب کی سیاحی میں گزار دی ہو، وہ شعر نہ کہنے لگے تو تعجب ہونا چاہیے۔ مشاعروں نے کتنوں کو شاعر بنا دیا اور ہمارے کشمیری لال ذاکر لاکھ فکشن نگار سہی، اصلاً جب تخلیق کی کسوٹی پر کسے گئے تو شاعر نکلے۔ سچ تو یہ ہے کہ غزل چیز ہی ایسی ہے جس سے چھو جائے اُس کا ستارہ بلند نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ ذاکر صاحب کے شاعر دوست پریشان ہوں گے کہ اگر یہ بھی شعر کہنے لگے تو مشاعرہ مار شاعروں کو کون پوچھے گا؟ فکر دوسروں کو ہوگی لیکن سچ بات یہ ہے

کہ ان کے شاعر ہونے سے ہمیں بہر حال خوشی ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ شاعر کشمیری لال ذاکر کا ذکر ہو اور فکشن نگار ذاکر کو فراموش کر دیا جائے۔ اولیت تو اسی کو حاصل رہے گی اور اُن کی اصل پہچان فکشن نگاری ہی ہے۔ اُن کے مطبوعہ ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں کی مجموعی تعداد ۸۵ سے بھی زائد ہے۔ وہ اُردو کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں بھی تواتر سے لکھتے رہے ہیں۔ اُن کی اُردو تصانیف کی تعداد ۴۲ ہے۔ اُن کی تصانیف میں زیادہ تر ناول، افسانے اور ڈرامے ہیں۔ اُردو ادیبوں میں کم ہی ایسے نکلیں گے جنہوں نے فکشن میں اتنا لکھا ہو۔ تعلیم بالغاں پر بھی انہوں نے ہندی اور اُردو میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جب سے انہیں ہریانہ اُردو اکادمی کی سربراہی تفویض ہوئی ہے، ہریانہ اُردو اکادمی کا شمار اُردو کے اُن اداروں میں ہونے لگا ہے، جن کے فیوض و برکات سے بہتوں کا بھلا ہو رہا ہے۔ جس شخص کی تخلیقات اور سرگرمیوں کا دائرہ اتنا وسیع ہو اور جو خدمتِ انسانی کو اپنا نصب العین سمجھتا ہو اور جس شخص نے سماجی، وطنی اور قومی مسائل پر مسلسل اور ان تھک لکھا ہو، اُس کا احترام سب پر کیوں نہ واجب ہوگا۔ کشمیری لال ذاکر کے ناولوں اور افسانوں کے موضوعات خاصے متاثر کن ہیں، مثلاً جب ''کشمیر جل رہا تھا'' اور ''آدھے چاند کی رات'' کشمیر کے بارے میں ہیں۔ ''انگوٹھے کا نشان'' بندھوا مزدوروں کے موضوع پر ہے، ''کھجوراہو کی ایک رات''۔ سمندر صلیب اور وہ'' ''خون پھر خون ہے'' نوعیت کے اعتبار سے تاریخی ناول ہیں۔ ''دھرتی سدا سہاگن'' کا موضوع بھودان اندولن ہے جس موضوع پر اُردو میں شاید کوئی دوسرا ناول نہیں لکھا گیا۔ اس طرح ''جاتی ہوئی رُت'' اور ''لمحوں میں بکھری ہوئی زندگی'' عورتوں کے مسائل پر ناول ہیں۔ ''بنجر بادل'' کا موضوع خشک سالی ہے۔ ''بلیک باکس'' ''کنشک ہوائی حادثے پر اور ''ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی'' بھوپال گیس حادثے پر مبنی ناول ہے۔ اور تو اور ذاکر نے قومی یک جہتی پر بھی کئی ناول اور ڈرامے لکھے ہیں۔ اس اعتبار سے ''کرماں والی'' اُن کا خاصا مشہور کارنامہ ہے۔ تفصیل کہاں تک بیان کی جائے کشمیری لال ذاکر کے کلکِ گہر بار سے جو کچھ بھی نکلا ہے ملک اور قوم کے مسائل سے گہرے طور پر مربوط ہے۔ ابھی اُن کی کئی کتابیں زیرِ اشاعت ہیں۔ وہ اُن خوش نصیب لوگوں میں ہیں کہ مجھ جیسے بے توفیق جتنا پڑھ نہیں سکتے، وہ اُس سے کہیں زیادہ لکھ لیتے ہیں۔ میں اُن کی تخلیقی رفتار پر رشک کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا اُنہیں عمرِ خضر عطا کرے تاکہ وہ اسی طرح اُردو کی کشتِ ادب کو سرسبز و شاداب بنائے رکھیں۔ (''شیشہ بدن حواب'' کا دیباچہ ۱۲ر جنوری ۱۹۹۸ء)

غزلیات

مجھ کو مرے فسانے رسوا کرتے ہیں
لوگ نہ جانے کیا کیا سوچا کرتے ہیں

وہ شبنم ہے پھول پہ سویا رہتا ہے
ہم پتے ہیں درد سے بکھرا کرتے ہیں

جانے والا آج تو یارو دیکھ لیا
آنے والے کل کی تمنا کرتے ہیں

تم بھی اپنے آپ کو دریا کر ڈالو
ہم بھی اپنے جسم کو صحرا کرتے ہیں

جانے کب، کس آن سویرا ہو جائے
ہم تو اُفق کی سمت ہی دیکھا کرتے ہیں

☆

رستوں کا کرب و درد مجھے جب جلائے گا
تیری نظر کا سایہ بہت یاد آئے گا

جتنے حسین لوگ تھے سارے چلے گئے
اس شہرِ کم نگاہ میں اب کون آئے گا

پڑھ لو کچھ اس خیال سے میری کہانیاں
ان میں کہیں عوام کا بھی ذکر آئے گا

اک دن وہ شخص چاند کو بانہوں میں کھینچ کر
پلکوں کے آسمان پہ تارے سجائے گا

لمحہ کڑا یہ درد کا ٹکڑا یہ وقت کا
اس کو سنبھال رکھ، یہ ترے کام آئے گا

جس کو ڈبو رہی ہیں کناروں کی سازشیں
لہروں کا زور اُس کو بھلا کیا بچائے گا

ویران بستیوں کو ابھی چھوڑیئے نہیں
اک بار خود کو ڈھونڈنے وہ شخص آئے گا

☆

خرد والوں کو دیوانے بہت تکلیف دیتے ہیں
کہ آبادی کے ویرانے بڑی تکلیف دیتے ہیں

یہ ظالم دوسروں کے درد سے واقف نہیں ہوتے
یہ معصوموں کے یارانے بڑی تکلیف دیتے ہیں

رسالے مانگ کر پڑھتے ہیں، تنہائی میں روتے ہیں
انہیں اب میرے افسانے بڑی تکلیف دیتے ہیں

کبھی سنسان گلیوں سے بڑی تسکین ہوتی ہے
کبھی آباد مے خانے بڑی تکلیف دیتے ہیں

کچھ اس انداز سے ملتے ہیں جیسے جاں لے لیں گے
چراغوں کو یہ پروانے بڑی تکلیف دیتے ہیں

ہم ایسے سادہ لوگوں کو بڑی پیچیدہ باتوں سے
حقیقت ہے کہ فرزانے بڑی تکلیف دیتے ہیں

☆

چند لمحے تری محفل سے چرانے ہوں گے
وہ جو مدہوش جواں سال، سہانے ہوں گے

میں انہیں دیکھ کے آیا تو یہ لگتا ہے
پاس اُن کے مرے کچھ تازہ فسانے ہوں گے

زندگی مجھ سے خفا ہے، میرا اندازہ ہے
اور کچھ دیر ابھی ناز اٹھانے ہوں گے

میکدہ، چاند، چمن، کوئی مہکتا سا بدن
ہم سے دیوانوں کے ایسے ہی ٹھکانے ہوں گے

جب نہ دو وقت کی روٹی کو کوئی ترسے گا
کیسی ہوں گی وہ رُتیں؟ کیسے زمانے ہوں گے

☆

مرے بدنام افسانے بہت ہیں
مگر اُن کے بھی دیوانے بہت ہیں

تمہیں تحفے بہاروں کے مبارک
ہمیں کانٹوں کے نذرانے بہت ہیں

یقیں جانو حقیقت کچھ نہیں ہے
مرے بارے میں افسانے بہت ہیں

ہجوم دوستاں کی خیر یارب
کہ اس میں آج بیگانے بہت ہیں

اگر دیکھو تو نظریں بھی ہیں تشنہ
اگر سوچو تو مے خانے بہت ہیں

یہ کلیاں، یہ فلک، یہ ماہ و انجم
مرے تسبیح کے دانے بہت ہیں

ابھی مایوس کیوں ہیں دنیا والے
ابھی ہم جیسے دیوانے بہت ہیں

☆

پیار کی پروائیوں سے جب نکھر جاتے ہیں لوگ
نکہتِ گل کی طرح، ہر سو بکھر جاتے ہیں لوگ

زندگی خود اپنے ہاتھوں سے بھی کر دیتی ہے قتل
موت سے پہلے بہت پہلے بھی مر جاتے ہیں لوگ

کس کے دروارے پہ دستک دیں، کہاں ڈھونڈیں انہیں
اپنا گھر جب چھوڑ دیتے ہیں کہاں جاتے ہیں لوگ

کس لیے دو پل کی قربت کو ترس جاتا ہے دل
کیوں اچانک پھر نگاہوں سے اُتر جاتے ہیں لوگ

رات کا بھرپور سناٹا سسکتا بھی نہیں
اس قدر خاموش قدموں سے گزر جاتے ہیں لوگ

☆

گلشن میں جتنے خار تھے سب میرے پاس تھے
پت جھڑ کے جتنے یار تھے، سب میرے پاس تھے

اُن حق کے دعوی داروں میں سے، ایک بھی نہ تھا
جو اہل رسم دار تھے، سب میرے پاس تھے

جس جس کی روح گنگ تھی، وہ اُس کے ساتھ تھا
جن جن کے دل فگار تھے، سب میرے پاس تھے
خوابوں کے پھول توڑنا، گلیوں میں بیچنا
جتنے بھی کاروبار تھے، سب میرے پاس تھے

☆

گلی کے بند مکانوں میں خواب جلتے ہیں
وہ اپنی آگ میں کتنے گلاب جلتے ہیں

اندھیری رات کی، خاموش خواب گاہوں میں
چراغ بجھتے ہیں، لیکن شباب جلتے ہیں

کبھی جو تم نے دیئے تھے کتاب میں رکھ کر
ورق ورق پہ وہ سارے گلاب جلتے ہیں

مَیں اُن کی راکھ کو لے کر بھی اب کہاں جاؤں
سوال جلتے ہیں میرے، جواب جلتے ہیں

ترے فلک پہ تو اک آفتاب جلتا ہے
مری زمیں پہ کئی ماہتاب جلتے ہیں

☆

دیوانگی کا درد کہاں جانتے ہیں لوگ
مَیں تیرا نام لوں تو بُرا مانتے ہیں لوگ

مدت سے اپنے شہر میں بھی اجنبی سا تھا
اب تو تمہارے نام سے پہچانتے ہیں لوگ
گلشن کو آگ دینے میں کس کس کا ہاتھ تھا
دشمن چمن کے کون تھے سب جانتے ہیں لوگ

مجھ کو تمہارے حُسن نے بدنام کر دیا
پہلے تو جانتے ہی تھے اب مانتے ہیں لوگ

ہم نے کہانیاں بھی لکھیں، نوکری بھی کی
دونوں فضول کام ہیں، یہ جانتے ہیں لوگ

O

پرندے جب بھی کہیں گھر بسانے لگتے ہیں
کچھ ایسے پیڑ ہیں، جو دل جلانے لگتے ہیں

کھلی فضاؤں میں جب ظلمتیں بکھرتی ہیں
دِوانے اپنے گھروں کو جلانے لگتے ہیں

میں واقعات کو اتنا تراش دیتا ہوں
فسانے ہوتے نہیں ہیں فسانے لگتے ہیں

کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں دیکھ آیا ہوں
جو زخم کھاتے ہیں اور مسکرانے لگتے ہیں

کنواری دھرتی کے گیسو سنوارنے کے لئے
حضورا دن نہیں لگتے زمانے لگتے ہیں

O

میں ٹوٹ کر بھی نہ بکھرا، کمال اُس کا ہے
فسانہ میرا ہے، لیکن خیال اُس کا ہے

مری یہ تازہ کہانی، بڑی پرانی ہے
خطوط میرے ہیں، لیکن جمال اُس کا ہے

کہاں کہاں پہ جلاتے رہیں، دِلوں کے چراغ
سوال میرا نہیں، یہ سوال اُس کا ہے

نہ کوئی پھول، نہ نغمہ، نہ چاندنی کی رمق
وہ جی رہا ہے، مگر یہ کمال اُس کا ہے

نہ اُس کا شہر ہی چھوڑوں، نہ اُس کا ذکر کروں
فقط تڑپتا رہوں، یہ خیال اُس کا ہے

○

اَنا کی قید سے یا رب مجھے رہائی دے
فضا میں چاروں طرف روشنی دکھائی دے

میں تیرے دَر سے جو مانگوں تو بس یہی مانگوں
حلال رزق دے، ایمان کی کمائی دے

ترا نگر ہے، فقیروں کو نااُمید نہ کر
زرِ وصال نہ دے، کاسۂ جدائی دے

نہ جانے کون سی منزل پہ رُک گئے ہیں ہم
اُفق کے پار تو کچھ بھی نہیں دکھائی دے

امیرِ شہر کو توفیقِ دردمندی بخش
فقیرِ شہر کی آواز کو رسائی دے

○

ہمیں تو اپنا فسانہ سنانا ہوتا ہے
تمہارا ذکر تو بس اک بہانا ہوتا ہے

کسی کے ساتھ کوئی آدمی نہیں ہوتا
کسی کے ساتھ سفر میں زمانہ ہوتا ہے

پھر اس کے بعد پرندے اِدھر نہیں آتے
بس ایک بار اُنھیں گھر بنانا ہوتا ہے

جسے خلوص سے پڑھتا ہے، ہر حسیں قاری
وہ میرا قصہ، وہ میرا فسانہ ہوتا ہے

لٹکنا ہوتا ہے، خود ہی، وفا کی سولی پر
پھر اپنی لاش کو، خود ہی اُٹھانا ہوتا ہے

فقیر شہر کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں
فقیرِ شہر کا بھی اک ٹھکانہ ہوتا ہے

○

ہر شخص کے ساتھ، اُس کے عذابوں میں جلا ہوں
سو بار میں خود اپنی کتابوں میں جلا ہوں

شبنم میں نہایا ہوں، شرابوں میں جلا ہوں
مت پوچھ کہ میں کتنے سرابوں میں جلا ہوں

سوتن کی طرح روح پہ بجلی بھی گری ہے
دلہن کی طرح لاکھ نقابوں میں جلا ہوں

کچھ ملگجی شاموں میں ستاروں نے ڈسا ہے
کچھ شبنمی راتوں کو، شرابوں میں جلا ہوں

ہر بار نئی رُت کو نئے ڈھب سے سنوارا
ہر بار نئے ڈھنگ سے گلابوں میں جلا ہوں

یہ فن کا سفر کتنا جگر سوز ہے ذاکر
محلوں میں سجا ہوں تو خرابوں میں جلا ہوں

○

یہ اور بات ہے کہ آگے ہوا کے رکھے ہیں
چراغ رکھے ہیں جتنے، جلا کے رکھے ہیں

نظر اُٹھاکے انہیں ایک بار دیکھ تو لو
ستارے پلکوں پہ ہم نے سجا کے رکھے ہیں

کریں گے آج کی شب کیا، یہ سوچنا ہوگا
تمام کام تو کل پر اُٹھا کے رکھے ہیں

کسی بھی شخص کو، اب ایک نام یاد نہیں
وہ نام سب نے جو مل کر خدا کے رکھے ہیں

انہیں افسانے کہو، دل کی داستانیں کہو
یہ آئینے ہیں، جو کب سے سجا کے رکھے ہیں

خلوص، درد، محبت، وفا، رواداری
یہ نام ہم نے کسی آشنا کے رکھے ہیں

تمہارے دَر کے سوالی بنیں تو کیسے بنیں
تمہارے دَر پہ تو کانٹے اَنا کے رکھے ہیں

○

شبنم میں، چاندنی میں، گلابوں میں آئے گا
اب تیرا ذکر ساری کتابوں میں آئے گا

جو لمحہ کھو گیا یہ، اُسے پھر نہ ڈھونڈنا
جو چاند ڈھل چکا ہے، وہ خوابوں میں آئے گا

دُکھ دے رہی ہیں، اس کی یہ برفیلی عادتیں
پگھلے گا ایک دن تو شرابوں میں آئے گا

پہچان بھی سکوگے نہیں، اپنے نام کو
آئے گا بھی، تو اتنے حجابوں میں آئے گا

جب تیرا نام حسن کی تاریخ بنے گا
پھر میرا ذکر دل کی کتابوں میں آئے گا

○

پتوں کو ہواؤں میں بکھرنے نہیں دیتے
یہ لوگ فضاؤں کو نکھرنے نہیں دیتے

تاریک مکانوں کے اُبھرتے ہوئے سائے
سورج کو بھی آنگن میں اُترنے نہیں دیتے

یخ بستہ ہواؤں کے ٹھٹھرتے ہوئے جھونکے
موسم کو کسی طور سنورنے نہیں دیتے

ہر سال مرے دوست، مری سالگرہ پر
مرنے کی دُعا کرتے ہیں، مرنے نہیں دیتے

احباب کی خاطر تو میں سولی پہ چڑھا تھا
احباب ہی سولی سے اُترنے نہیں دیتے

☆

اپنی باتوں ہی سے دیوانہ بناتے رہیے
جب بھی ملئے کوئی افسانہ سناتے رہیے

آگ لگ جائے اگر بستی میں بھونچال کے بعد
خود فنا ہو کے بھی اوروں کو بچاتے رہیے

غم کسی ایک کی، کسی دین کی میراث نہیں
غم تو خوشبو ہے اسے دل میں بساتے رہیے

دشت میں پھول کھلیں گے تو بہار آئے گی
آرزوؤں کی نئی فصل اُگاتے رہیے

ہم کوئی چاند کہیں سے بھی اُٹھا لائیں گے
آپ دیواروں کو بس اُونچا اُٹھاتے رہیے

☆

چلو ہم پھر اُسے آواز دے کر دیکھ لیتے ہیں
زباں کو طاقتِ پرواز دے کر دیکھ لیتے ہیں

یہ ممکن ہے کہ کلیاں مسکرا کر پھول بن جائیں
خزاں کو اک نیا انداز دے کر دیکھ لیتے ہیں

جنھیں نفرت کی طاقت پر۔ انا پر، ہی بھروسہ ہے
محبت کا انہیں اعجاز دے کر دیکھ لیتے ہیں

بڑے دھوکے دئے ہیں راستے میں عقل و دانش نے
جنوں کو ایک بار آواز دے کر دیکھ لیتے ہیں

جسے ہم نے دیا تھا کرشن کو، گوتم کو، نانک کو
تجھے اے زندگی وہ ساز دے کر دیکھ لیتے ہیں

☆

میری خوشبو، میرا غم، میری دعا لے جائے گا
سوچتا ہوں میرے گھر سے کوئی کیا لے جائے گا

ریت پر معصوم بچے چیختے رہ جائیں گے
ایک طوفاں آئے گا سب کچھ بہا لے جائے گا

تجھ کو تو معلوم ہے، میری کتابوں کا مزاج
چھپ گئیں تو ایک دن کوئی اُٹھا لے جائے گا

مجھ سے رخصت ہوگا تو اپنی حفاظت کے لئے
باندھ کر آنچل میں وہ میری دعا لے جائے گا

جب غزل پر گفتگو ہوگی تو اِک نقادِ فن
میرے افسانوں کی کچھ آب و ہوا لے جائے گا

اظہر جاوید

قطعہ نگاری کا نیا اُفق

یہ میری خوش نصیبی اور سعادت ہے، کشمیری لال ذاکر نے اپنے قطعات کی کتاب کے لیے مجھے رائے لکھنے کو کہا ہے۔ بقول صوفی تبسم ع

کہاں میں، کہاں یہ مقام اللہ اللہ

یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے، ذاکر صاحب، اس وقت اُردو رہاں کے سب سے سینئر اور سب سے معتبر قلم کار ہیں۔ ان کی خوبیاں دو چند ہیں۔ وہ افسانہ نگار، ناول نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ یہ بجا کہ اُنھوں نے نثری ادب زیادہ تخلیق کیا ہے اور اُن کی کتابیں اُن کی عمر کے برسوں سے بڑھ کر سو (۱۰۰) کی گنتی تک پہنچ گئی ہیں۔ شاعری کم ہی ہے، مگر اس میں بھی حُسنِ سلیقہ اور روح میں اُتر جانے کا طریقہ پوری طرح موجود ہے۔ نثر سلیس ہے لیکن دل نشیں، شاعری سادہ ہے اور دل پذیر۔

اُردو ادب میں خصوصیت سے ایک روایت بہت مستحکم ہو گئی ہے، جب کوئی لکھنے والا مشہور اور مقبول ہو جاتا ہے اور تجربے اور نو عمر کے ساتھ اوپر والی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہ یا تو ڈکشن (لفظیات) پر زیادہ توجہ دیتا ہے یا ثقیل اور بوجھل ترکیبیں، استعارے اور مکالمے استعمال کر کے قاری کے لئے ابہام پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے، قاری تک ابلاغ ہو نہ ہو، میرے نقاد میرے فن کے ڈانڈے عالمی ادب سے ملا دیں گے۔

کشمیری لال ذاکر سادہ مزاج اور معصوم فطرت انسان ہیں، میں ایک بات پھر وثوق سے لکھ رہا ہوں، شخصیت کا اثر انساں کی تخلیقات سے ضرور جھلکتا ہے۔ وہ جتنا مصنوعی بنے گا، تحریروں میں ویسا ہی تصنع نمایاں ہوگا۔ ذاکر صاحب، دل کی بات اور سوچ کے اندار کو سیدھے سھاؤ بیاں کرتے ہیں، یہی وجہ ہے اُن کی تحریریں دل و جاں میں اُترتی جاتی ہیں اور دیر تک گھر کیے رہتی ہیں۔

آپ اندازہ لگائیں، ایک شخص نصف صدی سے بھی زیادہ، کم و بیش ساٹھ، ستر برس سے لکھ رہا ہے۔ ساتھ مکروہاتِ زمانہ بھی ہیں، سماجی تعلقات بھی ہیں، گھر گرہستی بھی ہے، اور سب سے بڑھ کر عشق کی برکتیں ہیں۔ کیا یہ حیران کن بات نہیں کہ اُن کی تازہ ترین تحریر بھی اُتنی ہی شگفتہ ہے جتنی برسوں پہلے تھی

---نہ تھکن کا احساس نہ کہیں اپنے آپ کو دہرانے کا عمل۔ بندہ حیرتی رہ جاتا ہے، اتنے نئے نئے تجربے، انوکھے مشاہدے اور اچھوتے جذبے کیسے پھوٹ پڑتے ہیں۔ سچ ہے

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہاں آپ بے شک خدا کے بجائے بھگوان استعمال کریں، مجھے اور کشمیری لال ذاکر کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

قطعہ نگاری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یوں کہہ لیں اُردو زبان کے عروج اور ترویج کے ساتھ ساتھ اُس نے بھی جنم لیا--- یہ پرانی بات ہے، قطعہ ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں اور شاعری سے پھسل کر یہ عام بول چال میں بھی چلا گیا اور دنیادار قطعۂ اراضی جیسے لاحقے بھی برتنے لگے۔ قطعہ آج کے دَور میں چار مصرعوں تک محدود ہو گیا ہے۔ کبھی رباعی کے قریب تر، کبھی غزل کے رنگ میں، پرانے شعراء نے جو کشمیری لال ذاکر سے بھی پرانے تھے، اُنہوں نے آٹھ آٹھ، دس دس شعروں کے قطعات بھی کہے ہیں۔ بظاہر وہ غزل یا نظم کے روپ میں نظر آتے ہیں، لیکن مرکزی خیال کی موجودگی اور آخری مصرعے کے کلائمیکس کی وجہ سے نقادوں نے اُنہیں قطعہ قرار دیا--- پھر تین چار دہائیاں پہلے تک غزل میں ایک دو شعر، جب ایک ہی مزاج لے آجاتے تھے، تو ان پر ''ق'' لکھ دیا جاتا تھا گویا، غزل میں ایک قطعہ بند بھی آ گیا۔

عرصہ تک اختر انصاری دہلوی، جوش ملیح آبادی، عدم، اور نریش کمار شاد جیسے شاعر باقاعدگی سے قطعہ کہتے رہے۔ جوش نے قطعے کو رباعی کے نزدیک رکھا اور پھر زیادہ رباعیاں ہی کہیں۔ فیض کے ہاں بھی قطعات مل جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں مشاعروں میں یہ عام رواج تھا، شاعر سینئر یا جونیئر شاعر، ایک روایت کے طور پر غزل سنانے سے پہلے دو چار، پانچ چھ قطعات ضرور ''ارشاد'' کرتا تھا۔

دراصل نظم نگاری نے قطعے کو پس پشت ڈال دیا۔ پھر کئی شاعروں نے تجربوں کے لئے ثلاثی اور تروینی کو متعارف کروایا۔ یہ تین مصرعوں کا ٹکڑا ہوتا ہے اور اس میں بھی آخری مصرع پوری بات کھولتا ہے۔ پھر جاپانی صنف ہائیکو نے بہت شاعروں کو لپیٹ میں لیا (ابھی تک لے رکھا ہے) پنجابی زبان کی مقبول صنف ماہیا اُردو شاعری میں دَر آئی گو اسے بھی کھلے بازوؤں سے قبول کیا گیا۔ اس سب کے باوجود قطعہ نگاری ختم نہ ہو سکی، نہ ہوگی۔ کئی برسوں سے روزنامہ اخبارات نے سیاسی، سماجی حالات پر قطعہ لکھوانے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس میں بہت سے نامور شاعروں نے طبع آزمائی کی، اور قطعہ نگاری کو زندہ و پائندہ رکھا۔

کشمیری لال ذاکر جس طرح اپنے افسانوں اور ناولوں میں مکالمہ کرتے ہیں، اور اس وسیلے سے

رومانس، محبت اور عشق کی کیفیات کو اُجاگر کرتے ہیں، وہی رویہ اور اسلوب اُنہوں نے قطعہ نگاری میں بھی اپنا رکھا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے، اُن کی غزل بھی اسی سلاست، ندرت، روانی، جولانی اور جوانی کی مظہر ہوتی ہے۔ اصل میں قطعہ نگار کشمیری لال ذاکر کو اس اکائی میں مقید رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ میری طرح جو لوگ اُن کے مستقل قاری اور مکمل نیازمند ہیں، اُن کے دلوں میں ذاکر ایک مہکار اور پیار کی طرح بسے ہوئے ہیں۔ اپنے وقار اور ذی معیار کے ساتھ۔

دیکھیں کیا حقیقت بیانی ہے، تعلّی اور خودنمائی کے تصنع کے بغیر ــــ

لفظ لفظ زندہ ہے میری ہر کہانی میں
سانس سانس خوشبو ہے میری خوش بیانی میں
وقت کی امانت ہیں، میری ساری تحریریں
میں یقین رکھتا ہوں اس کی حکمرانی میں

کسی کو سادھو سنت اور درویش کہنا آساں ہے۔ یہ کہنے والے کی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن کیا آپ نے سوٹڈ بوٹڈ سرادھو سنت یا درویش دیکھا ہے؟ جی، میں نے دیکھا ہی نہیں محسوس کیا ہے۔ آپ کو پرت اُلٹ کر اُن کا احوال بتاتا ہوں۔ ذاکر، سچ مچ درویش ہیں ــــ صفِ اوّل ہی نہیں، اس صف میں اوّل اوّل وہی نظر آتے ہیں، مگر مجھ ایسے بے نام سے بھی یوں انکسار سے ملیں گے، جیسے خدانخواستہ میرا مرتبہ اور مقام اُن سے بلند ہو ــــ اور یوں، تحریروں ہی کی حکمرانی اُن کا منصب نہیں وہ دلوں پر بھی حکمرانی کرنا جانتے ہیں۔ میں جو سرحد پار بستا ہوں، یقیناً اُن کے لطف و کرم سے یہ اب ہوتا اور اُن کی محبت و عنایت سے شاداب ہوتا رہتا ہوں۔ یہ عالی ظرفی اور خوش دلی کم کم اہلِ قلم کو ودیعت ہوتی ہے۔

قطعہ کہنے میں اُنہیں سہولت تو ہوتی ہی ہے، یہ بھی ماننا پڑے گا، یہ چار مصرعے کہہ کر اُنہیں سکوں بھی ملتا ہے۔ ایک خوشگوار آسودگی یادوں کی خنک آنچ اور محبت کی تپتی برف جیسی رات محسوس کرتے ہوں گے۔ کیسے نہیں کرتے ہوں گے۔ اُن کی کیفیت اور حالِ دل کا بیان پڑھ کر تو اہلِ دل کو اپنی محبتیں اور اپنی تمازتیں یاد آجاتی ہیں۔

یہ قطعات دیکھیں ــــ

بڑی شفیق، بڑی غم شناس لگتی ہیں
تمہارے شہر کی گلیاں، اُداس لگتی ہیں

وہ دردمند نگاہیں، جو چھن گئیں مجھ سے
کبھی کبھی تو تجھے آس پاس لگتی ہیں

آپ دل پر ہاتھ رکھ کر ایمان کی کہیں، کیا یہ آپ کے دل میں ہلچل نہیں مچا رہے، کیا دھڑکنوں میں لرزش نہیں ہوئی، کیا یادوں نے انگڑائی نہیں لی، کیا سوچوں نے گزرے لمحوں کے کواڑوں پر دستک نہیں دی کیا یہ قول فراق ایسا نہیں ہوا ع

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

یہی ایک مقبول شاعر کا کمال ہے، وہ اس مہارت اور اس طہارت سے شعر کہتا ہے، کہ ہر اہلِ دل اسے اپنی ہی روداد جاں اور مان لیتا ہے۔ یہ شرف بہت کم لکھنے والوں، خصوصاً شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔

یہ قطعہ دیکھیں اور دیانت سے تسلیم کریں، اس میں یونیورسل (عالمی) سچائی اور پیغام نہیں ہے۔

لفظوں سے تحریریں روشن ہوتی ہیں
لفظوں سے تقریریں روشن ہوتی ہیں
دنیا والو! لفظوں کی تعظیم کرو
لفظوں سے تقدیریں روشن ہوتی ہیں

کشمیری لال ذاکر کی قطعات نگاری کو سامنے رکھ کر اور اس صنف کے پس منظر میں جھانکتے ہوئے، میں ایک پوری کتاب لکھ لوں، تو پھر بھی شاید میں اُن کی سوچ، فکر، خیال، آدرش، کلپنا، سادھنا اور اُن کی شعری بوطیقا کو مکمل طور پر نتھار اور نکھار کر آپ کے سامنے پیش نہ کر سکوں، اُن کا فن آرادھنا ہے۔ اور میں، ان کا پجاری، ان کا سیوک اپنی آشاؤں سمیت اُن کی شرن میں رہنا پسند کرتا ہوں — بلاشبہ، ان کا فن لازوال اور وہ بے مثال ہیں — اُن کا یہ کہا، ستیم، شوم، سندرم سے میل کھاتا ہے۔

میں نے ذاکر ساٹھ برس سے اس گلشن کو سینچا ہے
قطرہ قطرہ خون دیا ہے، سرو و سمن کو سینچا ہے
یارو، مجھ سے میری حکایات کیا پوچھو گے، رہنے دو
میں نے قلم کے دریاؤں سے، وادیٔ فن کو سینچا ہے

اور فارسی والے کی زبان میں در یں چہ شک!

کشمیری لال ذاکر صاحب

اور

جناب راجندر پال ورما

کی

دوستی کے نام

مرحوم راجندر ورما کے بیٹے آشیش ورما کی جانب سے

۲۳۱ سیکٹر ۷ پنچکولہ۔ ہریانہ (فون ۹۸۱۴۰۰۹۸۶۶)

کرشن کمار طور

ذاکر اپنے قطعات کے آئینے میں

مشہور مفکر، دانشور اور ادیب کروچ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعری تین طریقوں کو اپنی معروضیت کے لئے اختیار کرتی ہے۔ اول شاعر اپنی ذات کا ڈراما خود پیش کرتا ہے، دوسرے شاعر خود نہاں ہوتا ہے اور دنیا کو ظاہر کرتا ہے اور تیسرے شاعر اپنے جذبات کے مظہر کے لئے کردار تخلیق کرتا ہے۔ اگر ہم اس قول صادق کی روشنی میں کشمیری لال ذاکر کے قطعات کا محاکمہ کریں تو ہمیں علم ہوگا کہ ان کے زیرِ نظر قطعات شعری پیش منظر میں کیا کیا گل بوٹے کھلاتے ہیں۔

شاعری، شاعر کی شخصیت سے ہم آہنگ ہو کر ایک متحرک مگر بنیادی قدر مہیا کرتی ہے۔ دراصل ہر تخلیق اپنے تخلیق کار کے چہرے پر پڑی نقاب کو الٹ دیتی ہے اور اس کا حقیقی چہرہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے لے آتی ہے۔ یہ دل کشی اور جاذبیت تب ہی ممکن ہے جب چہرہ نمائی کا رویہ صورت گری کے جامد اور متعین نظریوں کے برعکس ہو اور انساں کے دروں میں جھانکنے کی ایک ہمدردانہ سعی۔ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں فن کار کے منفی جذباتی تناؤ اور اس کے اثباتی، جاں گسل مگر پُر مسرت تحیر کے رنگ تخلیق کے کینوس پر روش ہوں گے۔

سلامتی کے لئے بھی پکارنا ہوگا
کبھی تو سولی سے ان کو اتارنا ہوگا
خزاں رسیدہ ابھی سے ہیں پھول گلشن میں
خود اپنے خوں سے اس کو نکھارنا ہوگا

سفر کے بارے میں کچھ اور گفتگو کر لیں
کہاں ہے درد کی منزل یہ جستجو کر لیں
بھٹک نہ جائیں کہیں راستوں کے موڑوں پر
چراغ راہ ذرا اپنے روبرو کر لیں

کشمیری لال ذاکر کے قطعات کی ایک خوبی ان کی پُر اسراریت ہے جو ان کے تخلیقی عمل کا ایک واضح اشاریہ ہے۔ ان کے ہاں انسانی تصورِ اطمینان کے احساس کی بجائے تحیر کے ذہنی خلفشار سے عیاں ہے۔ وہ اپنے قطعات میں ایک ایسی ماورائی فضا خلق کرنے کی کوشش میں معروف نظر آتے ہیں جہاں منظر اور پس منظر دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک عجیب طرح کے وجدانی تعلق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کا یہ ذاتی تجربہ تمام تر انسانی تجربوں کے سرخیل کے طور پر ظاہر اور نمایاں ہوتا ہے۔ اس تجربے میں بلاتر دّد اُن کی مخصوص لفظیات اور اصطلاحات معاون اور مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ذاکر کے ہاں اسرار لایعنیت کے مترادف نہیں ہے بلکہ وہ ایک انفرادی اظہار کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

میرا اپنا وجود کچھ بھی نہ تھا
درد کی کائنات اس کی تھی

وہ تھا ذہن و خیال کا مالک
میری ساری حیات اس کی تھی

ہم تو اکثر اُداس شاموں میں
تیر سے ہم کلام ہوتے ہیں

اور لب پر سلامتی کے لئے
کچھ حسینوں کے نام ہوتے ہیں

اردو سخن میں میر کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ اگر چہ محمد حسین آزاد نے ان کے تمام کلام کو آہ سے تعبیر کیا ہے جو کہ ظاہر ہے مبالغہ ہے۔ میر نے اپنی یاسیت کو اپنی تہذیبی گمشدگی اور احساسِ زیاں کی علامت کے طور پر اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے جو اس بیانیہ اسلوب کا شاہکار ہے۔ میر نے غم کو نہ صرف اپنے اندر جذب کیا ہے بلکہ اپنی اسطوری تہذیب کا نمائندہ بھی نمود کیا ہے۔ میر کی محرومیت نومیدی جاوید سے اثر انگیز ہے۔ کشمیری لال ذاکر نے اسی نفی سے اثبات کے کئی پیکر تراشے ہیں اور زندگی کے ہشت پہلو پیکریت کا محاسبہ کیا ہے۔

میر کے بعد اتنی شدت سے
کس نے غم کو غزل میں ڈھالا ہے

کسی نے اپنی اداس شاموں کو
مے کدوں کی فضا میں پالا ہے

میر جیسے نفیس لوگوں نے
زندگی کو وقار بخشا ہے
شام غم کے طویل لمحوں کو
چاندنی کا نکھار بخشا ہے

میر کو جب پڑھا یہی سوچا
ماہر نفسیات ہے وہ شخص
زندگی پر نگاہ ہے اس کی
رازدار حیات ہے وہ شخص

کروچ نے جیسا کہ ابتدائی سطروں میں عرض کیا گیا ہے، غنائی مظہر کے لئے شاعر یہ وصف ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنی ذات کا ڈراما خود پیش کرے۔ سارتر نے بھی اس وجود الذات کو انسان کی معراج قرار دیا ہے اور کیوں نہ ہو، موجودہ عصری زندگی کے بحران، بے جہتی، خود غرضی، خلفشار، اور بے اعتقادی نے ہمارے حالات اور کیفیات کو اس طرح پامال کیا ہے کہ اس سے نپٹنے کے آثار نظر نہیں آتے۔ آدمی اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے اور اس کا وجود لازمی طور پر محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی لئے جدید شعراء نے علامت پسندی کو اپنے شعری تشخص اور اظہار کا آئینہ بردار بنایا ہے۔ ذاکر نے بھی اپنے قطعوں میں اسی ذہنی خلفشار اور کرب و ریخت کو بڑی خوبصورتی اور بھرپور تکنیکی لوازمات سے آراستہ کیا ہے۔ انہیں علم ہے کہ خود ان کی ذات کی ایک بیرونی حیثیت ہے اور وہ دنیا میں رہ کر بھی اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دنیا ان کے لئے ایک وجود دیگر ہے اور وہ اسے تشکیک کی نگاہ سے دیکھنے میں حق بجانب بھی ہیں۔

سفر کو اپنے ذرا اور معتبر کر دیں
کہ رہنما ہی کو ہم اپنا ہم سفر کر دیں
مسافروں کو سر شام لوٹ لیتے ہیں

ابھی تو دن ہے ذرا ان کو باخبر کر دیں

یہ راستوں میں بھٹکنا ہی میری عادت ہے
کسی جگہ نہ ٹھہرنا ہی میری فطرت ہے
یہ رات دن کی مسافت تو توڑ دے گی مجھے
میں جانتا ہوں مگر یہ تو میری قسمت ہے

کشمیری لال ذاکر اُردو افسانہ نگاری کے منور ترین دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سنہری دَور میں کرشن چندر، منٹو اور بیدی کی تخلیقات سے جو روشنی اور توانائی حاصل ہوئی، اُس کی گواہ اُردو ادب کی تاریخ ہے۔ اُس خاص دَور میں کسی دوسرے افسانہ نگار کا، افسانے کے ذہین قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لینا مشکل تھا مگر کشمیری لال ذاکر نے یہ مشکل اپنے تخلیقی جوہر کی مدد سے آسان بنالی۔ متوسط اور زیریں طبقات سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو حد درجہ سچائی اور حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے۔ اور اُن کی نفسیات کا مطالعہ کمال گہرائی سے کیا ہے۔ پھر کشمیری لال ذاکر کا اسلوب دلآویز، اُس کی زبان صاف اور سلیس اور اُس کا اندازِ بیاں اتنا رواں ہے جیسے افسانہ پڑھنے والے کے ساتھ اُس کی دوستانہ گفتگو ہو رہی ہے اور یہ کسی افسانہ نگار کا معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

۔۔اِحمد ندیم قاسمی

مہندر پرتاپ چاند

فخرِ علم و ادب

سو سے زائد کتابوں کے خالق اور ہریانہ اردو اکادمی کے نہایت فعال سکریٹری پدم شری کشمیری لال ذاکر کا شمار ہریانہ ہی نہیں بلکہ بھارت و پاکستان کے صفِ اول کے ادباء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے انگریزی ادب میں ایم اے، اور بی ٹی کی اسناد لینے کے بعد تعلیم بالغاں وسماجیات میں خصوصی تربیت بھی حاصل کی۔ تیس سال تک پنجاب و ہریانہ کے محکمۂ تعلیم میں ممتاز عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۷۷ء میں یہ ہریانہ سرکار کے شعبۂ غیر رسمی تعلیمِ بالغاں کے صدر کے باوقار منصب سے عہدہ براہوئے۔

ذاکر صاحب ایک نہایت ہی وسیع النظر اور وسیع المطالعہ ادیب وشاعر ہیں۔ اردو، ہندی و پنجابی زبانوں میں آپ سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں ناول، افسانوی مجموعے، سفرنامے، ڈرامے، خاکے اور تعلیم، بالغاں و ماحولیات پر بھی کتابیں ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے سماجی و ثقافتی موضوعات اور حالاتِ حاضرہ پر مبنی کئی کہانیوں اور ناولوں کے دیگر علاقائی زبانوں میں ترجمے بھی کئے ہیں۔

علمی و ادبی تعلق سے اور ادبی و ثقافتی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے آپ کئی غیر ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں، جن میں سری لنکا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، امریکا، کنیڈا اور پاکستان کے تین دورے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ذاکر صاحب کی طویل علمی وادبی مجموعی خدمات کے اعتراف واحترام کے طور پر اب تک آپ کو دئے جا چکے انعامات و اعزازات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس میں صدر جمہوریہ ہند کے دستِ مبارک سے ''نیشنل غالب ایوارڈ'' (۱۹۸۶ء)، پاکستان سرکار کی طرف سے عطا کیا گیا پروقار ''نقوش ایوارڈ'' ۱۹۹۰ء، نائب صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ''نہرو لٹریسی ایوارڈ'' (۱۹۹۱ء) (ذاکر صاحب شمالی ہندوستان میں اس قومی ایوارڈ کو حاصل کرنے والے پہلے شخص ہیں) صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے دیا گیا ''پدم شری اعزاز'' برائے سال ۲۰۰۶ء، پنجاب سرکار کی طرف سے ''شرومنی ساہتہ کار ایوارڈ'' (۲۰۰۶ء) ہریانہ بورڈ کی طرف سے حال ہی میں دیا گیا ۲۰۰۷ء کا ''خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ'' اور صدر جمہوریہ

ہند کے دستِ مبارک سے عطا کیا گیا "نیشنل لٹریسی مشن یونیسکو ایوارڈ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کی علمی و ادبی دسترس اور صلاحیتوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پنجاب، عثمانیہ، دلی، حیدر آباد اور کشمیر کی یونیورسٹیوں میں پچھلے کچھ سالوں میں لگ بھگ نصف درجن اسکالرز آپ کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالے لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔

ذاکر صاحب ایک ہمہ گیر اور ہمہ صفت شخصیت کے حامل ہیں اور اپنی علمی و عملی صلاحیت، بصیرت اور طباعی و تجسس کے طفیل آپ نے ادب کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابی اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ بقول قرۃ العین حیدر صاحبہ "وہ اردو کے سچے اور بے لوث خادم ہیں اور آج کے دور میں ان اعلیٰ تہذیبی اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا تذکرہ بھی اب بے وقت کی راگنی سمجھا جاتا ہے۔"

ذاکر صاحب اپنی زندگی کی ۸۹ بہاریں دیکھ چکے ہیں اور عمر کی اس ڈھلان پر بھی آپ کا تخلیقی و تعمیری سفر رواں دواں ہے۔ اپنے فکری اظہار کے لئے انہوں نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی اشہب قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ "عکس رخِ گلبدن" کے نام سے آپ کے قطعات کا مجموعہ اسی بات کی ایک زندہ مثال ہے۔

ان قطعات کے موضوعات آپ کے شدید ذاتی تاثرات ہیں۔ ان تاثرات پر اس کے بے چین اور عمیق ذہن کا ردِ عمل اور اس میں گوناگوں کیفیات کی جلوہ گری صاف نظر آتی ہے، جسے انہوں نے ایک نئے شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی فکری ذاتی انکشاف کی تازگی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ غرضیکہ اس زمانے کی جذباتی، ذہنی، عملی و فکری زندگی کے کم و بیش تمام پہلوؤں کی ترجمانی ان قطعات میں ملتی ہے۔

ان کی نثر کی طرح ذاکر صاحب کی شاعری میں بھی احساس کی شدت، جذبے کا خلوص اور شعور کی بلندی ہے۔ کئی جگہ ان کے دھیمے لہجے، سادگی اور بشریت سے جو فضا ابھرتی ہے وہ قاری کے دل و دماغ پر گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ ان کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ، توازن اور جذبۂ ہمدردی کے ساتھ ساتھ دردمندی اور خیر سگالی کا احساس بھی قوی ہے۔

ذاکر صاحب نہ صرف حسنِ اظہار کے معاملہ میں بلکہ حسنِ فکر کے معاملے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ عصر حاضر کے تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف اپنی شاعری کو رفعتوں سے آشنا کیا ہے بلکہ اردو شاعری کو بھی نئی سمت دی ہے۔ ان کی اہمیت، ان کی فکر کی صداقت اور لہجے کی انفرادیت سے عبارت ہے۔ اسی لئے ان کے فن میں جو رچاؤ ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس کے اشعار

میں ایک نیا آہنگ ملتا ہے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ خود فرماتے ہیں۔

میں جس خیال سے سنورا ہوں، کون سنورے گا؟
میں جس خوص سے نکھرا ہوں، کون نکھرے گا؟
کسی کو ہے بھی سلیقہ چمن میں جینے کا!
میں جس سکوں سے بکھرا ہوں، کون بکھرے گا؟

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ ان کی نثری تحریروں کی طرح ذاکر صاحب کا یہ شعری مجموعہ بھی قبول عام کی سند حاصل کرے گا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ میری دعا ہے کہ انہیں عمرِ خضر عطا ہو اور خدائے بزرگ و برتر ان کی اچھی صحت کو اسی طرح برقرار رکھے تاکہ یہ اپنے رشحات قلم سے ادبی سرمایے میں اسی طرح بیش بہا اضافے کرتے رہیں۔ آمین!

کشمیری لال ذاکر ایک معروف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک جانے پہچانے شاعر بھی ہیں۔ ان کی زیادہ تر وجۂ شہرت ان کی افسانہ نگاری ہے۔ مگر غزل کے میدان میں بھی انہوں نے تازہ کاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ افسانہ نگاری میں ان کے کام اور مقام سے ہم سب واقف ہیں۔ وہ کہانی کی بنت کاری اور کردار کی پیش کش میں جس فنی بالیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے ہاں تخلیق کاری کا سلسلہ ابھی کافی دیر تک اسی بھرپور انداز میں جاری رہے گا۔

۔۔۔وزیر آغا

قطعات

○

تیری آنکھیں شراب خانے ہیں
زُلف تیری گھٹا ہے ساون کی
کھل رہی ہے یہ کس کے آنگن میں
ایک سُندر کلی مدھوس کی

○

سخت جاں بھی ہیں اور نازک بھی
درود کے باوجود جیتے ہیں
زندگی زہر ہے مگر ہم لوگ
چھان کر گیسوؤں میں پیتے ہیں

○

تیرے جمال کی پُرکیف راحتوں کی قسم
حدودِ کون و مکاں سے گزر بھی سکتا ہوں
میں جس خلوص سے جیتا رہا ہوں تیرے لئے
اُسی خلوص سے اے دوست مر بھی سکتا ہوں

○

تمہاری یاد کے ٹھہرے ہوئے دُھندلکے میں
تمہارے خواب بڑی شان سے اُبھرتے ہیں
تمہارا غم ہی تمہاری وفا سے اچھا ہے
کہ اس سے داغ نکھرتے ہیں، دل سنورتے ہیں

○

مرے عزیزو، مرے دوستو، مرے یارو
قلم کا رشتہ بہت ہی عظیم رشتہ ہے
یہ رشتہ جو کہ امانت ہے اپنے کلچر کی
بڑا ہی پاک، بڑا ہی قدیم رشتہ ہے

○

کبھی جو ہم نے جلائے تھے دوستی کے چراغ
انہیں چراغوں کو پھر سے جلانے آیا ہوں
تمہارے دوست تمہیں اب بھی پیار کرتے ہیں
مرے عزیزو، تمہیں یہ بتانے آیا ہوں

○

گلوں کا، نغموں کا، خوابوں کا، چاندنی کا سلام
کھلی فضاؤں کا، خوشبو کا، روشنی کا سلام
گلی گلی کا یہ جوگی، نگر نگر کا فقیر
تمہارے شہر میں لایا ہے زندگی کا سلام

O

میں جس خیال سے سنورا ہوں، کون سنورے گا
میں جس خیال سے نکھرا ہوں، کون نکھرے گا
کسی کو ہے سلیقہ، چمن میں جینے کا
میں جس سکوں سے بکھرا ہوں کون بکھرے گا

O

بڑی شفیق، بڑی غم شناس لگتی ہیں
تمہارے شہر کی گلیاں، اُداس لگتی ہیں
وہ درد مند نگاہیں، جو چھن گئیں مجھ سے
کبھی کبھی تو مجھے آس پاس لگتی ہیں

O

کون سی برم میں شمعوں کی رہاں لے جاؤں
کون سے شہر میں خوشبو کی دُکاں لے جاؤں
مجھ کو سمجھاؤ، مرے یارو، مرے شیشہ گرو
اپنے یہ شیشہ بدن خواب کہاں لے جاؤں

O

مسئلے لے کے کوئی آج خفا ہو جاؤ
اس بھرے میلے میں تم، مجھ سے جدا ہو جاؤ
درد کی شمع لئے، چاروں طرف بھٹکا کروں
میرے افسانوں کے کردارو خدا ہو جاؤ

○

شعورِ بندگی مجھ کو نہیں ہے
اَنا کی تیرگی میں جل رہا ہوں
مرے مولا! مجھے دے انکساری
غرورِ آگہی میں جل رہا ہوں

○

ہم کو یقیں نہیں ہے، مے و جام و مینا کا
رشتہ ہے میکدے سے تو یاروں کے نام سے
رکھے ہیں جس کے پتّے ابھی تک خطوں کے ساتھ
ہم جانتے ہیں اُن کو چناروں کے نام سے

○

میں دشت دشت میں پھیلا ہوں، جستجو کی طرح
میں پھول پھول پہ برسا ہوں، رنگ و بو کی طرح
میں ہونٹ ہونٹ پہ مہکا ہوں، گیت کی مانند
میں قلب قلب میں دھڑکا ہوں، آرزو کی طرح

میں گام گام پہ بکھرا خنک ہوا کی طرح
میں دشت دشت میں بھٹکا کسی صدا کی طرح
اب آ گیا ہوں ترے پاس، جذب کر لے مجھے
ہتھیلیوں میں، مہکتی ہوئی حنا کی طرح

اُسے خلوص سے چاہا، قصور میرا تھا
نکھارا جس نے اُسے، وہ شعور میرا تھا
وہ کرچیوں پہ جو چمکا، وہ خون کس کا تھا
وہ آئینہ جو ہوا چور چور، میرا تھا

○

میں نے ذاکر ساٹھ برس سے، اس گلشن کو سینچا ہے
قطرہ قطرہ خوں دیا ہے، سرو سمن کو سینچا ہے
یارو! مجھ سے میری حکایت کیا پوچھو گے، رہنے دو
میں نے قلم کے دریاؤں سے وادیٔ فن کو سینچا ہے

○

بہت سے جلوے تصور کی دین ہیں ہمدم
بہت سے پردے خود اپنی نظر کے ہوتے ہیں
وہ زخم ہم جنہیں اپنا سمجھ نہیں پاتے
بہت سے اُن میں دلِ معتبر کے ہوتے ہیں

○

جہاں جہاں بھی کوئی برق منتظر تھی مری
جہاں جہاں بھی کسی آشیاں کو جلنا تھا
وہیں وہیں پہ مقدّر لئے پھرا مجھے
جہاں جہاں بھی مرے گلستاں کو جلنا تھا

○

بڑی ادا سے، بڑے بانکپن سے آئے ہیں
حسیں چہروں کی اک انجمن سے آئے ہیں
ہمارے پاس ہیں شبنم کے، چاندنی کے پیام
ہمیں مِلو کہ ہم اُس کے وطن سے آئے ہیں

○

وہ پھول پھول میں ہے، اوس میں، شراب میں ہے
وہ سانس سانس میں ہے، چاندنی میں، خواب میں ہے
وہ شخص جو کہ کبھی، روشنی کا دریا تھا
اب عکس ریز، مری روح کی کتاب میں ہے

○

گلوں کا، نغموں کا، ہواؤں کا، چاندنی کا سلام
کھلی فضاؤں کا، خوشبو کا، روشنی کا سلام
گلی گلی کا یہ جوگی، نگر نگر کا فقیر
تمہارے شہر میں لایا ہے، زندگی کا سلام

○

وہ میرا دوست ہے، میرا حبیب ہے یارو
دِل و نگاہ کے، بے حد قریب ہے یارو
تمہارے واسطے، وہ ایک آدمی ہے فقط
وہ میرا سایہ ہے، میرا نصیب ہے یارو

Heartiest wishes on the 90th birthday

To

Shri Kashmiri Lal Zakir

With prayers to God

For his long, healthy and prosperous life

&

Many many returns of the day

Om Parkash Sharma "GHAFIL"

Kothi No 22 , Sector 19-A Chandigarh

اختتامیہ

اب تو اپنی چھاؤں میں بیٹھا ہوں

آج میں اپنی زندگی کے آخری دہے میں داخل ہو رہا ہوں۔ زندگی کے دریا نے کافی طویل سفر طے کر لیا ہے۔ بہت توڑ پھوڑ بھی ہوئی ہے۔ شکست و ریخت کا عمل اب بھی جاری ہے۔ سمندر کے نزدیک پہنچ کر لمحہ بھر کو رُک گیا ہوں اور اپنے ماضی کا جائزہ لے رہا ہوں۔ کل ملا کر میرا سفر کامیاب رہا ہے۔ اب تو منزل کے نزدیک پہنچ گیا ہوں۔ کسی بھی لمحہ یہ سفر اختتام پذیر ہو سکتا ہے۔ زندگی کا دریا وسیع و عریض اور بے پایاں سمندر کا لامعنی ساحر بننے والا ہے۔ میں اپنے آپ میں ایک دم مطمئن ہوں اور اُفق پر لطریں گاڑے سورج کو دیکھ رہا ہوں۔ جس کا رنگ لمحہ بہ لمحہ سرخ ہوتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے اس کی بھرپور روشنی میری روح میں بھی داخل ہو رہی ہے اور میرے دل و دماغ بھی روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ میں اس روشنی میں آخری بار اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزویات کو دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں اور اپنے آپ میں مطمئن ہو رہا ہوں

میری جنم کنڈلی میں کہیں کوئی غلطی ضرور رہی ہے کیونکہ دن اور مہینہ تو ٹھیک ہے لیکن سال ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا جب ''برگھو سنگھتا'' والے جوتشی رام کرشن نے اس میں سے میری کنڈلی ڈھونڈنی چاہی۔ کہا جاتا ہے کہ رگھورشی نے ہزاروں کی تعداد میں جنم کنڈلیاں رچی ہیں۔ لگن اور سے ٹھیک ہو تو جوتشی رام کرشن اپنے گھر کے زمین دوز کمرے میں داخل ہو کر اُن کنڈلیوں کے بڑے سارے ڈھیر میں سے اصلی کنڈلی نکال لاتا ہے۔ زمین دوز کمرے کے باہر ہر گھڑی ایک بڑا سا تالا پڑا رہتا ہے اور اُسی وقت کھلتا ہے جب کوئی بھگت اپنی کنڈلی ملوانے آئے اور پچاس روپے راج جوتشی رام کرشن کی ہتھیلی پر رکھ دے۔ بہت سوچ وچار کے بعد راج جوتشی نے یہ کہا کہ میری جنم کنڈلی کا سال غلط ہے، تاریخ تیرہ ہے، مہینہ اپریل کا ہے مگر سال اُنیس سو اُنیس نہیں، اُنیس سو بیس ہونا چاہیے۔ تاہم میں اسے اُنیس سو اُنیس ہی مانتا ہوں کیونکہ میری جنم کنڈلی کشمیر کے ایک بہت ہی مشہور جوتشی سے میرے والد محترم نے اُس وقت بنوائی تھی جب وہ ریاست پونچھ میں سرکاری ملازم تھے اور خاص دبدبے سے رہتے تھے۔ مجھے آج بھی اس بڑی حویلی کا بہت بڑا دروازہ یاد آتا ہے جس پر بہت بڑے بڑے نکیلے کیل جڑے تھے جیسے کہ قلعے کی ڈیوڑھی پر ہوتے ہیں۔ دروازے کو بند کر دیا جاتا تھا اور ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی رہتی تھی

جس کے ساتھ پولیس کا ایک سپاہی بندوق سنبھالے کھڑا رہتا تھا۔ اس حویلی کے اندر ہی میرا بچپن گزرا ہے جس کے چاروں طرف بہت ہی اونچی دیواریں تھیں اور جس کے اندر بے شمار کمرے تھے، سب چھوٹی اینٹ کے بنے ہوئے اور جس کے ایک کونے میں دو بگھیاں کھڑی رہتی تھیں اور اس کے ساتھ نہایت ہی خوبصورت سفید گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ یہ بگھیاں راجہ صاحب کی تھیں جو صرف اُنہیں کے استعمال میں آتی تھیں۔ البتہ جب وہ اُن میں بیٹھ کر بازار سے گزرتے تو لوگوں کا حق تھا کہ وہ انہیں دیکھیں اور گھوڑوں کے سموں کے بازار میں لگے مستطیل پتھروں سے ٹکرانے کی گونج سنیں اور عقیدت سے اپنے سر جھکا لیں۔

زندگی کے ابتدائی دور میں مجھ پر کئی متضاد کیفیتیں اثر انداز رہیں   بہت نازک اور بہت بوجھل
بڑی لطیف اور بڑی کرخت   بڑی وسیع اور اتنی ہی محدود   بہت دلچسپ اور بہت تھکا دینے والی



کشمیری لال ذاکر اپنے کنبے کے ساتھ اپنی ۹۰ویں سالگرہ مناتے ہوئے۔

بھی۔ ایک طرف میری والدہ تھیں، بڑی نازک، شائستہ، حساس اور زودرنج جو مجھے بے حد پیار کرتی تھیں، اس لیے بھی کہ میں پہلوٹھی کا بچہ تھا اور اس لئے بھی کہ شفقت اور محبت اُن کی طبیعت کا جزو تھیں۔ جتنا پیار مجھے ملتا تھا اُتنا ہی میرے ساتھ کھیلنے والے کسی ملازم کے بچے کو بھی۔ آس پڑوس کے بچوں سے کھیلنا مجھے ایک مدت تک نصیب نہیں ہوا کیوں کہ اس حویلی سے باہر جانا مشکل تھا اور اس کے اندر بہت ہی کم لوگوں کو آنے کی اجازت تھی، چنانچہ میرا ساتھ چھوٹے درجے کے ملازموں کے بچوں سے رہتا تھا جنہیں میں

پیٹ بھی سکتا تھا اور جن سے ناانصافی بھی کر سکتا تھا لیکن ان شروع کے برسوں میں ماں کی انصاف پسندی اور شائستگی مجھ پر اثر انداز نہ ہوتی تو میری ذہنی ساحت خاصی مختلف اور غلط بھی ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف والد محترم کی سخت گیر طبیعت تھی جس میں زیادہ دخل ان فرائض کا تھا جو انہیں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں نبھانے پڑتے تھے۔ میں نے انہیں اکثر غصہ میں ہی دیکھا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں ان سے اس طرح نہ کھل سکا جس طرح اپنی والدہ سے کھلا ہوا تھا۔ وہ مجھے گود میں لے کر پیار کرتے تو میں پھر بھی اتنا خوش نہ ہوتا جتنا ماں کی ایک ہلکی سی مسکان پر ہوتا تھا۔ ماں کو میں وسعت، روشنی اور بلندی کا مظہر مانتا رہا ہوں۔ جب وہ مجھے حویلی کی کھلی چھت پر لے جاتی اور چنداں ماما کی طرف اشارہ کر کے آسمان کی وسعتیں اور اس کی بلندیاں اور اس میں پھیلی ہوئی روشنی دکھاتی تو میرا من خوش ہو اُٹھتا، اس لئے مجھے آج بھی رات کو چھت پر گھومنا اور ستاروں کو تکتے رہنا پسند ہے۔ مجھے حویلی کے اندر کھلے ہوئے پھولوں کی دلکشی اور خوبصورتی نے بھی متاثر کیا اور قلعے جیسی اونچی دیواروں کی قید نے بھی۔

میں اُس دن اور شاید اُس گھڑی پیدا ہوا تھا جب ہماری قومی زندگی پر ایک بہت بڑی آفت ٹوٹی تھی اور ہمارے ملک کو ایک عظیم اور ناقابل فراموش حادثہ پیش آیا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام۔ جنرل ڈائر کی گولیوں نے نہتے ہندوستانیوں کے سینے چھلنی کئے اور جنس، عمر اور مذہب کا کوئی امتیاز روا نہ رکھا اور بدیشی حکمرانوں کے ماتھے پر خون کا ایک ایسا بھرپور داغ لگایا جس کی چمک جنگ عالمگیر کے بھاری طوفان اور ہیروشیما پر گرائے ایٹم بم کے دم گھونٹ دینے والے دھوئیں میں بھی مدھم نہ پڑی۔

میں مسئلہ تناسخ میں یقین رکھتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ میرے جسم میں بھی جلیانوالہ باغ کے کسی ایسے ہی زخمی کی روح داخل ہوئی ہے جو پانی کی ایک بوند تک کو ترستا اور زخموں میں اُٹھتی ٹیسوں سے اُلجھتا ہوا انسانی لاشوں کے ڈھیر کے نیچے دبا سسکتا ہوا مر گیا دل میں ہزاروں تمنائیں اور حسرتیں لیے ہوئے۔ شاید اس لئے میری روح کو سکون نہیں۔ ایک دائمی اضطراب میرے ذہن و دل کو کریدتا رہتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی دور میں اثر انگیز متضاد کیفیتوں نے مجھ میں Day Dreaming کی عادت ڈال دی۔ نفسیاتی طور سے میں ایک Introvert بن گیا۔ تعلیم کے دنوں میں جب شام کی کھیلیں لازمی تھیں اور غیر حاضر ہونے والے طلباء کو دُگنا جرمانہ کیا جاتا تھا، میں حاضری لگوا کر پرنس آف کالج جموں کے پہلو میں بہتی ہوئی نہر کے کنارے گھومتا رہتا اور خنک ہوا کے لطیف جھونکوں کا لطف اُٹھاتا رہتا۔ کھیل کے وسیع میدانوں میں گونجتا ہوا شور ضرور مجھ تک پہنچتا لیکن میدان میں کھلاڑیوں کے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑنے کا نظارہ مجھے دکھائی نہ دیتا اور اگر کبھی کھیل کے میدان میں داخل ہو بھی جاتا تو سب سے پیچھے رہ کر بھی یہی سمجھا کرتا کہ میچ میں نے

ہی جیتا ہے اور جیت کا سہرا میرے ہی سر تھا۔ فتح کے اس یقین نے مجھے زندگی کی مثبت قدروں کا پرستار بنا دیا۔ میں تخریب کے ہر پہلو میں تعمیر کی روشنی دیکھتا ہوں اور فن کی Positive Values کا قائل ہوں۔ شکستوں اور ناانصافیوں سے قنوطیت کا درس نہیں لیتا، رجائیت کا سبق لیتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ دنیا کے سبھی شہری اچھے ہیں، پاکباز ہیں، عصمتوں کے محافظ ہیں اور اپنے بچوں کے لئے ایک حسین مستقبل کے طلبگار ہیں، یہ کبھی کبھار کے تخریبی جذبے، یہ جنگیں، یہ منفی قوتیں تو محض Cross Currents ہیں جو مجموعی طور پر دریا کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ میں اپنے افسانوں ڈراموں اور ناولوں کے لئے اکثر ایسے ہی کردار چنتا ہوں جو ذہنی لحاظ سے مطمئن نہیں ہوتے جن کی روحیں بےقرار ہوتی ہیں جن کے دماغ میں اُلجھنیں ہیں، جن کی نجی زندگی شکستوں کا ایک پہاڑ ہے، لیکن وہ اس پہاڑ پر کھڑے ہو کر نیچے پھیلے فنا کے بے کنار سمندر میں کود کر جان نہیں گنواتے بلکہ سب سے اُونچی چوٹی پر کھڑے ہو کر اُفق سے طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھتے ہیں جس کی کرنیں انہیں زندگی، روشنی اور حرارت کا پیغام دیتی ہیں۔ وہ اس چوٹی سے دھیرے دھیرے نیچے اُترتے ہیں، فنا کے عظیم سمندر کے پھیلاؤ کو ایک بار دیکھتے ہیں، ان کے اُداس ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور وہ ایک بار پھر کسی نئی جدوجہد کا آغاز کر دیتے ہیں۔ میرے کردار مرتے کم ہیں، مرمر کے زندگی کو تلاش کرتے ہیں اور جب انہیں زندگی کی یہ رمق کسی مسکراہٹ، کسی کلی، کسی کرن، کسی لہر میں مل جاتی ہے تو اُسے اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔

مجھے ماضی سے بڑا پیار ہے، یہ شاید اچھی بات نہیں لیکن میں ماضی کا آنچل تھامے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا اور آپ یقین جانئے کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے بستر میں لیٹے ماضی کے لمحوں کی یاد بے حد سکون دیتی ہے، قوت بخشتی ہے اور اُتساہ بڑھاتی ہے کم سے کم میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماضی کی کسی تلخ یاد کو دہرا کر رات کی تاریکی اور خاموشی میں بند آنکھوں کے پپوٹوں سے جو ایک چھوٹا سا آنسو باہر نکل آتا ہے، وہ روح کی گہرائیوں سے نکلا ہوا زہر ہے، زہر جب نچڑ جائے تو من کی کیفیت وہ ہوتی ہے جو خزاں رسیدہ بوٹے کی ہوتی ہے، جب اسے بہار کے ہاتھ مس کر جاتے ہیں، اس کی نس نس میں زندگی رقص کرنے لگتی ہے۔

مذہبی جنون کا میں قائل نہیں، جنم سے ضرور ہندو ہوں اور برہمنوں کی ایک اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہوں لیکن اپنے لئے کوئی فخر کی بات نہیں سمجھتا، محض اتفاق مانتا ہوں۔ میرے مسلمان دوستوں کی تعداد اگر ہندو دوستوں کی تعداد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ خدا کی ہستی سے منکر نہیں، اسے مانتا ہوں لیکن اپنے ڈھنگ سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم سے کوئی ایک بڑی طاقت بھی ہے جو ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن یہ اثر مجموعی ہے انفرادی نہیں۔ ایک ملک اور ایک قوم تو اس کے لئے ضرور اہمیت رکھتی ہے لیکن فرد

کی کوئی وقعت نہیں، وہ بڑی طاقت صرف وہی چھین سکتی ہے جو لاکھوں انسانوں کے منھ سے نکلیں اسے صرف ان آنسوؤں کا احساس ہے جو کئی ہزار آنکھوں سے بہیں۔ اسے فقط ان دعاؤں کی قدر ہے جو کروڑوں انسان مل کر کریں۔ ایک انسان اس کے لئے صرف نہ کے برابر ہے، فرد کی کراہ، دُعا، عبادت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خدا کو متاثر کرنے کے لئے ایک عالمگیر مذہب کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا مذہب جس میں اقتصادی، سماجی، نسلی اور کلچرل امتیاز روا نہ رکھا جائے، جس میں ہر انسان کو انسان کی طرح جینے، پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کے حقوق اور وسائل حاصل ہوں، جسے کوئی خاص لیبل لگا کر بدنام نہ کیا جائے۔ خدا ہے ضرور۔ لیکن ساتویں آسماں سے بھی کہیں اوپر بسنے والا جو مخلوق کی چھوٹی موٹی تکالیف کو



گورنر تمل ناڈو عالی جناب سرجیت سنگھ برنالہ، گورنر ہریانہ عالی جناب ڈاکٹر اے آر قدوائی کے ساتھ
کشمیری لال ذاکر اور ان کی صاحبزادی ڈاکٹر کملیش موہن

محسوس نہیں کر سکتا۔ اسے انسان کی مجبوریوں کا احساس دلانے کے لئے کسی زبردست بھونچال کے جھٹکے کی ضرورت ہے۔

اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ مذہب ایک نجی تعلق ہے جو کسی انسان کا اپنے خدا، بھگوان یا پیغمبر سے ہو سکتا ہے۔ اسے ایک ذاتی ضرورت سمجھ کر اپنے ہی تک محدود رکھنا چاہیے، اپنے مذہبی اُصول اور عقائد دوسروں پر نہیں ٹھونسنے چاہئیں۔

زندگی کے ابتدائی دور میں اُبھرے ہوئے Day Dreaming کے جذبے نے اور تو خیر کئی قسم کے نقصان پہنچائے ہیں لیکن اس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ کتابیں پڑھنے کا شوق شاید اسی کا ردِّ عمل ہے

لیکن یہ بھی ایک مصیبت۔ کتاب کے عنوان سے زیادہ متاثر ہوتا ہوں۔ کتابوں کے عنوان چننا بذاتِ خود ایک آرٹ ہے۔ یہی حال کتابوں کا بھی ہے۔ اچھے عنواں کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ کتاب بھی ضرور اچھی ہوگی اور فرسودہ سا معمولی عنواں اس بات کا ہرگز غماز نہیں کہ کتاب کے اندر جو کچھ ہے وہ بھی معمولی ہے۔ اسی لئے کئی بار بہت پرانے اور اچھے لکھنے والوں نے ایسا کیا ہے اور نئے لکھنے والوں نے ہمت بندھائی ہے۔

میری ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں کشمیر میں تھا۔ قبلہ آثر لکھنوی وہاں وزیر ترقیات تھے۔ میں نے جو چند برس اُن کی صحبت میں گزارے ہیں وہ میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ وہ میرے شعر دیکھتے بھی تھے اور مجھے مشورہ بھی دیتے تھے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ شعر میں نہیں کہہ سکتا۔ اسے کچھ اور وسعت کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب ہے میں اپنی بات اختصار میں نہیں کہہ سکتا، چنانچہ میں نے کہانی لکھنی شروع کی۔ آثر صاحب نے میری کہانیاں بھی سنیں اور مجھے یہ بھی مشورہ دیا کہ انہیں چھپنے کے لئے بھیجوں، چنانچہ میں نے اپنی سب سے پہلی کہانی ''الگ الگ راستے'' ہمایوں، لاہور میں بھیجی۔ یہ بات غالباً سن تینتالیس کی ہے۔ کہانی بھی چھپی اور اس کے ساتھ بہت سے خطوط بھی آئے۔ میری ہمت بندھی، اُپندر ناتھ اشک جموں آئے انہیں اکھنور جانا تھا، 'قیدِ حیات'، ڈرامے میں اکھنور کی فضا نہایت دلکشی سے جلوہ فگن ہے۔ اس دوران میری دو ایک کہانیاں 'ہمایوں' میں چھپ چکی تھیں، انہیں میری کہانیاں پسند آئیں۔ کہانی کے بارے میں مجھے اشک صاحب سے بڑی مدد ملی۔ اشک صاحب نے کہانی کے سلسلے میں کئی بڑی خوبصورت باتیں بتائیں اور میرا یہ خیال کہ مجھے شاعری چھوڑ کر نثر میں کام کرنا چاہیے اور بھی تقویت حاصل کر گیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے متعدد پرچوں میں، میں نے لکھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ کسی بھی ایڈیٹر نے میری کوئی کہانی کبھی واپس نہ کی تھی حالانکہ شروع شروع میں لکھنے والوں کو یہ دقت پیش آتی ہے، ہاں ایک بار ایک کہانی عرش ملسیانی صاحب نے ضرور واپس کی تھی جو میں نے 'آجکل' کے لئے بھیجی تھی لیکن اس کا میں نے برا نہیں مانا تھا کیونکہ عرش صاحب بڑے شاعر ہیں۔ لیکن افسانے اور شعر میں ایک فرق ہے جسے ہر اچھا شاعر شاید نہیں سمجھ سکتا۔ جیسا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر اچھا افسانہ نویس اچھے شعر کو پرکھ سکتا ہو۔ خود کرشن چندر نے بھی اسے قبول بھی کیا ہے۔ لیکن جب بلونت سنگھ کہانیوں کے حصے کو دیکھنے لگے تو انہوں نے میری کہانیاں مجھ سے جھگڑ جھگڑ کر اور رعب گانٹھ کر حاصل کیں اور 'آجکل' میں چھاپیں۔ بلونت سنگھ تھے ذرا اکھڑ قسم کے آدمی۔ ویسے ڈیل ڈول کے بھی اچھے تھے، اس سے دبنا بھی پڑتا تھا۔ انہوں نے میرے ایک مجموعے کا

دیباچہ بھی لکھا اور میرے بارے میں کسی مضمون میں یوں کہا کہ ''کشمیری لال ذاکر اُردو ادب کے میر ہیں۔'' یہ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا۔ اُپندر ناتھ اشک نے میری کہانیوں کے بارے میں لکھتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ میری کہانیوں کی فضا کو محسوس کرکے اُنہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ ایسی ہی فضا ہے جیسی چیخوف اپنے ڈراموں میں اُبھارتا ہے۔ انہوں نے ایک خاص کہانی 'جوہڑ' کا ذکر بھی کیا تھا، جو اُس زمانے میں شیام سندر پرویز کے رسالے 'شعاعیں' میں چھپی تھی۔ سہیل عظیم آبادی نے ایک بار میرے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا، ''نئے افسانہ نگاروں میں کشمیری لال ذاکر شاید سب سے زیادہ سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔'' مجھے اُن کی رائے سے اتفاق ہے کیونکہ سنجیدگی کا عنصر شروع سے ہی میری شخصیت پر اثر انگیز ہو گیا تھا جو اَب تک قائم ہے۔ میں کہانیوں میں سنجیدگی کو پسند کرتا ہوں اس لئے میرے لکھنے کی رفتار بہت کم ہے۔ میں اُس وقت لکھتا ہوں، جب واقعی مجھے لکھنا ہوتا ہے۔ میں صرف اس لئے نہیں لکھتا کہ میرے کسی دوست کو اپنے پرچے کے لئے کسی غیر مطبوعہ کہانی کی ضرورت ہے اور میں اسے ناراض نہیں کر سکتا۔ جب تک کسی کہانی میں زندگی کا کوئی فلسفہ سامنے نہ آئے کسی نظریے کی تشریح نہ ہو مجھے نہیں جچتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ کہانی میں پلاٹ ضرور ہونا چاہیے، لیکن کئی کہانیاں بڑے مضبوط پلاٹ کے باوجود بھی کمزور رہ جاتی ہیں۔ لیکن کچھ کہانیاں جن میں پلاٹ کو اہمیت نہیں دی گئی بڑی کامیاب رہتی ہیں۔ بات اتنی ہے کہ لکھنے والے کے پاس کچھ کہنے کو ضرور ہونا چاہیے۔ کوئی ایسی بات جو زندگی کی زبان سے نکلی ہو اور جو اس کے کسی راز کو عیاں کرتی ہو، راز جھکی ہوئی نگاہ سے بھی عیاں ہو جاتا ہے اور حیا کی سرخی سے بھی۔ اس کا اظہار لبوں کی ہلکی جنبش سے بھی ہو سکتا ہے اور دھڑکن سے بھی۔ راز سرگوشی میں بھی کہا جا سکتا ہے اور پورے گلے کی آواز سے بھی۔ اس کا انحصار ہے راز افشا کرنے والے پر۔ بس یہیں فرق پڑ جاتا ہے، تحریروں میں، اشاروں اور کنایوں میں بھی باتیں ہو سکتی ہیں اور چھت پر کھڑے ہو کر اونچی آواز سے بھی۔ کئی چلا کر کامیاب ہو جاتے ہیں، کئی زیرِ لب گنگنا کر۔ اسٹائل کوئی ہو لیکن زندگی کی ترجمانی ضرور ہو۔

ادبی زندگی کا آغاز میں نے شاعری ہی سے کیا تھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ خوش قسمتی سے مجھے شروع ہی سے نواب جعفر خاں اثر لکھنوی صاحب کی رہنمائی حاصل ہو گئی۔ انہی کی سرپرستی میں میری اُردو زبان کی لطافتوں، نزاکتوں اور رعنائیوں سے آشنائی ہوئی جو رفتہ رفتہ عشق کی حد تک پہنچ گئی۔ میری تعلیم اور درس و تدریس کا ذریعہ تو انگلش لٹریچر رہا۔ لیکن ادب کی تخلیق میں نے اُردو ہی میں کی۔ کچھ دیر کے بعد میری زیادہ تر توجہ افسانے، نثر اور ڈرامہ نگاری پر رہی۔ میرا ناول ''کرماں والی'' جب نیشنل اسکول آف ڈرامہ، دہلی نے ایم کے رینہ کی ہدایت کاری کے لئے ایڈپٹ کیا تو اُس نے ڈرامے کی دنیا میں تہلکہ مچا

دیا۔ لیکن اس دوران شاعری کے دو مجموعے "الفاظ بولتے بھی ہیں" اور "شیشہ بدن خواب" شائع بھی ہوئے اور مقبول بھی ہوئے۔

سکریٹری ہریانہ اُردو اکادمی کی حیثیت سے مشاعروں کا اہتمام کرتا رہتا ہوں گرچہ مشاعروں میں اپنی شرکت کم ہی رہتی ہے۔ میرا نام والدین نے کشمیری لال رکھا، نام جیسا ہے وہ ظاہر ہی ہے اس کی تعریف میں کیا کروں؟ بہت دن تک اس کی غرض وغایت جاننے کی کوشش کی۔ آخر معلوم ہوا کہ میرے دور کے تین چار چچا تھے ان کے نام لاہوری لال، پشاوری لال، ولایتی لال تھے۔ میرا گھرانہ ٹھیٹھ گاؤں کے زمینداروں کا گھرانہ تھا۔ ہل اور کھیت اور فصل سے تعلق رکھنے والا، میرے کسی چچا نے لاہور یا پشاور یا ولایت نہیں دیکھا تھا لیکن نام اُن کے بڑے رعب دار تھے، والدین میں کانفرنس ہوئی اور صدارت کے فرائض میری پھوپھی جان نے انجام دیئے۔ سوچا گیا کہ اوروں نے اپنے نام کے ساتھ ویسے ہی شہروں کا دم چھلا لگا رکھا تھا لیکن میرا تو کشمیر سے تعلق رہا تھا۔ میری تو کشمیر میں پرورش و پرداخت ہو رہی تھی، وہیں پل رہا تھا اور غالباً وہیں جوان ہوں گا، کیوں نہ میرا نام کشمیری لال رکھا جائے تا کہ میرے دور کے چچاؤں کو رشک آئے۔ انہیں رشک آیا یا نہیں، یہ تو کبھی مجھے دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوئی لیکن اپنے نام سے مجھے چڑ ہو گئی اور اس چڑ کے ساتھ ساتھ ہی شاید میرے ذہن نے ایک شاعر یا ایک ادیب کی روپ ریکھا بنانا شروع کر دی، میرا ذوق مطمئن ہوتا گیا۔ مجھے خوبصورت نام پسند آنے لگے۔ نرم طبیعت کے لوگ اچھے لگنے لگے، رنگ اور بو سے ایک راحت سی ملنے لگی اور پھر ایک روز میں شاعر بن گیا۔ شعر تو کئی کہے لیکن یہ شعر میرا پہلا شعر ہے جسے میں نے بزمِ ادب جموں و کشمیر کی ایک محفل میں پڑھا جس کی صدارت جناب عبدالسمیع پال اثر صہبائی مرحوم کر رہے تھے۔ انہیں میرا یہ شعر بہت پسند آیا تھا۔ اثر صہبائی اُن دنوں ریاست کشمیر میں ہی پریکٹس کرتے تھے۔ کچھ اور بھی شعر تھے لیکن وہ اب یاد نہیں۔

تیرا تو انتظار رہا مجھ کو رات بھر　　　میرا بھی انتظار رہے اب جا رہا ہوں میں

اور خیر سے اپنی ایک عدد بیاض کئی برس پہلے روہتک کے سیلاب میں بہہ گئی اور پانی میں کئی روز مصرعے گھلتے رہے اور غزلیں ڈھلتی رہیں۔ صابر دت کو جب میں نے یہ قصہ سنایا تو وہ دیر تک شرارت بھرے انداز میں قہقہے لگاتا رہا۔

شعر کہنا شروع کیا تو تخلص لازمی تھا۔ میرے نام کی طرح تخلص بھی میرا اپنا چنا ہوا نہیں، یہ بھی بقول عدم کسی دوست کی نشانی ہے۔ ان دنوں حضرت قیس شیروانی اور آذر عسکری بزمِ جموں و کشمیر کے روحِ رواں تھے۔ اُن سے بڑے گہرے مراسم ہوئے جو اَب بھی قائم ہیں، کچھ عرصہ ہوا قیس شیروانی نے جانے

کہاں کہاں سے میرا ایڈریس تلاش کر کے مجھے ایک خط لکھا۔ اس میں آذر عسکری کی بھی تحریر تھی، جس خلوص اور محبت سے انہوں نے یاد کیا تھا اسے محسوس کر کے آنکھیں بھر آئیں۔

میرے ایک ادیب دوست نے ایک بار مجھ سے ایک سوال کیا تھا، سوال انہی کے الفاظ میں ہے۔

''تمہاری کہانیوں اور ڈراموں کے نام بڑے خوبصورت ہوتے ہیں کیا وجہ ہے؟''

''اس لئے کہ میرا اپنا نام خوبصورت نہیں۔''

اُس وقت تو یہ جواب میں نے نہایت غیر سنجیدگی سے دیا تھا۔ سوچا تھا شاید یہ میری حاضر جوابی تھی لیکن اس کے بعد اس پر غور کیا تو اس کے پس منظر میں ایک بڑی عجیب سی نفسیاتی گتھی تھی۔ میرا جواب صرف حاضر جوابی نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت کی طرف اشارہ تھا۔ ہمیں اس کی چاہ رہتی ہے جو چیز ہمارے پاس نہیں۔ اپنے نام سے کبھی پیار نہ ہوا بلکہ کئی برسوں تک تو وہ کانٹا بن کر ذہن میں چبھتا رہا۔ اسی لئے تحت الشعور کو خوبصورت ناموں کی تلاش رہی۔ میرے عنواں، میرے کردار خوبصورت ہوں یہی سوچتا رہا اور اسی طرح میرے من کو تسکین ملتی رہی، ایک سکون کا سا احساس ہوتا رہا، شاید اسی لئے میں نے اپنے بچوں کے نام خوبصورت رکھے ہیں، اپنی تکمیل کا یہی سادھن میرے تحت الشعور نے میرے لیے تجویز کیا اور اپنے فن کی نوک پلک سنوارنے کا جذبہ استوار کیا۔ اس لئے جو کہانی مجھے خود نہ جچے میں نہیں چھپواتا، اپنی کہانیوں اور کرداروں کے نام بدلتا رہتا ہوں۔ خوبصورتی اور تکمیل کی اسی چاہ نے مجھے ذہنی طور پر آوارہ گرد بنا دیا ہے، پرفیکشن ہو یہی کوشش رہتی ہے، کوئی کمزور پہلو نہ رہ جائے، کوئی چیز اکھڑے نہیں، کہیں کوئی کونہ نہ رہ جائے جو غیر مناسب نظر آئے اور اس سنک نے مجھے Fastidions بنا دیا ہے، آداب میں، رکھ رکھاؤ میں، دفتری کارروائی میں، گفتگو میں، تحریر میں، دوستی میں غرض کہ زندگی کے سبھی پہلوؤں میں پرفیکشن ڈھونڈتا ہوں اور اسی لئے مایوس ہوتا ہوں اور کھیج اُٹھتا ہوں، ظاہر ہے کہ ایسا شخص تندرست ہے تو صبر آزما ساتھی ہوگا اور بیمار ہو جائے تو ایک ضدی مریض ہوگا۔

لیکن کوئی کیا ہے؟ یہ کون کہہ سکتا ہے، کہاں تک کہہ سکتا ہے، سینکڑوں بندھن ہیں، کس کس کو توڑے، کون کون سی دیوار پھلانگے، ایک نہ ایک دیوار تو ایسی آئے گی جسے وہ عبور نہ کر سکے گا اور اس کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر سوچے گا کہ وہ اب تھک گیا ہے، آگے نہیں چل سکتا اور وہ رُک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کچھ دیر ستا لے۔ اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد اب میرے بھی ستانے کی کیفیت آ گئی ہے، کھڑکی میں سے شرد پورنیما کی چاندنی کمرے کے اندر اس لئے نہیں آ رہی ہے کہ اندر بجلی کی تیز روشنی ہے۔ اب بجلی بجھا دینا چاہیے کہ چاندنی اندر آ سکے، جو کب سے کھڑکی کے باہر کھڑی دستک دے رہی ہے اور شرد پورنیما تو سال

میں صرف ایک بار آتی ہے اور اس رات امرت برستا ہے۔

نفسیات کے سمندر میں ہر لحہ روئیں چلتی ہیں، مختلف سمتوں کی طرف، سرد بھی اور گرم بھی، کبھی لہریں کبھی کنارے بن جاتے ہیں اور کبھی کنارے لہروں میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں، یہ کون جانتا ہے کہ جن باتوں پر مجھے آج یقین ہے کل کا اُجالا انہیں جھوٹا ثابت کر دے۔ جو کچھ میں آج لکھ رہا ہوں کل اس پر افسوس کروں اور یہ سوچوں کہ میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔ بہت کچھ کہنا باقی رہ گیا ہے جن نظریوں پر مجھے اعتقاد ہے کل خود میں انہیں غلط سمجھنے لگوں۔ نئی قدریں وقت کے ساتھ ہی تو جنم لیتی ہیں اور پھر آج جو راز میرے سینے میں محفوظ ہیں اور انہیں افشا نہیں کیا، کل وہی انگارے بن جائیں اور روح تک کو جھلسنے لگیں اور میں مجبور ہو کر انہیں باہر پھینک دوں۔ باہر، دنیا والوں کی بے رحم نگاہوں کے سامنے جو کسی سے انصاف کرتے وقت اکثر اپنی ذمہ داریوں کو بھول جایا کرتی ہیں۔

کشمیری لال ذاکر

Regd No45755/85

Registered with the Registrar of Newspapers in India

ALAMI URDU ADAB APRIL 2009

(The only reference journal in Urdu)

Kashmiri Lal Zakir Number

اردو کا واحد حوالہ جاتی مجلّہ

عالمی اردو ادب اپریل ۲۰۰۹ء

کشمیری لال ذاکر نمبر

Price (inland)Rs 300/- (Foreign) US Dollars 20/

Place of printing Sanjeev Offset, Krishan Nagar,Delhi 110051

Statement about ownership and other particulars about Form

(As required by rules of Registrar 'Act)

ملکیت فارم نمبر ۴

رجسٹریشن آف نیوز پیپرز ایکٹ کے مطابق بیان

بابت ملکیت و جملہ تفصیلات

Place of publication F-14/21(D) Alami Urdu Adab ۱۔ عالمی اردو ادب

Krishan Nagar Delhi-110051

F-14/21(D) Krishan Nagar Delhi-110051 ۲۔ مقام اشاعت ایف ۱۴/۲۱ (ڈی) کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱

3,Duration Half yearly ۳۔ وقفۂ اشاعت ششماہی

Printer, publisher & editor Nand Kishore Vikram

F-14/21(D) Krishan Nagar, Delhi 110051 ۴،۵،۶۔ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نند کشور وکرم

7 Nationality Indian ۷۔ قومیت ہندوستانی

8 Address F-14/21(D) Krishan Nagar, Delhi-51 ۸۔ پتہ ایف ۱۴/۲۱ (ڈی) کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱

Nand Kishore Vikram hereby declare that the particulars میں اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ اندراجات

iven above are true to the best of my knowledge and belief درست اور صحیح ہیں۔

Nand Kishore Vikram(Publisher) نند کشور وکرم (پبلشر)

طابع و ناشر نند کشور وکرم نے سنجیو آفسیٹ پرنٹرز کرشن نگر سے چھپوا کر ایف ۱۴/۲۱ (ڈی) کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱ سے شائع کیا۔